دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
ستمبر 2020ء
بانی
معراج رسول
الف بے جیم ڈاٹ کام
صفحات 290
قیمت 100 روپے
مہربانی فرما کر پبلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے مرصع ماہ ستمبر 2020ء کا دلکش شمارہ
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
افشاں آفریدی و نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول دلچسپ دوراہے پر
سعدیہ رئیس کا شاہکار...... پڑھیے منی ناول میں انمول کی صورت
مدیحہ شاہد کا سحر انگیز مکمل ناول پریوں کا دیس
عورت کہانی میں فرحین اظفر لائی ہیں ایک اور شاہکار داستان......
انداز نو میں
ملیں ایف ایم کے خوش گفتار آر جے
اسد علی چوہدری ...... سے
شمع ہدایت میں
اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ
رضا...... توفیقِ الٰہی
کے عنوان سے
اس کے علاوہ
ہما بیگ، ناہید سلطانہ اختر، طیبہ عنصر مغل،
سعدیہ قریشی، افشین نعیم و دیگر لکھاریوں کی لاجواب تحریریں
رنگارنگ مستقل سلسلے پُر مزاح تراشے اور مسحور کن شاعری......
یہ سب آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے
الف بے جیم ڈاٹ کام
مہربانی فرما کر پبلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 چینی، نکتہ چینی — مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

12 خونی ہیرے — امجد رئیس
پُرتجسس سنسنی خیز انگلش ناول کی ناقابلِ فراموش تلخیص

73 اجل گرفتہ — حسام بٹ
دوسرے کے حق پر ڈاکا ڈالنے والے بدفطرت لوگوں کا ماجرا

83 شیطان — اعتزاز سلیم وصلی
شاطر مجرم اور معصوم بچی کے اغوا کا سنگین معاملہ......

93 آزادی — عائشہ احمد
اس شخص کا قصہ جس کے لیے وطن...... ہر تعلق ہر رشتے سے اول تھا......

98 الاؤ — ڈاکٹر عبد الرب بھٹی
انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

131 خودنمائی — تنزیلہ ریاض
ایک عورت کی پُراسرار موت جو سنگین جرم میں ڈھل چکی تھی......

جلد 50 • شمارہ 09 • ستمبر 2020 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

143
ہنگامی شادی
طاہر جاوید مغل
اس پنچھی کی پرواز جو اپنے ہی
دام میں آگیا تھا......

153
بے گھر
مظہر سلیم ہاشمی
خوف، دہشت اور ڈرامائی صورتِ حال
کے گرد گھومتی پُراسرار کہانی......

166
انا گیر
امجد جاوید
صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ
ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

201
ریڈ کارڈ
محمد سلیم اکرم
ایک ہی انداز میں قتل ہونے والے
دو دوستوں کی سنگین واردات......

221
قاتل وصیت
شاکر لطیف
دو بھائیوں اور ایک بہن کے درمیان
حائل قاتل وصیت کی رسا کشی......

236
مظلوم رفاقت
روبینہ رشید
آگ کی طرح بھڑکتے، لپکتے جسموں کو بھسم
کردینے والے شعلہ صفت کی شرانگیزیاں

273
مقدر کا سکندر
غلام قادر
آرزوؤں اور حسرتوں کے جیتے
جاگتے شہر میں بسی کہانی کے پیچ و خم

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

ستمبر کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ ستمبر گیا، جاڑا آیا یعنی موسم سرما کی اب آمد آمد ہے۔ پاکستان کے بالائی اور وسطی علاقوں میں جم کر سردی کا راج ہوتا ہے لیکن کراچی کا موسم کوئٹہ سے آنے والی سرد ہواؤں کا محتاج ہوتا ہے۔ اُدھر سے یخ بستہ ہواؤں کی لہر آتی ہے تو لحاف اور رضائیاں یاد آتی ہیں ورنہ کونے کھدروں میں پڑی رہتی ہیں...... دوسری طرف وبائی لہر ہے جو گزرنے کا نام نہیں لے رہی۔ مہینے گزر گئے، رمضان المبارک، عید اور پھر عیدالاضحی بھی اس کے سائے میں گزر گئی۔ جشنِ آزادی کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا پڑتا نظر آرہا ہے...... لیکن ستمبر کے حوالے سے ایک دن ہمیشہ یادگار رہے گا۔ 6 ستمبر...... موذی صاحب اور ان کے ہم وطنوں کے زخم ہر سال تازہ کردیتا ہے...... پچھلے دنوں ان کے سرحدی سورما چینی فوجیوں کی ٹھوکروں میں گرتے پڑتے...... روتے بلکتے نظر آئے...... نیپال نے بھی بھارتیوں پر غرانا شروع کردیا ہے۔ بنگلا دیش سے ہمارے مراسم کی بحالی پر نریندر موذی پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ سارا غصہ کشمیر کے بہادر مسلمانوں پر نکال رہا ہے...... لیکن کب تک...... لگتا ہے کہ اس کے دن قریب آگئے ہیں۔ ظلم و ستم کا یہ سلسلہ ایک دن اپنے عذاب سے دوچار ہو کر رہے گا۔ اللہ کی پکڑ بہت سخت اور بے رحمانہ ہوتی ہے...... یہ مکافاتِ عمل ہے جو جلد ہی رونما ہو کے رہے گا۔ موجودہ حالات خاصے مایوس کن نظر آتے ہیں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمان جہاں بھی ہیں، پسماندگی، جہالت، ظلم اور تشدد کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے میں صرف ترکی سے توانا صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کی راہ پر لے جانے کا سہرا اسی برادر ملک کے سر...... پر سجے گا۔ فی الوقت یہی ایک امید نظر آرہی ہے...... اور اس کے ساتھ اب چلتے ہیں اپنی تندرست اور توانا محفل میں جہاں گرمی بھی ہے اور سرگرمی بھی......

داؤد خیل، میانوالی سے ریاست خان کی حسرت ’’اگست کا شمارہ 25 تاریخ کو ملتان سے لیا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ لال جوڑے لال سرخی میں قیامت سامنے تھی۔ ایسے میں اوپر موجود آدمی حسن دیکھ کر شاید زندگی کی بازی ہار گیا۔ چینی نکتہ چینی...... یوم آزادی اور عیدالاضحی کی مبارکباد آپ کو بھی اور سب جاسوسی کے دوستوں کو۔ کورونا نے واقعی ہر چیز کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس کے بارے میں نہ کبھی سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ اللہ پاک ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے اور اس بیماری کو ختم فرمائے آمین۔ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو...... بے شک۔ اس بار صدارت کی کرسی پر نوید ظفر نظر آئے۔ بھئی ہمارا نمبر کب آئے گا ہم تو ترس گئے خود کو صدارت کی کرسی پر دیکھنے کے لیے۔ نوید تپتی دھوپ میں شمارہ لیتے نظر آئے، یہ آپ کی محبت ہے بھائی۔ ابرار احمد عرصے بعد نظر آئے، خوش آمدید بھائی آپ کی واپسی قبول ہوگی کیوں نہیں ہوگی۔ سرفراز اپنے مختصر تبصرے میں فرمائشیں کرتے نظر آئے۔ راحیلہ صاحبہ بھی تھوڑی ہوشیار ہوتی جارہی ہیں، تبصرے اب کمال کے کرتی ہیں۔ مومنہ صاحبہ گرمی اور کورونا کا رونا روتے ہوئے حاضر ہیں۔ آپ کے شہر کا موسم ویسے بھی گرم ہے اور اوپر سے کورونا بھی آگیا اور اوپر سے آپ کو گول گپے چاہئیں۔ مبشر ہمدانی کو خوش آمدید، تبصرہ نگاری شروع کی ہے تو اس کو جاری رکھنے کی کوشش کریں۔ ابتدائی صفحات میں ایچ اقبال کافی عرصے بعد نظر آئے۔ سائبانی وحشت گردلا جواب کہانی تھی۔ افروز اور سفیان کی کیمسٹری کمال تھی۔ افروز نے جس طرح سفیان کا بدلہ لیا، اس نے دکھا دیا کہ اگر عورت انتقام لینے پہ آجائے تو ناگن بن جاتی ہے۔ مجھے شروع میں شک تھا کہ نبیل ہی دہشت گرد ہوگا لیکن کہانی نے ایسا رخ موڑا کہ حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر طالش اس کا اپنا چچا پاس تھا جعفر کے کردار نے بہت غصہ دلایا۔ لیکن...... منظر امام کی مختصر تحریریں کمال ہوتی ہیں۔ اس کہانی میں بھی ایسا ہی ہے۔ تنویر کی گمشدہ محبوبہ رضیہ اور تنویر خود دو مرتبہ بی اے کرچکا ہے ایک بار فیل پھر پاس ہوا۔ بے چارے کے ساتھ بہت برا ہوا۔ رضیہ کا باپ ظالم سماج بن گیا اور تنویر پردیس چل دیا۔ آخر میں اسٹوری نے بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور کردیا۔ الاؤ کی دسویں قسط بھی زبردست رہی۔ روبی اور سیف کی کیمسٹری خوب جارہی ہے لیکن رائٹر نے اصل ہیروئن کو شاید بھلا دیا، یہ بہت برا ہوا۔ اناگیر...... امجد صاحب کہانی کو بہت تیزی سے لے کے جارہے ہیں صرف چوتھی قسط میں کیا کیا کام کروا ڈالے۔ آہستہ جناب کہیں کہانی ختم تو نہیں کرنے چلے۔ فتنۂ دلگیر سرورق کی پہلی کہانی جتنا بڑا نام اتنے پھیکے پکوان کہانی میں

بالکل کوئی دم خم نظر نہیں آیا۔ کہانی شروع سے ہی ایسی تھی، پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن پڑھ لی دل پر پتھر رکھ کر۔ غیبی انصاف نجمہ مودی کی زبردست کہانی تھی۔ ثنا کو شوہر تو مل گیا تھا لیکن اس کے ماضی نے ثنا کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ریحان بھی مر گیا اور ثنا پر بھی ڈکیتی کے مجرموں کی پشت پناہی کا الزام لگ گیا۔"

ساہیوال سے محمد عثمان ذوالفقار کی دعائے خیر "بندۂ ناچیز آپ کا بہت شکرگزار ہے کہ آپ نے جون جولائی کے مشترکہ شمارے ... میں میرا خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ سب سے پہلے نکتہ چینی میں پہنچے تو نوید ظفر صاحب کو کرسی صدارت پر پایا۔ ریاست خان صاحب کا مجھے کھٹا کھٹا ویلکم کہنے کا بہت شکریہ۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ البتہ کچھ پرانے ساتھیوں کو غائب پایا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اناگیر کی طرف چھلانگ لگائی۔ یہ قسط کافی سنسنی خیز تھی مگر ابھی تک نہ تو علی کا ماضی معلوم ہوا ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہوا ہے کہ علی کا مقصد کیا ہے۔ پہلے ایک طرف تو بعد میں دوسری طرف۔ الاؤ ٹھیک تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب طارق کو آخر سے کچھ پہلے منظرِ عام پر لائیں گے مگر اس کے برعکس وہ جلد ہی سامنے آگئے۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ سائبانی دہشت گرد مجھے بہت پسند آئی۔ میرا خیال تھا کہ مصنف ہبر شاہ کی حقیقت آخر پر آشکار کرے گا تاکہ تھوڑا سا سسپنس پیدا ہو مگر وہ بھی جلد ہو گئی لیکن پھر بھی تھوڑا سا چونکا ضرور دیا۔ فتنہ دلگیر شروع سے تو روایتی لگی مگر سیٹھ داؤد کے اعتراف نے اسے غیر روایتی بنا دیا۔ کیونکہ سیٹھ داؤد جیسے لوگ اتنی آسانی سے اعتراف نہیں کرتے۔ غیبی انصاف شروع سے تو فلمی لگی مگر بعد میں وہ بھی روایتی کہانی بن گئی۔ اختتام بھی ٹھیک تھا۔ منظر امام کی لیکن نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ حق بجانب اور ناقص منصوبہ بھی ٹھیک تھی۔ بدقسمت اچھی لگی۔ حادثہ بھی اچھی تھی مگر یہ کہانی کچھ تھی اور اس کا اختتام کچھ ہوا۔ ولن بہت پسند آئی۔ واقعی اس معاشرے کو ٹھیک کرنے کے لیے کسی ہیرو کی نہیں بلکہ ولن کی ضرورت ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اور یہی ہمارے معاشرے کا حال ہے۔ لیکن میری پھر بھی یہی دعا ہے کہ خدا سرسبز رکھے اس چمن کو۔"

میانوالی سے نعیم تکوکر کا مشورہ "جاسوسی جلد ملا تو بڑی عید سے پہلے وڈی عید ہو گئی۔ مسرت اور بے تابی سے سینے لگایا تو کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ ٹائٹل چمکتا دمکتا عیدالاضحیٰ کے نمایاں حروف، سرخ لباس میں لال ہونٹوں، پھیننی سی ناک، جھیل سی آنکھوں اور سیاہ بالوں والی حسینہ دیکھی دیکھی سی لگی۔ یاد نہیں کب اور کہاں دیکھی۔ (اتنی جلدی بھول گئے؟) ٹائٹل پر دو چیزوں کو نظرانداز کیا۔ تبت اور مشروب جاں سے سیر ہو کر اداریہ پڑھا۔ چینی نکتہ چینی میں اپنا تبصرہ غائب پا کر حیرت سی ہوئی۔ میرے تبصرے میں مرچیں تو تھیں نہیں کہ چینی میٹھی چینی میں نہ بچتا۔ (ہمیں ملا ہی نہیں) اناگیر سے آغاز کیا۔ علی سرحد پار کیا گیا۔ کہانی نے رفتار پکڑ لی ہے۔ منظرنگاری، اندازِ بیاں اور تجسس سے بھرپور کہانی بڑی پسند آ رہی ہے۔ علی کے بیک گراؤنڈ کے کھلنے کا بے تابی سے انتظار ہے۔ لیکن حقیقت حال پر رواں دواں ہلکی پھلکی کہانی لکھنے کا فن کوئی سیکھے تو منظر امام سے سیکھے۔ ولن، زویا اعجاز جو نام ہے اعتماد کا۔ کیا خوب کہانی لکھی۔ یوسف جیسے لوگ معاشرے میں موجود ہیں جو ہیرو ہو کر بھی ولن سمجھے اور جانے جاتے ہیں۔ یوسف کو سانپ کیوں نہیں ڈستے تھے؟ بدقسمت بڑی اچھی رہی۔ فرسٹ ایئر کی انگلش کا پہلا پہلا سبق بٹن بٹن یاد دلا گئی۔ مختصر اور کچھ خار بھی اچھی لگیں۔ غلام قادر، ایچ اقبال اور نجمہ مودی کی آمد بہت بھلی لگی۔ یہ آتے رہیں تو بہت اچھا ہے۔ محمد سلیمان زبیر، ابراہیم جمالی، ناصر ملک اور علی اختر کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان کو بھی واپس لائیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اچھے رائٹر ہیں مگر ادارے نے ان پر اتنا بوجھ ڈالا ہے کہ ان کے قلم کا دم نکلتا جا رہا ہے۔ ان سے قسط وار کے بجائے ابتدائی صفحات اور سرورق کی کہانیاں لکھوائیں۔"

سکھر شریف سے نورین مبارک کی باتیں "میں تو مایوس ہی ہو چکی تھی۔ جب بھی کسی بک شاپ سے جاسوسی کا پتا کیا جواب انکار میں ہی ملا۔ بھلا ہو میری دوست شہلا کا کہ اس کی نظر ایک بک شاپ پر موجود چمکتے دمکتے جاسوسی پر پڑ گئی اور اس نے ٹھک سے مجھے کال کھڑکا کے بتا دیا۔ اس وقت جو خوشی محسوس کی، اس سے اندازہ ہوا کہ جاسوسی میری زندگی میں کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے اسے جاسوسی لینے کا کہا اور خود پڑوس میں موجود اس کے گھر جا کے اس کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اس اللہ کی بندی کے بھی پانچ منٹ دو گھنٹے کے برابر ٹھہرے۔ بارہا کال کرنے کے باوجود وہ دو گھنٹے بعد گھر پہنچی اور غصے سے جاسوسی میرے سامنے پٹخا، اور لگی میری کلاس لینے۔ میرا تو سارا غصہ جاسوسی کے دیدار سے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ پہلے تو کورونا کے خوف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے گلے لگایا۔ چوما، چاٹا۔ پھر دیر سے آنے پر چند کھری کھری سنائیں اور جاسوسی کو ساتھ لے کے گھر پہنچ گئی۔ سرورق کی حسینہ کے عید مبارک کے جواب میں جلدی سے اسے عید مبارک کہا اور چینی نکتہ چینی کی طرف چل پڑی۔ اپنے تبصرے کی تلاش میں جلدی سے صفحات پلٹے مگر تبصرہ ندارد۔ مارے باندھے دوسروں کے تبصرے پڑھنا شروع کیے تو اندازہ ہوا کہ اس سے قبل ایک اور مشترکہ شمارہ بھی چھپ چکا ہے اور میرا تبصرہ اس میں چھپ چکا ہے۔ اگلے دن عید تھی۔ پچھلے شمارے کی خریداری کو پھر کسی وقت پر رکھا

اور جو دستیاب تھا اسی کے مطالعے میں جُت گئی کہ پھر عید کے دنوں میں مرد حضرات تو ویلے ہو جاتے ہیں مگر ہم خواتین کے لیے سانس لینا بھی محال ہو جاتا ہے۔ نوید ظفر، دکان دار تو آپ کو پاگل، خبطی، جنونی سمجھتا ہوگا ہی مجھے بھی آپ نا سمجھ، بے وقوف، بے عقل وغیرہ لگے۔ بھئی، دکان دار کا نمبر لے لیں۔ کال کر کے پوچھ لیا کریں۔ چکر لگا کے کاہے کو خود کو ہلکان کرتے ہیں۔ مرد ہونے کا کچھ تو فائدہ اٹھائیں۔ مشورہ مفت ہے۔ مزے اُڑائیں۔ ریاست خان، آپ بھی مجھے اس بار خاصے میچور لگے۔ اسے انجمن ستائش باہمی ہی سمجھے گا۔ ابرار ساقی، خوش آمدید، آپ کا تبصرہ بھی جاندار رہا۔ سرفراز انکل کو بھی خوش آمدید۔ محفل کو آپ جیسے بزرگوں کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ آتے رہا کریں۔ راحیلہ بھٹی کا راگ ملہار آدھا سنا۔ میرا کوئی ذکر ہی نہیں۔ دس از ناٹ فیئر آنٹی جی۔ مومنہ کشف، اکثر معصومانہ سی باتیں کرتے کرتے ایسی بات کر جاتی ہیں کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ ھدانی انکل، آپ تو بہت اچھے انکل معلوم ہوتے ہیں۔ خوش آمدید۔ ایسے ہی ہماری حوصلہ افزائی کرنے کے لیے آتے رہنا۔ کہانیوں میں اس بار وقت کی کمی کے باعث چند ایک کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں۔ نجمہ مودی نے کمال کا رنگ پیش کیا۔ نیک و بد کرداروں پر مشتمل تحریر نے احساسات کو چھو لیا۔ ثنا بے چاری پر بڑا ترس آیا۔ پہلے رنگ میں غلام قادر نے ایک بار پھر سخت مایوس کیا۔ ایک بیٹی کا باپ کو تم کہنا سخت ناگوار گزرا۔ باپ چاہے جیسا بھی ہو باپ ہی رہتا ہے اور ہمارے معاشرے میں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے باپ بیٹی اس قسم کی گفتگو آپس میں نہیں کر سکتے۔ منظر امام کی لیکن دلچسپ کہانی تھی۔ اعتزاز سلیم کی بدقسمت کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ مشین کی کچھ حقیقت بتا دیتے تو ان کی بڑی مہربانی ہوتی۔ ماہ رخ ارباب کی اردو بہت اچھی لگی لیکن کہانی بور لگی۔ بس الفاظ کی چاشنی محسوس کرنے کے لیے ہی مکمل پڑھی۔ زویا اعجاز نے معاشرے کے سلگتے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ یہ سچ ہے کہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک، ہمارے معاشرے کو خطرناک صورتِ حال کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ ابھی اتنا ہی شمارہ پڑھ پائی ہوں۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو پھر آدھی ملاقات کے لیے حاضری دوں گی۔" (انتظار رہے گا)

منڈی بہاؤالدین سے منصور کامران کی بھرپور تبصرہ نگاری "امید ہے آپ سیلابی بارشوں، کورونا، دہشت گردی، ڈاکا زنی جیسے سب مصائب سے محفوظ ہوں گے، جن کا کراچی کے شہری اکثر نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ ہم بھی خیریت سے ہیں گو کہ کورونا نے ہم پر بھی اپنے پنجے گاڑے۔ بصد شکر کہ بات بخار اور گلے کی تکلیف تک ہی محدود رہی اور ہم گھر میں ہی قرنطینہ کر کے صحت یاب ہو گئے۔ قرنطینہ سے رہائی ملی تو پہلی فرصت میں دکان کا رخ کیا جہاں جاسوسی کے دو، دو شمارے ہمارے منتظر تھے۔ پہلے اگست کے شمارے کو شرفِ مطالعہ بخشا کہ تبصرہ بھی کرنا تھا۔ سرورق قدرے منفرد اور خوبصورت رہا۔ فہرست میں ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال، رنگوں میں غلام قادر اور نجمہ مودی کے نام دیکھ کے ایسا محسوس ہوا گویا کسی پرانے زمانے کا گولڈن شمارہ ہاتھ میں آ گیا ہو۔ ایچ اقبال سے سفر کا آغاز کیا۔ سنا تھا وقت کے ساتھ رائٹرز بہتر سے بہترین ہوتے جاتے ہیں مگر ایچ اقبال اور غلام قادر کے معاملے میں گنگا الٹی ہی بہتی دیکھی۔ دونوں سینئر مصنفین ماضی میں معاشرے میں پھیلے منفرد کرداروں کو پیش کرنے اور تجسس سے بھرپور کہانیاں لکھنے کی بنا پر ہمیں بہت پسند تھے، تاہم جب سے غلام قادر کی واپسی ہوئی ہے، ان کا وہ ماضی و حال کو ساتھ لے کے کہانیوں کو پُرتجسس بنانے کا انداز مفقود نظر آیا۔ معذرت مگر اب تو وہ سیدھے سادے انداز میں بس صفحات کالے کرتے ہی نظر آتے ہیں۔ فتنہ دلگیر ابتدا میں قدرے دلچسپ نظر آئی لیکن باپ، بیٹی اور ہونے والے داماد کی ملاقات میں جو مکالمہ نگاری کی گئی۔ باپ نے جیسے اپنے جرائم کا اعتراف کیا، یہ سب حقیقت سے بہت دور کی چیز تھی۔ بہت مایوسی ہوئی۔ ایچ اقبال کی تحریر شروع میں کافی بور رہی۔ بالخصوص چھوٹی چھوٹی بے مقصد جزئیات سے جہاں کہانی میں سقم پیدا ہوئے وہاں ہماری دلچسپی بھی بیزاری میں بدلتی گئی لیکن آگے جا کے کہانی قدرے بہتر ہو گئی۔ طالش کے کردار کو بہت جلدی کھول دیا گیا۔ ایک وہی تو جھٹکا تھا جو قاری کو بروقت لگایا جاتا تو کہانی کا رنگ بنتا۔ بہر حال مجموعی طور پر ہم اس کا شمار ایچ اقبال کی کمزور کہانیوں میں کریں گے۔ نجمہ مودی نے البتہ خوب سماں باندھا۔ یہ جیسا ماضی میں لکھتی تھیں اب بھی اسی معیار پر قائم ہیں۔ ثنا کے احساسات کو کمال انداز میں پیش کیا۔ یہ تحریر پسندیدگی کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہی۔ مختصر تحاریر میں زویا اعجاز کی ولن سب سے شاندار رہی۔ بس اختتام کچھ عجیب سا لگا۔ دوسرے سبق سے متصادم لگا۔ ماہ رخ ارباب نے پرانی کہانی کو نئے انداز میں پیش کیا اور کیا خوب کیا۔ ان کا انداز بہت پسند آیا۔ اعتزاز سلیم، بدقسمت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کافی منفرد اور دلچسپ تحریر رہی۔ منظر امام نے لیکن میں رونے والے واقعات پیش کر کے بھی ہمیں ہنسا دیا۔ کورونا سے دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو بالکل متاثر نہ ہوا ہو۔ سرور اکرام کی کچھ خار کا اختتام متاثر کن اور سبق آموز رہا۔ ہم دنیا میں بہت کچھ کھو دیتے ہیں لیکن اس سے مایوس ہونے کے بجائے اسے مثبت لیں تو نا صرف ہماری بلکہ بہت سے لوگوں کی زندگی بدل سکتی ہے۔ احمد جعفری نے حادثہ لکھی۔ یہ اس لحاظ سے بہت منفرد لکھتے ہیں

کہ ان کی کہانیوں میں عموماً ہیرو کے ساتھ سب اچھا ہی ہوتا جاتا ہے، معمولی سا مسئلہ آئے بھی تو حل ہو جاتا ہے۔ ٹینشن زدہ ماحول میں یہ تحریر اچھی لگی۔ جمال دستی کی سراغرسی پر مبنی کہانی حق بجانب بھی خاصی دلچسپ رہی۔ کہانی کے نام سے تو لگا تھا بیوی ہی قاتل ہوگی لیکن انجام چونکا دینے والا رہا۔ تنویر ریاض کا ناقص منصوبہ دراصل بہت اعلیٰ منصوبہ تھا لیکن چوروں کو پڑ گئے مور۔ سیر کو سوا سیر مل گیا۔ کچھ بھی کہیں ہمیں تو مزہ آ گیا۔ عکس فاطمہ کی تحریر بھی بہتر رہی۔ قسط وار اور چینی نکتہ چینی اس بار رہ گئیں کہ پچھلا شمارہ بھی ابھی باقی ہے۔ اب ان پر تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ۔''

ممتاز احمد فیروز پوری چونیاں سے ''28 جولائی کو جاسوسی کا شمارہ ملا۔ سرورق پر نظر دوڑائی تو ایسا لگا جیسے دکان دار نے غلطی سے سسپنس ڈائجسٹ پکڑا دیا ہے کیونکہ پورے سرورق پر حسینہ براجمان تھی۔ آنکھیں جھپکا کر اور غور سے دیکھا تو جاسوسی کا نام جگمگا رہا تھا۔ سرورق دیکھ کر بوریت محسوس ہوئی۔ عیدالاضحیٰ کی ایڈوانس مبارک وصول کرتے ہوئے کہانیوں کی فہرست پر جا پہنچا۔ امجد اقبال کا نام پہلے صفحات پر دیکھا تو یاہو کا نعرہ لگاتے ہوئے سب سے پہلے ان کی سائبانی دہشت گرد پڑھی۔ پوری کہانی ایڈونچر سے بھرپور تھی۔ سفیان کا کردار بہ حیثیت پائلٹ بہت زبردست تھا مگر اس کی المناک موت پر ایک دفعہ تو اداس ہو گیا کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ کہانی کا ہیرو سفیان ہے مگر اس کی موت کے بعد جس طرح افروز نے بدلہ لینے کا عزم کیا، قابلِ تعریف ہے۔ دورانِ مشن افروز کی بہادری اور خاص طور پر جس طرح سے اس نے ببر شاہ کو ٹریس کر کے اپنا بدلہ لیا وہ واقعی میں زبردست تھا۔ اس کے بعد واپس پلٹا اور گھس گئے اپنی محفل ہاؤ میں۔ اس دفعہ صدارتی سیٹ پر نوید ظفر براجمان ہیں۔ مبارک ہو۔ مبشر صاحب نے اپنی پہلی یلغار بھرپور انداز سے کی۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس طرح یلغار کرتے رہیں گے۔ سرفراز صاحب نے الاؤ پر اپنی بھڑاس نکالی۔ محفل کے بعد جاسوسی کا پہلا رنگ پڑھا جو کہ غلام قادر نے تحریر کیا۔ کہانی بالکل متاثر نہ کر سکی کیونکہ اس طرح کی ملتی جلتی کہانیاں جاسوسی میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ہی خاندان کے گرد گھومتی رہی۔ کہانی میں سسپنس زیادہ اور جاسوسی کا عنصر بہت کم تھا۔ نجمہ مودی کی غیبی انصاف میں ثنا کی زندگی کا احاطہ کرتی تحریر اچھی لگی خاص طور پر جب وہ ریحان کے ساتھ مختلف جرائم کرتی نظر آئی۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے زیادہ جس نے متاثر کیا وہ بدقسمت تھی۔ مایوسی کے اندھیروں میں گھرا جورڈی ہر طرف سے بدقسمت رہتا ہے مگر پھر یک دم زندگی اس پر مہربان ہوتی ضرور ہے مگر وہ موت کے سامنے ہار جاتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بدقسمتی رہی۔ کہانی کا انجام زبردست رہا۔ منظر امام کی لیکن نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ تنویر اپنی محبت کو پانے کے انتہائی قریب آ کر دنیا سے چلا گیا۔ قسمت کی خوبی دیکھیں کہ ٹوٹی کہاں کمند...... حادثہ ایک جاندار کہانی کے طور پر پسند آئی۔ تیزی سے واقعات رونما ہوتے ہوئے بالآخر پیٹر کے سوال پر ختم ہو گئی۔ میرے خیال میں پیٹر کے باپ نے گاڑی کی بریک فیل کی تھیں تا کہ وہ اپنی بیوی کی بلیک میلنگ سے چھٹکارا پا سکے۔ زویا اعجاز نے ولن میں ایک اہم معاشرتی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا۔ میرے خیال میں اگر ہر بندہ اس طرح سے اپنے طور پر انتقام لینا شروع کر دے تو... یہ اچھی علامت نہیں۔''

یو، اے، ای سے طلعت مسعود کی ذہنی تیز رفتاری ''اگست کا سرورق اچھا رہا۔ چینی نکتہ چینی میں قدم رکھا۔ کچھ پرانے اور کچھ نئے تبصرہ نگار نظر آئے۔ نوید ظفر، ریاست خان، مبشر ہمدانی، مومنہ کشف، راحیلہ بھٹی سمیت سب کے تبصرے طویل لیکن جامع تھے لیکن خواتین کی شرکت اب کم سے کم ہوتی جا رہی ہے ایسی کیا بات ہے بھئی میک اپ پارلر باہر بند ہوئے ہیں یہاں تو نہیں پھر لفظوں کا میک اپ تو خود کر سکتی ہیں خواتین۔ الاؤ میں بھٹی صاحب کے اندازِ تحریر سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ موجودہ اور پچھلی قسط مجموعی طور پر پہلی دو کے مقابلے میں اچھی رہیں۔ بس رائٹر بھی کبھی بہت مشکل الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں جو بے محل ہوتے اور اس سے الجھن ہوتی ہے۔ اس سے اگر اجتناب کریں تو زیادہ بہتر لگے گا۔ اناگیر کافی تیز ٹیمپو میں جا رہی ہے گو کہ ابھی ہیرو کا پس منظر دھند میں ہی ہے اور اس قسط کے بعد مزید پُر اسرار لگنے لگا ہے۔ مکمل کہانی کھلے گی تو ہی کچھ مزید کہا جا سکتا ہے فقط دلگیر اتنا متاثر نہیں کر سکی جتنا غلام قادر صاحب سے توقع تھی۔ کافی سیدھی سی کہانی لگی اور آغاز میں ہی کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ کہانی کس طرف جا رہی ہے۔ جبکہ غیبی انصاف بہتر رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ کام جو بھی کریں، اس کا بدلہ دنیا میں کسی نہ کسی صورت مل جاتا ہے اچھے کام کا انعام بھی اور برے کام کا بدلہ بھی۔ ثنا کا انجام افسوسناک لیکن اس کے کاموں کا عین نتیجہ تھا اسی کے ساتھ اگر اشرف کا بھی انجام دکھایا جاتا تو مزید اچھا لگتا۔ مختصر بھی اچھی رہی گو کہ اس کے انجام کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اب پتا نہیں ہمارا ذہن تیز چل رہا تھا' اس بار یا کہانیاں زیادہ آسان رہیں۔ ولن میں معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں نظام اتنا ناکارہ ہو چکا ہے کہ اب لگتا ہے کچھ بھی سیدھا نہیں اور لوگوں میں مایوسی بڑھ رہی لیکن اس کے باوجود اگر سب اپنا انصاف خود کرنے لگیں تو بھی معاشرہ انارکی ہی کی طرف جاتا ہے۔ کچھ خار اور لیکن ہلکے

پھلکے انداز کی سبق آموز کہانیاں تھیں۔ منظر امام یا سرور اکرام کی کہانیاں نامحسوس انداز میں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی پیغام دے جاتی ہیں۔ جورڈی بے چارہ بدقسمت رہا لیکن دولت جس فلمی انداز میں آئی تھی اس میں کچھ تو ہونا ہی تھا کیونکہ آسانی سے دنیا میں کچھ نہیں ملتا۔ کہانی کا خیال اچھا تھا۔ حادثہ کہانی پڑھ کر کافی دیر اس پر غور وفکر کیا کہ آخر اتنے صفحات کی کہانی لکھنے کی کیا ضرورت تھی شاید وبا کے دن گزارنے کے لیے ٹائم پاس لیکن اگر لکھ لی تھی تو شائع ہونا بھی شاید حوصلہ افزائی کے لیے ہی تھا۔ کیونکہ کہانی مرکزی خیال کے مطابق بس آخری ڈیڑھ صفحے میں ہی تھی اور دو صفحوں میں پوری ہوسکتی تھی۔ (اب آپ احمد جعفری صاحب کا دل توڑ رہے ہیں) سائبانی دہشت گرد بھی اچھی رہی۔ دہشت گردی پر گو کہ کافی لکھا جا چکا لیکن اس ناسور کو بے نقاب کرنے کے لیے جتنی آگاہی دی جائے، وہ کم ہے۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی پسند ناپسند" جاسوسی اس بار 25 جولائی کی ایک بھیگی بھیگی رُت میں ڈاکیا دے گیا۔ سرورق اچھا تھا مگر طباعت اب بھی خراب تھی۔ خطوط کی محفل میں اس ماہ پرانے اور نئے لکھنے والے نظر آئے۔ نوید ظفر صاحب (غالباً نئے) اس بار بازی لے گئے۔ سلسلہ وار کہانی الاؤ بے حد سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے البتہ دوسری سلسلہ وار کہانی اناگیر بہت دلچسپ جارہی ہے۔ سرورق کی کہانیاں فتنۂ دلگیر اور نیبی انصاف عین جاسوسی کے معیار کی تھیں۔ شمارے کی اولین کہانی سائبانی دہشت گرد بس گزارے لائق تھی۔ مغربی کہانیوں میں تنویر ریاض کی ناقص منصوبہ اور مقامی کہانیوں میں زویا اعجاز کی ولن بہترین تھیں۔"

لاہور سے راحیلہ بھٹی کے ارادے" اخبار والے نے جاسوسی لاکر دیا تو سب سے پہلے ٹائٹل کا تجزیہ کیا۔ ٹائٹل پہ موجود لڑکی کو خوب صورت تو نہیں کہا جاسکتا اور اوپر سے اس کے نیم وا ہونٹوں سے جھلکتے دانت اسے کسی چوہیا سے مشابہت دے رہے تھے۔ (یہ زیادتی ہے) لڑکی بھی کسی نامعلوم ٹارگٹ کو بڑی مستقل مزاجی سے گھور رہی ہے اور ساتھ میں ایک مرد۔ اپنی موت کا اعلان کر رہا ہے۔ گولی اور پسٹل نے بتادیا کہ ٹائٹل جاسوسی کے معیار کے عین مطابق ہے۔ ٹائٹل کا بغور جائزہ لینے کے بعد ہم اپنی پسندیدہ محفل میں پہنچے جہاں نوید ظفر وکٹری اسٹینڈ پہ نظر آئے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ واقعی بہت اچھا تھا، الاؤ کو چھوڑ کر۔ ریاست خان اور ابرار احمد ساقی نے بھی اچھا لکھا۔ فیصل آباد کے سرفراز ناز الاؤ کی برائیاں کررہے تھے۔ سمجھ نہیں آتا کہ... ان بزرگوں کو نیو ایج مصنفین سے اتنی شکایات کیوں ہیں؟ مومنہ کشف کا ہنستا مسکراتا تبصرہ بھی پسند آیا۔ مبشر ہمدانی کو ویلکم۔ اس بار خطوط کم تھے کیا جو ریگولر تبصرہ نگار غائب تھے۔ سب سے پہلے ہم نے چھوٹی کہانیاں پڑھیں جن میں تنویر ریاض کی ناقص منصوبہ سب سے اچھی تھی۔ لاٹری کے چکر میں انکل کا قتل کرنے کا یہی انجام... ہونا تھا۔ حقیقت اور حق بجانب بھی پسند آئیں۔ بدقسمت اچھی فینٹاسی تھی۔ حادثہ پڑھ کر افسوس ہی ہوا کہ اتنی بری کہانی آخر کیوں پڑھی جس کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ احمد جعفری سے گزارش ہے کہ جاسوسی کے معیار کا لکھا کریں، یہ بچوں والی کہانیاں لکھ کر وقت ضائع نہ کریں۔ مختصراً الجھی ہوئی کہانی تھی لیکن بہت پسند آئی۔ پرانے زمانے کی کہانیوں کی یاد دلوادی اس نے۔ ولن کا آغاز اچھا تھا اور سسپنس بھی تھی لیکن آخر میں نصیحتوں کا پٹارا کھلا تو بور ہوگئی۔ اب آتے ہیں طویل کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے امجد جاوید کی اناگیر کی چوتھی قسط بھی ہنگاموں سے بھرپور اور فل ایکشن ثابت ہوئی۔ چولستان کا بیٹا علی جس ثابت قدمی اور دلیری کے ساتھ دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما ہے، اس نے نئے پڑھنے والوں کے لہو کو بھی ابالا دے رکھا ہے۔ زبردست دھینگا مشتی کے باوجود کہانی کا تسلسل نہیں ٹوٹ رہا۔ اپنی فیورٹ کہانی الاؤ تک پہنچی تو بہت اچھی لگی۔ شروع شروع میں محسوس ہوتا تھا کہ عبدالرب بھٹی کہانی کے ساتھ کچھ انصاف نہیں کر پا رہے لیکن کہانی آہستہ آہستہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آرہی ہے۔ ایک بات جو اچھی نہیں لگتی وہ یہ ہے کہ بھٹی صاحب نے کرداروں کے مزاج میں اچانک ہی بہت تبدیلیاں کردی ہیں۔ بہرحال یہ قسط پڑھ کر واقعی مزہ آیا خاص طور پہ سرنگ والا سین۔ اس بار سرورق کی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ غلام قادر نے انتہائی حساس موضوع پہ جس طرح قلمکاری کی ہے، اسے نہ سراہنا ناانصافی ہوگی۔ معاشرے میں موجود اخلاقی برائیوں اور دولت کے لالچ میں ضمیر کا سودا کرنے والوں کے لیے ایک طمانچہ تھی یہ تحریر۔ ثانی کا کردار شدید دوغلا تھا لیکن کیا کہیں کہ یہی معاشرے کا چلن ہو چکا ہے۔ نجمہ مودی کی نیبی انصاف میں فلمی رنگ نمایاں تھا لیکن کہانی شروع سے لے کر آخر تک دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ آخر میں افسوس تو ہوا لیکن ثنا کو جرم کی نہ سہی جرم میں معاونت کی سزا تو ملنی ہی تھی۔ ایچ اقبال بڑے عرصے بعد آئے ہیں تو کوئی شاہکار ہی لائے ہوں گے اس لیے اسے فرصت میں ہی پڑھوں گی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ شائستہ حیدر، حیدرآباد۔ ہما انصار، کوٹری۔ شاہد محمود، لاہور۔ نعیم خان، پشاور۔ شائلہ جاوید، راولپنڈی۔

مشہور مصنف جیمس پیٹرسن کے جادوگر قلم کی فسوں گری

خونی ہیرے

امجد رئیس

جرائم... مافیا کی سفاک دنیا پر خون ریزی اور ظلم کی حکمرانی راج کرتی ہے... جہاں ہر موڑ پر انسانی جان سے زیادہ دولت کی اہمیت ہوتی ہے... طاقت کا قانون... دھماکے... برستی گولیاں... مارو یا مر جائو... مافیا کے کرداروں سے مزین ایک ایسی ہی سنسنی خیز داستاں... دولت و زر نے انہیں ایک دوسرے کا قاتل بنا دیا تھا... ایک قاتل کے پیچھے دوسرے قاتل کا تعاقب جاری تھا... چمکتے دمکتے ہیروں نے انسانوں کے درمیان لالچ... دشمنی اور نفرت کی تاریکی پھیلا رکھی تھی... کوئی بھی سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھا... زندگی اور موت کے درمیان حائل حدِ فاصل لمحہ بہ لمحہ زائل ہو رہی تھی...

پُرتجسس... سنسنی خیز انگلش ناول کی ناقابلِ فراموش تلخیص...

"بعض انسانوں کو ختم کرنا از حد دشوار ہوتا ہے۔"

گرینڈ سینٹرل ٹرمنل کے اندھے گوشوں میں والٹر زیلویز جیسے کانٹریکٹ کلر کی وہ آخری رات تھی۔ تاہم اسے ختم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ کوئی بھی "گھوسٹ" کو آسان کام کے لیے ہائر نہیں کر سکتا تھا۔

رات گیارہ بجے "گھوسٹ" وہاں موجود تھا۔ ڈائمنڈ سنڈیکیٹ نے گھوسٹ کو ہائر کیا تھا۔ سنڈیکیٹ کے لیے والٹر کی افادیت ختم ہو گئی تھی۔ ذمے دار خود والٹر تھا۔ گھوسٹ کو والٹر کے خاتمے کا مشن سونپا گیا تھا۔

گھوسٹ کی تیاری مکمل تھی۔ وہ بھیس بدل کے مخصوص لباس میں آیا تھا۔ بالوں میں سفیدی زیادہ تھی اور اُلجھی ہوئی داڑھی...... عام لباس پر ایک کمبل جس کے سوراخ میں سے سر گزر گیا تھا۔ اسلحہ اسی "پونچو" (کمبل) کے نیچے تھا۔ وہ ایک بے خانماں مفلس شخص کی عکاسی کر رہا تھا۔ جو ٹریک 109 کے قریب کسی بینچ پر رات گزارنے کا خواہش مند ہو۔ اس کا انگ انگ الرٹ تھا۔ نگاہ ٹارگٹ پر تھی۔ والٹر زیلویز... ایک بھاری بھرکم بھدا شخص...... جس کے اعصاب اور ردِعمل کسی خطرناک زہریلے سانپ کے مانند تھے۔ گھوسٹ کے برخلاف والٹر اپنے شکار کو تڑپا تڑپا کے مارتا تھا۔

جنڈا اٹھاتا تھا۔ بے رحم روسی بگلر برسوں سے سنڈیکیٹ کے لیے کام کررہا تھا لیکن اب اس کا کام ختم ہونے والا تھا۔

گھوسٹ کے لیے یہ مار دو یا مر جاؤ والا مشن تھا۔ بلاشبہ یہ موت کا موت سے ڈوئل تھا۔ گھوسٹ حد درجہ محتاط تھا۔ ڈپارچر کا اسکرین کہہ رہا تھا کہ والٹر کی مطلوبہ ٹرین تیس منٹ تاخیر کا شکار ہے۔ والٹر دل ہی دل میں گالیاں ایجاد کررہا تھا۔

والٹر نے کافی کا دوسرا کپ ختم کر کے ٹریش کین کی نذر کیا۔ وہ ائرپورٹ کے بجائے ریلوے اسٹیشن آیا تھا۔ جہاں سامان کی چیکنگ ہوتی تھی نہ میٹل ڈیٹکٹر ...... نہ ہی کوئی سیکیورٹی۔ کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اسے نکل جانا چاہیے۔ مثانہ ہلکا کرنے کے لیے وہ مردانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باتھ روم، اجل خانہ ثابت ہوگا۔ گھوسٹ نے سوچا۔ والٹر ماربل فلور کراس کر کے باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں مسافروں کا آنا جانا رہتا ہے لیکن اس وقت باتھ روم خالی تھا۔ اتفاق تھا، یا فرشتۂ اجل نے اس کے لیے باتھ روم کا انتخاب کیا تھا۔ والٹر اندر قدم رکھنے سے پہلے غیر متوقع طور پر برق رفتاری سے پلٹا۔ گھوسٹ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ والٹر نے اسے دیکھا اور متاثر نہیں ہوا اور دائیں بائیں دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں، تم پروفیشنل ہو۔ جو ہمیشہ اپنی پشت پر نظر رکھتا ہے۔“ گھوسٹ نے سوچا۔ والٹر اندر چلا گیا تھا۔

گھوسٹ نے کھڑے ہو کر ٹرمینل کا جائزہ لیا۔ پچاس فٹ کے فاصلے پر ایک باوردی پولیس والا موجود تھا۔ وہ مسافروں کی مدد کررہا تھا۔ ”مردانہ“ دروازے سے عاری تھا۔ داخلے کے لیے ”ایل“ کی شکل والی انٹری تھی۔ بوجہ والٹر نظر نہیں آرہا تھا۔ گھوسٹ اندر داخل ہوا سامنے دیوار تھی۔ اس نے دستانے چڑھائے اور دائیں جانب مڑا۔ والٹر ایک جگہ پیشاب کے لیے مخصوص جگہ پر کھڑا تھا۔ گھوسٹ نے اپنے مخصوص تین الفاظ دہرائے۔ ”میں ناقابلِ شکست ہوں۔“ وہ شکار پر جھپٹنے سے قبل یہ الفاظ دہراتا تھا...... خاموشی سے۔ بعد ازاں رواں اور تیز حرکت کے ساتھ وہ باتھ روم میں داخل ہوا۔ آواز نہ آہٹ...... گربہ پا۔ کمبل میں سے گلوک نکالا اور قریب سے والٹر کی کھوپڑی پر گولی ماری۔ اچنبھا...... گولی نے ٹارگٹ کو نہیں چھوا۔

”بعض انسانوں کو ختم کرنا از حد دشوار ہوتا ہے۔“

☆☆☆

والٹر نے مثانہ خالی کرنے کے لیے کبھی ایسی جگہ کا انتخاب نہیں کیا تھا جہاں سے وہ پشت پر نگاہ نہ رکھ سکے۔ باتھ روم میں وہ اس مقام پر رکا تھا جس کے فلیش پائپ پر کروم پالش تھی۔ یہ آئینہ تو نہیں تھا۔ تاہم تین چیزیں دکھانے کے لیے کافی تھا...... آدمی، ہاتھ اور گن۔

وہ بروقت دائیں پیر کی ایڑی پر گھوما اور ہاتھ چھرے کے مانند گھوسٹ کی کلائی پر مارا۔ جو گولی چلا چکا تھا۔ گولی کا زاویہ تبدیل ہوا اور شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ والٹر کا گھونسا اینٹ کے مانند گھوسٹ کے پیٹ میں لگا۔ ضرب کے باعث وہ ٹوائلٹ کے دروازے سے ٹکرایا۔ گلوک ہاتھ سے نکل کر چکنے فرش پر پھسل گیا۔

یہ دیکھ کر گھوسٹ نے لعنت بھیجی کہ مردود ابھی تک فارغ نہیں ہوا تھا۔ اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اس کا قاتل ہاتھ گن کے لیے لباس میں چلا گیا تھا...... گھوسٹ نے کروٹ بدلی اور متصل ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ والٹر کی گولی وہاں ٹکرائی جہاں چند سیکنڈ پیشتر گھوسٹ کا سر تھا۔ گھوسٹ پشت کے بل پڑا تھا۔ والٹر کا پلّہ بھاری تھا لیکن گھوسٹ ”ناقابلِ شکست تھا“ اس نے دونوں پیر جوڑ کر بھرپور طاقت سے ٹوائلٹ کے دروازے پر مارے۔ ڈور قبضوں سے اکھڑ کر اُڑتا ہوا والٹر سے ٹکرایا اور والٹر کا تصادم سنک سے ہوا لیکن روسی ریچھ نے گن نہیں چھوڑی۔ والٹر کو مہلت فراہم کرنا خودکشی تھی۔ گھوسٹ اپنی گن کی طرف جانے کے بجائے، طوفان بن کر جھپٹا اور اُڑتا ہوا والٹر سے ٹکرایا۔ گن والا ہاتھ گھوسٹ نے شدت سے سنک پر دے مارا۔ اسے توقع تھی کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئے گی۔ تاہم ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ آئینہ بکھر کر سوئے زمین گیا۔ گھوسٹ سرتاپا مانندِ برق تھا۔ عمل اور ردِعمل میں بلا کی سرعت تھی۔ دونوں مشاق تھے، کھلاڑی تھے۔ دونوں آگاہ تھے کہ ایک کی موت لازمی ہے۔

گھوسٹ نے عین اس وقت آٹھ انچ لمبا شیشے کا کٹیلا ٹکڑا فضا میں ہی تھام لیا۔ ٹھیک اس وقت دونوں نے جنونی مینڈھوں کے مانند سر ٹکرائے۔ اِدھر سروں کا تصادم ہوا، اُدھر گھوسٹ نے شیشے کی چھری روسی قاتل کی موٹی گردن میں اتار دی۔ والٹر کے حلق سے درد بھری چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے گھوسٹ کو پرے دھکیلا اور ایک مہلک غلطی کر بیٹھا...... اس نے شیشے کی چھری گردن سے کھینچ لی۔ نتیجتاً لہو اس طرح اُبلا جیسے کسی نے بھرے پانی کا نلکا کھول دیا ہو۔ والٹر تڑپ کر غراتا ہوا بھاگا۔ ایک ہاتھ گردن پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ عقب میں اندھی فائرنگ کررہا تھا۔ کچھ دیر گھوسٹ زمین سے چپکا رہا۔ پھر گلوک پر قبضہ جمایا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ والٹر باہر نکل گیا تھا۔ عقب میں گھوسٹ بھی لپکا۔ بے تحاشا جریان

خون کے باعث اس کی موت یقینی تھی لیکن تصدیق کے لیے گھوسٹ کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے گلوک سے نشانہ لیا اور پھر......

''پولیس۔ ڈراپ اِٹ۔''

گھوسٹ مڑا۔ ایک موٹا تازہ، بے ہنگم پولیس والا...... بے ڈھنگے انداز میں گن بدست دوڑا آرہا تھا۔ اسے گرانا بہت آسان تھا لیکن یہ گھوسٹ کا کام نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ نیویارک تھا۔ ایک کو مارنے کا مطلب تھا، درجن اور آجاتے۔ گھوسٹ نے اوپر تلے تین فائر اس کی ٹانگوں میں کیے۔ پولیس والا ناچ اٹھا اور زخمی ہوئے بغیر ہی لڑھک گیا۔ وہ ستون کی آڑ لینے کی کوشش کررہا تھا۔ گھوسٹ نے کمبل میں ہاتھ ڈال کر دو عدد دھوئیں کے بومب نکالے۔ دونوں کی پن نکال کر دہاڑا۔ ''بومب!'' بومب سماعت شکن دھماکے سے ماربل سے ٹکرائے۔ سیکنڈوں کے اندر سو میٹر کے دائرے میں گاڑھا سرخی مائل سیاہ دھواں پھیل گیا۔ فائرنگ نے پہلے ہی دہشت پھیلا دی تھی۔ رہی سہی کسر دھماکوں نے پوری کردی۔ افراتفری کا عجب عالم تھا...... اِک حشر بپا تھا جس کے جہاں سینگ سمائے، بھاگ اٹھا۔ نصف درجن پولیس مین تیرگی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

گھوسٹ غائب ہوچکا تھا۔

☆☆☆

میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا نام میتھیو بینن ہے۔ میں بارسن، نیویارک سٹی میں فائن آرٹس کا طالب علم ہوں...... لیکن قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ پینٹر کے شعبے کے انتخاب کے لیے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آپ کبھی امرائکی صف میں شامل نہیں ہوسکتے۔ ممکن ہے، میری بقیہ زندگی فاقہ کشی کی نذر ہوجائے لیکن ہوا کیا...... حقائق کرشماتی انداز میں تبدیل ہوگئے۔ ایک رات گرینڈ سینٹرل ٹرمینل کے مقام پر جب ایک لاکر سے مجھے اچانک ملین ڈالرز کے قیمتی ہیرے ہاتھ لگے۔ گویا میگا ملین لاٹری کھل گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب خواب کے مانند ہے۔

میں نے لاکر نمبر 925 پر ہوشربا خزانہ حاصل کیا تھا۔ ہیرے چرمی بیگ میں بھرے تھے۔ ایک منٹ قبل میں مفلسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دوسرے منٹ میں ہیروں کا بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔

میرے والد اور ان کے والد دونوں میرین میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ آرٹ کا شوق مجھے والدہ کی جانب سے ملا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں مجھے سکھایا تھا۔ حالانکہ والد محترم ملٹری کی روایت کے حامی تھے۔ دونوں کی تکرار مفاہمت پر ختم ہوئی۔ میں نے چار سال میرین کور میں گزارے۔ بعد ازاں تیس سال کی عمر میں ملک کے بہترین آرٹ پروگرام میں شامل ہوگیا۔

اب دفعتاً غربت کا تصور تحلیل ہوگیا تھا۔ میں خواب و خیال سے زیادہ امیر ہوچکا تھا۔ کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہیروں کا مالک حیاتِ فانی کو خیرباد کہہ چکا تھا۔

☆☆☆

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک بہترین اور نایاب اتفاق میری زندگی میں درآیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ بہترین چیز کیتھرائن سن بورن تھی۔ ہماری ملاقات وھٹنی میوزیم میں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ پری وش، خوش خصال، غنچہ دہن...... ایسی ہی تھی۔ اسے بچوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میں جارج لوکس کی اپنی پسندیدہ ترین پینٹنگ ''آرمس ٹاریس'' کو گھور رہا تھا۔ ''جارج، امریکن ریلسٹ تھا۔'' کیتھرائن نے کہا۔

''اور میں ریکن رومینٹک۔'' ایک لڑکا بولا۔ قہقہہ بلند ہوا۔

''آہ، میں غریب وان گوگ۔'' دوسرا قہقہہ۔

نصف درجن کے قریب نوعمر لڑکوں کے مابین معلومات اور قہقہوں کا تبادلہ ہورہا تھا۔ کیتھرائن مسکرا رہی تھی۔

''تم میں سے کوئی بھی اتنا فنی (funny) نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور جارج کی پینٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارے خیال میں یہ پینٹنگ مضحکہ خیز ہے۔'' ریکن رومینٹک بولا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جارج ضرور کامیڈین تھا اور کامک السٹریٹر بھی۔ پھر اس نے سات مصوروں کی ٹیم بنائی، جو ''ایشکن اسکول'' کے نام سے معروف تھی۔''

''کول۔'' لڑکے نے ستائش کی۔

''وہ خود بھی نرم خو اور ضبط نفس کا حامل تھا...... حتیٰ کہ ایک رات اس نے بے ہودہ مے نوش کو مار پیٹ کے بعد بار روم سے نکال دیا اور چند گھنٹوں بعد مردہ پایا گیا۔ اب تم لوگ اگر اپنی استانی سے مستفید ہونا چاہو تو کافی کچھ جان جاؤ

گے کہ ٹھنڈا دماغ، گرم کیسے ہوتا ہے۔''

میں وہاں سے ہٹ گیا۔

نصف گھنٹے بعد کیتھرائن نے مجھے تلاش کرلیا۔

''تمہاری کلاس کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ان کی ٹیچر نہیں ہوں۔'' وہ بولی۔ ''ہر بدھ کے روز میوزیم میں، میں والنٹیئر ورک کرتی ہوں... بچوں نے تمہیں پسند کیا ہے اور معذرت خواہ ہیں...... تم چلے گئے تھے۔ میں بھی معذرت طلب ہوں۔ تم آرٹ کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو۔''

میں نے شانے اچکائے۔ ''میں پینٹر ہوں۔ تاہم یہ کوئی بہت دلچسپ اور متاثر کن کہانی نہیں ہے۔''

''آرٹ کے بارے میں دوسرے افراد کے خیالات جاننا مجھے بہت پسند ہے۔ کیا میں تمہیں چائے اور لذیذ مفن کی آفر کرسکتی ہوں؟'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔

''میرا خیال ہے، نہیں۔''

کیتھرائن کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ آنکھوں میں حیرت نمایاں تھی۔

''لیکن یہی آفر میں تمہیں کرسکتا ہوں۔''

وہ پھر سے مسکرا اٹھی اور ہاتھ بڑھایا۔ ''میرا نام کیتھرائن سن بورن ہے۔''

''میتھیو بینٹن۔'' میں نے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔ اس کا نرم ہاتھ میرے ہاتھ کا نصف تھا۔ مصافحہ بمشکل دو سیکنڈ قائم رہا ہوگا لیکن میں سرتاپا بل چکا تھا...... چائے نوشی کے دوران ہم گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اپنے خواب کے بارے میں بتایا جو آرٹ سے متعلق تھا۔

''شاید میں تمہاری مدد کرسکوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں آرٹ سکھاتی ہوں۔ میں تمہارا کام دیکھنا چاہوں گی۔ تم کل چند نمونے لے کر میری کلاس میں آسکتے ہو۔''

''لیکن تم نے کہا تھا کہ بچے تمہاری کلاس کا حصہ نہیں ہیں؟''

''ٹھیک کہا تھا۔ ہائی اسکول سے میرا تعلق نہیں ہے۔''

''اوہ...... او کے...... تم کس گریڈ میں پڑھاتی ہو؟''

وہ مسکرائی۔ ''کوئی گریڈ نہیں...... یہ ماسٹر پروگرام ہے۔ پارسن میں، میں فائن آرٹ کی پروفیسر ہوں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ یہ عمر...... یہ حسن...... یہ ادا...... ایسا انداز۔ حسن اور ذہانت یکجا ہوگئے تھے۔ وہ پروفیسر تھی۔

میں مکمل طور پر خود کو اناڑی محسوس کررہا تھا۔

☆☆☆

آدھی رات تک میں سوچ بچار میں غلطاں رہا کہ کیتھرائن کو کون کون سی پینٹنگ دکھاؤں...... اگلے روز میں نے اپنی دانست میں چودہ بہترین تصاویر منتخب کیں اور کیتھرائن کے آفس میں پہنچ گیا۔ سچ یہ ہے کہ میں اندر ہی اندر پُراعتماد نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں بے لباس ہوگیا ہوں۔

''تم بنیادی طور پر ریلسٹ ہو۔'' اس نے تصاویر دیکھ کر کہا۔ ''اور مجھے توقع بھی تھی۔ تمہارا کام دیکھ کر مجھے ایڈورڈ ہوپر یاد آگیا۔ جب وہ کام کا آغاز کررہا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ تم کہنا چاہ رہی ہو کہ...... جب ہوپر کنڈر گارٹن میں انگلیوں سے پینٹنگ کرتا تھا؟''

کیتھرائن نے مترنم قہقہہ لگایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک نرم اور ظریفانہ قہقہہ تھا۔ وہ ایک قابل پروفیسر تھی۔

''اوہ، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم دلچسپ آدمی ہو۔''

'اور تم بہت حسین۔' میرے ذہن نے خیال آرائی کی۔

''ہوپر ایک لیجنڈری تھا لیکن اس کا ابتدائی کام اتنا شاندار نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے فن میں نکھار آتا گیا...... تصاویر کے نقوش میں جذبات اُجاگر ہونے لگے۔ ''نائٹ ہاک'' اس کا بہترین کام تھا اور میرا پسندیدہ بھی...... اس وقت وہ ساٹھ سال کا ہوچکا تھا۔'' کیتھرائن نے وضاحت کی۔

میں نے سر کھجایا۔ ''میں ساٹھ سال تک نہیں جاسکوں گا اور ''نائٹ ہاک'' جیسے شاہکار کے نصف کو بھی چھو نہ پاؤں گا۔''

''یوں نہ سوچو۔'' وہ بولی۔ ''صحیح اسکول میں اسٹڈی کروگے تو بہت کچھ کرسکتے ہو۔''

''کوئی مشورہ؟ کہاں؟ ایمانداری سے بتانا۔''

''یہاں اور کہاں؟'' کیتھرائن نے جواب دیا۔

اس مرتبہ میرا دل شدت سے دھڑکا تھا۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔ وہ زیرلب مسکرارہی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں پارسن میں؟''

''یہ ممکن ہے...... ہارنے والے جیتنے والوں کے لیے جگہ خالی کرتے رہتے ہیں اور تم جیتنے والوں میں سے ہو۔'' کیتھرائن نے اعتماد سے کہا۔

چھ ماہ بعد ہم ایک جان دو قالب کے روپ میں ڈھل

چکے تھے۔ تاہم دیگر طلبا و طالبات کے لیے یہ رنگ محبت خفیہ تھا۔

☆☆☆

او کے، دولت کی طرف چلتے ہیں۔ میرا مطلب ہیروں سے ہے۔ لاکر نمبر 925۔ وہ رات میں بھی نہیں بھول سکتا۔ گرینڈ ٹرمینل میں دوسرے مسافروں کے لیے وہ رات ایک بھیانک خواب کی طرح تھی۔

نیویارک میں، میں نے ٹینک دیکھے تھے، بومب سونگھنے والے کتے، کوپس کونوائے...... وغیرہ...... سب کچھ این وائی پی ڈی (نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ) کی اینٹی ٹیرر ڈرل کا حصہ تھا۔

لہٰذا گرینڈ سینٹرل میں فائرنگ کے بعد دو فلک شگاف دھماکوں نے پہلا تاثر دہشت گردی کا دیا۔ ہر طرف جیسے بھونچال آ گیا۔ قیامت کا منظر تھا۔ چیخ و پکار...... ہر ایک اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ سرخی مائل دھوئیں نے دہشت میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے وار زون میں خاصا وقت گزارا تھا لیکن یہاں میرا کوئی کام نہیں تھا۔ بوجہ میں نے بھی فرار میں ہی عافیت جانی...... معاً میری نظر خونی لکیر پر گئی۔ میں کیوں لہو کے نشانات کے پیچھے گیا؟ شاید یہ اضطراری حرکت ماضی کی وجہ سے تھی۔ جب میں نے چار سال میدانِ جنگ میں گزارے تھے۔ جلد ہی میں ایک بھاری بھر کم آدمی تک پہنچ گیا۔ وہ لاکرز کے قریب اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا...... اس بھگدڑ میں کون رکتے اور اس طرف توجہ دینے کی زحمت کرتا۔ میں اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ کوئی شے میرے گھٹنے سے ٹکرائی...... گن۔

''ڈاکٹر کو کال کرو۔ خون رکنا چاہیے۔'' وہ غرغرایا۔ وہ زندہ تھا۔ لہجہ غیر ملکی تھا۔ شاید روسی، لیکن وقت ہی نہیں تھا۔ صورتِ حال مایوس کن تھی۔ قبل اس کے، میں کچھ کہتا...... اس کی آنکھیں اوپر گھوم گئیں۔ جسم لرزا...... اس نے آخری سانس لی۔ وہ مر چکا تھا۔ میری نظر لاکر نمبر 925 پر گئی...... جہاں یقیناً اس کے ہاتھ کا خونی نشان چسپاں تھا۔ بلاشبہ وہ لاکر اسی کا تھا۔

لاکر کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆

میرے ذہن میں ایک ہی خیال آیا کہ یہ مرتا ہوا آدمی پاگل تھا جو مدد حاصل کرنے کے بجائے لاکر کی فکر میں تھا۔ کیا لاکر میں اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی شے تھی۔

''کامریڈ، تم نے نمبر 925 کو 911 پر ترجیح کیوں دی؟'' میں نے سرگوشی کی۔ اگر میں نیم پاگل بھی ہوتا تو دوسروں کے ساتھ بھاگ نکلتا...... تجسس نے مجبور کیا تو میں کھڑا ہو گیا۔ دھواں کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے لاکر میں ہاتھ ڈال کر ایک بیگ نکالا۔ یہ ظاہر ہے، میرا نہیں تھا۔ ساخت پرانے میڈیکل بیگ کے مانند تھی۔ روسی احمق نہیں تھا۔ میڈیکل بیگ کا سامان، خون روکنے میں کافی حد تک مدد کر سکتا تھا۔ میں نے احتیاط سے بیگ کھول کر اندر جھانکا۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس بیگ کے لیے تو کوئی بھی جان داؤ پر لگا سکتا تھا۔

☆☆☆

میں نے ہیرے پہلے بھی دیکھے تھے۔ میری ماں کی منگنی کے رِنگ میں ایک ہیرا تھا۔ آنٹی کے کانوں میں دو ہیرے تھے لیکن بیگ میں جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، اتنے ہیرے زندگی میں، ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے۔ روسی مر چکا تھا۔ بیگ میرا تھا۔ کم از کم فی الحال میری ملکیت تھا۔ گن کی موجودگی بتا رہی تھی کہ روسی نے یہ بیگ کسی اور سے لیا ہے۔ یعنی یہ اس کا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر میں مخمصے کا شکار رہا لیکن یہ کشمکش جلد ہی ختم ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے بیگ بند کر دیا۔ زندگی بدلنے والی تھی۔ کتنی جلدی کتنے آرام سے اور کتنی زیادہ۔

عقب سے آنے والی آواز نے مجھے خوابوں کی دنیا سے باہر نکالا۔

''پولیس، آہستگی سے گھوم جاؤ۔ بہت آہستہ...... ہاتھ میرے سامنے کرو۔''

حسبِ ہدایت میں گھوم گیا۔ وہ جوان افریقن امریکن پولیس مین تھا۔ گرانڈیل...... اس کے جثے نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ سروس ریوالور کا رخ میرے سینے کی جانب تھا۔

''ہم...... م...... زندگی تو پہلے ہی بدل چکی تھی۔ مردہ آدمی میرے قدموں میں تھا۔ ہیروں کا خزانہ ہاتھ میں۔ این وائی پی ڈی کا افسر گن بدست سر پر کھڑا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ میں نے اس کی وردی پر نام پڑھا۔ ''آفیسر کینڈل، خوشی ہوئی...... تم بروقت آئے ہو۔ شکر ہے خدا کا۔ میری مدد کرو۔''

''کون ہو تم؟ اور وہ کون ہے؟''

''میں ڈاکٹر جیسن ووڈ۔'' میں نے تشویش سے کہا۔ ''اور یہ کون ہے...... مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ یہ مر چکا ہے۔'' میں نے پولیس مین کی گن کو نظر انداز کر

دیا تھا۔ ’’میرے پہنچنے تک یہ ختم ہو گیا تھا۔‘‘

کینڈل نوجوان اور جلد باز پولیس مین معلوم ہو رہا تھا۔ پولیس اکیڈمی سے نکلنے کے بعد غالباً شاذ ہی اس کا واسطہ اس قسم کی صورتِ حال سے پڑا تھا۔

’’پلیز ایک احسان کرو۔‘‘ میں نے بے اعتنائی سے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ’’اس گن کا رخ کسی اور طرف کر لو۔‘‘

’’سوری ڈاک۔‘‘ اس نے گن ہولسٹر میں رکھ لی۔

میں لاش پر اس طرح جھک گیا، جیسے کوئی اہم کام کرنا ہو۔

’’اسے بومب کا ٹکڑا لگا ہے۔ چوٹ شدید تھی...... تمہیں پتا ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ نوجوان پولیس مین نے کہا۔ ’’میں چھیالیسویں اسٹریٹ پر تھا۔ اس وقت یہاں بومب بلاسٹ کی اطلاع ملی۔ میں فی الفور اس طرف بھاگا۔‘‘

’’ایک منٹ رکو۔ میری کال آ رہی ہے۔‘‘ میں نے سیل فون نکال کر کان سے لگایا اور اداکاری شروع کی۔

’’ہیلو، دس از ڈاکٹر ووڈ...... ہاں، جانتا ہوں...... اس وقت میں گرینڈ سینٹرل میں تھا...... دھماکوں کے باعث الجھ گیا۔ جتنی جلدی ہو سکے گا میں ایمرجنسی روم میں پہنچ جاؤں گا۔‘‘

میں کھڑا ہو گیا۔ ’’دیکھو آفیسر، یہ آدمی کسی بھی قسم کی مدد سے بے نیاز ہے لیکن سینٹ ونسنٹ میں مریضوں کو میری ضرورت ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔ کیا سب وے کام کر رہا ہے؟‘‘

’’شٹ ڈاؤن۔‘‘

’’آل رائٹ، پیدل ہی سہی۔‘‘

کینڈل کا ریڈیو بیدار ہو گیا۔ ’’دس۔ تیرہ۔ دہراتا ہوں، دس تیرہ...... آل یونٹ۔ آفیسر کو بیک اپ درکار ہے۔ متعدد لٹیرے یہاں فائیو بورو جیولر، بیالیس اسٹریٹ پیچ وے پر فائرنگ کر رہے ہیں۔‘‘

کینڈل مشکل میں نظر آیا۔ ’’میں روانہ ہو رہا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’تم یہاں کورونر کا انتظار کرو۔‘‘ یہ کہہ کر وہ لڑھکتا ہوا بھاگا۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے اپنا راستہ پکڑا۔ میری روانگی اس کی نسبت بہت تیز تھی۔

میں بدحواس مسافروں کے درمیان راستہ بناتا ہوا چھ منٹ کے اندر لیگزنگٹن ایونیو پہنچ گیا۔ جہاں افراتفری عروج پر تھی۔ لوگ وہاں سے دور جانے کے لیے پیلی ٹیکسیوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ سوٹ میں ملبوس تین آدمی ایک ڈرائیور کو گھیر رہے تھے۔ ایک تین سو ڈالر کی پیشکش کر رہا تھا دوسرا ہزار ڈالر دینے کے لیے آمادہ تھا۔ میں انگشت بدنداں تھا۔ اتنی رقم میں جاپان جایا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی ہتھیانے کے لیے گویا نیلام گھر لگا ہوا تھا۔ ایک کامیاب ہو کے ٹیکسی میں گھسنے لگا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔

’’میں ڈاکٹر ہوں۔ تم شہر کے مرکز میں جا رہے ہو۔ سینٹ ونسنٹ اسپتال میں مریضوں کو میری ضرورت ہے۔ اگر تم ہالینڈ ٹنل سے جاؤ تو وہیں سے گزرو گے۔‘‘

اس نے میرے میڈیکل بیگ پر نگاہ ڈالی۔ ’’ہاں، ڈاک...... یہاں سے نکلنے کی کرو۔‘‘

میں اس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مفت کا سفر تھا۔ سینٹ ونسنٹ میرے اپارٹمنٹ کے قریب تھا۔ یعنی میں گھر جا رہا تھا۔ سیاہ رنگ کا میڈیکل بیگ ساتھ رکھنا بہتر تھا۔

☆☆☆

والٹر زیلویز کو دم توڑے تیس منٹ گزر گئے تھے۔ جب این وائی پی ڈی کے دو سراغ رساں مشرقی سترویں اسٹریٹ کی عمارت میں داخل ہوئے۔ جہاں والٹر کا اپارٹمنٹ تھا۔ دونوں کتابی اصولوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جان رائس اور تک بن زیٹی۔ وہ گندے کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اس وقت ان کا مشن سادہ تھا۔ ہیرے تلاش کرو۔ دونوں کو یہ ڈیوٹی شکوف نے سونپی تھی۔ پچاس ڈالرز کے عوض ڈور مین نے چابی ان کے حوالے کر دی تھی۔

دونوں ایلی ویٹر میں سوار ہو گئے۔ بن زیٹی کا قد چھ فٹ تھا۔ بال سیاہ اور ناک طوطے جیسی۔ مجموعی طور پر وہ ایک بدنما شخص تھا۔ رائس قد و قامت میں اپنے ساتھی سے تین انچ بلند تھا اور نیم گنجا۔ دونوں میں اس وقت ایک چیز مشترک تھی۔ خوف...... وہ دونوں والٹر سے محض ایک مرتبہ ملے تھے۔ والٹر نے انہیں ماشہ بھر اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ شکوف کے لیے کام کر رہے ہیں یا وردی میں ہیں۔ اس وقت وہ شکوف کے اپارٹمنٹ میں والٹر کے ہمراہ تھے۔ میز پر پنیر اور واڈکا کی بوتل رکھی تھی۔

’’میرے ساتھ ہیرا پھیری کی تو جان لے لوں گا۔‘‘ والٹر نے کہا تھا۔

’’گن استعمال نہیں کروں گا۔‘‘ اس نے قہرناک انداز میں اسٹین لیس اسٹیل کی دس انچ لمبی چھری اٹھا کر پنیر کے بوجھل ٹکڑے پر چلائی۔ اشارہ کافی تھا۔ ’’تمہیں علم ہے کہ کھال اترنے کے بعد آدمی کتنی دیر زندہ رہتا ہے؟‘‘ اس نے پنیر منہ میں رکھا۔ ’’چھ دن۔ نمک شامل کر لو تو چار دن۔‘‘ اس کے چہرے پر حیوانیت تھی۔

اب وہ دونوں اپارٹمنٹ E-16 کے دروازے پر دائیں بائیں کھڑے تھے۔ گن ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ وہ

جانتے تھے کہ شکوف، والٹر کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ البتہ ان دونوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ والٹر بیس منٹ قبل اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔

''اگر وہ اندر ہوا تو ہمیں تیزی دکھانی ہوگی۔'' رائس نے کہا۔ ''میں سر کا نشانہ لوں گا۔ تم دل پر گولی مارنا۔''

دونوں نے احتیاط اور بنا آواز کے چابی کے ذریعے دروازہ کھولا۔ وہ تساہل کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ لیونگ روم میں آ گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ معاً خواب گاہ سے ایک آہنی آواز آئی۔ آواز مدھم تھی۔ دونوں اپنی جگہ پر جم گئے۔ خواب گاہ میں جو بھی تھا، خاصا مصروف تھا اور ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر۔ دونوں خواب گاہ کے دروازے کے اطراف میں چپک کر ماہرانہ انداز میں متحرک ہوئے۔ ڈور اَن لاک تھا۔ برق رفتاری سے دروازہ کھول کر وہ اندر گھس گئے۔

''میرے خیال میں، والٹر یہاں نہیں ہے۔'' رائس کی گن کا رخ سیف پر موجود لڑکی کی طرف تھا۔ لڑکی کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ وہ بلا کی سیکس اپیل رکھتی تھی۔ لباس نے کشش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''شوٹ۔'' بن زیٹی نے حکم صادر کیا۔

''کوئی حماقت نہ کرنا۔'' لڑکی نے بے خوف آواز میں کہا۔ ''ظاہر ہے تم مجھے نہیں جانتے۔''

''جان پہچان کی ضرورت نہیں ہے۔ شوٹ......'' بن زیٹی نے حکم کا اعادہ کیا۔

''ایک منٹ، ختم کرنے سے پہلے جان لینا چاہیے؟'' رائس نے کہا۔ ''وہ خود کو کوئی اہم چیز سمجھ رہی ہے۔''

''مجھے پروا نہیں ہے۔'' بن زیٹی نے کہا۔

''اوہ، بہت خوب...... گڈ کوپ، بیڈ کوپ۔ تم دونوں شکوف کے لیے کام کرنے والے دو عدد بوٹ چاٹنے والے کتے ہو۔ بن زیٹی اور رائس۔ والٹر نے مجھے تمہارے بارے میں وارن کیا تھا۔''

''اور تم وہ ہو جو والٹر کا سیف توڑنے کے لیے یہاں گھس آئی ہو۔''

''غلط، والٹر نے چابی اور سیف کا کمبی نیشن مجھے دیا تھا۔'' وہ پُراعتماد نظر آ رہی تھی جبکہ وہ دونوں اس کے تبصرے پر بپھر گئے تھے۔

''والٹر کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں اس کی گرل فرینڈ ہوں، نٹالیا۔''

رائس نے بن زیٹی کی طرف دیکھا۔ ''والٹر نے کبھی نٹالیا نام کی کسی گرل فرینڈ کا ذکر نہیں کیا۔''

''کیوں تم اس کے ہم نشیں ہو؟ کیا تم شکوف کے لیے کام نہیں کرتے؟'' نٹالیا نے کہا۔ ''شکوف نے تمہیں یہاں کیوں بھیجا ہے...... کیا مجھے ختم کرنے؟''

''اس نے ہمیں یہاں ہیرے لینے کے لیے بھیجا تھا۔''

''میں ناتھانیل پرنس کے لیے کام کرتی ہوں...... اس نے مجھے ہیروں کے لیے یہاں بھیجا تھا...... اور وہ شکوف کا باس ہے۔''

''شکوف باس نہیں ہے؟'' بن زیٹی نے سوال کیا۔

''شکوف؟'' نٹالیا نے تھوک دیا۔ ''وہ ست چوہا اس قابل نہیں ہے کہ ڈائمنڈ سنڈیکیٹ چلا سکے۔ وہ پرنس کا محتاج ہے۔ لہٰذا ہتھیار نیچے کر لو۔ کمبی نیشن کے بغیر سیف کھولنا تمہارے بس کی بات نہیں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ وہ سیف کھول چکی تھی۔

والٹر نے گھر میں ہوم جم کھولا ہوا تھا۔ رائس نے دو سو پاؤنڈ وزنی ''باربیل'' کے ساتھ نٹالیا کو ہتھکڑی لگا دی۔ بن زیٹی، سیف کی طرف گیا...... جو کھینچنے پر کھل گیا۔ اندر ایک سیاہ ویلویٹ کا بیگ تھا۔ وزن کئی کلو کے قریب تھا۔ وہ حیران تھا کہ کتنے ہیرے ہوں گے۔ اس نے بیگ بیڈ پر الٹ دیا۔ برآمد ہونے والی شے برتھ ڈے سائز کا پنیر تھا۔

نٹالیا روسی زبان میں اول فول بک رہی تھی۔

''آرام سے رہو۔'' بن زیٹی نے کہا۔ ''تمہاری جوانی اور حُسن کو آزمانا ہے۔''

لیکن نٹالیا کی زبان نہیں رکی۔

''میں روسی نہیں جانتا لیکن والٹر اس گلاب کی خوشبو سونگھ کر اسے اُلّو بنا گیا ہے۔'' رائس نے تبصرہ کیا۔

''لیکن وہ ہمیں بھی جھانسا دے گیا۔'' بن زیٹی نے کڑواہٹ سے کہا۔ ''ہیروں کے بجائے پنیر......''

☆☆☆

نٹالیا کو زنجیر سے بندھا چھوڑ کر دونوں اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے لگے۔ پانچ دس منٹ میں انہوں نے کارِ تلاش کا اختتام کر دیا۔ ''فضول ہے۔ سیف میں نہیں ہیں تو تلاشی وقت کا ضیاع رہے گی...... کون یہ بُری خبر شکوف تک پہنچائے گا؟'' بن زیٹی نے سوال اٹھایا۔

دونوں نے سکہ اچھالا اور بن زیٹی ہار گیا۔ ''گاڈ، وہ اس کال پر بھڑک اٹھے گا'' تاہم کال تو کرنی تھی۔

شکوف بھی والٹر کے مانند پہلوان نما سفاک آدمی

تھا...... بے رحم۔ اس کا وزن ڈھائی سو پاؤنڈ تھا۔ بن زیتی نے اسے ایک مرتبہ پوکر (جوا) کی میز پر بیئر کی بوتل توڑتے دیکھا تھا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل اس نے حریف کھلاڑی کی بے ایمانی پر اس کے جبڑے میں بھونک دی تھی جبکہ داؤ پر محض سو ڈالر لگے تھے۔

''پنیر؟'' شکوف دہاڑا۔ ''پنیر...... تم مذاق کررہے ہو؟''

بن زیتی نے تصور کیا جیسے شکوف کے منہ سے زہریلا تھوک نکل رہا ہے۔

''اور ہیرے؟'' وہ پھر غرایا۔

''ہیرے نہ والٹر......؟'' بن زیتی نے کہا۔

''والٹر مر چکا ہے۔'' شکوف ہانپ رہا تھا۔

''وہاٹ؟'' بن زیتی کو ساعت پر شبہ ہوا۔ رائس نے بھی سن لیا تھا۔ ''اور تمہیں علم ہوگا کہ یہ کیسے ہوا؟''

''وہ ہمیں دھوکا دیتا آیا تھا۔'' شکوف نے کہا۔ ''میں سنڈیکیٹ کا انچارج ہوں۔ انچارج...... میری ذمے داری ہے کہ میں ممکنہ نقصان اور غداری پر نظر رکھوں۔ میرے ڈپارٹمنٹ نے معلوم کرلیا تھا کہ والٹر کچھ عرصے سے ہیروں کی سپلائی میں گڑبڑ کررہا تھا۔ سنڈیکیٹ نے ہیروں کی برآمدگی اور والٹر کو اوپر پہنچانے کا حکم دیا۔''

''وہ ہیروں کے ساتھ نکل گیا۔'' بن زیتی نے کہا۔

''اس نے ہمیں یہی بتایا تھا لیکن مجھے وہ ہیرے واپس چاہئیں۔'' شکوف چلایا۔

''ہیرے نتالیا/ پرنس کو درکار ہیں...... یوں کہو وہ ان کی واپسی کا خواہاں ہے۔'' بن زیتی نے معلومات کا مظاہرہ کیا۔ اس کا فقرہ کام کر گیا۔

روسی نے کہا۔ ''تم پرنس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''وہ تمہارا باس ہے؟''

''تم دونوں میرے لیے کام کررہے ہو، اتنا جاننا تمہارے لیے کافی ہے۔'' شکوف تڑخا۔

''دراصل درمیان میں ایک سوال اور پیدا ہوگیا ہے...... نتالیا کون ہے؟'' بن زیتی نے اس کا سراپا اور عمر بیان کی۔

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''وہ یہاں سیف کھول رہی تھی۔ ہم نے بروقت اُسے قابو کرلیا۔''

''نتالیا، پرنس کی محبوبہ ہے۔'' شکوف نے بتایا۔

''پرنس کی محبوبہ؟ وہ کہہ رہی ہے کہ وہ والٹر کی منظورِ نظر ہے؟''

شکوف نے قہقہہ لگایا۔ ''پرنس نے والٹر کو گھیرنے کے لیے اسے وہاں بھیجا ہوگا۔''

''اس آفت کا کیا کرنا ہے؟''

''دو چوائس ہیں۔'' شکوف نے کہا۔ ''اسے آزاد کرکے معذرت طلب کرو کہ تم اس کی حیثیت سے ناواقف تھے اور اسے بتاؤ کہ ہیروں کی واپسی کے لیے تم دونوں ہر ممکن کوشش کروگے۔''

''یہ چوائس میرے لیے قابلِ قبول نہیں۔ دوسری کے بارے میں بتاؤ۔''

''پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تمہارا من کہہ رہا ہے اور میں واقف ہوں کہ تمہاری رال ٹپک رہی ہے...... لیکن یہ خیال رکھنا کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر تم لذت اندوز ہونے کے بعد مردہ پائے جاؤگے۔ پرنس تمہیں ہلاک کردے گا، گولاگ اسٹائل۔''

''گولاگ اسٹائل؟''

''ہاں، اسٹالن کے دور میں قیدیوں سے سرد ترین علاقوں میں ناکافی سہولتوں کے ساتھ متواتر سخت کام لیا جاتا تھا۔ وہ تیزی سے وادیِ اجل میں اترتے جاتے تھے...... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہارے اعضا کاٹ کر پیٹ چاک کرے اور اعضا پیٹ میں محفوظ کردے۔ چوائس کا انتخاب کرلو۔''

☆☆☆

میں حال سے بے حال تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہوگیا۔ دل کررہا تھا کہ بیگ کھول کر دیکھوں...... تصور میں، میں سرمایہ کاری کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی باتونی تھا۔ وہ ہیروں کے بغیر ہی سرمایہ کاری کے پلان ترتیب دے رہا تھا۔ وجہ وہ غیر یقینی کرایہ تھا جو مسافر نے اسے دیا تھا۔ گرینڈ سینٹرل پر اور بھی امراء ہوں گے۔ وہ واپس جاکر باری باری زیادہ سے زیادہ خوف زدہ افراد کو بھاری معاوضے پر وہاں سے نکال سکتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ایک خوب صورت رات تھی۔ ہزاروں ڈالر کمائے جاسکتے تھے۔ دوسرے آدمی کے لیے بھی یہ ایک حسین رات تھی۔ وہ آدمی میں تھا۔

میں لاشعوری طور پر مسکرا رہا تھا۔ ڈرائیور نے مجھے سینٹ ونسنٹ کی ایمرجنسی کے قریب اتارا اور عجلت میں روانہ ہوگیا۔ میں پیدل تین بلاک طے کرکے اپنے

اپارٹمنٹ کی طرف گیا۔ میں ہر قدم پر نارمل لیکن محتاط تھا۔ منزل پر پہنچ کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ عمارت پانچ منزلہ تھی۔ میری رہائش ٹاپ فلور پر تھی۔ یہاں کلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم بھی تھا۔ بیشتر راتوں میں مجھے کیمرے کی طرف ہاتھ لہرانا پڑتا تھا۔ ڈور کھولنے والے کے اولین الفاظ ''ہائے میتھیو'' ہوا کرتے تھے۔ اس روز میں سیڑھیوں کے ذریعے اوپر گیا۔ اندر جا کر ڈور ڈبل لاک کیا اور اطمینان کی سانس لی۔ میں گرفتار نہیں ہوا تھا اور زندہ بھی تھا۔ اب میں محفوظ تھا۔ دیواروں پر جا بجا میری پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سیاہ اور سفید ہوپر (بلی) میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ میں خزینہ کسی کو دکھانے کے لیے بے قرار تھا۔ بلی کو نہیں۔ ظاہر ہے اسے ہیروں سے زیادہ ہڈی بوٹی میں دلچسپی تھی۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے بیگ کھولا اور ہاتھ ڈال کر انگلیوں کے ساتھ ہیروں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

مجھ سمیت سب خواب دیکھتے ہیں لیکن یہ خواب نہیں عجوبہ تھا۔ معاً ڈور بیل نے میرے خیالات منتشر کر دیے۔ پہلا خیال یہی تھا کہ کوئی ہیروں کے پیچھے آیا ہے۔ لعنت ہے، یہ تو ہونا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ سیدھا کیبنٹ کی جانب لپکا جہاں میری ذاتی اشیا کے علاوہ بریٹا M9 بھی رکھا تھا۔ میں ایکس۔ میرین تھا۔ بریٹا اسی وقت کی یادگار تھا۔ باہر جو بھی تھا بہرکیف اس کے علم میں ہو گا کہ میں ایک آرٹ اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرے لیے یہ ایک ایڈوانٹیج تھا۔

میں نے بریٹا لیا اور کلوز ڈ سرکٹ مونیٹر کی طرف گیا۔ ہوپر نے بھی حرکت کی...... آدھی رات کے بعد کون آیا ہے۔ اسکرین دیکھ کر میرے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

بیڈ روم میں چھوٹے سائز کا دہرے قفل والا ٹرنک تھا۔ یہ بھی عسکری ایام کی یادگار تھا جس میں میری چند پرانی یونیفارم اور سوونیئر رکھے تھے۔ اسے کھول کر میڈیکل بیگ زیریں سطح پر رکھ دیا۔ ٹرنک لاک کر کے میں واپس لیونگ روم میں آ گیا۔ گن واپس رکھی اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔

سامنے چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کیتھرائن توبہ شکن انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جام سے توبہ شکن اور میری توبہ جام شکن تھی۔ سلسلہ یہی رہے تو توبہ اور جام دونوں ٹوٹتے ہیں۔ ڈھیر لگ جاتا ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا۔

''اس وقت یہاں؟'' میں نے مچلتی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔

لالہ زار نے بانہیں میری گردن میں حمائل کر دیں۔ چہرہ قریب کیا اور بولی۔ ''گرینڈ سینٹرل پر دہشت گردی ہوئی ہے اور میں آج رات تنہا نہیں رہنا چاہتی۔''

ایک اور پیمانہ ٹوٹنے والا تھا...... توبہ بھی۔ ''اچھا سوچتی ہو تم...... دہشت گردی کا دوسرا نشانہ غالباً آرٹ پروفیسرز ہوں گے۔'' میں نے اسے قریب کر لیا۔

''مذاق اڑا رہے ہو؟'' وہ بولی۔

''یہ ہمت، ایسی غلطی...... جسارت...... حماقت...... خطا...... جرأت......''

''بس، بس...... تمہاری چرب زبانی نے ہی لوٹا تھا۔''

''گویا میں آرٹسٹ نہیں لٹیرا ہوا۔ میری وجاہت کہاں گئی؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''وجاہت ایسی ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔

''اسی لیے اس وقت چلی آئیں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ تم نہاتے کیسے ہو؟''

''مطلب؟''

''کپڑوں سمیت؟'' اس کی آنکھوں میں شوخی تھی، شرارت تھی، نشہ تھا، خمار تھا......

جام سے توبہ شکن!

☆☆☆

واڈم شکوف جانتا تھا کہ پُرخطر حالات اور کاروبار میں زندہ کیسے رہا جاتا ہے...... اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، وہ پکڑنے والوں کی کار میں تھا۔ تین افراد اس کے ساتھ تھے۔ اس نے اسی حال میں تینوں کو راہی ملکِ عدم کیا۔ خود بھی زخمی ہوا اور بھاگ نکلا۔ جب چار پریزن گارڈ نے اسے مار پیٹ کر قیدِ تنہائی میں پھینکا تو وہ جلد ہی وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعدازاں ان چاروں کو ان کے خاندان کے ساتھ قتل کر دیا۔ شکوف چار مرتبہ بُری طرح تشدد کا شکار ہوا تھا۔ وجہ پولیس بھی تھی اور حریف کاروباری بھی...... دو مرتبہ اس نے گولی کا ذائقہ چکھا۔ ایک مرتبہ چلتی ٹرین سے کودنا پڑا۔

وہ گیارہ سال کی عمر میں سگریٹ سے متعارف ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھرپور جوانی میں COPD کا شکار ہو گیا۔

جان لیوا خطرات کو مات دینے والا اب COPD کے چنگل میں پھنس کر دو چیزوں کا محتاج ہو گیا تھا۔ انہیلر اور اسٹیم۔ اس وقت وہ نیم برہنہ تولیا لپیٹے اسٹیم روم میں بیٹھا تھا۔ انہیلر گود میں رکھا تھا۔ دفعتاً سیل فون نے نغمہ سرائی کی۔ اس نے فوراً فون اٹینڈ نہیں کیا۔ پرنس اچھی خبر کے لیے بے

تاب تھا۔ تاہم اسی نے فون اٹھایا۔
”میری رقم کہاں ہے؟“ آواز گھوسٹ کی تھی۔
”ہیرے کہاں ہیں؟“ شکوف کی آواز میں تلخی تھی۔
”میں نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہے ہو؟“ گھوسٹ نے کہا۔ ”ہمارے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔ میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ والٹر ختم ہو گیا لیکن میرا معاوضہ ”کے مین“ منتقل نہیں ہوا۔“
”تمہاری سوچ میں فرق ہے۔“ شکوف بولا۔ ”والٹر نے سنڈیکیٹ کے ڈائمنڈز چرائے تھے۔ ڈائمنڈز کہیں نہیں ہیں اور تم نے والٹر کو آخری بار زندہ دیکھا تھا۔“
”اگر مجھے رقم نہیں ملی تو میں تمہیں آخری بار زندہ دیکھوں گا۔“
”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“
”بائیں جانب دیکھو۔“ گھوسٹ کی آواز آئی۔
شکوف نے گردن موڑی۔ دیوار پر سرخ ڈاٹ نظر آرہا تھا۔ ڈاٹ چھت کی طرف گیا۔ S بنایا۔ دیوار پر گیا اور ناچتا ہوا شکوف کے سینے پر آکے ٹھہر گیا۔ شکوف ڈرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن اس کا سامنا گھوسٹ سے تھا اور ڈاٹ کا مطلب واضح تھا۔
”تم یہاں ہو؟“ شکوف کی آواز میں خفیف سا ہراس پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچے؟ تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“
”وقت ضائع مت کرو۔ ادائیگی کی بات کرو۔“
”جلد بازی نہیں کرو۔ ہیرے تلاش کرنے کے لیے مجھے تھوڑا وقت دو۔“
”یہ میرا...... مسئلہ...... نہیں ہے۔“ گھوسٹ نے کہا۔
سرخ ڈاٹ نے حرکت کی...... سینے سے پیٹ کی طرف۔ پھر وہ گود میں رکھے انہیلر پر جم گیا۔
شکوف کا سینہ جلنے لگا۔ ”پلیز۔“
اس نے بارہا موت کو شکست دی تھی۔ خوف کا سامنا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ وہ اس لفظ سے ناآشنا تھا۔ اچانک وہ تولیا جھٹک کر برہنہ ایستادہ ہو گیا۔ بے خوف، پُراعتماد۔ ”جہنم میں جاؤ...... شکوف زندگی میں کسی کے سامنے نہیں جھکا۔“
اس کے جسم پر سولہ ٹیٹوز کھدے تھے۔ گلاب، شیر، کھوپڑی...... ہر ایک کے ساتھ نیلی لکیر تھی، جو روسی مافیا میں اس کی تاریخ کے ریکارڈ کو ظاہر کرتی تھی۔ روسی مافیا کے اراکین اس تاریخ کو پڑھنا جانتے تھے۔
☆☆☆
”سات نمبر، کہاں گزرا؟“ گھوسٹ نے سوال کیا۔
”وہاٹ؟“
”گھٹنے پر ستارہ بنا ہوا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ سات سال تم نے قید میں گزارے۔ میں پوچھ رہا ہوں کہاں؟“
”اگر تم ٹیٹوز کا مفہوم سمجھتے ہو تو سات کونوں والے ستارے کا مطلب صرف سات سال کی قید ہی نہیں ہے؟“
”ہاں، یہ روسی مافیا کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔“ گھوسٹ نے کہا۔
”پکھان۔“ (مافیا لیڈر) کی حیثیت میں تم روس میں کہاں تھے؟“
شکوف نے گہرا سانس لے کر نیم گرم بھاپ کے بخارات سے پھیپھڑوں کو بھرا۔ ”میں نہیں، پرنس ”پکھان“ ہے...... میری حیثیت کم تر ہے۔“
”اتنی کم بھی نہیں۔“ گھوسٹ نے کہا۔
”اگر تم نے کوڈ توڑا ہے تو کچھ حاصل نہ کر پاؤ گے۔“
”میں صرف قتل کرتا ہوں۔ میں نے کنٹریکٹ پورا کر دیا اور تم نے ادائیگی نہیں کی۔“
”میں کیسے یقین کروں کہ تم سچ بول رہے ہو؟“
”نہ کرو...... ایسی صورت میں تم پانچ سیکنڈ میں مرجاؤ گے۔“ گھوسٹ نے الٹی گنتی شروع کر دی۔ وہ چار تک پہنچا تھا کہ شکوف کے اعصاب ٹوٹ گئے۔
”میں ادا کر دوں گا۔“
”کب؟“
”بہت جلد۔“
سرخ ڈاٹ غائب ہو گیا۔
”شکریہ۔“ شکوف نے کہا۔ ”ایک اور کام ہے تمہارے لیے۔“ شکوف نے شکریے کے بعد کہا۔
”میں سن رہا ہوں۔“ گھوسٹ نے کہا۔
”میں نے یقین کر لیا ہے کہ ہیرے تم نے نہیں چرائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں واپس لاؤ۔“
”یہ دو کام ہوئے۔ جس کے پاس ہیرے ہیں، اسے ختم کرنا پڑے گا اور معاوضہ بڑھ جائے گا۔“
”کتنا؟“
”والٹر کے لیے جتنا تھا۔ اس کا دوگنا۔“
شکوف کی ہنسی میں مسرت کا عنصر کم تھا۔ ”دوگنا، بہت زیادہ ہے۔“
”ٹارگٹ کو کھوجنا، ہیرے واپس لینا اور اسے ختم کرنا...... میں نے زیادہ رقم نہیں مانگی ہے۔“

تھوڑی سی ردوکد کے بعد شکوف راضی ہوگیا۔

''یعنی ہم پھر نیا ''بزنس'' شروع کررہے ہیں۔''

''ہاں۔'' شکوف نے سینے کی طرف دیکھا جہاں سرخ ڈاٹ واپس آگیا تھا۔ جب گھوسٹ الٹی گنتی گن رہا تھا۔

''گن ہٹالو۔'' شکوف نے کہا۔ جواب آیا نہ سرخ ڈاٹ نے جگہ چھوڑی۔ شکوف نے ایک منٹ انتظار کیا پھر اسے احساس ہوا کہ سرخ ڈاٹ کبھی نہیں ہٹے گا۔ لیزر بیم، آٹو پائلٹ پر تھی۔ وہ گالی دے کر اٹھا اور سرخ لکیر کے سہارے اس کے منبع تک پہنچا...... وہاں کوئی گن نہیں تھی۔ عام سے کی چین کے ساتھ لیزر پوائنٹر ایک جگہ ٹکا ہوا تھا۔

گھوسٹ جاچکا تھا۔

☆☆☆

شکوف نے شاور کے بعد لباس تبدیل کیا اور ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گیا۔ پہلا کام اس نے یہ کیا کہ گھوسٹ کا معاوضہ متعین اکاؤنٹ میں منتقل کیا۔ واڈکا لینے کے بعد اس نے فون اٹھایا اور پرنس کا نمبر ملاتے ملاتے رک گیا۔ پرنس کے غضب کا سامنا کرنے کے لیے مزید واڈکا کی ضرورت تھی۔

وہ دونوں کزن تھے۔ پرنس کا باپ پنیر بنا کے فروخت کرتا تھا لیکن دونوں کزن مطمئن نہیں تھے۔ وہ دولت کے پجاری تھے۔ شکوف کا باپ مجرمانہ سرگرمیوں کے باعث قید بھگت رہا تھا۔ شکوف نے کاریں چرانا شروع کردیں۔ کاروں میں اکثر اسے بونس کے طور پر قیمتی کیمرے، گن، گھڑیاں اور دیگر اشیا مل جاتی تھیں...... ایک مرتبہ اسے جیولری اور اسلحہ ہاتھ آیا۔ شکوف نے اپنے کزن پرنس کو شاملِ راز کیا۔ پرنس کے ذہن میں آئیڈیے نے جنم لیا۔ اس نے بیش قیمت چیزوں کو ریپ کرکے پنیر کے ساتھ ٹب میں رکھنا شروع کردیا۔۔۔ وہ خاص گاہکوں کو مطلوبہ پنیر مہنگے داموں فروخت کرتا۔ اس طرح وہ تیزی سے اپنے باپ کو مالی اعتبار سے پیچھے چھوڑتا چلا گیا۔ منہ کو خون لگ گیا تھا۔ اسے مزید دولت درکار تھی۔ اکیس سال کی عمر میں اس نے ڈائمنڈ سنڈیکیٹ سے رابطہ کیا۔ اپنا آئیڈیا اور خدمات پیش کیں پھر اس نے مڑ کے نہیں دیکھا۔

سنڈیکیٹ غیرقانونی ہیروں کی ٹریکنگ میں ملوث تھا۔ جنگ زدہ افریقی ممالک اور باغی قبائل مارکٹائی کے لیے فنڈ حاصل کرتے۔ اس کے لیے وہ قیدیوں کے ذریعے ان ہیروں کے لیے کھدائی کرتے۔ جو دریائی کناروں میں دفن تھے۔ کوئی تعاون سے انکار کرتا تو اسے قتل کردیا جاتا۔ دریاؤں کے پانی میں سرخی گھل جاتی۔ اس طرح قیمتی پتھروں کا نام ''بلڈ ڈائمنڈ'' پڑ گیا۔ خونی ہیرے۔

پنیر کے ذریعے پرنس نے فول پروف پروگرام بنایا جس کے تحت ہیرے امریکا پہنچائے جاتے۔ پنیر اسی پروگرام کا مرکزی حصہ تھا۔ پرنس نے ایک چھوٹی سی فیکٹری خرید لی۔ جہاں اعلیٰ قسم کا پنیر تیار کیا جاتا تھا۔ بہترین پیکنگ کا انتظام تھا۔ جب انگولا اور سیرالیون سے ''خونی ہیروں'' کی شپمنٹ پہنچتی تو مزید احتیاطی اقدامات کے بعد اسے نیویارک برآمد کردیا جاتا...... جہاں والٹر اور اس کے آدمی پنیر میں سے ہیرے نکال کر سینتالیسویں اسٹریٹ پر فروخت کردیتے۔ اسٹریٹ کے مرچنٹ بلیک مارکیٹ کی ارزاں قیمت سے زیادہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ہیرے، قاتل افریقن وار لارڈز کی جانب سے آرہے ہیں...... ہیروں کی تراشی اور ڈریسنگ معیاری نہیں تھی۔ یہ دوسرا عیب تھا لیکن ہیرا، ہیرا ہوتا ہے۔ لہٰذا سنڈیکیٹ خاصی رقم کما رہا تھا۔ پلان ٹھیک ٹھاک جارہا تھا۔ جب والٹر کے ذہن میں حرص نے سر اٹھایا۔ وہ ہر شپمنٹ میں سے چند ہیرے اِدھر اُدھر کرنے لگا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ شکوف کی نظروں میں آگیا۔

اب والٹر مرچکا تھا اور ہیرے غائب۔ ہیروں کی برآمدگی شکوف کی ذمے داری تھی۔ اس نے تیسری بار واڈکا کی بوتل پکڑی...... چند منٹ گزرنے کے بعد وہ پرنس سے رابطہ کررہا تھا۔

''شکوف اچھی خبر معلوم ہوتی ہے۔'' پرنس کی آواز آئی۔

''ایسا ہی ہے۔'' شکوف نے کذب گوئی سے کام لیا۔

''رائس اور بن زیٹی کامیابی کے قریب تر ہیں۔ ہیرے بہت جلد مل جائیں گے۔''

''رائس اور بن زیٹی؟'' پرنس برہمی سے چلایا۔

''تم ان ناکارہ پولیس والوں پر انحصار کررہے ہو؟''

''نہیں، نہیں...... میں نے درجن بھر آدمی اور لگائے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے گھوسٹ کو ہائر کرلیا ہے۔ گھوسٹ ایک لیجنڈ ہے۔ ون آف دی بیسٹ۔''

''شکوف، میں یاد رکھوں گا۔ اگر تم نے تیزی نہیں دکھائی تو تم سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے گھوسٹ کو ہائر کرنا پڑے گا۔'' پرنس نے رابطہ منقطع کردیا۔ شکوف نے واڈکا کی بوتل اٹھالی۔

باسٹرڈ، خود شکوف کی وجہ سے وہ آج باس بنا بیٹھا ہے۔

☆☆☆

برائٹن بیچ سیکشن، بروک لین میں واقع تھا۔ جہاں روسی بکثرت آباد تھے کہ علاقے کا نام ''لٹل اوڈیسا'' پڑ گیا تھا۔ پرنس روس میں پیدا ہوا۔ ماسکو...... وہیں پلا بڑھا لیکن وطن میں رہنے سے انکاری تھا۔ اس کی منطق تھی کہ برائٹن بیچ جرائم کا گرم بستر ہے۔ اس نے رہنے کے لیے ''پارک سلوپ'' کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے پڑوسیوں میں بیشتر آرٹسٹ، رائٹرز، موسیقار اور اداکار تھے۔ پرنس کے لیے یہ ماحول موزوں تھا۔ ایسے معروف و مشہور افراد کے درمیان پرنس کی طرف کون توجہ دیتا۔ اس کے لگژری مکان کی قیمت چار ملین ڈالرز تھی۔ اس نے مکمل گمنامی اختیار کی ہوئی تھی۔ ماسٹر بیڈ روم نے پوری تیسری منزل گھیری ہوئی تھی۔ یہ پرنس کی جنت تھی۔ جسے وہ نٹالیا جیسی فتنہ پرور حسینہ کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔

''کس پر چلا رہے تھے؟'' وہ باتھ روم سے مہکتی ہوئی نکلی۔

''شکوف۔''

''کیا ہوا؟''

''ملینز ڈالرز کے ہیرے غائب ہیں...... والٹر مرتے مرتے بھی ہمیں جھانسا دے گیا۔ میں اسے شکوف کی غلطی سمجھتا ہوں۔''

''کچھ غلطی میری بھی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میں سمجھی تھی کہ میں نے اسے گھیر لیا ہے جبکہ وہ میرے ساتھ بھاگنے کے منصوبے بناتے بناتے اکیلا نکل گیا۔''

☆☆☆

کثرت سے واڈکا چڑھانے کے باعث شکوف کے حواس تاخیر سے بحال ہوئے۔ یہ حرکت پریشان کن تھی۔ دو ہفتے قبل وہ والٹر کے ہمراہ مے نوشی میں مشغول تھا اور اپنے خونی کارناموں کے قصے بیان کررہا تھا۔ مستی میں اس نے بیک وقت ستائیس افراد کو ٹھکانے لگانے کے شیطان صفت عمل کی وضاحت کی۔

والٹر نے ڈکار ماری۔ ''بکواس۔'' وہ بولا۔

''بکواس نہیں ہے۔ اپنی مردہ ماں کی روح کی قسم کھاتا ہوں۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ پرنس، اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے کے ہمراہ سڑک کراس کررہا تھا۔ تب ایک تیز رفتار ٹیکسی سڑک کے کونے سے نمودار ہوئی...... تصادم ناگزیر تھا۔ بیوی اور بیٹا سڑک پر گرنے سے پہلے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیٹی کی حالت نازک تھی۔ ڈرائیور نے جائے حادثہ پر رکنے کی کوشش نہیں کی۔ پرنس چھ ماہ تک اپنی بیٹی کے ساتھ اسپتال میں رہا۔ وہ بچ گئی۔

''پرنس اور میں نے انتقام کا منصوبہ بنایا۔ اس کے اندر آتش فشاں ابل رہا تھا۔ صرف ایک سراغ ملا تھا کہ ٹیکسی نیلے اور سفید رنگ کی تھی۔ وہ ٹیکسیاں ڈمٹرو کیب کمپنی کی تھیں۔'' شکوف نے بتایا۔

''ایک صبح میں نے درجن بھر آدمی ساتھ لیے اور ٹیکسی بارن پر چڑھائی کردی۔ وہ نئے دن کا آغاز کرنے والے تھے۔ کمپنی کا تقریباً ہر فرد وہاں موجود تھا۔ اکثر ڈمٹرو فیملی کے ممبر تھے۔ میں نے سب کو اسٹوریج روم میں بند کر کے گیس کی مرکزی لائن کھول دی۔ فرش پر پیٹرول کے کین بہا دیے...... ایک دیا سلائی کافی تھی۔ تمام کے تمام بھسم ہو گئے۔'' شکوف نے فخریہ انداز میں والٹر کو دیکھا۔

''میری نظر میں تمہاری قدر بڑھ گئی ہے، کامریڈ۔'' والٹر نے کہا۔ شکوف نے ترنگ میں بک دیا کہ نٹالیا پرنس کی محبوبہ ہے۔ یہ سنتے ہی والٹر کے کان کھڑے ہو گئے اور شکوف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ یہ کیسا راز عیاں کردیا۔ وہ تو......

اس نے والٹر سے وعدہ لیا کہ نٹالیا کا نام کبھی اس کی زبان پر نہیں آئے گا۔

☆☆☆

میں صبح بیدار ہوا تو کیتھرائن میری بانہوں میں تھی اور ہیروں کا تصور ذہن میں۔ ایک سوال تھا...... ہیرے کتنی مالیت کے ہوں گے؟

کیتھرائن کے آفس روانہ ہونے کے بعد میں نے ٹرنک سے بیگ نکالا اور اسے کھول کر بیڈ پر الٹ دیا۔ ہوپ بھی بیڈ پر آ گئی۔ ظاہر ہے وہ ان چمک دار پتھروں کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ وہ قریب قریب ایک سائز کے تھے۔ بڑے نہ چھوٹے...... اور تعداد میری توقع سے زیادہ تھی۔

میں نے ٹی وی آن کیا۔ گرم خبر...... گرینڈ سینٹرل کی چل رہی تھی۔ مردہ آدمی کو والٹر زیلویز کی حیثیت سے شناخت کرلیا گیا تھا۔ تاہم ہیروں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ میں نے اندازاً گنتی کی اور آنکھ بند کر کے پانچ ہیرے اٹھا لیے۔ بقیہ واپس بیگ میں منتقل کر کے ٹرنک میں رکھ دیے۔ اپارٹمنٹ لاک کر کے میں راک فیلر سینٹر اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ رخ مغرب کی جانب تھا۔ منزل سینتالیسویں اسٹریٹ تھی جہاں میں ایک مختلف دنیا میں داخل ہونے جا رہا

تھا۔ ڈائمنڈ ڈسٹرکٹ۔ اس سے قبل میں کبھی یہاں نہیں آیا تھا۔ کم از کم کاروباری ارادے سے۔

میں نیشنل جیولرز ایکسچینج میں چلا گیا۔ سیکڑوں خریدار اپنے اپنے بوتھ میں خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ سونا، چاندی، زیورات اور ہیرے..... جانا لیونتھال، فربہ عورت تھی...... عمر غالباً ساٹھ سال کے قریب۔ اس نے مجھے شوکیس میں رکھے ڈائمنڈ رِنگ گھورتے دیکھا۔

''ینگ مین، معلوم ہوتا ہے کہ تم منگنی کی انگوٹھی کی تلاش میں ہو۔'' وہ بولی۔

''تمہارے خیال کے برعکس۔'' میں نے کہا۔ ''انگوٹھی میں دے چکا تھا لیکن کچھ عرصے بعد مجھے واپس کر دی گئی۔''

''اوہ، تم جیسے وجیہہ آدمی کے ساتھ تمہاری منگیتر نے اچھا نہیں کیا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کم از کم اس نے انگوٹھی تو واپس کر دی۔'' جانا نام کی عورت نے کہا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر ایک ہیرا نکالا۔ ''اس نے صرف ڈائمنڈ واپس کیا ہے۔ مجھے نہیں آیا۔ کہیں اس نے ہیرے کی جگہ شیشے کا ٹکڑا تو نہیں پکڑا دیا۔''

''لاؤ، میں دیکھتی ہوں۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ بولی اور آواز لگائی۔ آواز کے جواب میں ایک آدمی اٹھ کر آیا۔ جانا نے ہیرا اس کے حوالے کیا۔ وہ مختلف طریقوں سے بیس منٹ تک ہیرے کو جانچتا رہا پھر میری طرف آیا۔

''اطمینان رکھو۔ یہ ''کوشر'' (kosher) ہے، کہاں سے خریدا؟''

''کولوروڈو۔''

اس نے شانے اچکائے اور جانا کی طرف دیکھا۔

''تمہیں یہاں آنا چاہیے تھا۔ کولوروڈو مہنگا ہے۔''

''کتنی ادائیگی کی تھی تم نے؟'' مرد نے سوال کیا۔

''پندرہ ہزار؟''

''سولہ مع ٹیکس کے۔''

''چور ہیں وہ لوگ۔'' جانا نے تبصرہ کیا۔

''یہ پرفیکٹ نہیں ہے لیکن بہرحال قیمتی ہے۔'' مرد نے بتایا۔

''اگر میں فروخت کرنا چاہوں تو کیا ملے گا؟''

''آٹھ ہزار۔'' جواب آیا۔

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں سوچ کر بتاؤں گا۔ تم لوگ کافی مددگار ثابت ہوئے ہو۔''

''میرا مشورہ ہے کہ اسے پاس رکھو۔ تمہیں کوئی اور لڑکی مل جائے گی اُسے دے دینا۔ فیصلہ کر لو تو آجانا۔ ہم اس کے لیے خوب صورت انگوٹھی بنا دیں گے۔'' جانا نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل گیا۔ بعدازاں میں نے دس ڈیلرز کو آزمایا۔ کوالٹی بھی ایک جیسی تھی اور وزن بھی تقریباً یکساں۔ قدر کا اندازہ یہ تھا کہ پانچ ہیرے اوسطاً باسٹھ سو ڈالرز کے تھے۔ البتہ دسویں ڈیلر نے ہیرے کو جعلی قرار دیا۔ وہ اس کے سو ڈالرز دینے کے لیے تیار تھا۔ میں نے کہیں بھی ایک ساتھ پانچوں ہیرے سامنے نہیں کیے۔ ظاہر ہے دسواں ڈیلر مجھے ٹھگنے کے چکر میں تھا، بہرحال میرا مقصد خوش اسلوبی سے پورا ہو گیا۔

اندازے کے مطابق بیگ میں اکیس سو ہیرے تھے۔ اگر میں باسٹھ سو پر ہی رہتا تو اس وقت تیرہ ملین ڈالرز کی مالیت کے ہیرے میرے قبضے میں تھے لیکن میں حریص نہیں تھا۔ میری ترجیح تھی کہ انہیں جلد فروخت کیا جائے نہ کہ سودے بازی میں وقت ضائع کروں اور خطرات کو بھی دعوت دوں۔

میں نے مارکیٹ سے ہی کیتھرائن کو فون کیا۔

''گریٹ نیوز ہے میرے پاس۔''

''جلدی بتاؤ، جلدی بتاؤ۔''

''میں آج رات آٹھ بجے پارٹی کر رہا ہوں۔''

''وجہ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''میرے پاس تیرہ ملین وجوہات ہیں۔''

''میں مصروف ہوں۔ صرف ایک بتا دو۔''

''میں دنیا کی حسین ترین لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوں۔''

''شاندار...... میں آؤں گی اُس لڑکی سے ملنے۔''

☆☆☆

میں ابھی تک اسٹوڈنٹ بجٹ پر تھا۔ لہٰذا پارٹی میں زیادہ اہتمام کرنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ نہ ہی پارٹی کی کوئی خاص وجہ بتائی تھی۔ ہر طرف دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں۔ زیادہ تر مہمان ''پارسن'' سے آئے تھے۔ کچھ بلڈنگ کے پڑوسی تھے۔ میں نے عمارت کے ڈور مین کو بھی مدعو کیا تھا۔ تصاویر تعریف و تنقید دونوں کی زد میں تھیں۔ تاہم مجھے پروا نہیں تھی۔

دس بجے ڈور بیل بجی۔ میں نے کلوز ڈسٹرکٹ مونیٹر میں دیکھا۔ دیو ہیکل آدمی میرے لیے اجنبی تھا۔ اجنبیوں

کے لیے میں خدشات محسوس نہیں کرتا تھا۔ تاہم ہیروں کی وجہ سے میں نے بے چینی محسوس کی...... لیکن فرنٹ ڈور کھولے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہ وزن کے باعث آہستہ چل رہا تھا۔ چوتھی لینڈنگ تک پہنچتے ہوئے وہ خاصا ہانپنے لگا تھا۔

''کون ہے؟'' کیتھرائن میرے قریب آگئی۔

''پتا نہیں...... اجنبی لگتا ہے۔''

بالآخر وہ اپارٹمنٹ تک آگیا۔ ہم دونوں کو دیکھا۔

''ہیلو، کیتھرائن۔'' اس نے کیتھرائن کو مخاطب کیا۔

''ہیلو، نیوٹاؤن۔''

نیوٹاؤن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اوپر آتے ہوئے نڈھال سا ہو گیا تھا۔ کیتھرائن نے ہم دونوں کا آپس میں تعارف کرایا۔ تعارف کراتے وقت کیتھرائن نے میرے لیے ''بریلینٹ آرٹسٹ'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ وہ پہلے ہی اُسے میرے بارے میں بتا چکی تھی۔

''ہر شاندار آرٹسٹ آخر اتنے اوپر کیوں رہائش اختیار کرتا ہے؟'' نیوٹاؤن نے پیشانی سے پسینا صاف کیا۔

''خوشی ہوئی مل کر مسٹر نیوٹاؤن۔'' میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''مسٹر نہیں۔ صرف نیوٹاؤن...... جیسے میڈونا۔''

''تم تھک گئے ہو۔ آؤ میں تمہیں کچھ دیتا ہوں۔''

''آکسیجن ٹینک بہتر رہے گا۔'' نیوٹاؤن بولا۔

''بیئر ہے۔''

''اور بھی بہتر ہے، دو کین۔''

جب میں بیئر لے کر آیا تو نیوٹاؤن نے اپنی 54 نمبر کی جیکٹ اتار دی تھی۔ نیچے نیلی شرٹ پر پسینے کے دھبے نظر آرہے تھے۔ یہی حال بغلوں کے نیچے تھا۔

''نیوٹاؤن یہاں تمہارا کام دیکھنے آیا ہے۔'' کیتھرائن اٹھلائی۔

''گریٹ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''قدر افزائی ہے۔''

''کیا یہ میرا کام پسند کرے گا؟'' میں نے کیتھرائن سے سرگوشی کی۔

''اس کی پسند ناپسند سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ اپنے مالدار مالک کے لیے خریداری کے لیے آیا ہے۔ اُس کے پاس وقت نہیں ہے۔ نیوٹاؤن ہی اس کے لیے شاپنگ تک کرتا ہے۔'' کیتھرائن نے جواب دیا۔

''اگر وہ آدمی اتنا ہی مالدار ہے تو ''پکاسو'' یا ''ولیم ڈی کوننگ'' کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا...... میتھیو بینن ہی کیوں؟''

''وہ ینگ ٹیلنٹ کی قدر یا حوصلہ افزائی کو ترجیح دیتا ہے۔''

نیوٹاؤن نے میری تمام پینٹنگز دیکھنے میں صرف دس منٹ لیے۔ دو خالی کین مجھے پکڑائے...... جواباً میں نے دو اور اس کے حوالے کیے۔

''تم، عمر کتنی ہے؟''

''بتیس سال۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم نے ملٹری کے لیے کام کیا ہے؟''

''میرینز۔''

''میں نے تمہارے کام سے اندازہ لگایا۔'' وہ بولا۔ ''اس میں کھردرے فن کی جھلک ہے...... باس پسند کرے گا۔ میں تین تصاویر خریدوں گا۔ میں باس کو جانتا ہوں۔ تمہارا کام آج جیسا ہے...... برسوں بعد اس کام کی قدر کچھ اور ہو گی۔''

مجھے یقین کرنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے تین پینٹنگز کی نشاندہی کر دی اور قیمت پوچھی۔ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ حیرانی سے میں نے کیتھرائن طرف دیکھا۔

''نیوٹاؤن، ایک منٹ۔'' اس نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف لے آئی۔ ''کیا سوچا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ کینوس، فریم۔ پینٹ اور کام...... شاید چار سو ایک پینٹنگ کے۔''

کیتھرائن نے آنکھ ماری اور واپس نیوٹاؤن کے پاس آئی۔ نیوٹاؤن سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک پینٹنگ کے دو ہزار۔''

''زیادہ ہیں۔''

''تین کے پانچ ہزار۔'' کیتھرائن کچھ نیچے آئی۔

''سمجھو ایک فلور اوپر آنے کے ایک ہزار۔'' وہ مسکرائی۔

''کتنا بُرا لگے گا تمہارا خالی ہاتھ لوٹنا۔''

نیوٹاؤن نے آخری بیئر چڑھائی۔ ''ڈیل۔'' ''کل میں اپنے آدمیوں کو بھیج دوں گا۔ وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ محفلِ طرب کے اختتام پر میں نے کیتھرائن کو گلے سے لگا لیا۔ ''تم ٹیچر ہو یا سیلز مین؟''

''وہ لڑکی کہاں ہے۔ دنیا کی حسین ترین...... جس کی وجہ سے تم نے اس پارٹی کا اہتمام کیا تھا؟'' نشیلا سوال تھا۔

''وہ بیڈروم میں ہے۔ آؤ......''

☆☆☆

پہلے کیتھرائن نے میری زندگی میں انقلاب آفریں تبدیلی پیدا کی۔ دوسرے نمبر پر ہیروں کی بارش ہوگئی۔

''کیا یہ اچھا آغاز نہیں ہے؟'' وہ بولی۔

''تمہاری وجہ سے ہے۔ فلوک بھی ہوسکتا ہے۔''

''نہیں، تمہارے اندر ایک آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم ایماندار ہو...... یہی چیز تمہارے کام میں جھلکتی ہے...... یہ ریکلوم کاشٹ ہے...... نچوڑ ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

وہ غلطی پر تھی۔ میں بے ایمان تھا۔ کسی اور کے ہیرے میرے گھر میں تھے۔

☆☆☆

رائس اور بن زیٹی گرینڈ سینٹرل ٹرمینل پر تھے۔

''یہ روسی بہت حرامی ہیں۔ اگر ہم نے ہیرے دریافت نہیں کیے تو یہ ہمارا وہی حشر کریں گے جو والٹر جیسے خوفناک قاتل کا ہوا۔''

''سیکیورٹی ٹائٹ ہے۔'' رائس نے کہا۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''سینٹرل سیکیورٹی آفس۔ لوئر لیول۔'' بن زیٹی نے گھڑی دیکھی۔ موجود شفٹ میں ایک دوست ہے۔ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

وہ سیڑھیاں اتر کے مخصوص علاقے میں چلے گئے۔ آخرکار ایک دروازے پر رکے جہاں پلیٹ لگی تھی۔ ''غیر متعلقہ شخص کا داخلہ منع ہے۔''

بن زیٹی نے گھنٹی بجائی اور کیمرے کو اپنا بیج دکھایا۔ چند سیکنڈ میں دونوں اندر تھے۔

''این وائی پی ڈی۔'' اس نے ڈیسک کی دوسری جانب موجود ایم ٹی اے کوپ سے کہا۔ ''سارجنٹ بلیک سے ملنا ہے۔''

کوپ نے سر ہلا کر ڈائریکٹری چیک کی اور نمبر ملایا۔

''پہنچ رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

پانچ منٹ بعد دراز قامت عورت اندر داخل ہوئی۔

''یہ سوشل کال تو نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ بولی۔

بن زیٹی نے پہلے رائس کا تعارف کرایا اور اعتراف کیا کہ یہ سوشل کال نہیں ہے۔

''آؤ پھر...... یہاں سے نکلو۔'' وہ ان دونوں کو لے کر کمانڈ سینٹر میں آگئی۔ جہاں متعدد میزیں، کمپیوٹرز اور اہلکار موجود تھے۔ مونیٹرز پر ٹرمینل کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ ''مجھے اچھا نہیں لگا...... تمہیں زحمت دوں، لیکن منگل کی رات کی ویڈیو دیکھنی ضروری تھی۔'' بن زیٹی نے کہا۔

''بمباری؟'' بلیک نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''ہم پہلے ہی ٹیپ این وائی پی ڈی، ایف بی آئی، امیگریشن ہوم لینڈ سیکیورٹی...... وغیرہ تک پہنچا چکے ہیں۔ ہر ایک سرگرم ہے۔''

''بومبنگ کا معاملہ دھوکا ہے۔ پوسٹ کے رپورٹر نے اسے لوٹ مار کا نام دیا ہے...... کسی بے خانماں کا کیا دھرا ہے۔''

''لوٹ مار؟''

''ہاں، مونیٹر پر دیکھنا ہے کہ اُس روز وہاں کون مسافر تھے...... کتنے اور کیا کر رہے تھے؟''

''چھ ہزار افراد روز وہاں سے گزرتے ہیں...... بہرحال ٹیپ ہم نے متعلقہ اداروں کو بھجوادی ہے۔'' بلیک نے کہا۔ ''ہاں، گرینڈ سینٹرل بیشتر بے خانماں افراد کا گھر ہے، جہاں انہیں کوئی خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بینچوں اور ٹوائلٹس میں وقت گزار لیتے ہیں، بہرحال آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ دونوں بلیک کے ہمراہ ایک ٹیکنیشن کے ساتھ بیٹھے تھے۔ کمپیوٹر کا اسکرین تیس انچ کا تھا۔ ''سولہ کیمرے نگرانی کرتے ہیں۔'' رائس نے کہا۔ ٹیکنیشن نے اپنا کام شروع کیا۔

''منگل کے روز بوم بلاسٹ گیارہ بجے سے ذرا دیر بعد ہوا تھا۔ گیارہ سے ایک گھنٹا قبل سرچ کا آغاز کرو۔'' بن زیٹی نے ہدایت دی۔

امیج بہت واضح تھے۔ بیس منٹ میں انہوں نے والٹر کو دیکھ لیا۔ وہ کافی لے کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ بار بار گھڑی دیکھنے کے انداز سے وہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ غالباً اس کی مطلوبہ ٹرین تاخیر کا شکار تھی۔ ان دونوں کو معلوم تھا کہ اس روز کون کون سی ٹرین لیٹ آئی تھیں۔

''گیارہ بجے وہ اٹھا، کافی کپ ٹریش کی نذر کرکے باتھ روم کا رخ کیا۔ دونوں سراغ رساں چوکس ہوگئے۔ گیارہ کے بعد دھماکے ہونے تھے۔ رائس نے پھر مونیٹر روک دیا۔ اُلجھی ہوئی داڑھی والا ایک عمر رسیدہ آدمی والٹر کے پیچھے باتھ روم کی طرف جارہا تھا۔ لباس میں نمایاں چیز بوسیدہ ''پونچو'' (کمبل) تھا۔ جیسا ویسٹرن فلموں میں ہوتا ہے۔ کوئی سلائی نہیں، کوئی آستین نہیں۔ دامن کی طرف پسند

کا کٹاؤ ہوتا ہے اور سر کی جانب کھوپڑی سے کچھ بڑا سوراخ۔ ''یہ ہوسکتا ہے۔'' رائس نے کہا۔

''اسے شکوف نے ہائر کیا ہے...... والٹر کو ختم کرنے کے لیے۔''

''کیسے کہہ رہے ہو؟'' رائس نے سوال کیا۔

''ابھی پتا چل جائے گا...... باتھ روم کے کیمرے پر لاؤ۔''

''باتھ روم میں کیمرے نہیں ہیں۔''

اٹھاسی سیکنڈ بعد والٹر باتھ روم سے اس حال میں برآمد ہوا کہ اس کی گردن سے خون فوارے کے مانند نکل رہا تھا۔ وہ پیچھے ہاتھ کر کے اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ معاً وہ فریم سے نکل گیا۔ فوراً ہی کمبل میں ملبوس داڑھی والا نمودار ہوا...... اس کی گن کا رخ بھاگتے ہوئے زخمی والٹر کی جانب تھا لیکن عین وقت پر پولیس مین نے مداخلت کی اور داڑھی والے نے پلٹ کر پولیس مین کے قدموں میں فائرنگ کی...... اور والٹر کی طرف متوجہ ہوا...... فائر کیا اور کمبل سے دو گرینیڈ نکال کر پنین ہٹائیں...... سب کچھ دھندلا گیا۔ اسکرین پر دھوئیں کے سوا کچھ نہ تھا۔

''اس کی حرکات وسکنات بوڑھوں والی نہیں تھیں۔ بدمقابل والٹر تھا۔ داڑھی والے نے بھیس بدلا ہوا تھا۔'' رائس نے تیقن کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا۔ بن زیٹی نے اتفاق کیا۔

''کون ہوسکتا ہے۔ والٹر ترنوالہ نہیں تھا۔'' بن زیٹی نے گالی دی۔ انہوں نے فاسٹ فارورڈ کے ذریعے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی...... لاحاصل۔

''اب کیا کیا جائے؟'' رائس کا سوال تھا۔

''شکوف نے کونٹریکٹ کلر کو ہائر کیا تھا۔ وہی اسے دیکھے گا...... ہمارا کام ہیرے تلاش کرنا ہے۔ کوئی نہ کوئی جانتا ہے کہ ہیرے کہاں ہیں؟''

''والٹر جانتا ہے۔'' رائس نے کہا۔

''والٹر مردہ ہے۔''

''وڈیو میں زندہ ہے۔ ابھی آسرا ہے۔'' رائس کیمروں کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ ''وہ رہا۔'' چند منٹ بعد وہ جذباتی انداز میں بولا۔

دونوں دیکھ رہے تھے کہ خون آلود والٹر لڑکھڑاتا ہوا لاکرز کے بنک سے ٹکرایا۔ اس نے ایک لاکر کھولا اور گر گیا۔

رائس نے پھر اسکرین فریز کردیا۔ ''وہ مارا۔''

''لاکر نمبر 925۔'' بن زیٹی نے کہا۔ ''کیا کہو گے؟ لاکر میں پنیر ہے یا ہیرے؟'' بن زیٹی نے اندازہ لگایا۔

زمین بوس والٹر کے سفید ماربل پر خون کی سرخی پھیل رہی تھی۔ دھواں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ ''دیکھو مسافروں کی والٹر کی طرف توجہ نہیں ہے۔ ان کو اپنی جان کی پڑی ہے۔ وہ اس کے اوپر سے بھاگے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ امداد سے بے نیاز ہوگیا ہے۔'' رائس بولا۔

''ایک منٹ...... یہ ذات شریف کون ہے؟''

ذات شریف گھٹنوں کے بل بیٹھ کر والٹر کی مدد کر رہا تھا۔

''کون ہے؟'' رائس نے سوال کیا۔

''کون جانے؟ بھاگتے ہوئے والٹر کو دیکھ کر رک گیا ہے۔''

''اوہ، والٹر زندہ ہے...... وہ کچھ کہہ رہا ہے۔''

بظاہر چند ہی الفاظ تھے۔ ''والٹر کا سر ڈھلک گیا ہے...... ڈیڈ۔''

''اب ذاتِ شریف کیا کرے گا؟'' رائس کی نظر اسکرین پر تھی۔

''اگر وہ اسمارٹ ہے تو بھاگنے کی کرے گا۔''

لیکن اس کے برعکس ذاتِ شریف نے اوپر خون آلود لاکر کی طرف دیکھا۔

''اوہ، بندر کیلا کھانے کے چکر میں ہے۔'' رائس نے تبصرہ کیا۔

ذاتِ شریف نے اٹھ کر کھلے لاکر میں سے ایک چرمی بیگ برآمد کیا اور کھول کر دیکھا۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان پولیس مین پہنچ گیا۔ ذاتِ شریف نے بسرعت بیگ بند کر دیا۔

''پولیس اہلکار این وائی پی ڈی سے تعلق رکھتا ہے۔'' رائس نے اطلاع دی۔

''وہ ایڈیٹ اسکواڈ سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک سویلین پر گن تان رکھی ہے۔'' بن زیٹی نے اعتراض کیا۔

ذاتِ شریف نے گن مین کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی توجہ مردہ روسی (والٹر) کی جانب تھی۔

''وہ اسمارٹ ہے۔'' رائس بولا۔ ''وہ والٹر کے بیگ کے سہارے ڈاکٹر کی اداکاری کر رہا ہے۔''

''اور آفیسر احمق ہے...... اس نے دھوکا کھا کر گن ہولسٹر میں رکھ لی ہے۔''

آخر کار ذاتِ شریف نے اپنا سیل فون نکالا۔

''او...... پاگل وہ دھوکا دے رہا ہے، اس کا کارڈ

چیک کرو۔'' رائس چلایا اور رکے ہوئے اسکرین کو زوم کیا۔ آفیسر کے ٹیگ پر نام ''کینڈل'' لکھا تھا۔

ذاتِ شریف سیل فون پر اداکاری کر رہا تھا اور آفیسر ریڈیو پر کچھ سن رہا تھا۔ بات ختم کر کے اس نے چند سیکنڈ نقلی ڈاکٹر کے ساتھ گزارے اور ریڈیو پر ملنے والی نامعلوم ہدایت کے تحت وہاں سے بیالیسویں اسٹریٹ کے راستے کی طرف نکل گیا۔

''لعنت ہے۔'' بن زیتی بھنا گیا۔

ذاتِ شریف نے دس سیکنڈ انتظار کیا اور مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ رائس کیمرے کی مدد سے اس کے پیچھے تھا۔ ڈراما ختم ہو رہا تھا۔ ذاتِ شریف نے کیب پکڑی اور روانہ ہو گیا۔ رائس نے فریم جام کیا اور نمبر نوٹ کیا۔

''TLC کو کال کر کے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کرنی پڑے گی۔''

''مجھے کچھ خاص امید نہیں ہے۔ اس افراتفری میں ڈرائیور کیا یاد رکھے گا۔'' بن زیتی نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ''بہتر ہے کہ کینڈل کو پکڑیں۔''

''ہم ذاتِ شریف کا اسکرین شاٹ لے کر اس کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں پھر اسے تلاش کر کے ہیرے وصول کریں گے اور ایک عدد گولی اس کے سر میں ٹھونک دیں گے۔ اگر ناکام بھی ہوئے تو بطور کارکردگی ذاتِ شریف کی تصویر شکوف کے حوالے کر دیں گے...... کہ ہیرے یہاں موصوف کے پاس ہیں۔''

بن زیتی نے سر ہلا کے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

پرنس کی کال سن کر شکوف بوکھلا گیا۔

''میں فون کرنے ہی والا تھا۔ پرنس کام ہو گیا ہے۔ بہت اچھی خبر ہے۔ اس آدمی کا سراغ مل گیا ہے...... ہیرے جس کے قبضے میں ہیں...... میں اس کی تصویر ای میل کر رہا ہوں۔''

''تصویر؟'' پرنس پھنکارا۔ ''مجھے اس کا سر درکار ہے...... یہاں فرنٹ ڈور پر...... دونوں کان اور آنکھیں اس کے منہ میں ہونی چاہئیں...... کون ہے وہ؟''

''والٹر نے گرینڈ سینٹرل کے لاکر میں ہیرے رکھے تھے۔ میں جس آدمی کی بات کر رہا ہوں، اُسے ہیرے وہاں سے ملے تھے۔ گھوسٹ نے اپنا کام کر دیا تھا لیکن والٹر سیف تک پہنچ گیا۔ اسے کھول بھی لیا...... اس کے بعد اس کی روح جہنم کی طرف پرواز کر گئی اور ہیرے اس آدمی کو مل گئے۔''

''اس نے ہیرے وہاں کیوں رکھے تھے؟''

''اسے نتالیا پر شک ہو گیا تھا۔ نتالیا اس کے گھر میں موجود سیف کا کمبی نیشن جانتی تھی۔'' شکوف نے جواب دیا۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

''ابھی معلوم نہیں ہوا لیکن اغلباً وہ اسٹیشن پر ہی کام کرتا ہے...... یا پھر عموماً وہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ ہم بہت جلد اسے پکڑ لیں گے۔''

''ہم، کون؟''

''میں، رائس، بن زیتی اور گھوسٹ۔'' شکوف نے جواب دیا۔

''نہیں، مجھے اور مین پاور چاہیے۔ یہ کافی نہیں ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔''

''ایک درجن آدمی اور ہیں۔''

''نہیں...... مجھے پروفیشنل چاہئیں۔'' پرنس چلایا۔ ''شکاری، کلر، کونٹریکٹ کلر......''

''گھوسٹ سے بڑا شکاری کون ہوگا؟''

''وہ اکیلا ہے۔'' پرنس نے کہا۔ ''سنڈیکیٹ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے۔ گھوسٹ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو، وہ ہر وقت ہر جگہ نہیں رہ سکتا۔ ٹھوس کام ہونا چاہیے۔ کوئی بیک اپ بھی ہونا چاہیے۔ ہم پہلے بھی اس کے ساتھ کام کر چکے ہیں...... وہ جرمن ہے۔''

''کرال؟'' شکوف نے نام لیا۔

پرنس نے تصدیق کی۔

''میں کہہ نہیں سکتا۔'' شکوف نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ''ایسے قاتل آپس میں رزم آرا ہونا پسند نہیں کرتے۔ کونٹریکٹ انفرادی ہونا چاہیے۔''

''مجھے ان کے اصولوں کی پروا نہیں ہے۔ وہ کام کریں، میں ادائیگی کروں گا۔ شرائط میری ہوں گی۔ اگر کرال رضامند نہ ہو تو کسی اور کو پکڑو۔'' پرنس نے فون بند کر دیا۔''

وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ تھا۔ پرنٹ آؤٹ دیکھ کر نتالیا نے اسے چھیڑا۔ ''یہ تو خاصا کیوٹ ہے۔''

☆☆☆

مارٹا کرال جتنی پُرکشش تھی، اتنی ہی ذہین۔ برائیاں بھی دو تھیں۔ ''سنگدلی'' اور ''اس کا پیشہ'' وہ کونٹریکٹ کلر تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ تھا۔ وہ سابقہ ماڈل تھی،

جسے دیکھ کر مردوں کی دھڑکن چال بدل دیتی تھی لیکن مرضی کی رقم کے عوض وہ دھڑکن بند کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔

آٹھ گھنٹے بعد شکوف نے اسے لاس اینجلس میں ٹریپ کیا اور اس وقت وہ شکوف کے رُوبرو بیٹھی تھی۔ اس نے بولنے میں پہل نہیں کی۔ خاموشی سے تکتی رہی۔ برف کا مجسمہ، شکوف نے سوچا...... بے بدل قاتل۔

''والٹر نے ریٹائرمنٹ قبل از وقت لے لی ہے۔'' شکوف نے آغاز کیا۔

''میں نے نیویارک ٹائمز میں پڑھا تھا۔ وہ گرینڈ سینٹرل میں مارا گیا۔'' کرال نے جواباً کہا۔ ''ریٹائرمنٹ کی وجہ؟''

''وہ بھاگ رہا تھا...... سنڈیکیٹ سے فراڈ کر کے......''

''اوہ، تم ڈائمنڈ بزنس میں ہو۔''

''مجھے وہ تمام ہیرے واپس چاہئیں جو اس نے چُرائے۔''

''چوری شدہ اشیا کی دریافت میرا کام نہیں ہے...... خونی ٹاسک۔'' وہ اٹھنے والی تھی کہ شکوف نے ایک جوان کی تصویر دکھائی جو گرین سینٹرل کے لاکرز کے پاس کھڑا تھا۔

کرال نے تصویر دیکھی۔ ''سیکسی۔'' اس نے ایک لفظ کہا۔

''اسے ختم کرنے سے پہلے کھیلنا پڑے گا۔''

''اور ہیرے بھی اسی کے پاس ہیں۔''

''ٹھیک ہے، معاوضے کی بات کرو۔'' کرال نے کہا۔ کچھ دیر تک اس موضوع پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ شکوف، کرال کے بلند مطالبے کو ماننے پر مجبور تھا۔

''ایک سوال؟'' کرال نے کہا۔ ''میرے مقابلے پر کون ہے؟''

''یہ مقابلہ نہیں ہے...... دو مقامی پولیس مین ہیں اور ایک پروفیشنل۔''

''کون پروفیشنل؟''

''گھوسٹ۔''

کرال نے بیرونی تاثرات کو قابو میں رکھا لیکن اندرونی طور پر وہ برہم ہو گئی تھی۔ اس کی کبھی گھوسٹ سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی تاہم وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ لوگ گھوسٹ کے بارے میں اس طرح تبصرے کرتے تھے جیسے وہ کوئی گاڈ ہو۔

''گھوسٹ۔'' کرال نے عام سے انداز میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ وہ بہت خطرناک ہے۔''

شکوف نے قہقہہ لگایا۔ ''صرف خطرناک...... وہ واحد قاتل ہے جو جنت میں جائے گا۔ شیطان جہنم میں اس کی ہمراہی سے نالاں ہو گا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے؟''

''دراصل میرا باس چاہتا ہے کہ دوسرا پروفیشنل بیک اپ کے طور پر کام کرے۔''

کرال کھڑی ہو گئی۔ ''میری توہین مت کرو۔ کسی اور کو ڈھونڈو۔''

شکوف نے محسوس کیا کہ وہ اسے غلط ہینڈل کر گیا ہے۔ وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اگر نکل گئی تو پرنس، شکوف کو نہیں چھوڑے گا۔

''رک جاؤ۔'' وہ پکار اٹھا۔ ''بھول جاؤ کہ میرا باس کیا چاہتا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میرے خیال میں گھوسٹ ہیروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ اگر تم اسے بھی ختم کر دو تو میرے اوپر احسان ہو گا۔ معاوضہ دوگنا دوں گا۔''

کرال نے حیرت سے دیکھا۔ گھوسٹ کو ختم کر کے وہ ناقابلِ قیاس مسرت محسوس کرے گی۔ خطیر معاوضہ الگ ملے گا۔ اس نے شکوف کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ڈیل۔''

شکوف اس بے ساختہ آفر پر خود بھی متحیر تھا۔ اس نے اضطراری طور پر سینے کی طرف دیکھا۔ سرخ ڈاٹ وہاں نہیں تھا۔ اسے اپنے فیصلے پر افسوس نہیں تھا۔ گھوسٹ کو مرنا چاہیے۔

شکوف زندگی میں کسی آدمی کے آگے نہیں جھکا۔

☆☆☆

کرال نے بیالیسویں اسٹریٹ اور چھٹے ایونیو کے لیے کیب لی۔ وچ کرافٹ کساک برانٹ سے سینڈوچ خریدے۔ ناردرن پرائی نیڈ میں درخت کے نیچے میز سنبھال کر اس نے اینٹی گراوسی سے فرانس میں رابطہ قائم کیا۔

اس کی آواز سن کر اینٹی کا منہ کڑوا ہو گیا۔ کرال نے ماضی میں ایک مرتبہ اس کی جان بچائی تھی جس کا قرض وہ اب تک اتار رہا تھا۔ اینٹی جوئے کی لت میں گرفتار تھا اور ایک موقع پر بیس ہزار یورو الجیرین ڈرگ ڈیلر سے لے کر پھنس گیا تھا۔ ڈرگ ڈیلر نے کرال کو اسے ختم کرنے پر لگا دیا۔ کرال نے بجائے اس کی جان لینے کے اس کا قرض ادا کر دیا۔ کرال کے لیے زندہ اینٹی زیادہ قیمتی تھا۔ وہ انٹرپول

کے کمپیوٹر ریکارڈ روم میں کام کرتا تھا۔
''ایشی، میں نے ایک آدمی کا فوٹو ای میل کیا تھا۔''
''میں آفس سے نکل گیا تھا۔''
''تو واپس جاؤ۔'' کرال نے اطمینان سے حکم جاری کیا۔
''مجھے بیوی کے ساتھ ڈنر اٹینڈ کرنا ہے۔ آج اُس کی سالگرہ ہے۔'' ایشی نے کہا۔
''پلیز میرے بہترین الفاظ اس تک پہنچاؤ اور بتاؤ کہ چند روز میں، میں بھی اس سے ملاقات کروں گی اور اس وقت وہ تمہاری بیوہ ہوگی۔''
''میں آفس واپس جارہا ہوں۔''
''گڈ، فوٹو چند روز قبل گرینڈ سینٹرل، نیویارک سی سے کیمرے نے اٹھایا ہے...... میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ آدمی کون ہے۔''
''تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''
''نہیں، یہ تمہارا کام ہے۔''
''او کے۔''
کرال نے اسے فون نمبر دیا۔ ''کتنا وقت لگے گا؟''
''اگر اس کا مجرمانہ پس منظر ہے تو دو گھنٹے۔ ورنہ زیادہ کھدائی کرنی پڑے گی۔''
''وقت ضائع مت کرنا۔''
''سمجھ گیا۔''
''ایک اور بات۔ گھوسٹ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''
وہ ہنس دیا۔
''ہنسنے کی کیا بات ہے؟''
''نہیں، کچھ نہیں...... آدھی پولیس ایجنسیاں دنیا میں گھوسٹ کی بُو سونگھتی پھر رہی ہیں۔ اب تم بھی۔''
''ٹھیک، اگر کوئی اطلاع ملے تو پہلے مجھے بتانا۔'' کرال نے فون بند کردیا۔
کرال کے علم میں تھا کہ ایشی ہینڈسم فوٹو کی شناخت میں زیادہ مددگار ثابت ہوسکتا ہے اور گھوسٹ کے لیے ارا۔ ارا، نیویارک میں ہی تھا۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی واشنگٹن اسٹریٹ کی ایک عمارت پر پہنچی۔ عمارت چھ منزلہ تھی اور چھ ڈوربیل۔ نام کی جگہ ایشی انڈسٹریز لکھا تھا۔ اس نے بٹن دبایا۔
جواب آیا۔ ''سوری، وقت ختم ہوگیا ہے، کل آنا۔''
''مجھے بتایا گیا ہے کہ پریمیئر کسٹمر کے لیے دیر سے بھی انڈسٹری کھلتی ہے۔'' کرال نے کہا۔
آواز آئی۔ ''لیول آف پریمیئر؟''
''ٹائی ٹینیم۔''
ایک منٹ کے اندر وہ اندر داخل ہورہی تھی۔ ارا کا دروازہ چوتھی منزل پر تھا۔ گھنٹی بجا کر وہ اندر چلی گئی۔ ایریا تین ہزار اسکوائر فٹ وسیع تھا۔ کوئی انچ خالی نہیں تھا۔ چھوٹی بڑی میزیں، کمپیوٹرز، الیکٹرونکس، کچن ایریا۔ فون کنٹریز، پیزا کینز، پورن میگزینز، گاربیج کین، کمپیوٹر مینوئلز اور کاؤنٹر پر دو عدد چوہے۔
اس کباڑ میں ایک بڑے صوفے پر غیر معمولی بھاری شخص بیٹھا تھا۔ اس کے قریب کمپیوٹر پر دو لیٹر کی پیپسی کی بوتل رکھی تھی۔ ہاتھ میں کول رینچ کا کھلا ہوا بیگ تھا۔ ہائی جین سے وہ غیر متعلق نظر آرہا تھا۔
''میں ارا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''سوری اگر کچھ بُو محسوس ہورہی ہو۔ زیادہ سوشل کالز نہیں آتی ہیں...... کیا ضرورت ہے بار بار ٹب میں گھس کر نکلنے کی۔''
''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے ایشی یا ٹائی ٹینیم کے بجائے خود کو کارلا کہا۔
''کس نے بھیجا ہے؟''
''ایک دوست نے۔''
''دوست خود آتا تو اچھا تھا...... کیا کام ہے؟''
''میرے شوہر نے جان عذاب میں کی ہوئی ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے لگاتا ہے بلکہ اسی کو ٹھکانے لگا دو...... ایک سرکش بندہ چاہیے۔ بیسٹ۔''
''آسان ہے، کئی آدمی ہیں۔'' ارا نے کہا۔
''کئی آدمی نہیں۔ مجھے بہترین کی ضرورت ہے۔ میرا شوہر بڑا خونخوار ہے۔''
''سیکنڈ بیسٹ...... نمبر ون ایسے کام نہیں کرتا۔''
''میں منہ مانگا معاوضہ دوں گی...... اُس کا نام کیا ہے؟''
''گھوسٹ۔''
''بہترین؟''
''بہترین سے آگے۔''
''ویری گڈ۔''
''میں اس سے ملنا چاہوں گی۔ کچھ بتاؤ اس کے بارے میں۔''
''وہ کینڈل لائٹ ڈنر پسند کرتا ہے۔ ساحل پر چہل

قدمی...... کنسرٹ...... کراس ورڈ پزلز اور بیڈ میں حسیناؤں کے ساتھ...... جیسے تم ہو۔''

کارلا نے تناؤ محسوس کیا۔'' بکواس ہے۔''

''کم آن، کرال۔'' ارا نے پہلی بار اس کا اصلی نام لیا۔'' کیا تم مجھے احمق خیال کرتی ہو۔ میرے پاس وائس پرنٹ کا ڈیٹا بیس ہے جس میں لاکھوں آوازیں محفوظ ہیں۔ تمہاری بھی نصف درجن کالز ہیں۔ تمہارے اندر آنے سے پہلے میں نے آواز ملائی تھی۔ مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہوئی تھی۔ میرے کلائنٹ آفس نہیں آتے۔ گھوسٹ سے کیا کام ہے؟''

''ہم ایک ہی جاب پر ساتھ کام کر رہے ہیں۔''

''کیسی جاب؟''

''والٹر مر گیا ہے۔ ہیرے غائب ہیں جو ایک آدمی کے پاس ہیں۔ اس کی تصویر میری تحویل میں ہے۔ ہیرے بازیاب کر کے اسے ختم کرنا ہے۔ ہیرے والٹر نے سنڈیکیٹ سے غداری کرتے ہوئے چرائے تھے۔''

''شگوف نے وہ فوٹو مجھے بھجوایا تھا جو میں نے گھوسٹ تک پہنچوا دیا۔''

''میں اور گھوسٹ ایک ہی ٹارگٹ پر ہیں لہٰذا مجھے اس سے ملنا ہے۔''

''میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ خود رابطہ کرتا ہے...... اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔''

دفعتاً کرال نے گلوک نکال لیا۔'' میری بھی یہی پالیسی ہے۔''

وہ کرال کو اُسی طرح دیکھ رہا تھا۔ کرال کو توقع تھی کہ وہ خوف زدہ ہو جائے گا۔

''کم آن کرال۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں تمہارے اور دیگر کلرز کے راز، راز رکھتا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے لیکن گھوسٹ کے بارے میں تمہیں کن گن ہے۔ لہٰذا تمہارا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔''

''تم اسے زندگی کہتی ہو۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''یہاں پڑے پڑے گند میں کھاتے پیتے رہو...... وزن بڑھاتے رہو۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ قاتلوں، قصائیوں اور گینگسٹر کے ساتھ کام کرنا۔ یہ میری زندگی ہے۔ اگر اس فضول، بے مقصد زندگی کو ختم کرنا چاہتی ہو تو ٹریگر دباؤ۔ تم سے پہلے بھی کچھ افراد نے میرے اوپر گن تانی تھی۔''

''لیکن میں گن نکالتی ہوں تو گولی بھی چلاتی ہوں...... یہ ایک بدنما زندگی ہے...... کیا جینا چاہتے ہو؟''

اچانک ارا کا رنگ بدل گیا۔'' ہاں۔''

''معمولی اطلاع بھی ملے تو اس نمبر پر کال کرنا۔ کرال نے ایک کارڈ اسے دیا۔ مجھے گھوسٹ سے ملنا ہے۔ تم مجھے جانتے ہو کوئی ہوشیاری مت کرنا۔'' کرال نے گن نیچے کر لی۔

☆☆☆

میں نے کیتھرائن کا نمبر ملایا۔

''کیا بات ہے؟''

''احسان چکانے کا وقت ہے۔'' میں نے کہا۔'' تم نے مجھے حیران کیا تھا اب میں کروں گا۔''

''خوب، کیا سرپرائز ہے؟''

''فون پر نہیں بتاؤں گا۔''

''اشارہ ہی دے دو۔''

''ہوں...... ل...... چمک دمک۔''

''اوہ، مزہ آئے گا۔ میں پہنچنے میں تیس منٹ لوں گی۔''

''لنچ میری طرف سے۔'' میں نے اضافہ کیا۔

''ڈیل، لُو یُو۔''

''لُو یُو۔'' میں نے فون بند کیا اور تیس منٹ سے قبل نیوامی پہنچ گیا۔ ایک بوتھ منتخب کر کے انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ گزرے تھے کہ کیتھرائن کا چہرہ نظر آیا...... آرڈر پلیس ہونے کے بعد اس نے کہا۔'' سسپنس پیدا مت کرو۔ کہاں ہے سرپرائز......'' میں نے میڈیکل بیگ میز پر رکھ دیا۔

''یہ کیا؟'' وہ مایوس نظر آئی۔'' تم نے تو کوئی اور اشارہ دیا تھا۔''

''کھول کر تو دیکھو۔''

کیتھرائن نے بیگ کھولا اور میں نے سانس روک لی۔ اس نے ہاتھ ڈال کر پوسٹ کارڈ کا بنڈل نکالا جو سرخ ربن سے بندھا تھا۔ اس نے کارڈ دیکھنے شروع کیے۔ آرک ڈی ٹرومف، نوٹرے ڈیم کیتھڈرل، لوور، ایفل ٹاور......''

''اور دیکھو۔'' میں نے اشارہ کیا۔ اس نے پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

''کیا ہم پکنک پر جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟'' اس نے ہاتھ ڈال کر دوائی۔ ٹکٹ نکالے جو میں نے ایک گھنٹے قبل کمپیوٹر سے حاصل کیے تھے۔ وہ تقریباً چیخ اٹھی۔'' پیرس۔''

''کب؟''
میں نے نکلوں کی طرف اشارہ کیا۔
''آج رات؟ پاگل ہو؟''
''ہاں، تم نے بنایا ہے۔''
''آج کیسے جاؤں گی؟''
''تم جاؤ گی۔ کل جگمگاتے ''سٹی آف لائٹ'' میں ڈنر کریں گے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''ابھی آٹھ گھنٹے باقی ہیں۔''

☆☆☆

رائس اور بن زیٹی نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹریک کر لیا تھا جس نے بتایا کہ تصویر والا آدمی ڈاکٹر تھا اور دوسری سواری کے ساتھ درخواست کے بعد بیٹھ گیا تھا۔ جسے ڈرائیور نے سینٹ ونسنٹ اسپتال کے قریب چھوڑ دیا تھا۔
بعدازاں دونوں پولیس مین گرینڈ سینٹرل کی دکانوں، ریسٹورنٹ اور ٹکٹ ونڈوز کو کھنگالتے رہے...... ہر ایک نے تصویر پہچاننے سے انکار کر دیا۔
اب اس احمق پولیس والے کا نمبر ہے، جو اسے پکڑ سکتا تھا۔ اس کا نام روبن کینڈل ہے اور ہم اس سے باہر ملیں گے...... اکیلے میں۔ رائس نے جمع کردہ تفتیش کی مدد سے بہ آسانی اس کا نمبر ملایا، تعارف کے بعد گرینڈ سینٹرل کا حوالہ دیا۔ بات چیت کی خواہش ظاہر کی۔
''ہم پچاسویں اسٹریٹ کے کونے پر سیاہ رنگ کی شیوی تاہو میں منتظر ہیں۔'' اس نے کینڈل سے کہا۔
''نو پرابلم۔ میں پہنچ رہا ہوں۔'' چھ بج کر چار منٹ پر کینڈل پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ بچوں جیسا تھا۔ رائس نے تصویر اس کے سامنے کی۔ ''اسے پہچانتے ہو؟''
کینڈل نے جواب دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔
''یہ وہی ڈاکٹر ہے جو اُس رات مردہ آدمی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔''
''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر تھا؟'' بن زیٹی نے طنز کیا۔
کینڈل گڑبڑا گیا۔ ''وہ...... وہ اُس نے مجھے بتایا تھا۔''
''اگر وہ کہتا میں لیڈی نرس ہوں؟'' رائس بولا۔
کینڈل کی زبان لڑکھڑائی۔ ''ہم...... میں نے اُس کی آئی ڈی چیک نہیں کی تھی۔''
''اکیڈمی میں تم نے کیا سیکھا تھا؟''
کینڈل کی پیشانی پسیج گئی۔
''بچے تم نے بنیادی غلطی کی...... اور کیا بتا سکتے ہو؟''
کینڈل نے جلدی سے نوٹ بک نکالی۔ وہ سینٹ ونسنٹ میں کام کرتا ہے۔ اس نے اپنا نام ووڈ بتایا تھا۔ ڈاکٹر جیسن ووڈ۔''
''اگر یہ نام اصلی ہے تو کام آسان ہو جائے گا۔'' رائس نے کہا۔
''ٹریننگ کے دوران میں بھی تمہارا ریکارڈ اچھا نہیں ہوگا۔''
بن زیٹی نے کینڈل کو گھورا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ جیسن ووڈ اصلی نام ہو۔''
کینڈل کو گویا چپ لگ گئی تھی۔
''سنو بچے۔'' رائس نے کہا۔ ''تمہارے خلاف کوئی ایکشن نہیں ہوگا۔ اتنا یاد رکھو کہ تم ہم سے کبھی نہیں ملے تھے۔ نہ ہی کوئی بات چیت ہوئی تھی...... سمجھ گئے...... اور آئندہ خیال رکھنا۔''
''یس سر...... یس سر۔''
''چلو نکلو۔''
کینڈل نے بہت تیزی سے واپسی کی راہ پکڑی۔
بعدازاں انہوں نے سینٹ ونسنٹ کا نمبر ملایا۔ دو منٹ کی ناکام کوشش کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔
''اب کیا کریں؟''
بن زیٹی نے جواب نہیں دیا۔ اس کی توجہ کسی اور جانب تھی۔ وہ انہماک سے کچھ دیکھ رہا تھا...... وہ دراز قامت مکھن ملائی جلوے بکھیرتی پیدل رواں دواں تھی۔
''دیکھ رہے ہو...... چہرہ دیکھوں، بدن یا چال......''
''ڈریم گرل۔'' رائس نے تبصرہ کیا۔
دفعتاً لڑکی کا رخ ان کی کار کی جانب ہو گیا۔ ''قاتل ہے، قاتل۔'' بن زیٹی نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔
''کیا کر رہے ہو؟'' رائس بولا۔
لڑکی کار کے قریب سے گزرتے گزرتے رکی اور کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر بن زیٹی کی ٹائی پکڑ لی۔ زوردار جھٹکا دیا، بن زیٹی کا سر کار ڈور سے ٹکرایا۔
''تم دونوں شکوف کے آدمی ہو۔'' وہ بولی۔ ''مجھے تمہاری تلاش تھی۔''

☆☆☆

بن زیٹی درد سے بلبلا رہا تھا۔ ساتھ ہی گن نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس سے پہلے ہی لڑکی نے گلوک کی نال اس کے منہ میں ڈال دی۔ رائس نے بھی گن کے لیے

ہاتھ مارا۔
''حماقت نہ کرنا۔'' لڑکی جنگلی بلی کے مانند غرائی۔ ''گولی اس کے سر سے نکل کر تمہارے سر میں جائے گی۔ ایک شاٹ اور دو مردہ کوپ۔''
رائس اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ ''کیا شکوف نے تمہارے لیے بونس رکھا ہے، اگر تم ایک گولی سے ہم دونوں کا شکار کرو گی؟''
وہ مسکرائی۔ مسکراہٹ حُسن اور شیطنت کا امتزاج تھی۔ ''شکوف نے مجھے ہائر کیا ہے...... تم دونوں میرے ساتھ کام کرو گے۔'' اس نے ٹائی چھوڑ دی۔ ''ہم دوست ہیں۔''
''تم نے ہمیں کیسے پہچانا؟''
''ظاہر ہے، شکوف کے ذریعے۔''
''دوست ہیں اور گن میرے ساتھی کے منہ میں رکھی ہے؟''
''اس کا انداز ایسا تھا جیسے زنجیر سے بندھا کُتا۔ جو سامنے پڑی بوٹیوں کو بھنبھوڑنے کے لیے بے قرار ہو۔ آئندہ یہ محتاط رہے گا۔ میرا نام مارٹا کرال ہے۔''
نام سن کر دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

☆☆☆

جس آدمی کے پاس ہیرے ہیں...... اس کے بارے میں تم دونوں نے اب تک کیا کیا ہے؟''
رائس اور بن زیٹی نے اب تک کارکردگی کے بارے میں اسے بتایا۔
''وہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں کیا مدد ملے گی؟''
''خزانہ اتفاقاً ہی اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔'' بن زیٹی نے کہا۔ پہلی فرصت میں وہ گھر گیا ہوگا۔ ڈرائیور کو اس نے صحیح پتا نہیں بتایا۔ سینٹ ونسنٹ جہاں ہے...... اندازے کے مطابق اسے وہاں سے پانچ سے دس بلاک تک کے دائرے میں ہونا چاہیے۔''
''یہ کافی بڑا علاقہ ہے۔'' کرال نے خیال آرائی کی۔ ''اور اگر وہ سینٹ ونسنٹ سے دوسری کیب پکڑ مزید آگے نکل گیا...... پھر؟''
''ہمیں موقع دو پولیس کے پاس کئی طریقے ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ ہم ہیروں تک پہنچ جائیں گے۔ اب تک کی کارکردگی امید افزا ہے۔''
''مجھے شک ہے۔'' کرال نے کہا۔ ''لیکن اگر تم کامیاب ہو گئے تو ایک ہیرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رکھنا۔'' کرال نے دونوں کو باری باری کڑی نظروں سے دیکھا جو کرال کے حُسن غارت گر، زُہد تو بہ شکن کو بھول چکے تھے۔
''ایسا ہی ہوگا۔''
''میں تم دونوں پر نظر رکھوں گی، وقت کا خیال رکھنا۔''

☆☆☆

''وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' رائس بڑبڑایا۔ ''وقت کم ہے۔ شکوف نے وقت کی بات کی تھی۔''
''لیکن یار یہ عجیب مرد مار قسم کی عورت ہے۔ ہالی ووڈ میں جانے کے بجائے کونٹریکٹ کلر بنی ہوئی ہے۔''
''تم پھر بہک رہے ہو۔''
''اچھا پلان بتاؤ۔'' بن زیٹی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
''عوام میں جانا پڑے گا۔ اس کی فوٹو پریس میں جاری کریں گے۔''
''دماغ جگہ پر ہے...... یہ ہمارا کیس نہیں ہے۔ بومبنگ ہے، اس کا تعلق ہوم لینڈ سیکیورٹی سے ہے۔ ہمیں ہیروں کی تلاش ہے جو درندہ نما قاتلوں سے چرائے گئے ہیں۔ خود کو ہمیں پس منظر میں رکھنا ہے۔ عوام میں جانے کا مطلب ہے کہ ایف بی آئی والے ہمیں گھیر لیں گے۔''
''میں سمجھتا ہوں، ہم گرینڈ سینٹرل کا ذکر گول کر جائیں گے۔ صرف اتنا کہ دو کوپس ایک مشتبہ شخص کی تلاش میں ہیں۔'' رائس نے وضاحت کی۔ ''وہ مشکوک شخص روبری، مرڈر یا کسی اور جرم میں درکار ہے...... فون نمبر کی جگہ ہماری ڈائریکٹ لائنز ہوں گی، کیسا؟''
بن زیٹی نے سر ہلایا۔ ''سر چٹنے دو۔''
''گن منہ میں تھی تو کیا سوچ رہے تھے۔ وہ گوری کُتیا شکوف سے زیادہ خطرناک ہے اور ہمیں وارننگ دے چکی ہے۔ اس کی تنبیہ پر مجھے یقین ہے۔ ابھی میرا مرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس کیا پلان ہے؟''
''او کے، او کے۔ مختصر وقفوں کے ساتھ ہم اس مردود کی فوٹو الیکٹرونک میڈیا پر دکھائیں گے۔''

☆☆☆

میں اور ہوپر اپارٹمنٹ میں اکیلے تھے۔ میں پیکنگ میں مصروف تھا۔ میرے فادر کا کہنا تھا کہ پیکنگ کے طریقے ہوتے ہیں۔ ''میرین وے'' اور ''رونگ وے'' پہلا اصول: سامان کم سے کم ہونا چاہیے۔ اگر تم جانتے ہو کہ دنیا

میں کہاں کہاں پھرو گے تو ایک بیگ رکھو۔

میرا ایک سفری بیگ وریڈ او کسی اسکائی ٹرین بکثرت استعمال ہوا تھا۔ سفر کے لیے یہ دنیا کا بہترین بیگ تھا۔ میں نے اسے کھولا اور مخصوص طریقے سے چیزیں رکھنا شروع کیں۔ یہ پرانی ملٹری ٹرک تھی جو جگہ بھی بچاتی تھی اور شکنیں بھی نمودار نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے تہ میں کپڑے بچھائے۔ پھر اس پر موزوں اور زیر جاموں کی پاؤچ رکھی۔ پھر اس پر کپڑے رکھنے شروع کیے۔ ایک کے اوپر ایک۔ آخر میں ایک گھیر دار بنڈل رکھا۔ یہ بہترین تکنیک تھی جسے میں سیکڑوں مرتبہ برت چکا تھا لیکن اس مرتبہ معاملہ اور تھا۔ درمیانی کور کے موزوں میں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ غیر ملک میں ان کو اسمگل کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ فرنچ کسٹم کے ہاتھوں پکڑا جاتا تو سیدھا جیل جاتا۔ اگر یہ انکشاف ہوتا کہ ہیرے وہی ہیں جو والٹر نے چرائے تھے تو حالات بدترین شکل اختیار کر لیتے۔

ڈور بیل کی آواز پر میں نے مونیٹر چیک کیا۔ وہ کیتھرائن تھی۔

میں نے مخصوص بیگ بند کیا۔

وہ جین اور نیوی بلیو سویٹر میں ملبوس سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ سر پر یانکی بیس بال کیپ تھی۔ اندر آکر اس نے کینوس کیری آن بیگ فرش پر رکھ دیا۔

”کیا خالی ہے؟ ہر بات پر سنجیدہ ہو جاتی ہو۔“

”ہر چیز واش ایبل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور مجھے امید ہے کہ تم نے پیرس میں جو ہوٹل روم منتخب کیے ہوں گے وہاں لباس کا معاملہ لازمی نہیں ہوگا۔“

میں ہوپر کی طرف مڑا۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ یہ لڑکی ملین میں صرف ایک ہے۔“

”میاؤں۔“

وہ میری زندگی تھی۔ آرٹ تھا اور اب دولت بھی۔ میں نے زندگی بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی میرا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”اس کا نام بینن ہے۔ میتھیو بینن۔“ ایلتھی نے بتایا۔

کرال کو لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ”اتنی دیر کیوں لگائی؟“

”اس کا کریمنل ریکارڈ نہیں ہے۔“

کرال نے سگریٹ سلگائی اور کچھ دیر بعد بولی۔

”ٹھیک ہے۔ اس کے بارے میں بتاؤ۔“

”میں نے ملٹری ریکارڈ سے ڈھونڈا ہے۔ وہ امریکن ہے اور چند سال میرینز میں کام کر چکا ہے۔“

”وہ اب کہاں ہے؟“

”نیویارک میں...... وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے۔“

”اسٹوڈنٹ؟“ کرال نے حیرت سے کہا۔ ”کتنی عمر ہے اس کی؟“

”اس وقت بتیس سال۔“

”کومبٹ ٹریننگ اور فائن آرٹ...... کیا تضاد ہے...... وہ کہاں ملے گا؟“

”پیری اسٹریٹ پر اس کا اپارٹمنٹ ہے۔“ ایلتھی نے فون نمبر بھی دیا۔ اور پارسن کا پتا فراہم کیا۔ کرال مسکرائی۔ احمق پولیس مین...... اتنے بھی احمق نہیں تھے۔ پارسن اور ونسنٹ اسپتال میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

”سالگرہ مبارک ہو۔“ کرال نے کہا۔

☆☆☆

کرال کا پکا اصول تھا کہ کام کے دوران کوئی نقش/اشارہ نہ چھوڑا جائے...... جسے بھلانا مشکل ہو۔ اسی لیے وہ کیب استعمال نہیں کرتی تھی۔ کیب ڈرائیورز کی یادداشت عموماً اچھی ہوتی ہے۔ وہ ہوٹل سے ٹائمز اسکوائر...... بھیڑ میں شامل ہو کر ڈاؤن ٹاؤن نمبر 1 ٹرین سے شیریڈن اسکوائر پہنچی۔

وہ ونڈو شاپنگ کے انداز میں کرسٹوفر اسٹریٹ پر جا رہی تھی...... اسی طرح وہ مطلوبہ بلڈنگ تک پہنچ گئی۔ اردگرد کا جائزہ لیا۔ عمارت پانچ منزلہ تھی۔ اسے ٹاپ فلور پر جانا تھا۔ بلڈنگ آس پاس کی عمارتوں سے زیادہ محفوظ نظر آ رہی تھی۔ اس نے چھ سیڑھیاں طے کیں۔ فرنٹ ڈور کھلا تھا۔ وہ آگے بڑھی تو سیکیورٹی کیمرے پر نظر پڑی۔ اندرونی دروازے کو وزنی چینل کی پلیٹ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ وہاں پانچ ڈور بیلز موجود تھیں۔ نمبر 5 بینن۔ بیل پش کرنے پر کوئی جواب نہیں ملا لیکن اندرونی دروازے سے افریقن امریکن آدمی برآمد ہوا۔ قد چھ فٹ، چھ انچ رہا ہوگا۔ گردن سانڈ کے مانند تھی۔ سر گنجا تھا۔ وہ کرال پر سرسری نظر ڈال کر گزر گیا۔

کرال نے بینن کی گھنٹی دوسری مرتبہ بجائی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ کرال نے یکے بعد دیگرے پانچوں گھنٹیاں بجا ڈالیں۔ کسی نے اندرونی دروازہ کھولا اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بینن کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو وہ لاک تھا۔ اپارٹمنٹ نمبر 1 سے ایک آدمی نکلا۔ ”کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

وہ بولا۔
کرال نے سوچا شریف آدمی ہے، تاہم یہ مغالطہ جلد ہی دور ہو گیا۔
''مجھے میتھیو بیٹن سے ملنا ہے۔'' وہ بولی۔
''وہ اس وقت یہاں نہیں ہے جب تم نے دوسری بار گھنٹی بجائی تو تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ بجائے اس کے تم نے پانچوں گھنٹیاں بجا ڈالیں اور کسی احمق نے ڈور کھول دیا۔ ہم بے وقوف افراد کو اپارٹمنٹ کرائے پر نہیں دیتے۔ لہٰذا خوب صورت لڑکی بیٹن کو کہیں اور ڈھونڈو یا اس کے آنے کا انتظار کرو۔''
کرال کی آنکھیں سرد اور تاثرات سپاٹ تھے۔ اس نے گلوک کی موجودگی کو محسوس کیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بیٹن کے ساتھ اس آدمی کی پیشانی پر گولی مارے گی...... اس نے خود ہی دعوت دی تھی۔ ''پھر آؤں گی۔''

☆☆☆

JFK ائرپورٹ کی سیکیورٹی سے گزرتے ہوئے میں ملین ڈالرز کیری آن بیگ کے ساتھ صاف نکل گیا۔ دوسری طرف کیتھرائن رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ وجہ پانچ اونس کی ٹوتھ پیسٹ ٹیوب تھی۔ اسے TSA اسکرینر نے روک لیا۔ ایک ہسپانک عورت جس کے ٹیگ پر نام مورالس لکھا تھا۔ کیتھرائن کے پاس آئی۔
''آپ کا ٹوتھ پیسٹ مجھے اُلجھن میں ڈال رہا ہے۔''
''میں تین اونس کے اصول سے آگاہ ہوں۔'' کیتھرائن نے کہا۔ ''اور یہ پانچ اونس کی ٹیوب ہے لیکن یہ نصف سے زیادہ خالی ہے۔ اس میں پیسٹ دو اونس ہی بچا ہوگا۔''
''سچائی کی قدر کرتی ہوں، مس...... لیکن تمام سیال اشیا اور ان کے کنٹرینز تین اونس کے ہونے چاہئیں۔ بڑے کنٹرینز کی اجازت نہیں ہے۔ چاہے وہ خالی ہی کیوں نہ ہوں۔'' مورالس نے متانت سے کہا۔
''تم مذاق کر رہی ہو؟'' کیتھرائن بولی۔
''مس ہم یہاں مذاق کرنے کے لیے نہیں بیٹھے ہیں۔''
''گاڈ سیک...... ہاف ٹیوب سے کیا میں جہاز بل......''
میں نے بروقت اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ وہ بلاسٹ بولنے جا رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں نے اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دو مزید اسکرینز آ رہے تھے۔
''کیا کر رہے ہو میتھیو؟''
''میں بتاتی ہوں، مس۔'' مورالس نے کہا۔ ''وہ تمہاری جان بچا رہا ہے۔ اسے قانون کا ادراک ہے۔''
میں نے مورالس سے معذرت کی اور کیتھرائن سے کہا۔ ''پلیز، پیرس میں، میں تمہیں دو ٹوتھ پیسٹ دلا دوں گا۔ فرنچ ٹوتھ پیسٹ۔'' پھر میں نے...... کِس کرنے کے بہانے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یقین کرو، پانچ سیکنڈ رہ گئے تھے...... پھر ہمیں گرفتار کر لیا جاتا۔''
کیتھرائن نے ٹیوب بِن میں پھینک دی۔
''نائس فلائٹ۔'' مورالس نے کہا۔
''تھینک یو...... تھینک یو۔'' وہ اس تکرار پر مسکرائی۔
وہ بے خبر تھی کہ ٹیوب پھنکوا کر میں کیا لے جا رہا ہوں۔

☆☆☆

''چلو کوئی بار دیکھتے ہیں۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
''گیٹ کے قریب ہمیں ایک چھوٹی جگہ مل گئی۔ جہاں برگر اور بیئر دستیاب تھے۔ میں نے اپنے اور کیتھرائن کے لیے دونوں چیزیں منگوا لیں۔ کیتھرائن نے دلچسپی نہیں لی اور اسٹار بک کی طرف چلی گئی۔ میں برگر سے انصاف کرتے ہوئے ایل سی ڈی کے ہموار اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ مقامی نیوز اسٹیشن لگا ہوا تھا۔ آواز بند تھی۔ فاصلہ اتنا تھا کہ میں کیپشن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ معاً بیئر ٹیبل پر چھلک پڑی۔ برگر نے حلق سے نیچے اترنے سے انکار کر دیا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔
''میں...... میتھیو بیٹن......'' جو گرینڈ سینٹرل کے لاکرز کے قریب سیاہ بیگ لیے کھڑا تھا۔
''اوہ خدایا......''
''کیا ہوا؟ خدا کیوں یاد آ گیا؟'' کیتھرائن واپس آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ ٹی وی کی طرف نہیں تھا۔
''ایک بیئر اور چاہیے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر بار کی طرف چلا گیا۔ میں نے بروقت پہنچ کر کیپشن پڑھ لیا۔ ڈاکے کا ملزم ہے...... فون نمبر بھی چمک رہے تھے۔ جہاں رابطہ کرنا تھا۔ اچانک اشتہار شروع ہو گیا۔ میں نے دیکھا بار پر ایک درجن افراد تھے۔ عموماً ایسے موقع پر وہ بے دھیانی سے ٹی وی گھورتے رہتے ہیں۔ خیال غالب تھا کہ کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ٹھوڑی نیچے کی اور فرش دیکھنے لگا...... واپسی پر کیتھرائن نے بیئر کے بارے میں سوال کیا۔
''میرا خیال بدل گیا ہے...... مجھے ایک ہیٹ خریدنا چاہیے۔ مجھے تمہاری کیپ چاہیے۔ ابھی آیا۔ گفٹ شاپ میں جا کر

میں نے بیس بال کیپ خریدی۔ اس کے بعد دھوپ کا چشمہ......

''یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا؟'' وہ ہنس رہی تھی۔

''میں آرٹسٹ ہوں اور فرانس جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

پیرس کی جانب فلائٹ میں ایک گھنٹے بعد ڈنر کی آمد ہوئی۔ ڈنر سے نمٹ کر کیتھرائن کمبل میں مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی جبکہ میں بیدار تھا۔ میں کیتھرائن کی محبت میں گرفتار تھا اور وہ میرے پیار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں اسے کس بکھیڑے میں اُلجھا رہا تھا۔ میرے دماغ میں سوالات کی بھرمار تھی۔ اگر میں پکڑا گیا تو وہ بھی نہیں بچے گی۔ اسی خلفشار میں کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو جہاز ''اورلی'' ائرپورٹ کے قریب تھا۔

''یقین نہیں آرہا...... تم مجھے پیرس لے آئے ہو۔'' اس نے کس کی۔

''یقین کرلو۔'' میں نے جوابی ردِعمل پیش کیا۔

جہاز ٹارمک پر پارک ہوا اور مسافروں کو ٹرمینل تک پہنچایا گیا۔ ہر کوئی فرانسیسی زبان بول رہا تھا۔ میں نے ہیٹ اور چشمہ اتار دیا۔ میں نیویارک سے ہزاروں میل دور تھا۔ یہاں مجھے تلاش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

آرٹسٹ، لیونارڈ کارنس، بینٹن اور کیتھرائن سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھے۔ دونوں کی قربت سے وہ اور تلملا اٹھا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ بھی بدمزاجی سے پیش آتا تھا۔ اسے ریئل ازم سے چڑ تھی۔ اس کا مزاج تجریدی آرٹ کی طرف مائل تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھا بینٹن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نظریں ٹی وی پر تھیں۔ اچانک اسکرین پر بینٹن کی تصویر نمودار ہوئی اور وہ اچھل پڑا۔ اناؤنسر کے مطابق اس پر روبری کا شک تھا۔ فون نمبر دیے گئے تھے۔ بتانے والے کے لیے انعامی رقم بھی تھی۔ اس نے فی الفور نمبر ملایا۔ ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ سراغ رساں رائس کی آواز تھی کہ پیغام چھوڑ دیا جائے۔ بہت جلد رابطہ کیا جائے گا۔

کارنس نے اپنا نام اور فون نمبر بتایا۔ فون بند کرتے وقت اس کے ذہن میں مکروہ خیال آیا۔ اس نے پیغام میں اضافہ کردیا۔ ''مزید یہ ہے کہ وہ آرٹسٹ پورا فراڈ ہے۔''

☆☆☆

مجھے اندیشہ تھا کہ جلد یا بدیر کیتھرائن کی طرف سے سوال اٹھے گا...... ہم ابھی ائرپورٹ میں تھے۔ میں کرنسی ایکسچینج ونڈو کی جانب بڑھا۔ ڈالرز کی جگہ یورو درکار تھے۔ کیتھرائن نے کچھ کیش میرے حوالے کیا۔

''اوکے، میرے پاس ہیں۔'' میں نے اسے ٹالا۔

وہ ہنس دی۔ ''کیا مطلب؟ تم دونوں کی ادائیگی نہیں کرو گے۔''

''میں نے تمہیں مدعو کیا تھا۔ انتظامات میری طرف سے ہیں۔''

''ہے، میٹ...... پارسن میں، میں نے تمہیں مدعو کیا تھا لیکن تمہاری فیس میں نے نہیں دی تھی۔''

''فرق ہے۔ یہ پیرس ہے۔ یہاں مرد خرچ کرتے ہیں۔''

''لیکن وہ مرد نہیں...... جو آرٹسٹ بننے کے لیے جدوجہد کررہے ہوں۔ کہیں تم پینٹنگز کی فروخت سے حاصل شدہ رقم تو خرچ نہیں کررہے۔''

''نہیں، نہیں...... رقم مجھے کسی اور ذریعے سے ملی تھی۔''

''تم نے مجھے بتایا نہیں؟''

میں نے شانے اچکائے۔ ''اوکے۔ مجھے اسٹیشن سے ہیروں سے بھرا بیگ ملا تھا۔''

''اور میں نے کوئین آف انگلینڈ کے ساتھ چائے پی تھی۔'' وہ بولی اور بانہیں میرے گلے میں ڈال کر کہنے لگی۔ ''تم بہت فیاض، وجیہہ ہو...... تمہارا دل بھی بہت پیارا ہے لیکن تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ اگر تمہیں ایسا بیگ ملا بھی ہوگا تو تم نے واپس کردیا ہوگا۔''

اُس کے آخری فقرے پر میں بوکھلا اٹھا تھا۔

باہر نکل کر ہم نے ٹیکسی پکڑ لی۔ میں نے ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتایا...... ہوٹل پہنچ کر اول ہم نے اسٹرابری جام، فروٹ، دہی اور فرنچ ڈش کا آرڈر دیا۔ کھا پی کر نہانے کے بعد لباس تبدیل کیا اور ہوٹل سے سیدھے ایفل ٹاور پہنچے۔

ہم دونوں کے لیے بکنگ پہلے سے موجود تھی جو کیتھرائن نے نیویارک سے ہی کرائی تھی۔ پرائیویٹ ایلیویٹر کے ذریعے ہم اوپر معلق شاندار کمرے تک پہنچے۔ کمرا اسٹیل اسٹرکچر کے سہارے قائم تھا۔ نیچے شہر کا منظر قابلِ دید تھا۔ کوٹ پینٹ میں ملبوس میزبان نے کمرے کے وسط میں ہمیں میز تک پہنچایا۔ میں نے اپنی زندگی کا شاندار

ترین اور مہنگا ترین لنچ کیا۔ مینیو پر قیمتیں دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔

''پریشان مت ہو۔'' کیتھرائن نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''ہیرے خرچ کرو...... لوگوں کو ڈالرز پڑے نہیں ملتے۔ تمہیں ہیرے مل گئے...... میں اس لنچ کی ادائیگی کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی۔''

آخر میں میزبان چھوٹے قد کا سجا ہوا چاکلیٹ کیک لے کر آیا۔ کیک کے مرکزی حصے میں ایک دائرہ تھا۔ جہاں ایک عدد شمع روشن تھی۔

''یہ کیا؟'' میں نے کیتھرائن کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری سالگرہ ہے؟''

''پتا نہیں...... مزے کرو اور نکلو۔ کافی وقت لگا دیا یہاں۔'' بعدازاں کیتھرائن کی تجویز پر ہم فرانس کے قومی آرٹ اسکول پہنچے (باؤ آرٹس)۔ وہاں متعدد ہالز میں طلبا کام کررہے تھے۔

''یہ پارسن کی طرح ہے۔'' کیتھرائن نے کہا۔

''تقریباً۔'' میں بولا۔ ''آرٹ اسکول پوری طرح دیکھنے کے بعد ہم باہر نکل آئے۔''

وہاں سے ہم لوور گیلری گئے جو دراصل ماضی میں ایک محل تھا۔ اسی لیے لوور پیلس کہلاتا تھا۔ گائیڈ بک کے مطابق وہاں روزانہ تقریباً پندرہ ہزار افراد وزٹ کرتے تھے۔ یہاں آرٹ کے چار لاکھ نمونے موجود تھے۔ جنہیں دیکھنے کے لیے ایک ہفتہ بھی کم تھا۔ ہم نے دو گھنٹے کا وقت طے کیا۔ ایک سو بیس منٹ ہم نے مائیکل اینجلو، رافیل اور چند اٹالین ماسٹرز کے چیدہ چیدہ شہ پاروں کے لیے مختص کیے تھے۔ وہاں سے نکلے تو ٹیکسی میں مونالیزا گیلری گئے۔ عام سیاح اس مقام سے بے خبر ہوتے ہیں۔ گیلری سے عازم سفر ہوئے ''ریوڈی بوسی'' (اسٹریٹ) کے بائیں جانب ''دریائے سین'' تھا...... وہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے ''لی بون مارش'' کا راستہ ناپا۔ یہ فرنچ ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ کیتھرائن خریداری کے لیے تیار نہیں تھی۔ تاہم میں نے اس کے لیے مشہور برانڈ کی نائٹی خرید لی۔

دوبارہ دریائے سین کے قریب سے گزرے اور جارڈن ڈے ٹولری (پیرس کا باغ)...... رات ہو چلی تھی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

رائس اور بن زیتی نے مطلوبہ آدمی کی عرفیت ''بیگ بوائے'' رکھ دی تھی۔ اشتہارات کا ردعمل صبح میں توقّے

''ٹپس'' کی شکل میں ان کا منتظر تھا۔ انہوں نے پیغامات کے تین حصے کیے۔ ٹھوس، ممکنہ اور فضول۔ ٹھوس پیغامات میں لیونارڈ۔ کارنس کا نام بھی شامل تھا۔ وہ اس کے پیغام تک پہنچے تو آخری فقرہ سن کر کوفت میں مبتلا ہوگئے۔ آخری فقرہ تھا۔ ''مزید یہ کہ وہ آرٹسٹ پورا فراڈ ہے۔''

دونوں نے کارنس کا پیغام ''فضول'' میں شامل کر دیا۔ ''بل شیٹ'' رائس بڑبڑایا۔ دونوں سراغ رساں سارا دن کالز کرتے رہے...... تمام کاوش رائیگاں گئی۔ انعام کے لالچ میں افراد نے لغو کہانیاں گھڑ رکھی تھیں۔ بالآخر انہوں نے ان پیغامات پر توجہ دی۔ جن پر انہوں نے ''فضول'' کا ٹھپا لگا دیا تھا۔ یہاں تک کہ کارنس کا نمبر آ گیا۔ جس نے جھٹ شکوہ کیا کہ اسے ٹپ دیے ہوئے ایک دن سے زیادہ ہو چکا ہے۔

''یہاں کثیر تعداد میں پیغامات آئے تھے۔'' رائس نے اسے تسلی دی۔ ''تم نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ یہ آدمی آرٹسٹ ہے؟''

''ہاں وہ خود کو آرٹسٹ سمجھتا ہے۔ اس کا کام غیر اہم...... یہی حقیقت ہے۔ لیکن یہاں ایک پروفیسر نے اس پر ہاتھ رکھا ہوا ہے......''

رائس بے دھیانی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ معاً اس کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ لفظ ''پارسن'' تھا۔ جسے سن کر وہ چونک اٹھا۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔

''مسٹر کارنس، پلیز سر بتائیے پارسن کہاں ہے؟''

''ویسٹ اسٹریٹ تیرہ۔'' جواب آیا۔

''ہُرّا'' اس کے دل نے کہا۔ ''بیگ بوائے نے گرینڈ سینٹرل سے جو ٹیکسی پکڑی تھی...... ویسٹ اسٹریٹ تیرہ وہاں سے محض ایک بلاک کے فاصلے پر تھی۔

''کیا نام ہے اس ناکارہ آرٹسٹ کا؟''

''عجلت سے کام مت لو...... پہلے انعام کی بات کرو۔''

انعام محض ایک کہانی تھی جس کے بغیر کوئی بھی ان کی اشتہاری مہم پر آنکھ، کان نہیں دھرتا۔

''انعام وہی ہے، جس کا اعلان کیا گیا تھا۔ پچیس ہزار ڈالرز۔ اور تمہارا نام پردۂ اخفا میں رہے گا۔''

رائس نے بن زیتی کو آنکھ ماری۔

''رقم سامنے رکھو، ساری معلومات فون پر لو گے؟''

کارنس بھی ایک کائیاں تھا۔

''اگر تم نام اور رہائش بتاؤ گے تو انعام کی رقم بڑھ بھی

سکتی ہے۔'' رائس نے مزید چارہ ڈالا۔
''مجھے این وائی پی ڈی کی قانونی دستاویز بھی درکار ہے جس کے مطابق میں اسے پکڑنے میں مدد کروں گا تو کتنی رقم مجھے دی جائے گی۔'' کارنس نے مطالبہ کیا۔
''تمہارا مطالبہ جائز ہے۔ ہم اپنا نمائندہ روانہ کرتے ہیں۔''
''اس کا نام؟''
''وہ لڑکی ہے، نام ہے ڈینکلو کرال۔''

☆☆☆

''میرا خیال غالب ہے کہ وہ خچر، بیگ بوائے کے بارے میں جانتا ہے۔'' رائس نے اظہارِ خیال کیا۔
''اس کا دیدار کر لیتے ہیں۔'' بن زیٹی تیار تھا۔
''نہیں، ہم نہیں جائیں گے۔ تم اس جرمن قتالہ کو بھول گئے...... جس نے گن تمہارے منہ میں ڈال دی تھی۔''
''اس وقت میں غافل تھا۔''
''ڈیئر وہ پروفیشنل ہے۔ اس کا معاوضہ بھی بلند ہے۔ دو پولیس کے آدمی ایسے ہی مار دے گی جیسے مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ ہم کارنس تک پہنچ گئے۔ آگے مسئلہ اس کا ہے، اسے کرنے دو۔''
''او کے۔'' بن زیٹی نے ہامی بھری۔ ''میری خواہش ہے کہ میں اسے دوبارہ نہ دیکھوں۔''
''ہاں، اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ میں بات کرتا ہوں۔'' رائس نے سیل فون نکال کر رابطہ قائم کیا۔
''ہم مطلوبہ آدمی تک پہنچ گئے ہیں۔''
''کون ہے وہ؟'' کرال نے اطلاع پر تحیّر کا اظہار کیا۔
''نہیں معلوم۔''
''کہاں رہتا ہے؟''
''نہیں معلوم۔''
''این وائی پی ڈی کی کارکردگی اچھی ہے۔'' کرال نے طنز کیا۔ ''میں دو دن سے اس کے اپارٹمنٹ کے آس پاس منڈلا رہی ہوں۔''
''سنو، میں اور میرا پارٹنر بھی زیادہ دور نہیں ہیں لیکن تم اس تک پہنچ گئی ہو تو ہمارا کام ختم۔ گڈ بائے۔'' رائس نے جان چھڑائی۔
''رکو...... وہ غائب ہے۔ تاہم جلد یا بدیر سامنے آئے گا۔''
''او کے۔ تم انتظار نہیں کر سکتی ہو تو میں ایک آدمی کا نام اور پتا دیتا ہوں۔ وہ جانتا ہے کہ ہیرے اٹھانے والے کو کہاں پکڑا جائے گا اور وہ کون ہے۔'' رائس نے کارنس کا نام اور پارسن کا پتا بتایا۔

☆☆☆

ایک بج کر تیس منٹ، دوپہر...... کرال، پارسن سے ہوتی ہوئی کارنس کے اپارٹمنٹ تک پہنچی۔ ایک منٹ سے قبل دروازہ کھلا۔ پینٹ اور ٹی شرٹ میں ایک پستہ قد آدمی کھڑا تھا۔ جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔
''تم ڈینکلو کرال ہو؟'' اس نے پہلا سوال کیا۔
وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی اور اپنے حلق کی طرف اشارہ کر کے سرگوشی کی۔ ''لیرنجائٹس (اس بیماری میں آواز کا باکس خراب ہو جاتا ہے)'' کامیاب اداکاری تھی۔
''سوری۔'' وہ بولا۔ ''تم جانتی ہو، کیا معاملہ ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں؟''
کرال نے مسکراتے ہوئے قدم اندر رکھا۔ ہر جانب دیواروں پر آرٹ کے نمونے تھے جو یقیناً کارنس کی کارکردگی تھی۔ اس نے رک کر آرٹ ورک میں دلچسپی ظاہر کی اور ایک ہاتھ کا انگوٹھا بلند کیا۔ ''بہت خوب۔'' وہی بیٹھی ہوئی آواز۔ کارنس کا سینہ پھول گیا...... کرال نے ''اشتہاری ملزم'' کی تصویر نکال کر اسے پکڑائی۔ کارنس کی نگاہ کرال کے بالائی دھڑ سے ہٹ گئی۔
''کاغذی کارروائی اور انعامی رقم کا بندوبست کر کے آئی ہو...... رائٹ؟''
''کیوں نہیں۔'' اس نے سحر طراز مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کا انداز توبہ شکن تھا۔ اسکرٹ کافی اوپر اٹھ گیا تھا۔ اس نے پیڈ اور پنسل نکالی۔
''یہ آدمی، اس کا نام میتھیو بینٹن ہے۔'' اس نے تصویر دیکھی۔ ''یہاں پارسن کی کلاس میں ہے۔ تم نے میرا کام دیکھ لیا۔ اس کا کام دیکھو گی تو آرٹ سے نفرت ہو جائے گی۔ اسے آرٹ کی سمجھ ہی نہیں ہے۔''
کرال نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس کی بات سمجھ رہی ہے۔ دل میں اس نے کارنس کے لیے ''ایڈیٹ'' کا لفظ استعمال کیا۔
''وہ یہاں ایک پروفیسر لڑکی کیتھرائن سن بورن سے عشق لڑا رہا ہے۔''
کرال کی پنسل چل رہی تھی۔ کیتھرائن کے نام کے آگے اس نے سوالیہ نشان لگا دیا۔ کارنس نے اٹھ کر ڈیسک

کی دراز سے ایک کتاب نکالی۔ ”یہ فیکلٹی ڈائریکٹری ہے جو طلبا کی دسترس سے باہر ہے۔ اصل ڈائریکٹری کی نقل ہے۔“ اس نے کیتھرائن کے کوائف والا صفحہ کھول کر دکھایا۔ کیتھرائن کے نام کے گرد کئی پنسل کے دائرے بنے ہوئے تھے۔

”مسٹر آرٹسٹ، نقل تمہارے پاس کیسے آئی؟ کیتھرائن میں تمہاری کیا دلچسپی ہے؟“ کرال نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ اس کی نظر کوائف پر تھی، پنسل متحرک تھی...... کیتھرائن کی رہائش گاہ، گھر کا فون، سیل فون اور ای میل...... اتنا کچھ کرال کے لیے کافی تھا۔

”تم دونوں سے بدظن ہو؟“ کرال نے صاف اور بلند آواز میں کہا۔

”بدظن مناسب لفظ نہیں ہے...... حقیقت کہو۔“ اچانک وہ چپ ہو گیا۔ ”ارے تمہاری آواز کیسے واپس آگئی؟“

”کرشمہ سمجھو۔“

وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ ”کیا تم جرمن ہو؟“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ کرال نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کراس بنایا۔ وہ گلوک نہ دیکھ سکا۔ اس کی گرسنہ نظریں کرال کے گھٹنوں سے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ گلوک نے اس کا آدھا سر اُڑا دیا۔

☆☆☆

کرال کو یہ معلوم کرنے میں وقت نہیں لگا کہ کیتھرائن کا اپارٹمنٹ بھی خالی ہے...... وہ پانچ منزلہ عمارت تھی۔ کیتھرائن نے فرنٹ ڈور پر تین ہیوی ڈیوٹی لاک لگائے تھے۔ کھڑکیوں پر ضرورت نہیں تھی...... کرال ایلیویٹر کے ذریعے سیدھی چھت پر گئی۔ وہاں سے دس فٹ نیچے جانے کی راہ تلاش کی اور کھڑکی کے ذریعے اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔

اپارٹمنٹ کی حالت ابتر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی طوفان گزرا ہو۔ ڈریسر کی درازیں کھلی پڑی تھیں۔ جابجا کپڑے بکھرے پڑے تھے...... بستر پر، فرش پر...... بظاہر کیتھرائن جلدی میں پیکنگ کر کے وہاں سے نکلی تھی۔ کرال اس قسم کے مناظر سے ناآشنا نہیں تھی۔ ٹارگٹ بھاگ نکلا تھا اور ساتھ میں اپنی گرل فرینڈ کو بھی لے گیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گئے ہوں گے؟

پہلا کلیو ڈائننگ روم ٹیبل پر ملا۔ تصاویر کے ساتھ چند پوسٹ کارڈز تھے۔ ایفل ٹاور کے علاوہ پیرس کے خاص خاص مقامات کی تصاویر تھیں۔ کرال نے کیتھرائن کا کمپیوٹر بوٹ اَپ کیا۔ پاس ورڈ موجود نہیں تھا۔ غالباً اس لیے کہ کمپیوٹر میں چرانے کے لیے کچھ نہیں تھا یا پھر کیتھرائن نے سوچا ہوگا کہ اپارٹمنٹ میں کون، کیونکر داخل ہو پائے گا۔ کرال نے ای میلز چیک کیں...... اس کی توجہ مبذول کرنے کے لیے تازہ پیغام کافی تھا۔

کیٹ،

یقین نہیں آتا، تم اور میتھیو اچانک پیرس جارہے ہو۔ اور تم جوان ہو گئی ہو۔ ہمیں فلائٹ نمبر بھیجو اور ہوٹل کا نام بھی۔ مجھے پروا نہیں ہے تم دونوں کیا کررہے ہو...... بڑے ہو گئے ہو۔ لیکن ماں کو مطلع کرو۔

پیار

مام اور ڈیڈ

کرال نے جوابی میل میں فلائٹ کی تفصیل دیکھی۔ لیکن ہوٹل کا نام نہیں تھا۔ کیتھرائن نے لکھا تھا کہ وہ پیرس پہنچ کر بتائے گی...... کرال نے کمپیوٹر بند کیا اور ایجنسی کو کال کی۔

”تم نے میرے لیے میتھیو بیٹن کو تلاش کیا تھا۔ وہ پیرس چلا گیا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ کیتھرائن سن بورن بھی اس کے ہمراہ ہے۔ انہوں نے ایک دن قبل ”اورلی“ پر لینڈ کیا ہوگا۔ تصدیق کر کے بتاؤ۔“

”لائن پر رہو۔“ ایجنسی نے جواب دیا۔ ایک منٹ کے اندر اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”ہاں وہ ائرپورٹ سے کلیئر کر گئے تھے۔ وہ طالب علم ہے۔ کیا سرخ جھنڈا لگا دیا جائے؟“

”نہیں، وہ دہشت گرد نہیں ہیں۔ چھوٹا مسئلہ ہے۔ میں نمٹ لوں گی۔ وہ کہاں ٹھہرے ہیں؟“

”بک سینٹ جرمین۔“

☆☆☆

کرال نے شکم سیری اپارٹمنٹ میں ہی کی۔ فریج میں کافی کچھ تھا۔ اس نے مائیکرو ویو استعمال کیا۔ وائن بھی دستیاب تھی۔ بعدازاں اس نے شگوف کا نمبر ملایا۔

”تمہارے ہیروں کا سراغ مل گیا ہے۔ میں جانتی ہوں ہیرے کہاں ہیں؟“

”کون؟ کہاں؟“ شگوف نے اضطراب مخفی رکھنے کی سعی نہیں کی تھی۔

”اس کا نام میتھیو بیٹن ہے۔ ہیرے اس کے پاس ہیں اور وہ خود اس وقت پیرس میں ہے۔“

”پیرس؟“

''ہاں، وہ اور اس کی گرل فرینڈ بھاگ نکلے ہیں۔ حالانکہ جرمنی میں سیاحوں کے لیے بہت مقامات ہیں۔ وہاں بھی جاسکتے تھے۔''

''تمہارے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔'' شگوف نے کہا۔

''ہاں، میں آج رات ہی نکل رہی ہوں۔''

''فلائی کوچ؟''

''کرال کوچ میں سفر نہیں کرتی۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''

''لیکن ایسے ہوٹل میں نہ رکنا جہاں ایک رات کے ہزار ڈالرز بن جاتے ہیں۔''

''آرام سے رہو۔ جہاں ملینز داؤ پر لگے ہوں۔ وہاں چند ڈالرز کے لیے مرے جارہے ہو...... میں اسی ہوٹل میں جاؤں گی جہاں وہ دونوں ہیں......''

''ہوٹل کا نام تو بتادو؟''

''کیوں؟ کیا میرے کمرے میں شیمپین بھجواؤ گے یا اپنے دوست گھوسٹ کو اطلاع فراہم کرو گے؟''

''تم غلط سوچ رہی ہو۔ ہماری ڈیل میں یہ چیز شامل ہے کہ گھوسٹ کو تم ختم کروگی۔''

''لیکن اطلاعات ''لیک'' ہوجاتی ہیں۔ زیادہ باتیں بتاؤں گی تو گھوسٹ تک پہنچ جائیں گی...... قطع نظر اس کے، کہاں سے پہنچتی ہیں۔ یوں بل اس کے کہ میں اس تک پہنچوں وہ مجھے تلاش کرلے گا۔ میں تمہیں پیرس سے کال کروں گی۔'' کرال نے رابطہ منقطع کردیا۔

اِدھر کرال اپارٹمنٹ سے نکلی۔ اُدھر شگوف نے گھوسٹ کو کال کی۔ ''تم جس آدمی کو ڈھونڈ رہے ہو اس کا نام میتھیو بیتن ہے۔ وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ پیرس میں موجود ہے۔ ان کا ہوٹل ''کارلیئر سان جرمین ڈیپرے'' میں کہیں ہے۔ کیا تم تلاش کرلو گے؟''

''ہاں۔'' مختصر جواب آیا۔

''مجھے یقین ہے تم کرلو گے۔'' شگوف نے کہا اور فون بند کردیا۔

میتھیو کے گرد پھندا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ دو نامور پیشہ ور قاتل اُس کے پیچھے تھے۔ گویا دو بدروحوں کا آپس میں تصادم تھا۔ ہیرے ملتے ہی شگوف بخوشی کرال کو ادائیگی کے لیے تیار تھا۔ اگر وہ گھوسٹ کا خاتمہ کردیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا۔ آئیڈیل صورتِ حال ہوگی اگر دونوں کے ٹاکرے کا نتیجہ ایک دوسرے کے خاتمے پر منتج ہو۔

☆☆☆

میں کمرے میں واپس آیا تو وہ بیڈ پر بیٹھی تھی۔

''بونجور۔ (ہیلو)۔'' میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''خود کو بونجور کہو...... سویرے سویرے کہاں سے آرہے ہو؟''

''میں چھ بجے اٹھ کر واک کے لیے نکل گیا تھا۔ واپسی میں کافی پی۔ پھر ہوٹل کے اسسٹنٹ سے طویل بات چیت کی۔'' میں نے بتایا۔

''طویل بات چیت؟''

''ڈنر، ہنی...... ڈنر۔ اس نے ڈنر کے لیے ریسٹورنٹ منتخب کیا اور ریزرویشن کرادی۔''

''کیسا ریسٹورنٹ؟''

''این ٹیکو مارٹینی۔''

''یہ تو اٹالین نام لگتا ہے۔''

''ظاہر ہے۔ وینس میں ہے۔''

''وینس؟ اٹلی؟ ڈنر کے لیے ہم وینس جائیں گے...... لیکن...... لیکن......'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔ ''ڈنر یہاں بھی ہوسکتا ہے۔''

''میں کچھ ایڈونچر پسند ہورہا ہوں۔''

''ناقابلِ یقین۔'' کیتھرائن نے تکیہ اٹھا کر دے مارا۔

''تم ساری زندگی، بطور غریب آرٹس کے جدوجہد کرنا چاہتے ہو...... کون پروا کرتا ہے۔''

''مجھے پروا ہے۔'' میں نے تکیہ واپس اس کی طرف پھینکا۔

کیتھرائن نے تکیہ سینے سے لگالیا۔ ''آئی لو یو۔''

''مجھ سے کہہ رہی ہو یا تکیے سے؟''

اس نے جواباً وہی فقرہ دہرایا۔ ''آئی لو یُو۔''

☆☆☆

ڈیلٹا فلائٹ نے سات بجے جے ایف کے (جان ایف کینیڈی انٹرنیشنل ائرپورٹ) سے پرواز کی۔ کرال کے پاس چھوٹا سا بریف کیس تھا۔ وہ اگلی صبح پونے نو بجے چارلس ڈیگال ائرپورٹ پر اتری۔ کسٹم سے فارغ ہوکر وہ قریبی لیڈیز روم میں چلی گئی۔ ڈور لاک کرکے بیگ کھولا۔ بیگ کے اندر سیاہ کیسنگ میں ہیئر ڈرائیر موجود تھا جو دراصل ڈرائیر نہیں تھا۔ یہ اس نے خاص طور پر ہالینڈ کے کاریگر سے بنوایا تھا۔ پیپر کلپ کی مدد سے کرال نے ڈرائیر کے زیریں حصے میں بٹن پش کیا۔ ڈرائیر کا دہانہ کھل گیا۔ اندر گلوک

ٹکڑوں کی شکل میں رکھا تھا۔ ہر ٹکڑے کو اسٹیل لاک نے پکڑا ہوا تھا۔ کرال نے تین منٹ میں گن اسمبل کرلی......

چالیس منٹ بعد وہ ہوٹل بک سینٹ جرمین میں وارد ہوئی۔ فرنٹ ڈیسک پر موجود عورت ایک مہمان سے بات کررہی تھی۔ اسے فارغ کر کے وہ کرال کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بونجور میڈم، کیا خدمت کرسکتی ہوں؟'' وہ بولی۔

''ایک کمرا۔'' کرال نے کہا۔ ''ترجیحاً اسی فلور پر جہاں میرے دوست میتھیو بیشن اور کیتھرائن سن بورن ٹھہرے ہیں۔''

اس نے کمپیوٹر کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں......

''مجھے افسوس ہے، آپ کو آنے میں تھوڑی تاخیر ہو گئی۔''

''کہاں ہیں وہ؟ کب تک آئیں گے؟''

''واپسی متوقع نہیں ہے۔ وہ چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔''

''کمال ہے۔'' کرال نے پُرسکون انداز میں اظہارِ حیرت کیا۔ تاہم اندر سے وہ کھول رہی تھی۔ ''میری ملاقات ضروری ہے...... کیا انہوں نے اگلی منزل کے بارے میں پیغام چھوڑا ہے؟''

''نہیں، لیکن میں نے آپ کے دوست کو اسسٹنٹ سے بات کرتے دیکھا تھا۔ وہ شاید آپ کی مدد کرسکتا ہے۔''

اسسٹنٹ کے بارے میں معلومات لے کر وہ اس تک پہنچی۔ وہ چھریرے بدن کا دراز قامت شخص تھا اور اس وقت کسی جاپانی جوڑے کے ساتھ مصروف تھا۔ چند منٹ بعد اس نے کرال سے معذرت کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس کا نام لورینٹ تھا۔

کرال نے جھک کر کہنیاں ڈیسک پر ٹکا دیں۔ ڈھیلا گریبان کچھ اور کھل گیا۔ لیکن لورینٹ نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''مجھے اپنے دوستوں سے ملنا تھا۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ فرنٹ ڈیسک کے مطابق وہ جا چکے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ وہ کہاں چلے گئے؟''

''اکثر و بیشتر ایسا ہو جاتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ان کے نام بتائیے۔''

کرال نے نام بتائے۔ لورینٹ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ''مجھے افسوس ہے۔ آپ کے دوستوں نے اگلی منزل کا ذکر نہیں کیا۔'' کرال کی تیز نگاہ نے بہ آسانی پڑھ لیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ سوال تھا، وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟

''لورینٹ۔'' کرال نے میٹھی آواز میں کہا۔ ''بلاشبہ تم جانتے ہو، وہ کہاں گئے ہیں۔ یہ رکھو۔ تمہاری یادداشت بہتر ہوجائے گی۔'' اس نے پچاس یورو ڈیسک پر رکھے۔

لورینٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''مجھے معلوم ہے یا نہیں، یہ ایک غیر متعلقہ امر ہے۔ سوال مہمانوں کی پرائیوسی کا ہے۔ اگر میرے علم میں ہوتا تب بھی میں ہوٹل کی پالیسی کے خلاف کیسے جاسکتا ہوں۔''

کرال مزید جھک گئی۔ ''تم مجھے بتا سکتے ہو۔'' اس نے چمکارا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ اس طرح تم میرے اوپر کتنا بڑا احسان کرو گے۔''

وہ بھی کچھ جھکا۔ ''ماموزیل۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''میں کسی صورت میں......'' اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

کرال نے اس کی انگلی سختی کے ساتھ پکڑ لی۔ ''تمہیں میرا حُسن پسند نہیں آیا، یورو بھی تمہارے لیے پُرکشش نہیں ہیں...... انگلیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

لورینٹ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کک...... کیا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے۔'' اس نے گرفت مضبوط کی اور انگوٹھا جوڑ پر رکھ دیا۔ ''تمہیں اپنی انگلیوں کی کتنی فکر ہے؟''

وہ شکنجے جیسی پکڑ پر حواس باختہ تھا۔

''عجیب بات ہے۔ تم دھمکی نہیں دے سکتی ہو۔ یہ......''

کرال نے جھٹکا دے کر جوڑ سے انگلی توڑ دی۔ چٹخ کی آواز کے ساتھ اذیت بھری چیخ بلند ہوئی۔ کرال کی فنکاری تھی کہ وہ بھی ساتھ ہی چلائی اور پھر ہسٹریائی انداز میں ہنسنے لگی۔ فرنٹ ڈیسک والی فون پر بات کررہی تھی۔ دونوں کی چیخ نے عجیب تاثر دیا۔ وہ بمشکل کچھ مڑی۔

کرال نے ہاتھ چھوڑا نہیں تھا۔ ''نو باقی ہیں پھر پوچھ رہی ہوں کہ اپنی انگلیوں کی کتنی قدر کرتے ہو؟''

یہ صورتِ حال لورینٹ کے سان گمان میں نہ تھی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ ''وہ وینس کی فلائٹ تھی...... آج رات آٹھ بجے...... این ٹیکو مارٹینی میں ڈنر......''

''یہ ریسٹورنٹ کون سے ہوٹل میں ہے؟''

''ڈانیلی۔''

''ایک سوال اور......'' کرال پھنکاری۔ ''تم جھوٹ

کیوں بول رہے تھے؟''

''اس نے مجھے ایک سو یورو دیے تھے کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں۔''

وہ معمولی اسٹوڈنٹ کیا ہوشیاری کر رہا ہے...... کرال نے سوچا۔ چوہے بلی کے کھیل میں اسے مزہ آرہا تھا۔ اس نے لورینٹ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ لورینٹ نے جھٹ ہاتھ بغل میں دبایا۔ چہرے پر کرب کے تاثرات عیاں تھے۔ کرال نے یورو اٹھائے اور دھیمی چال کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

نیویارک میں صبح تڑکے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا۔ جب شکوف کے فون نے بولنا شروع کیا۔ شکوف نے کال وصول کی۔ آواز نسوانی تھی اور لہجہ جرمن......

''وہ میری نظروں میں ہے۔''

''کہاں ہو تم؟''

''چارلس ڈیگال ائرپورٹ کی طرف جارہی ہوں۔''

''ائرپورٹ کی طرف؟ یا ائرپورٹ سے شہر کی طرف؟''

''شہر دیکھ لیا۔ وہ ہوٹل چھوڑ چکا ہے۔''

''ہوٹل چھوڑ دیا۔ کہاں گیا؟''

''وینس کے ہوٹل ڈانیلی۔''

''ڈانیلی۔'' شکوف کراہ اٹھا۔ ''تمہیں اس کے کرائے کا اندازہ ہے؟''

''اسے پروا نہیں ہوگی۔ وہ تمہارا مال خرچ کر رہا ہے۔''

شکوف بھنا اٹھا۔ ''وہ فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ پانچ گولیاں اس کے سر میں ٹھونک دینا۔'' شکوف نے انہیلر دبوچا۔

''اتنا بڑا سر نہیں ہے اس کا۔ میرے گلوک کی ایک گولی کم از کم اس کا آدھا سر اڑا دے گی۔ باقی چار گولیاں کہاں ماروں گی؟''

''باقی چار اس کی تشریف میں...... لیکن پہلے ہیرے وصول کر لینا۔''

''وہ پیرس میں چوبیس گھنٹے رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہیرے فروخت کردیے ہوں۔''

''نہیں......'' شکوف چلایا۔ ''کوئی احمق پیرس میں یہ حرکت نہیں کرسکتا...... نہ وینس میں۔ وہ اینٹ ورپ یا ایمسٹرڈیم جائے گا۔ تل ابیب بھی جاسکتا ہے۔''

''کہیں نہیں جاسکتا۔ میرا وعدہ ہے...... وینس اس کا فائنل اسٹاپ بننے والا ہے۔ وعدہ رہا۔''

☆☆☆

شکوف باتھ روم کے فرش پر نیم گرم شاور کے نیچے کھڑا تھا۔ گرم پانی کی بھاپ نے جیسے باتھ روم میں دھواں بھر دیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دس منٹ بعد باہر نکل کر اس نے واڈکا کی بوتل پکڑ لی...... گھوسٹ کا نمبر ملایا۔ ''تمہاری ٹانگیں اب تک پیرس میں پھنسی ہیں کیا؟''

''نہیں۔'' گھوسٹ نے جواب دیا۔ ''میری ٹانگیں یہاں وینس میں سوئمنگ پول کے اندر ہیں۔ ہوٹل ڈانیلی میں۔''

شکوف پر سناٹا طاری ہوگیا۔ چند لمحے بعد وہ بولا۔ ''وینس میں؟ ہوٹل؟ ہوٹل ڈانیلی؟ تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ وہ وینس میں ہے؟''

''میرا معاوضہ یوں ہی سب سے بلند نہیں ہے۔'' گھوسٹ نے جواب دیا۔ ''بہتر سوال یہ ہے کہ تمہیں کیونکر پتا چلا۔ خواب آیا تھا...... نیویارک میں اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ کس نے تمہیں کال کی؟''

شکوف نے واڈکا کا گھونٹ لیا۔ منصوبے کی تحریک کا وقت آ گیا تھا۔ ''کیا تم مارٹا کرال کو جانتے ہو؟''

''محض ساکھ کے حوالے سے...... وہ کوڑھ مغز اور ست ہے لیکن اس کے حسن میں کلام نہیں۔ اسی وجہ سے وہ تم جیسے افراد سے کام کے لیے موٹی رقم وصول کرلیتی ہے۔ اس کے بعد اکثر کام خراب کردیتی ہے۔'' گھوسٹ کا جواب آیا۔

شکوف ہنسنے لگا۔ گھوسٹ بھی دوسروں کے مانند نکلا۔ اسے مقابلہ پسند نہیں تھا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید تمہیں اس کے لیے ڈرنک خریدنا پڑے۔ جب وہ ہیرے وصول کرکے بیٹن کو ذبح کرے گی۔''

''یعنی میرے ساتھ ڈیل ختم ہے؟''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ دو ایک سے بہتر ہیں لیکن یاد رکھو ادائیگی صرف ایک ہی وصول کرپائے گا۔''

☆☆☆

گھوسٹ نے شکوف سے بات ختم کرکے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر شے جدید۔ قیمتی اور شاندار تھی۔ ساتھ ہی بیالیس انچ کا چپٹا ایل سی ڈی ٹیلی ویژن۔ ہائی اسپیڈ انٹرنیٹ اور آرام دہ جیکوزی (یا جکوزی) Jacuzzi۔

ڈانیلی گراں کرایہ وصول کرنے کا حق دار تھا۔ بل کے معاملے میں شکوف کی جیب ہی ہلکی ہوتی تھی...... اب یہ

انکشاف ہوا تھا کہ بیک اَپ کے لیے اس نے کرال کو ہائر کیا ہوا تھا۔

کرال۔ وہ جانتا تھا۔ شگوف سے اس نے جو کہا، وہ محض ایک دھوکا تھا۔ گھوسٹ آگاہ تھا کہ کونٹریکٹ کلنگ، کرال کے لیے پیشے سے بڑھ کر تھی۔ اس کا شوق اور جنون تھا۔ وہ باہر سے کچھ اور تھی...... اندر زہر ہی زہر تھا۔ وہ اپنے پیشے کی اس اعتبار سے کوئین تھی کہ شکار یا ٹارگٹ کو تڑپا تڑپا کر مارتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ڈی ای اے ایجنٹ کو ختم کرنے میں تین دن لگائے۔ اس دوران مختلف اوقات میں اس نے اٹھارہ گولیاں خرچ کیں۔ کوئی گولی سینے اور سر میں نہیں ماری...... ایجنٹ جریانِ خون اور شاک کے باعث ہلاک ہوا۔ کئی مرتبہ کرال نے اس کی مرہم پٹی بھی کی۔ ایسی کئی مثالیں تنوع کے ساتھ اس کے ریکارڈ میں شامل تھیں۔

گھوسٹ کھڑا ہوگیا۔ کھڑکی سے اس نے باہر کا نظارہ کیا۔ مناظر کی خوب صورتی حد سے سوا تھی۔ یہ پانی کا شہر تھا۔ اس کی ثقافت جداگانہ تھی۔ دنیا کے کسی اور شہر سے اس کا موازنہ دشوار مرحلہ تھا۔ وہ خواہش ہی کرسکتا تھا کہ زیادہ دیر تک وہاں رک سکے......

کنگ سائز بیڈ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کرال کی سوچ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا منصوبہ ہوگا؟ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ وہ کس طرح مدِمقابل سے ایک قدم آگے رہ سکتا ہے؟ اس کے نزدیک شگوف بھی مشکوک تھا۔

☆☆☆

دفعتاً کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ اس کے حرکت کرنے سے قبل ایک عورت درانہ وار داخل ہوئی...... اگلے لمحے وہ اچھل کر بیڈ پر اس کے اوپر تھی۔

''جیسس، کیتھرائن تم نے مجھے ڈرا دیا۔'' اس نے کیتھرائن کو بانہوں میں لے لیا۔

''میں تمہارے سیل پر کوشش کررہی تھی۔ تم کس سے بات کررہے تھے؟''

''این ٹیکو مارٹینی...... میں ڈنر کنفرم کررہا تھا۔ یہ ایکسٹرا اسپیشل ہوگا۔''

''تم سے زیادہ اسپیشل کچھ نہیں ہے۔ مجھے کوئی تعجب محسوس نہیں ہوگا اگر عورتیں تمہارے گرد منڈلانے لگیں...... بائی دا وے تم اب تک بچے کیسے رہے، اتنے پارسا ہو کیا؟''

''تمہارا دامِ الفت میرے لیے کافی سے زیادہ ہے۔''

''تم ٹھیک تو ہو؟ کچھ مضطرب لگ رہے ہو؟''

''سویٹی، میں ٹھیک ہوں۔ سیاحت کے تیز رفتار ایڈونچر نے کچھ تھکاوٹ پیدا کردی ہے۔''

''میں سمجھی تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے...... تھکاوٹ دور کروں؟''

''اور تھکا دوگی۔''

''ڈارلنگ، تم کہاں تھکتے ہو......''

''اگر تم نے کبھی نظر پھیری تو تھک جاؤں گا۔''

کیتھرائن نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''چپ، آگے کچھ نہ کہنا۔''

☆☆☆

میں قسم کھاتا ہوں کہ میری داستان عجیب تر لیکن سچ ہے۔ میں کئی برس میرینز میں رہا۔ وہاں سے نکلا تو آرٹ اسٹوڈنٹ بن گیا اور پھر پارسن میں کیتھرائن...... فتنہ گر... کی زلف برہم کے پیچ و خم میں گرفتار ہوگیا۔ چند حقائق میں نے افشا نہیں کیے تھے۔ میں بے آواز خود سے بات کررہا تھا۔

میں ایک پیشہ ور قاتل ہوں۔

یہ ایسے ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ میرے والد میرین میں تھے اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کے نقشِ قدم پر چلوں گا اور میں نے کیا۔ میرین میں چار سال گزارے۔ ایک رات میرے والد مجھے ریسٹورنٹ لے گئے۔ انہیں میرے بدلتے ارادوں کا علم ہوگیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ میرے شوق (آرٹ) کے خلاف ہیں اور بات کرنا چاہتے ہیں۔

ان کا پہلا سوال تھا۔ ''چار سال میں تم نے کیا سیکھا؟''

''اس سے زیادہ کچھ نہیں جو آپ پہلے ہی بتا اور سکھا چکے تھے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہوشیار مت بنو۔ میں سنجیدہ ہوں۔'' انہوں نے سوال دہرایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی کوئی انتہائی سنجیدہ بات ہے۔ تاہم میں لاعلم تھا کہ گفتگو کیا رخ اختیار کرے گی۔

''میں نے طاقت اور برداشت کی انتہائی حد کے بارے میں سیکھا۔'' میں نے بتانا شروع کیا۔ ''وفاداری، بہادری، دوستی، فنِ حرب......''

والد صاحب نے مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی۔

''اس کے علاوہ؟''

"میں نے سیکھا کہ دشمنوں کے مقابل اور بدترین حالات میں کیسے زندہ رہا جاتا ہے۔"

"اس کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"کافی کچھ...... لیکن مقابل کو ہلاک کرنا اولین نکات میں سے ہے...... میں نے ایسا کیا لیکن ملک کے مفاد میں۔ کیا اسے ہنر کہہ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔" انہوں نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا۔ ہم اس وقت "بچ کس" کے نارتھ فورک ڈائنر میں بیٹھے تھے جو ایک چھوٹا بار ہے۔ ہماری میز کونے میں تھی۔ یہ جگہ کولوراڈو میں تھی۔

"میں تمہیں کچھ بتانے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔" والد صاحب نے کہا۔

میں نے پھیپھڑوں میں اکڑن محسوس کی۔ کون سی بات ہے جو انہوں نے اب تک مجھے نہیں بتائی؟

"تم آگاہ ہو کہ میں ایک کارپوریٹ ہیڈکوارٹر سے دوسرے، تیسرے...... بطور کنسلٹنٹ ملک اور دنیا بھر کا سفر کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کنسلٹنٹ نہیں ہوں۔ میں افراد کو ہلاک کرتا ہوں۔ میٹ۔ بُرے آدمیوں کو...... بنیادی بات یہ ہے کہ میں کلر ہوں۔" والد نے حقیقت سے پردہ ہٹایا۔

میں شاک میں تھا۔ کانوں میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔

"مرڈر؟" میں نے کہا۔ "رقم کے لیے؟"

"مرڈر انسان کا ہوتا ہے۔ میں ناسوروں کا آپریشن کرتا ہوں۔ ان میں سے بیشتر خود قاتل ہوتے ہیں اور بعض ایسے جو قاتلوں کی خدمات دوسروں کو قتل کرنے کے لیے خریدتے ہیں۔ یہ لوگ موت بانٹنے والے درحقیقت خود موت کے حق دار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکون کی نیند سوتا ہوں۔ کیا تم ایسے نہیں سوتے؟"

"سوتا ہوں۔ لیکن میں نے جن کو مارا، وہ جنگ تھی۔ ملک کے لیے۔ ایک فوجی میں اور قاتل میں فرق ہوتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے آپ کی طرح کرنا چاہیے؟"

"کرنا نہیں چاہیے...... تم کر سکتے ہو۔ یہ ایک آپشن ہے۔ میں نے تمہارا سروس ریکارڈ دیکھا ہے۔ شوٹنگ میڈلز دیکھے ہیں۔ متاثر کن ریکارڈ ہے۔ بُرا آدمی بُرا ہے۔ تم اسے جنگ میں ہلاک کرو یا میری طرح......"

میں نے اس منطق سے اتفاق نہیں کیا لیکن والد نے میرے دماغ میں بیج بو دیا تھا۔ کولوراڈو میں بوئے گئے اس بیج سے چند ماہ بعد کونپل پھوٹی...... اور میں نے پہلا کونٹریکٹ پکڑا۔ میں پہلے بھی والد کے نقشِ قدم پر گیا تھا اور اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں والد کا سایہ یا بھوت ہوں۔ لہٰذا میں نے عرفیت گھوسٹ منتخب کر لی۔

مجھے اپنا آخری سوال یاد تھا۔ میں نے والد سے پوچھا تھا۔ "کیا ماں کو معلوم ہے؟"

"میں نے پہلے ان کو نہیں بتایا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ کسی دن مجھے بتانا پڑے گا۔ کیونکہ جس سے تم محبت کرتے ہو اس کے ساتھ جھوٹی زندگی نہیں گزار سکتے۔ علم ہونے پر تمہاری ماں علیحدگی اختیار کر سکتی تھی۔ وہ مجھے منع کر سکتی تھی کہ میں خونی پیشے سے الگ ہو جاؤں لیکن مجھے بتانا تھا۔ میں نے بتایا اور انہوں نے معمولی احتجاج کے بعد میرا ساتھ دیا۔ انہوں نے میری منطق تسلیم کر لی۔ یہ بھی سمجھ گئیں کہ جان کا خطرہ جنگ میں بھی ہوتا ہے۔"

اب میری باری تھی کہ میں کیتھرائن کو شریکِ راز کر لوں...... دروازہ لاک کر کے کلوزٹ سے میں نے بیگ نکالا اور کیتھرائن کو آواز دی۔

☆☆☆

ہم دونوں ساتھ ساتھ بیڈ پر بیٹھے تھے۔ "تمہیں کچھ بتانا ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے بیگ کی جانب دیکھا۔

"ڈاکٹر میتھیو کا جادوئی بیگ۔ آرٹ چھوڑ کر میڈیکل میں جا رہے ہو؟"

"نہیں، کچھ اور بتانا ہے۔"

"چلو بتاؤ...... ہچکچا کیوں رہے ہو؟"

"ہیروں والی بات یاد ہے؟"

"ہاں، کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"لیکن تم نے یقین نہیں کیا تھا۔"

اس نے آنکھیں گھمائیں۔ ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے ٹکایا اور آہستہ سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ وہ بغور میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے بیگ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر کے ہیرے نکال کر بیڈ پر ڈال دیے۔ کیتھرائن کے تاثرات ناقابلِ بیان تھے۔ وہ خاموش بھی تھی۔ جگمگ کرتے ہیروں کی ایک اور مٹھی بھر کے نکالی۔ بالآخر اس نے زبان کھولی۔ "میتھیو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن محبت اندھی اور احمقانہ نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری کہانی مضحکہ خیز ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ تم نے اچانک سیاحت کا پروگرام کیوں بنایا اور اسے کیسے افورڈ کر رہے ہو لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم

نے ہمیشہ کی طرح مجھے سچ بتایا۔''
''سیاحت سے قبل میں نے تمھیں ''چمک دمک'' کا اشارہ دیا تھا۔ وہ یہی تھا۔ دیکھو کیا بات ہے...... جگمگ جگمگ......''
وہ چیخ اٹھی۔ ''اوہ مائی گاڈ!''
میں نے بیگ پوری طرح کھول دیا۔ اس نے بیگ میں جھانکا اور اچھل پڑی۔ بیڈ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ''مائی گاڈ'' کے الفاظ تسلسل کے ساتھ سنائی دے رہے تھے۔
''کیا یہ اصلی ہیں؟''
''ہمارے پیار کے مانند۔'' میں نے جواب دیا۔
''قیمت؟ ملین، بلین...... اوہ مائی گاڈ۔ یہ سب تمہارے ہیں؟''
''میرے نہیں ہمارے۔ نئی زندگی کی چابی۔'' پھر میں نے اختصار کے ساتھ گرینڈ سینٹرل کے دھماکوں اور مرتے ہوئے آدمی کے بارے میں بتایا...... کھلا ہوا لاکر اور ہیروں کا بیگ......
''اب تم کیا کرو گے؟''
''فروخت کردوں گا۔ اندازہ ہے کہ سات سے دس ملین کی رقم اکاؤنٹ میں آجائے گی۔''
''لیکن وہ آدمی؟ اس کے بیوی بچے ہوں گے...... میتھیو میری سمجھ میں نہیں آرہا......''
''مجھ پر بھروسا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''والٹر نام تھا اس کا۔ کوئی بیوی تھی، نہ کوئی بچہ...... نہ کوئی رشتے دار۔''
مکمل سچائی بتانے کا وقت آن پہنچا تھا۔ ''کیتھرائن۔'' میں نے کہا۔ ''ایک سچ باقی ہے۔ میرے اپنے بارے میں۔ والٹر جس کے پاس ہیروں کا بیگ تھا...... میں ہی تھا جس نے......''
دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا۔ وہ آگئی تھی۔ کرال دہلیز پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں مہلک گن تھی۔ گن کا رخ میری طرف، پھر کیتھرائن کی جانب...... اور دوبارہ میں اس کے نشانے پر آگیا۔
''کہاں سے شروع کروں؟'' وہ بولی۔

☆☆☆

''مسٹر بیتھن۔'' اس نے کلام کا آغاز کیا۔ اس کے منہ سے میرا نام سن کر کیتھرائن کا منہ کھل گیا۔ دوسری وجہ گن تھی جس نے کیتھرائن کو بدحواس کر دیا تھا۔ ''کون ہے یہ عورت؟ تمھیں کیسے جانتی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟'' اس نے بیک وقت تین سوال کیے۔ جواب کرال نے دیا۔

''جو میں چاہتی ہوں، وہ بیڈ پر موجود ہے...... اور یقیناً باقی ہیرے بیگ میں ہوں گے...... مس سن بورن۔''
کیتھرائن اپنا نام سن کر لرز اٹھی۔ اس نے سرگوشی کی۔
''میتھیو، ہیرے اس کے حوالے کردو۔''
''گڈ، تم جوانی میں مرنا نہیں چاہتی ہو۔ تمہاری بات پسند آئی۔''
اگر کرال کے علم میں ہوتا کہ وہ گھوسٹ کے سامنے ہے تو دروازہ کھلتے ہی اگلے لمحے میں، میرا قصہ تمام کر دیتی۔ اپنے تئیں ہیرے اسے مل گئے تھے...... شگوف کے ہیرے۔ جس کے لیے وہ آئی تھی لیکن وہ محض ایک قاتل نہیں تھی۔ اذیت پسند تھی۔ اس کے لیے میں ایک آرٹ اسٹوڈنٹ تھا۔ میں نے اسے کافی دوڑایا تھا۔ سر میں گولی مار کر اسے تسلی نہیں ہوتی۔ وہ تڑپا کر مارے گی۔ وقت لے گی...... کھیلے گی۔
''ہاں تو مسٹر بیتھن۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''تم تمام لیڈی پروفیسرز کے ساتھ سوتے رہے ہو یا صرف حسیناؤں کے ساتھ؟'' پھر اس نے کیتھرائن کو مخاطب کیا۔ ''تمہارے افیئر کا اختتام موت پر ہوگا۔''
باتیں کر کے وہ فاش غلطی کر رہی تھی۔ مجھے چند سیکنڈ مل گئے تھے۔ میں نے کیتھرائن کو فرش کی طرف دھکا دیا اور میڈیکل بیگ اٹھا کر کرال پر پھینکا۔ اسے توقع نہیں تھی۔ تاہم وہ اناڑی نہیں تھی۔ کرال نے پھرتی سے فائر کیا۔ چند انچ کے فرق سے میں بچ گیا۔ ہر طرف ہیرے بکھر گئے۔ اس کی توجہ بٹنے سے مجھے ایک دو سیکنڈ ملے۔ میں سانڈ کے مانند اس سے ٹکرایا۔ گولی دوبارہ چلی، جس نے ایل سی ڈی ٹی وی کو اڑا دیا۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم دونوں گرے۔ میں نے کروٹ لی۔ تاہم جست لگا کے اس نے مجھے چھاپ لیا۔ میرے چہرے پر وہ مردوں کی طرح گھونسے برسا رہی تھی۔ گھونسوں کے ساتھ اس کی کہنیاں بھی چل رہی تھیں۔ میں نے ان برستی ضربوں میں راستہ بناتے ہوئے سر کی ٹکر اس کی ستواں ناک پر رسید کی۔ وہ بلبلا کر پسپا ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ میں بھی اچھل کر قدموں پر آیا۔ رُوبرو...... دُوبدو...... آمنے سامنے...... ہتھیار کے بغیر۔ میں نے دائیں ہاتھ کا بھرپور گھونسا اس کے رخ روشن پر جمایا۔ اس نے جھک کر خود کو بچایا۔ میں تیار تھا۔ نیچے سے میں نے لیفٹ ہک روانہ کیا۔ وہ کراہتی ہوئی سیدھی ہوئی۔ جسم کا پورا وزن استعمال کرتے ہوئے میں نے چارج کیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ دیوار سے ٹکرائے گی مگر ہوا اس کے برخلاف...... اس کے عقب میں خوب صورت سجاوٹ والی بڑی سی کھڑکی تھی۔ شیشہ اور اس کی آرائش بکھر گئی۔ وہ ہاتھ لہراتی ہوئی باہر گری۔ میں نے آسمان کی جھلک دیکھی۔ کوئی اور مقام ہوتا تو وہ نیچے گر کے راہیِ ملکِ عدم ہو جاتی۔ لیکن ہم وینس میں...... پانی کا شہر۔ وہاں کوئی سڑک نہیں تھی۔ وہ پانی میں گری۔ میں نے لپک کر اس کی گن اٹھائی اور نیچے جھانکا۔ وہ پندرہ سیکنڈ بعد ابھری۔ میں گولی چلا سکتا تھا۔ تاہم میں نے ایسا نہیں کیا۔

کیتھرائن کی موجودگی میں، میں یہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''کیا وہ مر گئی؟'' کیتھرائن نے سرگوشی کی۔

''بدقسمتی سے نہیں۔''

''میتھیو، مجھے یقین نہیں آ رہا...... وہ پاگل عورت ہمیں مارنا چاہتی تھی...... ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔''

''نہیں، کیتھرائن ہم یہ نہیں کر سکتے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ہمارے نام جانتی ہے۔ ہیروں کے بارے میں جانتی ہے۔ پولیس کو کال کرنی چاہیے...... وہ اگر واپس آ گئی؟''

''غور سے سنو۔'' میں نے اس کے دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھے۔ ''سوئٹ ہارٹ، وقت بہت کم ہے۔ یہ پوچھنا بے معنی ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ لیکن میں پوچھوں گا۔''

''ہاں، ہمیشہ کے لیے۔''

''مجھ پر بھروسا ہے؟''

وہ ہچکچائی۔ میں نے الفاظ تبدیل کیے۔ ''میں یہ نہیں معلوم کروں گا کہ گزشتہ تین دنوں میں جو کچھ ہوتا رہا، تم اس کی حقیقت سے واقف ہو لیکن اگلے تین منٹ میں جیسے کہوں ویسے کرو۔ میں تمہارے پیار میں پاگل ہوں اور تمہاری حفاظت ہر شے پر مقدم ہے۔ اس کے لیے میں آخری حد تک جاؤں گا۔ کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اب بتاؤ، مجھ پر بھروسا ہے؟''

''ہاں، یقیناً۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

''ہم پولیس کو کال نہیں کریں گے۔ اوکے؟ چند منٹ میں یہاں ہر جگہ پولیس نظر آئے گی اور ہمیں گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''کیوں؟ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

''ملین ڈالرز کے ہیرے، ٹوٹی ہوئی کھڑکی...... گولیوں کے نشان۔ گرفتاری یقینی ہے۔ خود کو معصوم ثابت کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ کچھ نہیں پتا کیا ہو گا...... شروع ہو جاؤ۔ دو منٹ میں جتنے ہیرے سمیٹ سکتی ہو سمیٹ لو، پلیز۔''

میں تیز رفتاری سے بکھرے ہوئے ہیرے جمع کرنے لگا۔ ایک سیکنڈ بعد کیتھرائن بھی شروع ہو گئی۔

''بس رک جاؤ جو ہاتھ آ گیا کافی ہے۔ تیس سیکنڈ میں کپڑے بیگ میں ڈالو یا چھوڑ دو۔''

''نہیں، نکلتے ہیں۔'' وہ بولی۔

☆☆☆

ہوٹل ڈانیلی کی لابی میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ منیجر، اس کے متعدد معاون، چار ڈیسک کلرک اور چند بیل مین بدحواسی کے عالم میں فون پر لگے ہوئے تھے۔ میں نے چند الفاظ سنے...... اسٹاف کا ایک حصہ پانچویں منزل پر ہمارے کمرے کی جانب رواں تھا جہاں ٹوٹی کھڑکی سے کرال نے اُڑان بھری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس زیادہ دور نہیں تھی۔

افراتفری ہمارے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے بیگ کے ساتھ بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ نیویارک میں ہوتے تو تیزی سے غائب ہو سکتے تھے لیکن یہ وینس تھا۔ سڑکیں بھی پانی کی تھیں۔ آبی راہ گزر...... ہم ایک ''واٹر ٹیکسی'' میں گھس گئے جس میں دس نشستیں تھیں۔ مسافر ہم دو تھے۔ ہم نے فرنچ زبان میں ریلوے اسٹیشن کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے خالی نشستوں کی طرف اشارہ کیا۔ بوٹ کھڑی رہی۔

''کیا کہہ رہا ہے؟'' کیتھرائن نے استفسار کیا۔

''پانچ منٹ انتظار کرو۔'' میں نے جواب دیا اور پولیس کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ ہوٹل رجسٹریشن میں ہمارے اصل نام موجود تھے۔ ہمارے غیاب پر پولیس تلاش کا دائرہ وسیع کر دیتی۔ اس سے پہلے کہ ہمارے پوسٹر ہر بارڈر کراسنگ تک پہنچتے، ہمیں اٹلی سے نکل جانا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو اپنی مجبوری سمجھانے کی کوشش کی۔ تاہم وہ یورو کی زبان سمجھتا تھا۔ کئی عدد سو سو کے یورو نکالنے کے بعد بوٹ حرکت میں آئی۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی گردن کے گرد حمائل تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ایمسٹرڈم۔''
''وہاں کیوں؟''
''خوب صورت جگہ ہے۔ سب سے بڑھ کر رائیکس میوزیم...... ڈچ ماسٹرز۔ وان گوگ، ورمیئر، ریمبر اں وان رین...... تم مدہوش ہو جاؤ گی۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔
''میٹ ٹریول ایڈونچر کا ڈراما بند کرو۔ مجھے بتاؤ کہ واپس نیویارک جانے کے لیے ہم ایمسٹرڈم کیوں جا رہے ہیں؟''
میں نے اُس کے کان سے ہونٹ لگائے۔ ''ہیرے وہیں فروخت ہوں گے۔''

☆☆☆

پندرہ منٹ بعد ہم ٹرین اسٹیشن پر تھے۔ میلان کے لیے اگلی ٹرین کے لیے پینتالیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ میلان سے ایمسٹرڈم جانے کے لیے ہمیں رات کی ٹرین پکڑنی تھی۔ پرواز کرتے تو ائرپورٹ سیکیورٹی میں پھنس جاتے۔
میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لیے اور کافی بار میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ ہوٹل روم میں میرا آخری جملہ کیا تھا؟'' میں نے کیتھرائن سے سوال کیا۔
''جب وہ اندر آئی؟''
تم نے تو میری یادداشت گم کر دی تھی۔ تمہاری ڈاکٹر کٹ مجھے حملۂ قلب کے قریب لے گئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔
''تم ایک اور غیر معمولی خفیہ راز افشا کرنے جا رہے تھے۔''
میں نے سر ہلایا۔ ''والٹر زیلویز...... گرینڈ سینٹرل میں دم توڑنے والا آدمی والٹر تھا۔ وہ ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ وہ روسی مافیا کے لیے کام کرتا تھا۔ جرائم کی فہرست میں ہیروں کی اسمگلنگ بھی شامل تھی۔ کچھ عرصے بعد والٹر کی نیت خراب ہوئی اور اس نے تھوڑے تھوڑے ہیرے چُرانے شروع کر دیے۔ بالآخر ڈائمنڈ سنڈیکیٹ کو علم ہو گیا۔ وہ اس پر ہاتھ ڈالنے والے تھے کہ اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ وہ بوسیب بلاسٹ میں نہیں مرا تھا۔ سنڈیکیٹ نے ایک دوسرے پروفیشنل کو اسے ختم کرنے کے لیے ہائر کیا جس نے اس کا کام تمام کیا۔''
کیتھرائن نے ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ ''تم مجھے سچ بتا رہے تھے؟''
''ہاں۔''
''لیکن تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''
میں کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''وہ میں تھا جسے والٹر کی ہلاکت کے لیے ہائر کیا گیا تھا۔''
کیتھرائن نے لرزنا شروع کر دیا۔ ''تو...... نو...... نو...... یہ ممکن نہیں ہے۔''
''کیتھرائن، یہ سچ ہے۔ میں توقع نہیں کرتا کہ تم پوری بات سمجھ سکو گی لیکن میری محبت اجازت نہیں دیتی کہ میں تمہیں حقائق سے بے خبر رکھوں...... ہوٹل میں جو عورت آئی تھی۔ اس کا نام مارٹا کرال ہے۔ وہ خود پیشہ ور قاتل ہے۔ جنہوں نے مجھے ہائر کیا تھا، بعدازاں انہوں نے کرال کو مجھے مارنے کے لیے ہائر کیا۔''
کیتھرائن، میری آنکھوں میں نہیں...... فرش کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ''نہیں ایسا نہیں ہوا ہے۔'' اس نے بمشکل کہا۔
''جب میں نے آرٹ کے لیے میرین چھوڑی تو ڈیڈی مجھے کولوراڈو کے ایک بار میں لے گئے۔'' میں نے ڈیڈی کے ساتھ ہونے والی گفتگو اس کے گوش گزار کر دی۔
''میں نے ابتدا میں ان کی بات سے اتفاق نہیں کیا لیکن چند مہینے بعد میں اس ڈگر پر چل پڑا۔ معاوضہ مجھے پینٹنگ میں مدد دے رہا تھا جو میرا خواب تھا۔ دوسری طرف میں برائی کا خاتمہ کر رہا تھا۔''
کیتھرائن پر سکتہ طاری تھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ وہ شمع کے مانند پگھل رہی تھی۔ میرا دل بھی پھڑکنے لگا...... تڑپنے لگا...... مجھے خطرے کا احساس ہوا۔
''یقین نہیں آتا، تم پیسوں کے لیے قتل کرتے ہو اور تمہارے ڈیڈی بھی......'' وہ چپ ہو گئی۔ پھر وہی سوال آیا جو خود میں نے ڈیڈی سے کیا تھا۔ ''کیا انہوں نے تمہاری ماں کو بتایا تھا؟''
''ہاں۔''
''ویل، میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔'' وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ''گڈ بائے، میتھیو۔'' دل کی کائنات یک لخت برہم ہو گئی۔ شرح اسرار کیا کرتا۔ دل کی بات محتاج بیان رہ گئی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ بیگ اٹھایا اور چل پڑی۔ میں اُچھلا۔
''کہاں جا رہی ہو؟''
''تم سے دور۔ ائرپورٹ سے نیویارک۔ میرے پیچھے نہ آنا...... نہ مجھے کبھی کال کرنا۔''
''میں نے بھاگ کر اسے شانوں سے پکڑا۔ ''پلیز

کیتھرائن۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں زندگی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ میرے ذہن نے کہا کہ دنیا اجڑ گئی ہے۔ پامالِ دل نے کہا کہ جام خالی ہے۔ جذبات کو ہمیشہ میں نے قابو میں رکھا تھا لیکن اس وقت رگِ جان ٹوٹ گئی۔

''تم جانتی ہو...... میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔'' میری آواز ٹوٹ گئی۔ ''نہ جاؤ...... میں خود کو بدل دوں گا۔ جو کہو گی وہی کروں گا۔'' میں بیم ورجا کی کیفیت میں بھٹک رہا تھا۔

''ہاتھ ہٹاؤ، ورنہ میں شور مچادوں گی۔'' میں نے ہاتھ ہٹالیے۔

''کیا کیا میں نے؟ یہ جاب کی طرح ہے...... میرین بھی جاب...... وہاں بھی میں نے انسانوں کو مارا...... بُرے انسانوں کو۔ کوئی چیز تم سے زیادہ اہم نہیں۔''

''تم غلطی پر ہو کیتھیو...... گڈ بائے۔'' وہ منہ پھیر کے جانے لگی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ آہ، ایسی ہوتی ہے زیست کی بے کیفی...... یہ ہوتا ہے سوزِ جگر و دیدۂ تر۔ ایسی ہوتی ہے بے چارگی۔ اسے کہتے ہیں گردشِ ایام۔ احساسِ شکست، غمِ ہجراں۔ یہ تھی ''گھوسٹ'' کی حقیقت۔

مجھے لگا کہ کشکول لیے میں ازل سے وہیں کھڑا ہوں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

شمالی اٹلی کی طرف سفر میں تین گھنٹے صرف ہوئے۔ اس دوران پڈوا، ون سنزا، ویرونا اور دوسرے مقام راستے میں آئے۔ تاہم میں نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ کیتھرائن کے بغیر سب کچھ بے رنگ سا تھا۔ سات بجے میں میلانو (میلان) میں تھا۔ میلانو سینٹرل، دنیا کے چند بہترین ریلوے اسٹیشنز میں سے ایک تھا لیکن اسے دیکھ کر مجھے گرینڈ سینٹرل یاد آگیا جہاں سے ہیرے ملے تھے۔ ہیروں کی وجہ سے میں نے کیتھرائن کو کھودیا تھا۔

ایمسٹرڈم کے لیے سولہ گھنٹے کا سفر تھا۔ آرام کے لیے مجھے پینتالیس منٹ کا وقفہ ملا۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ سیل فون نکال کر میں نے ڈیڈی کو کال کی۔ کال فوراً وصول کی گئی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے، بوائے؟''

''نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔ ''ایک غلطی ہوگئی۔ میں ''بزنس ٹرپ'' پر گرل فرینڈ کو بھی ساتھ لایا تھا۔''

''اوکے، میں سمجھ گیا۔'' ڈیڈی نے کہا۔ ''اسے تمہارے بزنس کے متعلق علم ہوگیا اور وہ خوش نہیں ہے۔''

''ڈیڈی، یو آر اسمارٹ۔''

''تجربہ زیادہ مناسب لفظ ہے۔''

''تو پھر مجھے آپ کے تجربے کی ضرورت ہے۔''

''تین سوال ہیں۔'' ڈیڈی کی آواز آئی۔ ''پہلا یہ کہ تم اُس سے محبت کرتے ہو؟''

''بے شک...... ہر چیز سے زیادہ۔''

''ہمارے ''بزنس'' میں محبت آجائے تو آدمی ناکارہ ہوجاتا ہے۔''

''مطلب، کوئی امید نہیں ہے؟''

''نہیں، مطلب یہ کہ تمہیں سمجھنا پڑے گا کہ مستورات کیسے سوچتی ہیں؟''

''میں سن رہا ہوں۔''

''اوکے گڈ...... دوسرا سوال۔ اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور تم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔''

''میں محبت کرتا ہوں اور اسے سکھانے کے لیے پُرعزم ہوں۔''

''مستورات اسی طرح سوچتی ہیں۔ وہ ہم سے محبت کرتی ہیں اور ہمیں سکھانے کے لیے پُرعزم ہوتی ہیں۔''

میں مسکرایا۔

''آخری سوال۔ ''بزنس ٹرپ'' میں دشواری کی شدت کس قدر ہے؟''

''میرے نزدیک یہ سادہ معاملہ تھا اسی لیے میں کیتھرائن کو ساتھ لے آیا۔ تاہم صورتِ حال بدل گئی۔ مدِمقابل پیشہ ور ہے اور مجھے ہمیشہ کے لیے آؤٹ کرنا چاہتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے، مائی بوائے...... تو کیتھرائن کو بھول جاؤ۔ ایک سو دس فیصد توجہ بزنس پر رکھو۔ سمجھ گئے ایک سو دس فیصد۔ یا پھر مرنے کے لیے تیار رہو۔''

''یس سر۔''

''کیتھرائن کے لیے تمہیں چانس ملے گا۔ اگر تم زندہ رہے۔''

''ڈیڈی، شکریہ۔ آپ کا مقروض ہوں۔''

''تو قرض اتارو، اسی وقت...... بتاؤ کس مقام پر ہو؟''

میں نے قرض اتارا۔

''اوکے، میں وہاں درجن مرتبہ گیا ہوں۔ وہاں ٹریک سات پر ایک عمر رسیدہ نن (nun) سسٹر فلومینا بیٹھی

ہے۔ وہ میرے لیے کام کرتی رہی ہے۔ سو ڈالر یا جو مقامی کرنسی ہے...... اس کی باسکٹ میں ڈالو۔ اسے کہو کہ یہ کولوروڈو سے آئی ہے۔" انہوں نے چند ٹپس اور کوڈ بتائے۔ "شکریہ۔"

"دھیان سے سفر کرو۔"

"آئی کو یو ڈیڈ۔"

☆☆☆

ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق میں ٹریک سات پر پہنچا۔ وہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے سو یورو کا نوٹ باسکٹ میں ڈالا۔ اس نے تیزی سے سر اٹھایا۔ "گرازے میلے (بہت شکریہ)۔"

"یہ کولوروڈو سے آیا ہے۔"

"آہا، سینور کولوروڈو۔ اچھا آدمی ہے۔" اس نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ "تم جوان ہو؟"

"میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ایمسٹرڈم۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں بند کیں...... کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ "میں نے دعا کر دی ہے، جاؤ۔"

میں نے اسے بغیر گڈ بائے کہا اور ایمسٹرڈم کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ سولہ گھنٹے بعد اسٹیشن پر اترا اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف گیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ سسٹر فلومینا کی دعا کا کیا مطلب تھا۔ ایک آدمی نے مجھے مخاطب کیا اور بتایا کہ وہ سسٹر فلومینا کا دوست ہے۔ "تمہیں ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر مسافر اور اس کی منزل کی نگرانی ہو رہی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں سیاہ رنگ کی سسٹرون میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ڈرائیور کا نام ہیرالڈ تھا۔ وہ بھی کوئی پروفیشنل تھا۔ اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ سفر خاموشی سے ہوا۔ اس نے مجھے زی ڈیک (ایمسٹرڈم کی سڑک) کے قریب اتار کر ایک کارڈ میرے حوالے کیا۔ کارڈ پر صرف ایک فون نمبر لکھا تھا۔

"دن ہو یا رات، کسی بھی وقت۔" اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور چند الفاظ کہے۔ میں نے والٹ نکالا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے سرسری انداز میں اطراف کا جائزہ لیا۔

ڈیڈی ریٹائر ہو چکے تھے لیکن ان کا نیٹ ورک فعال تھا۔

☆☆☆

زی ڈیک دیکھ کر مجھے نیویارک کا ٹائمز اسکوائر یاد آیا۔ میں نے بوڈبرگ ہوٹل کا انتخاب کیا۔ یہ ایک عام سا ہوٹل تھا۔ ہیروں سے جان چھڑانا میری پہلی ترجیح تھی۔ یہ میتھیو کے بس کی بات نہیں تھی لیکن "گھوسٹ" یہ کام کر سکتا تھا۔

اگر آپ یورپین یونین میں "منظم جرائم" کے بارے میں سوچیں گے تو اٹلی سب کو مات دیتا نظر آئے گا لیکن ہالینڈ کا اسمگلنگ میں اپنا مقام تھا۔ یہاں کے کئی کھلاڑیوں کو میں بحیثیت گھوسٹ جانتا تھا۔ انہیں میں ایک ڈیڈ رائنگ تھا۔ جو "ناگ" کے نام سے مشہور تھا۔ میں نے اجنبی حیثیت میں پرسوں اس کے ساتھ میٹنگ طے کی۔

دروازہ لاک کیا۔ کھڑکیوں کی جانچ کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ میری آنکھ صبح نو بجے کھلی۔ غسل کیا...... لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کچھ کھانے کے لیے ہوٹل کے بجائے باہر ایک ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ وہاں بیشتر میزیں خالی تھیں۔ واپسی پر ہوٹل کے کمرے میں رہا۔ لنچ بھی وہیں کیا اور رات میں کافی پینے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال، جو کمرے کے مانند تھا، میں چلا گیا۔ کونے کی میز سنبھالی...... کیتھرائن کا خیال آیا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ کئی بار خیال آیا کہ کال کروں...... وہ نیویارک پہنچ گئی ہوگی۔ تاہم ہر بار میں نے خود کو روک لیا۔ کیا ڈیڈی صحیح کہہ رہے تھے کہ وہ مجھے دوسرا چانس دے گی...... میں نے جیب سے مخصوص ریپیڈ وگراف قلم نکالا۔ جسے انجینئرز اور آرکیٹیکچرز بھی استعمال کرتے ہیں۔ کافی لانے والے سے کاغذی شیٹ منگوائی اور کیتھرائن کا اسکیچ بنانا شروع کیا۔

کاغذ پر اس کا چہرہ ابھرنے لگا...... احساسِ زیاں فزوں تر ہونے لگا۔ گھوسٹ قابلِ تسخیر تھا۔ مسخر بھی کس نے کیا۔ اِک ماہ جبیں، نازک اندام...... دلربا نے۔ شرارِ آرزو کے سبب آگ سی سینے میں لگی تھی۔ میں نے خود فراموشی کے عالم میں تصویر بنائی تھی۔ اس سے پہلے بھی سیکڑوں مرتبہ بنائی تھی لیکن یہ اسکیچ بہترین تھا۔ گویا وہ قلم کے اندر تھی۔ وہاں سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ پزیر ہو گئی۔

"میں جان گیا ہوں کہ تم میرے خفیہ کام سے بدظن ہو۔" میں سوچ رہا تھا۔ تصویر سے مخاطب تھا۔ "لیکن اتنا کریڈیٹ تو مجھے ملنا چاہیے کہ میں کبھی کسی اور لڑکی کے ساتھ نہیں سویا۔"

مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں ہر قیمت پر اسے رام کروں گا...... ایک سو دس

فیصد...... ڈیڈی نے نصیحت کی تھی لیکن اس وقت ڈیڈی کی آواز بہت دور چلی گئی تھی۔ میں نے قلم جیب میں رکھا اور اسکیچ اٹھا کر ہوٹل سے نکل گیا۔ آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک پارک میں چلا گیا۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ پارک میں موجود بینچوں اور میزوں پر اکا دکا جوڑے نظر آرہے تھے۔ میں نے ایک میز سنبھالی۔ قلم نکال کر میز پر رکھا۔ اور کاغذ بھی...... نظریں مہ جبیں کے اسکیچ پر تھیں...... تصور میں، میں نیویارک پہنچ گیا۔

دفعتاً گردن کی پشت پر سرد لوہا آن ٹکا۔

”اوہ یہ تو مس سن بورن کی تصویر ہے۔ کیوں مسٹر بیٹن؟“ جرمن لہجے میں نسوانی آواز آئی۔ ”پریشان مت ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

میرا وجود برفانی بُت میں تبدیل ہو گیا۔

”پارٹی ختم ہو گئی، خوب صورت لڑکے...... شاباش جلدی سے بتاؤ کہ شگوف کے ہیرے کہاں ہیں؟“

میں نے زندگی میں بارہا موت سے پنجہ آزمائی کی تھی۔ متعدد بار زیست و اجل کی کشمکش میں مبتلا ہوا تھا۔ میرے تجربے کے مطابق بچنے کا کوئی نہ کوئی امکان موجود ہوتا ہے۔

کرال نے اپنا سوال دہرایا۔ میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کیونکر مجھ تک پہنچی۔ گن کی نال میری گردن میں چبھ رہی تھی۔

”میں احمق نہیں ہوں۔ اگر تمہیں بتایا تو تم مجھے ہلاک کر دو گی؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہیرے ملنے کے بعد تمہاری موت تیز اور اذیت سے عاری ہو گی۔ صرف ایک گولی۔“ وہ بولی۔

”کیا ہو گا۔ اگر میں نے نہیں بتایا۔“

”موت پھر بھی یقینی ہے...... تیز تر موت لیکن کیتھرائن کے ساتھ معاملہ دوسرا ہو گا۔“

کیتھرائن کے نام نے میرے اندر کی دنیا تہ و بالا کر دی۔ ”اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت تک بے خبر تھی جب تم ہوٹل میں آئیں۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ وہ دھیرے دھیرے موت کی وادی میں اترے گی۔“ کرال نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ اذیت پسندی کے معاملے پر والٹر سے زیادہ خطرناک تھی۔ ذہنی بیمار تھی۔ میری تمام خفیہ صلاحیتیں یک لخت بیدار ہو گئیں۔ میں نے دل میں مخصوص الفاظ دہرائے۔ ”میں ناقابلِ تسخیر ہوں۔“

کرال کے پاس گن تھی۔ مجھے معمولی سبقت حاصل تھی۔ یعنی وہ میری اصلیت سے ناواقف تھی۔ وینس میں جو کچھ ہوا، کرال نے اسے میری میرین ٹریننگ پر محمول کیا ہو گا اور کچھ قسمت پر...... اس نے سوچا ہو گا کہ ایسا دوبارہ نہیں ہو گا۔ وہ خیال رکھے گی۔ میں نے اس کے خیال کو تقویت پہنچانے کے لیے اداکاری کا فیصلہ کیا۔

”میں ہیروں کے بارے میں بتا دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”پلیز میری دوست کو نقصان مت پہنچانا۔ مجھ سے وعدہ کرو۔“ میری آواز میں خوف اور شکست خوردگی کا عنصر واضح تھا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”مم...... میں نے ہیرے چھپا دیے ہیں۔“ میری حالت دگرگوں تھی۔ میری آنکھیں کسی ہتھیار کے لیے گردش میں تھیں لیکن وہ محتاط تھی۔

”بیئر کی بوتل اٹھا کر آہستگی سے نیچے رکھ دو۔“

”یس میم۔“ میں اس کا حکم بجا لایا۔

”ہیرے کہاں چھپائے ہیں؟“

”بس اسٹیشن، لاکر میں۔“

”چابی دو۔“

”سوری، وہ ہوٹل کے کمرے میں چھپائی ہے۔“

”مجھے وہاں لے چلو۔“

”وعدہ کرو کیتھرائن کو کچھ نہیں کہو گی۔“

”میں وعدہ کر چکی ہوں۔“ اس نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ گردن پر سے گن ہٹ گئی۔ وہ گھوم کر سامنے آئی۔ میں بھیگی بلی کے مانند خوف زدہ...... اُسے تک رہا تھا۔ میری باڈی لینگویج اس کی فتح کا اعلان کر رہی تھی۔

”تمہاری بہادری کہاں گئی۔ کیا وہ صرف گرل فرینڈ کی وجہ سے تھی؟“ اس نے مضحکہ اُڑایا۔

”مم...... میں بہادر نہیں ہوں۔“

”ہاں، تم ایک گاؤدی ہو...... چلو حرکت میں آ جاؤ۔“

میں نے قدم اٹھائے اور چلتے چلتے رک گیا۔

”کیا ہوا؟“

”میری تصویر...... وہ کیتھرائن......“

کرال نے نفرت کا اظہار کیا۔ ”اٹھاؤ یہ فضول تصویر۔“

میں ڈولتا ہوا میز پر گیا اور کاغذ اٹھایا اور کراہنے لگا۔

''اب کیا ہوا؟'' وہ بولی۔
میں نے سر جھکا کے نیچے دیکھا اور خجالت سے کہا۔ ''پیشاب نکل گیا۔''
''تم انسان نہیں ایک بیمار کتے ہو۔ میری طرف گھومو۔''
گھومتے وقت میں نے ریپیڈوگراف قلم اٹھالیا۔ اس کی نگاہ نیچے میری پتلون کی طرف گئی۔ یہ انتہائی قلیل وقفہ تھا جس کے دوران میں نے برق رفتاری سے قلم کی فولادی نوک اس کی دائیں آنکھ میں داخل کر دی اور دباتا چلا گیا۔ ریپیڈوگراف اپنی مخصوص ساخت کے باعث اندر دماغ تک اتر گیا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ چہرے کی ساخت بگڑ گئی۔ اس کی لمبی ٹانگیں مڑیں۔ وہ میری جانب گری۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی...... اسے زمین بوس ہونے دیا۔ ریپیڈوگراف چھری کے مانند آنکھ کے راستے دماغ میں اتر گیا تھا۔ اس کا جسم کچھ دیر پھڑ پھڑا کے ساکت ہوگیا۔ آنکھ سے خون بہہ رہا تھا۔
اطراف کا جائزہ لینے سے قبل میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگا۔ پھر امدادی انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا۔ میں نے قلم کھینچ لیا۔ تصویر والا کاغذ اٹھا کر جیب میں ٹھونسا۔ میں اس کی گن ساتھ رکھنا نہیں بھولا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے اسے اٹھا کر کاندھے پر لادا اور گھنی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔
صبح ساڑھے پانچ بجے میں بوڈبرگ ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ ایمسٹرڈم کے قلب میں چائنا ٹاؤن میں ہوٹل گیلڈ رسکٹ میں چیک اِن کیا۔ وہیں ناشتا کیا۔
ڈیڈ رانک عرف ناگ سے ملاقات میں آٹھ گھنٹے باقی تھے۔ اس ملاقات کے لیے مجھے حلیہ لازمی تبدیل کرنا تھا۔ دنیا کے مختلف مقامات پر کئی مرتبہ مجھے میک اپ آرٹسٹ کا سہارا لینا پڑا تھا۔ انہی میں سے ایک ''ڈومینگو فاموسا'' تھا۔ یہ کیوبن آرٹسٹ ہالینڈ میں مقیم تھا۔ وہ کاسترو آنجہانی کی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ میں کیب کے ذریعے اس کے اسٹوڈیو پہنچا۔
میں چھ گھنٹے تک میک اپ چیئر پر بیٹھا رہا۔ اس نے اول، جیل (gel) کی مدد سے میرے بال سیدھے کر کے چپکائے۔ چہرے پر نم دار بینڈیج پلاسٹر کیا۔ یہ وقت کے ساتھ سخت ہو کر ماسک بن گیا۔ ماسک ہٹا کے اس نے پلاسٹی سین کا اضافہ کیا۔ بعدازاں چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں اور جھریاں بنائیں...... دوسری مرتبہ اس نے نیم گرم جلاٹین استعمال کرتے ہوئے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ آخر میں اس نے کانٹیکٹ لینس لگائے اور سر پر سفید وگ۔ میں نے آئینہ دیکھا تو بے ساختہ داد دی۔ میتھیو غائب ہو چکا تھا۔ آئینہ میتھیو کے دادا کی شکل دکھا رہا تھا۔ ڈومینگو نے وارڈروب سے قدیم طرز کے تین سوٹ اور سفید شرٹس نکالیں۔ جوتے بھی پرانی طرز کے تھے۔ لباس تبدیل کر کے میں قدِآدم آئینے کے سامنے آیا۔ کچھ کام مجھے بھی کرنا تھا۔ میں نے پوز تبدیل کیا۔ شانے ڈھلکا کر سر کسی قدر نیچے کیا۔ پشت کا بالائی حصہ بھی جھکایا۔ چال بدل کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا۔ واپس آیا اور ڈومینگو کا شکریہ ادا کیا۔
''تم ایک سچے آرٹسٹ ہو۔'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ادائیگی میں، میں نے فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔
☆☆☆
ڈیڈ رانک فون پر معقول آدمی لگ رہا تھا لیکن میں اس کی اصلیت سے بے خبر نہیں تھا۔
''اگر معیار اچھا ہے تو میں مناسب ادائیگی کروں گا۔'' اس نے کہا۔
میں آگاہ تھا کہ وہ خریدنے کے بجائے حرام خوری کرے گا۔ اس کے لیے پورا گینگ تھا...... جو اس کے نیچے کام کرتا تھا۔ کیفے کارپرشاک میں دو بجے ملاقات طے ہوئی۔ یہ سینٹرل اسٹیشن کے سامنے تھا۔ مقامی افراد کے علاوہ سیاحوں کا اجتماع رہتا تھا۔
سنجیدہ افراد کے لیے یہ اچھی جگہ تھی۔ میں ٹھیک دو بجے اندر داخل ہوا۔ سرخ رومال میری جیب سے جھانک رہا تھا۔ یہ نشانی تھی جسے دیکھ کر کونے کی میز کے ساتھ ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بارہا اخبارات میں اس کی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ وہ سلاخوں کے پیچھے کبھی نہیں گیا۔
میں ترمیم شدہ چال کے ساتھ اس کی طرف گیا اور مصافحہ کیا۔
''میں ''یانک زفار'' ہوں۔'' میں نے یورپی یہودی لہجہ اختیار کیا۔
''آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔
''کیا شاندار جگہ ہے۔'' میں نے تعریفی نظروں سے نگاہ دوڑائی۔ میرا مقصد پورا ہوگیا۔ دو آدمی بار کی جانب سے نظر رکھے ہوئے تھے اور دو فاصلے کی میز سے نگراں تھے۔
''اس کی تاریخ قدیم ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ، کوئی تو چیز ملی...... جو مجھ سے بھی پرانی ہے۔''
جواباً وہ ہنسا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔
اس نے بیئر کے دو جام تیار کیے۔
''مسٹر زفار، عجیب بات ہے...... ہمارا پہلے واسطہ نہیں پڑا۔ میرا مطلب ہے ''کاروبار'' کے سلسلے میں؟''
''میں نیویارک سے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ''ڈائمنڈ ڈسٹرکٹ'' میں کام کرتا تھا۔ پندرہ برس قبل ریٹائر ہوگیا تھا لیکن میرے دوست کو میری ضرورت ہے۔ وہ غیر متوقع طور پر ہیرے لے کر آیا تھا۔ تاہم وہ سودے بازی میں کچا ہے۔''
وہ مسکرایا۔ اس کی عمر پچاس سے کم تھی۔ بال سیاہ اور ناک شکرے کے مانند...... ''حال ہی میں، میں نے ایک جوان آدمی کے بارے میں سنا تھا جس کے پاس ہیرے ہیں...... کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟''
''فی الحال میں صرف نمونہ لایا ہوں۔'' میں نے مخملی پاؤچ نکالا۔ ''اس میں تیس عدد ہیرے ہیں۔''
اس نے پاؤچ میں انگلیاں ڈال کر چھیڑ چھاڑ کی۔ ایک ہیرا نکال کے جوہری کے مخصوص آلے سے آنکھ کے قریب لا کے دیکھا...... اس طرح اس نے دس ہیروں کو جانچا۔
''نائس...... باقی کہاں ہیں؟''
میں نے اسے فوٹو دکھائے۔ جو میں نے نیویارک میں اتارے تھے۔ تمام ہیرے شیشے کے شفاف جار میں تھے۔
''شاندار۔'' اس نے فوٹو دیکھ کر تبصرہ کیا۔ ''افواہیں گردش میں ہیں کہ شاید یہ ہیرے میری مقابل پارٹی کے ہیں۔''
''یہ میرے کلائنٹ کے ہیں۔ اگر تمہیں دلچسپی نہیں ہے تو میں تمہاری مخالف پارٹی کو فروخت کر دیتا ہوں۔''
''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم نے کوشش کی تو وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ الفاظ سفر کرتے ہیں۔ روسیوں کو چرائے ہوئے ہیروں کو تلاش ہے۔''
میں کھڑا ہوگیا۔ ''میں مسٹر زوم ایک خریدار کی تلاش میں آیا تھا۔ ظاہر ہے میں غلطی پر تھا۔''
''بیٹھ جاؤ۔''
''میں پہلے ہی وقت ضائع کر چکا ہوں۔''
''پلیز، بیٹھ جاؤ۔''
میرے بیٹھنے پر وہ بولا۔ ''مسٹر زفار میں گستاخی کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا۔ میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ روسیوں نے خریداروں کو تنبیہ کی ہے اگر تمام ہیرے ایسے ہی ہیں، جو میں نے دیکھے پھر میری طرف سے پانچ ملین امریکی ڈالرز کی آفر ہے۔''
''مسٹر ڈیڈرائنگ، میں اچھا فوٹو گرافر نہیں ہوں۔ ہیرے جیسے نظر آرہے ہیں، اس سے کہیں بہتر ہیں...... تیرہ ملین۔''
اس نے پلک نہیں جھپکائی۔ میں نے بیئر کی چسکی لی۔
''لیکن میں جلدی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے دس ملین بھی چلیں گے۔''
''چھ ملین۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے کلائنٹ کو کم از کم بھی نو ملین ملنے چاہئیں۔''
''تمہارا کلائنٹ بہت خوش ہوگا...... اگر روسی اس تک نہیں پہنچ سکے۔ فائنل آفر...... سات ملین۔''
''میں نو پر ہوں، تم سات پر...... آٹھ پر طے کرلو۔''
''سات ملین بہت ہیں، ہاں یا نہ؟ بیئر میری طرف سے۔''
''یہ چرانے والی بات ہوئی۔ تمہاری قسمت۔ مجھے واپس جانا ہے۔ آج رات ڈیل کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں رقم یورو کرنسی لوں گا...... نوٹ...... نہیں معلوم کہ سات ملین ڈالرز کے کتنے یورو ہوں گے اور ان کا وزن کتنا ہوگا۔ کیا میں اٹھا پاؤں گا؟'' میں جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ ایک ملین اور چون پاؤنڈز کے برابر تھے۔ بوڑھے آدمی کے لیے یقیناً اتنا وزن لے کر چلنا مشکل تھا۔
ڈیڈرائنگ نے شانے اچکائے۔ کرنسی کوئی بھی ہو اسے پروا نہیں تھی۔ غالباً وہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ رقم دے کر ہیرے قابو کرے گا پھر رقم بھی چھین لے گا۔
''ہاں آج رات ٹھیک ہے۔'' اس نے ڈیل کے لیے ایک بار کا نام لیا۔
میں نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ''خریدار کو ہی احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فروخت کنندگان کو بھی خیال رکھنا پڑتا ہے...... پرائیوسی کی ضرورت نہیں ہے۔ مقام ایسا ہو جہاں سناٹا نہ ہو۔ کیا خیال ہے اگر ہم دونوں بحری سفر کے دوران مون لائٹ ڈنر پر رقم اور ہیروں کا تبادلہ کریں۔ جھیل کے ساتھ...... میں بوٹ پر ہوں گا۔ جو پرنس ہینڈریکیٹ ڈاک سے ساڑھے سات بجے نکلے گی۔ اور تم اکیلے آؤ گے۔''

''منظور ہے اور تم بھی اکیلے ہو گے۔''

☆☆☆

میں کیفے کارپر شاک سے نکلا تو وہ دو آدمی تعاقب میں تھے۔ جو بار سے ہم دونوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ گھوسٹ ایک منٹ کے اندر ان سے جان چھڑا لیتا...... لیکن ایک بوڑھا مجہول شخص ایسا کرتا تو شکوک وخدشات پیدا ہو جاتے۔ مجھے کوئی اور فریبی انداز اختیار کرنا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی لی...... ڈرائیور کو ہدایت دی کہ انٹرکانٹی نینٹل ایمسٹل ہوٹل چلے۔

''رفتار کم رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''میں مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ڈیڈ رائنگ کے آدمی سہولت کے ساتھ دوسری ٹیکسی میں پیچھے آ رہے تھے۔ ہوٹل ایمسٹل سے میں خوب واقف تھا۔ ماضی میں ایک ''جاب'' نمٹانے کے لیے مجھے وہاں آنا پڑا تھا، یہ وہاں کی ایک تاریخی اور شاندار عمارت تھی۔

ٹیکسی وہاں رکی تو وردی میں ملبوس مونچھوں والے دربان نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ میں اُسے پہچان گیا۔ ''رنجر۔'' میں نے اس کا نام لیا۔ ''تم ہمیشہ میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے ہو۔ تمہیں یاد ہے نہ میرا نام...... یاشک زفار۔ گزشتہ موسم گرما میں تم نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔'' میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ''تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' وہ مجھے سہارا دے کر باہر نکال رہا تھا۔ ظاہر ہے میرے حلیے کے باعث وہ مجھے پہچاننے سے قاصر تھا۔ میں نے فی الفور سو یورو کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ سو یورو اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھے۔

''خوش آمدید مسٹر زفار۔ کیا آپ کے پاس بیگ ہیں؟''

''نہیں، میں کل رات چیک ان ہوا تھا۔ تاہم اگر تمہیں پریشانی نہ ہو تو ایک چھوٹا سا کام کرو۔''

''کیوں نہیں۔'' اس نے نوٹ جیب میں رکھا اور مجھے سرخ کارپٹ والی سیڑھیوں پر لایا۔

''جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں ایک قلمکار ہوں۔ یہاں میں اپنی نئی کتاب کی رونمائی کے لیے آیا ہوں لیکن میرے کچھ مداح بعض اوقات دردِسر بن جاتے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو ان دونوں کو جو ٹیکسی سے اتر رہے ہیں؟''

''یس سر، کیا وہ آپ کو پریشان کر رہے ہیں؟''

''بہت زیادہ۔ شہرت بھی بُری چیز بن جاتی ہے۔ کام بھی تھکا دینے والا ہے۔ ان شریر بچوں کو اس وقت تک روکو۔ جب تک میں اپنے کمرے میں نہیں چلا جاتا۔ میں سونا چاہتا ہوں۔''

''سر فکر نہ کریں۔ چند منٹ کیا...... میں ان کو گھسنے ہی نہیں دوں گا۔'' دربان نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر ستائش کی اور مدھم رفتار سے سیڑھیاں طے کرنا شروع کیں۔

کن انکھیوں سے دیکھا۔ رنجر دونوں کی راہ میں دیوار بن گیا تھا۔

''کیا تم لوگ رجسٹرڈ ہو؟'' اس کی آواز آئی۔

''راستے سے ہٹو۔'' ایک بدمعاش نے اسے دھکیلا۔ تاہم ڈھائی سو پاؤنڈ وزنی دربان کو ہٹانا آسان نہیں تھا۔ اس نے بھی جوابی دھکا دیا۔ دوسرے بدمعاش نے پنچ مارا۔ میں سیڑھیوں سے ہٹ کر لابی میں آ گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ دربان کی باچھوں پر خون تھا لیکن وہ ڈٹ گیا تھا۔ سیٹی بجاتے ہوئے اس نے ایک کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ معاً دو دربان اور دو بیل مین نمودار ہوئے اور داخلے کا راستہ میدانِ جنگ بن گیا۔

میں تیز رفتاری سے عقبی راستے کے ذریعے ہوٹل کے باغ میں نکل آیا۔ وہاں سے نکلا تو قریبی دریا کے ساتھ چلتا ہوا دائیں جانب مڑا اور دوسری ٹیکسی پکڑی۔ ٹیکسی کا رخ چائنا ٹاؤن کی طرف تھا۔ کسی دن میں پھر آؤں گا...... کیتھرائن کے ہمراہ اور دربان کو بھاری ٹپ دوں گا۔ میں نے دل میں کہا۔

☆☆☆

ڈیڈ رائنگ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا ہوگا کہ کمرے تک جائیں اور کہانی وہیں ختم کر کے آئیں۔

میں ڈاکیارڈ پر دو گھنٹے پہلے پہنچ گیا تھا اور ٹکٹ لے کر بوٹ پر چلا گیا۔ ڈائننگ ایریا شیشے کا بنا تھا۔ چند جوڑے وہاں مرضی کی میز منتخب کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھے۔ میں نے کچن کے گھومنے والے ڈور کے قریب ایک چھوٹی میز پر قبضہ جمایا۔ یہ کونے میں تھی۔ جہاں سے میں ڈاک، گینگ پلینک اور ڈائننگ روم کے تمام مناظر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے بار پر کلب سوڈا کا آرڈر دیا اور انتظار کرنے لگا۔

سوا سات بجے میں نے ڈیڈ رائنگ کو ''ڈاک'' پر دیکھا۔ وہ سیاہ جینز اور چرمی جیکٹ میں ملبوس تھا۔ کندھے پر ایک ڈفل بیگ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ رقم ضرور دکھائے گا۔ تاہم وہ منصوبہ بنا کر آیا ہوگا کہ میں بوٹ سے اترنے نہ پاؤں۔ اس نے ٹکٹ خریدا تھا لیکن نیچے ہی کھڑا تھا۔ کچھ دیر

بعد میں نے ان آدمیوں کو دیکھا جو کیفے میں نظر آئے تھے۔ ڈیڈ رانک سے میری پہلی ملاقات پر...... انہوں نے ٹکٹ خریدا اور ڈیڈ رانک سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ دونوں ڈیڈ رانک سے انجان نظر آرہے تھے۔ دونوں سگریٹ نوشی کرتے ہوئے بات چیت کر رہے تھے۔ بالآخر وہ دونوں نظر آئے جنہوں نے میرا ہوٹل ایمسٹل تک پیچھا کیا تھا۔ ان دونوں نے ٹکٹ نہیں خریدا۔

سات پچیس پر ڈیڈ رانک نے اشارہ کیا اور دو بدمعاش اوپر آگئے۔ دونوں کی نظریں ڈائننگ روم کو کھنگال رہی تھیں۔ جلد ہی انہوں نے مجھے تاڑ لیا۔ ایک نے دوسرے کو موہوم اشارہ کیا جس نے سیل فون پر نمبر ملایا...... میں ڈیڈ رانک کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے فون اٹینڈ کیا۔ مسکرایا اور بوٹ کی طرف بڑھا۔ بلاشبہ وہ مجھے ایک آسان شکار سمجھ رہا تھا...... بلکہ احمق۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد بوٹ حرکت میں آئی۔ وہ ڈائننگ روم میں رکا پھر میری جانب متحرک ہوا۔ ”زفار!“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

”اچھی جگہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”رش ہے لیکن مزہ آئے گا۔ کھانا بھی اور کاروبار ساتھ ساتھ......“

”تم ناگ نہیں، کچھوے ہو۔“ میں نے دل میں کہا۔

کچھ دیر عام سی گفتگو ہوئی پھر میں نے ہیروں کا بیگ میز پر رکھ دیا۔ ڈیڈ رانک نے بیگ اپنی طرف کیا اور اپنا بڑے سائز کا بیگ میری جانب...... میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اودے رنگ کے پانچ سو والے یورو نوٹ تھے۔

”گنتی کرو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں چند منٹ میں آتا ہوں۔ اس دوران تم ہیرے دیکھ لو۔“ میں اٹھ کر مردانہ ٹوائلٹ کی جانب چل دیا جو مخالف سمت میں تھا۔ تاہم ڈیڈ رانک اپنی میز سے وہاں دیکھ سکتا تھا۔ مجھ کو رقم گننی نہیں کرنی تھی۔ اسے ہیرے مل گئے تھے اور میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے ٹوائلٹ لاک کیا۔ بیگ فرش پر رکھا اور زیریں خلا سے رینگ کر ملحقہ ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ وہاں میں کموڈ کے ڈھکن پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

بیس سیکنڈ بعد جھری سے میں نے ڈیڈ رانک کے کارندوں کو آتے دیکھا۔ انہوں نے دوسرے ٹوائلٹ کو نظرانداز کر دیا جو بظاہر خالی پڑا تھا۔ پہلے والے میں نیچے سے بیگ کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ سائیلنسر لگی گنوں سے انہوں نے وہاں اوپر تلے آٹھ دس گولیاں برسائیں۔ جہاں بیٹھ کر میں رقم گن رہا تھا۔ پھر ایک نے لات مار کر دروازہ توڑا۔ بلاشبہ خالی ٹوائلٹ دیکھ کر ان کی حالت دیدنی رہی ہو گی۔ تاہم میرے پاس تاثرات کے مشاہدے کا وقت نہیں تھا۔ میں کموڈ کے ڈھکن پر کھڑا ہو گیا۔ ایک ایک گولی میں نے دونوں کے سر میں بٹھائی۔ میں نے عمداً گن کے ساتھ سائیلنسر نہیں رکھا تھا۔ فائرنگ نے وہاں بھگدڑ مچا دی۔ میں نے تیزی سے پارٹنر کو سگنل دیا۔ میں اکیلا نہیں تھا۔ میں بیگ اٹھا کر بھاگا۔ ڈیڈ رانک اچھلا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بوکھلا گیا تھا۔ دوسرے لمحے میں اس نے مجھے بھاگتے دیکھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں جوانوں کے مانند بیگ لیے بھاگ رہا تھا۔

دوسری جانب پبلک کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ حد سے حد ڈیک یا برج تک جا سکتے تھے۔ ڈیڈ رانک کے پوری طرح سنبھلنے سے پہلے میں بھیڑ سے ٹکرایا۔ ایک آدمی نیچے گرا۔ ڈیڈ رانک ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے میں گن لیے میرے پیچھے تھا۔ اس صورتِ حال نے اس کا سرکٹ اڑا دیا تھا۔ وہ فائرنگ کرنے لگا۔ شیشے ٹوٹنے لگے۔ شور شرابے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ڈاج دیتا، راستہ بناتا اڑا جا رہا تھا۔

ڈیڈ رانک خوش فہمی میں تھا کہ میں بوٹ سے کہاں بھاگوں گا جبکہ میں مطمئن تھا۔ آگاہ تھا کہ میری راہِ فرار کس جانب ہے...... متعین کردہ مقام سے میں نے اندھی چھلانگ لگائی۔ نیچے کناؤ نامی پارٹنر میرا منتظر تھا۔ میں کمبلوں کے طویل ڈھیر پر گرا۔

”کیا ہوا؟“ وہ چلایا۔ اور تین سو ہارس پاور کی بوٹ اسٹارٹ کی۔

”کچھ نہیں...... خون خرابا ہو گیا۔“

”یہ تو ہوتا ہے۔“ اس نے کہا اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

کناؤ میرا امیرین کا پرانا ساتھی تھا۔ جس کا سینہ میڈلز سے سجا تھا لیکن وہ رئیل اسٹیٹ کے ٹائیکون کی بیٹی سے شادی کر کے ہانگ کانگ چلا گیا۔ تاہم اپنی خواہش کے برعکس اسے پھر میدانِ جنگ کا رخ کرنا پڑا۔ پانچ برس مزید اس نے وہاں گزارے۔ پانچ مرتبہ زخمی ہوا۔ دوسری مرتبہ نکلا تو اس نے ہالینڈ میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں ڈیک کے زیریں حصے میں موجود کمرے میں گیا۔ میک اپ ختم کیا۔ اپنا ریڈ اوکسی بیگ نکال کر لباس

تبدیل کیا۔
ڈیک پر واپس آیا۔ کناؤ بوٹ کو ڈاک پر لگا چکا تھا۔ ہم دونوں اتر کر اس کی کار میں بیٹھ گئے۔ دونوں بیگ میرے ساتھ تھے۔
''کہاں؟'' اس نے سوال کیا۔
''وجس ٹرا میں ایک بینک ہے، وہاں ڈپازٹ کرنا ہے۔''
''تو بج رہے ہیں۔ بہرحال یہاں کام ہو جائے گا۔''
بینک، انڈونیشین ریسٹورنٹ کے ساتھ ایک مصروف سڑک پر تھا۔ وجس ٹرا بذاتِ خود شہر کے قلب میں تھا۔ میں نے ڈفل بیگ کی زپ کھینچی اور نوٹوں کا بنڈل نکالا۔
''جناب میں کرائے کا فوجی نہیں ہوں۔'' وہ بولا۔
میں جانتا تھا کہ ضد کرنا بے معنی تھا۔ میں شکریہ ادا کر کے کار سے اتر گیا۔
''تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں یہیں انتظار کر رہا ہوں۔'' کناؤ نے کہا۔
بینک کا ڈبل گلاس ڈور لاک تھا۔ میں نے بیل بجائی۔ ایک نوجوان نے ڈور کھولا۔ ''ہم منتظر تھے۔ آپ میتھیو بینن ہیں؟''
''یس۔''
یہاں پرانی روایت زندہ تھی۔ ''ہم ان کے لیے ہر وقت کھلے ہیں جو بھاری رقم لے کر آتے ہیں۔''
اس نے اپنا تعارف کرایا اور مجھے اندر ایک عمر رسیدہ آدمی کے پاس لے گیا جس نے قیمتی سوٹ زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ نوجوان آدمی نے سینئر آدمی کا تعارف کرایا۔
کیشیئر ایک لڑکی تھی۔ خوب صورت چہرہ، دلکش مسکراہٹ...... مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ بنیادی وجہ غیر معمولی رقم تھی۔ لڑکی نے بیگ سے بنڈل نکال کر میز پر سیٹ کیے اور مشین کے ذریعے گنتی شروع کی۔
''کیا تمام رقم ڈپازٹ کریں گے؟'' لڑکی نے تشکیلی نظروں سے دیکھا۔
''اسی ہزار یورو الگ کر دیجیے۔''
''او کے۔'' اسی ہزار، بینک کے خاکی لفافے میں میرے حوالے کر دیے گئے۔ کاغذی کارروائی کے بعد میں باہر آ گیا۔
''یار میں ٹیکسی کر لوں گا۔'' میں نے کناؤ سے کہا۔
''بیٹھ جاؤ، نخرے مت کرو۔'' وہ بولا۔ ''رخ ایئرپورٹ کی طرف تھا۔

☆☆☆

نیویارک کے لیے اگلی فلائٹ دوسرے روز دوپہر دو بجے سے پہلے نہیں مل سکتی تھی۔ طویل انتظار ممکن نہیں تھا...... شاید دولت تمام تر خوشیاں اور سکون مہیا نہیں کر سکتی۔ تاہم زندگی ضرور بدل دیتی ہے۔ کناؤ مجھے جنرل ایوی ایشن سینٹر لے گیا۔ دو منٹ بعد میں کیپٹن ڈان کے ساتھ ٹارمک سے نکل رہا تھا۔ کیپٹن ڈان، جیٹ 900EX (فالکن) کا پائلٹ تھا۔ چارٹرڈ جیٹ تک پہنچتے پہنچتے میں اس کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ وہ بطور پائلٹ تیس سال سے کام کر رہا تھا۔ ہمارا سودا سات ہزار فی گھنٹا ڈالرز میں طے ہوا۔ میں نے اسے کیش ادائیگی کی۔
کو پائلٹ، کاک پٹ میں تھا۔ ''کہاں اتریں گے؟''
''انچاس ہزار ڈالرز کے عوض...... میں بلیکر اور پیری کے کونے میں ویسٹ ولیج، یعنی ٹیٹر بورو کو ترجیح دوں گا۔''
دونوں ہنس دیے۔ ''گڈ چوائس۔'' یہ نیوجرسی میں کارپوریٹ اور پرائیویٹ جیٹس کے لیے ایک چھوٹا سا ایئرپورٹ تھا۔ کسٹم کی بھی رسمی کارروائی تھی۔
''مسٹر بینن آپ کے لیے جیٹ میں چودہ نشستیں ہیں۔'' کیپٹن نے کہا۔ ''افسوس، مسافر ایک ہے۔''
میں نے مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مسافر دو ہیں۔ ایک بینن اور دوسرا گھوسٹ۔ اور شکوف دونوں کو ختم کرنے کے لیے پُرعزم تھا۔ ڈیڈ رائنک کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جلد یا بدیر روسیوں کو ہیروں کی فروخت کا علم ہو جائے گا۔ نیم پاگل شکوف آگاہ ہوگا کہ ہیرے فروخت کر کے میں دنیا میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ اگر واپس آیا تو کم از کم نیویارک میں اترنے کی غلطی نہیں کروں گا۔
مجھے واپس آنا تھا۔ کیتھرائن کا دل جیتنے کے لیے۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے۔ زندگی کا تیسرا موڑ...... دوسرا موڑ وہ تھا جب ڈیڈی نے مجھے یہ خونی راستہ دکھایا تھا۔ تمام تر خطرات کے باوجود مجھے واپس آنا تھا۔ میرا فیصلہ حتمی تھا۔ کیتھرائن کی محبت نے مجھے بدل دیا تھا اور وہ غیر محفوظ تھی۔
کیا ہونے والا تھا، کتنے امکانات تھے...... سوالات تھے...... میں بے خبر تھا۔ تاہم میرا مقصد واضح تھا۔
فالکن آدھی رات کے لگ بھگ ٹیٹر بورو پر لینڈ کر گیا۔ واچ لسٹ پر میرا نام نہیں تھا۔ کسٹم اور امیگریشن ایجنٹ نے میرا پاسپورٹ چیک کیا۔ اس پر مہر لگائی اور جمائی لیتے

ہوئے سوال کیا۔ ''میں پیرس، وینس اور ایمسٹرڈم کیوں گیا تھا؟''

''میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ ٹور پر گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے پاسپورٹ واپس کیا۔ اس کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ میں کون سا اس صدی کا عظیم آرٹسٹ ہوں جو چارٹرڈ طیارے پر گھوم رہا ہے...... میں ٹیکسی لے کر اپنے علاقے سے کچھ دور اتر گیا۔ اپارٹمنٹ تک کا سفر پیدل کیا۔ جوں جوں میں قریب ہو رہا تھا، میری احتیاط بڑھتی جا رہی تھی۔ نظریں ہر شے کا ایکسرے کر رہی تھیں۔ تاہم میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔

اپارٹمنٹ کی عمارت پر کیمرے کی طرف دیکھ کر میں نے بیل بجائی۔ دروازہ کھلنے پر میں سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ یورو کا بیگ نیچے رکھ کر میں نے کرال کی گن نکالی اور دروازہ کھولا۔ ہوپر کی میاؤں میاؤں سنائی دی۔ میں نے دروازہ عقب میں بند کیا۔ تاہم ناکام رہا۔

میں ناکامی پر پلٹا۔ وہ تین تھے۔ سر سے پاؤں تک مسلح۔

''واپسی مبارک ہو۔'' تینوں اندر آ گئے۔

☆☆☆

''خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔'' میں نے کہا۔

اسٹیونز، وارن اور بنجامن...... میرین کور...... ہم بوٹ کیمپ میں ملے تھے۔ ٹریننگ ساتھ کی اور شانہ بہ شانہ رزم آرا ہوئے۔ جب میں نے گھوسٹ بننے کا فیصلہ کیا تو ادراک ہوا کہ خونخوار پیشے میں تنہائی بہتر نہیں۔ نہ ہی میں ان تینوں کے علاوہ کسی پر بھروسا کر سکتا تھا۔ تینوں میرے بہترین دوست تھے۔ جاں نثار۔ میں نے آغاز ہی میں ان کو اپنی پشت پر نظر رکھنے کے لیے ہائر کیا۔ وہ پانچویں منزل پر مستقل میرے اپارٹمنٹ کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم آپس میں گلے ملے۔

''تم خوش قسمت رہے۔ ہم نے تو اڑا دینا تھا۔ تم نے بتایا کیوں نہیں کہ آ رہے ہو؟'' بنجامن نے کہا۔

''میں دن میں تمہارے دروازے پر آتا لیکن تمہیں کیونکر علم ہوا؟''

''تم نے خاموش الارم پر پاؤں رکھا تھا۔''

''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' میں نے اظہارِ حیرت کیا۔

''سوری باس۔'' اسٹیونز نے کہا۔ ''ہم نے ایک نیا الارم تیسری منزل کی لینڈنگ پر نصب کیا تھا جس دن تم روانہ ہوئے اسی دن ایک مشکوک حسینہ وارد ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کی آمد دوبارہ متوقع تھی۔''

''اس کا حلیہ؟'' میں نے سوال کیا۔

اسٹیونز نے جیب سے ایک تصویر نکالی۔ جو کلوزڈ سرکٹ کیمرے کی کارستانی تھی۔

''یہ مارتا کرال ہے۔'' میں نے بتایا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری آرٹ ٹیچر ہے۔''

''میں نے اسے چند اسباق پڑھا دیے ہیں۔ زندگی میں دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔ وہ فائنل ہار چکی ہے۔''

تینوں میں سے کسی نے پلک نہیں جھپکائی۔ مارو یا مر جاؤ، یہ چیز ان کے ڈی این اے میں شامل تھی۔

''اس کی جھلک کے بعد سے ہم زیادہ ہی الرٹ تھے۔''

''ٹھیک تھے۔ کرال کی ذمے داری تھی کہ مجھے ختم کر دے لیکن چند نئے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔''

''کیپٹن، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔'' بنجامن نے کہا۔ ''کہانی کیا ہے؟''

میں نے اختصار سے بتایا۔ والٹر، شکوف، ہیرے، پیرس، وینس، ایمسٹرڈم، کرال اور...... کیتھرائن۔

''کیتھرائن کہاں ہے؟''

''وینس سے نیویارک آنا چاہیے اُسے...... کرال سے نمٹنے کے بعد میں نے کئی بار رابطے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ شاید وہ کترا رہی ہے۔''

''روسی مافیا، تم تک پہنچنے میں ناکام رہی تو وہ اس کے پیچھے جائیں گے۔'' وارن نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو اسی لیے میں یہاں آیا کہ وہ میرے پیچھے آئیں۔'' میں نے سیل فون نکالا اور نمبر پنچ کیے۔ وقفے کے بعد اونگھتی ہوئی آواز آئی۔ ''شکوف۔''

''گھوسٹ بات کر رہا ہوں۔''

آواز کی غنودگی یک دم ہوا ہو گئی۔ ''کہاں ہو تم؟ ہیرے کہاں ہیں؟''

''میں ایمسٹرڈم میں ہوں اور ہیرے نیویارک میں۔''

''کہاں پر؟''

''میتھیو بینن کے پاس...... وہ اناڑی تھا۔ فروخت نہیں کر سکا۔ میرے پہنچنے تک ڈر کے بھاگ گیا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''اپنے اپارٹمنٹ میں چھپا بیٹھا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ جواب میں شکوف نے انوکھی گالی ایجاد کی۔

''آرام سے رہو۔ میں بھی نکل رہا ہوں۔''

''میں منتظر ہوں۔'' وہ بولا۔ رابطہ منقطع ہوگیا۔

''لڑکو تیار ہو جاؤ، روسی آرہے ہیں۔''

☆☆☆

شکوف کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے فون اٹینڈ کیا۔

''ہیلو، پرنس، میں کال کرنے......''

''وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔'' پرنس چلایا۔

''کون؟''

''کون آسکتا ہے؟ سنڈیکیٹ کے آدمی...... انہیں جواب درکار ہے۔''

''لیکن......''

''ہیرے کہاں ہیں؟'' پرنس آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''ہم کام کر رہے ہیں۔ بس ذرا خرابی پیدا ہوگئی۔''

''کیسی خرابی؟''

''کرال ماری گئی۔ وہ بیٹن تک پہنچ گئی تھی جس نے اسے ہلاک کر دیا۔'' شکوف نے فون کان سے ہٹایا۔ پرنس، کرال، بیٹن اور شکوف تینوں کو فحش گالیوں سے نواز رہا تھا۔

''پرنس، صورتِ حال بگڑی نہیں ہے۔ گھوسٹ کی کال آئی تھی۔ بیٹن ہیروں سمیت ناکام واپس آگیا ہے۔ چند گھنٹوں میں ہیرے آپ کی دسترس میں ہوں گے۔''

''میں اور نتالیا، اس وقت ائرپورٹ پر ہیں۔ سنڈیکیٹ نے بلایا ہے۔ نساؤ جائیں گے، وہاں کیا ہوگا، بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہیرے لاؤ۔ اگر اس نے فروخت کر دیے ہیں تو رقم لاؤ۔''

''پرنس میں وعدہ کرتا ہوں۔'' شکوف نے کہا۔ پرنس نے رابطہ ختم کر دیا۔ شکوف کا ہاتھ واڈکا کی بوتل کی جانب گیا۔ اس کی ٹاپ لسٹ پر پانچ پروفیشنل تھے۔ تین ''بزنس'' پر ملک سے باہر تھے لیکن ایک جمیکن اور دوسرا سی لین...... دونوں مہیا تھے۔ اس نے ٹیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ دونوں سے بات کر کے اس نے بن زیٹی کا نمبر ملایا اور اسے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کرال کے بارے میں بتایا۔ جواباً بن زیٹی نے جھوٹا اظہارِ افسوس کیا اور مطالبہ کیا کہ وہ اور رائس بھی اتنا معاوضہ لیں گے جتنا جمیکن اور سی لین کو دیا جائے گا۔ شکوف نے مالی حالت کا رونا رویا تو بن زیٹی نے آنکھیں پھیر لیں۔

''اوکے، تمہیں سستے مزدور بھی مل جائیں گے۔ گڈ بائے۔''

''اوکے، اوکے۔'' شکوف نے انہیلر اٹھایا۔ ''لیکن وقت کم ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ وہ ایک معمولی اسٹوڈنٹ ہے۔''

☆☆☆

نساؤ، بہاماس میں تھا۔ پرنس اور نتالیا جیٹ بلیو فلائٹ میں وہاں پہنچے۔ اٹلانٹس میں سنڈیکیٹ نے سوئیٹس کا پورا بلاک کرائے پر لیا ہوا تھا۔ اٹلانٹس ریزارٹ، سحر تھا، خیرہ کن تھا۔ جنت نظیر تھا...... ڈزنی لینڈ... سی ورلڈ اور لاس ویگاس تینوں کا مجموعہ تھا۔

دونوں کو ائرپورٹ سے ایک لیمو میں اوشین کلب میں لایا گیا۔ پیراڈائز آئی لینڈ کا اوشین کلب اپنی نوعیت کا واحد کلب تھا۔

''نیویارک سے نکلنے کے بعد تم نے اب تک صرف چند الفاظ کہے ہیں۔'' پرنس نے کمرے میں تنہائی میسر آتے ہی سوال کیا۔

''کیا کہنا ہے؟'' وہ بولی۔ ''ہم یہاں تفریح پر نہیں بلکہ باز پرس کے لیے بلائے گئے ہیں...... دھوکا دینے والا والٹر تھا۔ تم نے اسے پکڑا۔ تم نے اسے ٹھکانے لگوایا۔''

لیکن دونوں جانتے تھے کہ یہ آدھا سچ ہے۔ سنڈیکیٹ کو فوراً مطلع کر کے ہیرے واپس کرنے تھے جس میں وہ اب تک ناکام رہے۔ والٹر ہلاک ہو چکا تھا۔ ہیرے غائب تھے۔ سزا پرنس کو بھگتنی تھی۔

''پاپا، وہ تمہیں مار دیں گے۔'' وہ سسک پڑی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پرنس نے کھوکھلا وعدہ کیا۔ ''میں شکوف کے ذریعے رقم دے دوں گا۔ انہیں ہیرے یا رقم سے مطلب ہے۔''

''نہیں، پاپا نہیں۔ وہ مار دیں گے۔ ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔''

''نہیں ہم بھاگ نہیں سکتے۔''

نتالیا رو رہی تھی۔

☆☆☆

اٹلانٹک ریزارٹ کے رائل ٹاورز میں بارہ سو ایک کمرے تھے۔ بارہ سو کے بعد اکلوتا برج سوئٹ دس کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کی شان تصور سے پرے تھی۔ دنیا کا مہنگا

ترین سوئٹ۔ ایک رات کے پچیس ہزار ڈالرز۔ یہاں ڈائمنڈ سنڈیکیٹ کی میٹنگ تھی۔ پرنس کا باڈی اسکین کیا گیا پھر ای ایم ایف میٹر سے چیک کیا گیا۔ نتالیا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ پرنس کو پُرتعیش لیونگ روم لایا گیا۔ چھ آدمی گراں قدر صوفوں پر براجمان تھے۔ چھٹا آدمی پُراسرار تھا۔

سینئر ہیڈ نے کہا۔ ”رمی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ تم جانتے تھے، والٹر ہیرا پھیری کر رہا تھا؟“

”نہیں۔“ پرنس نے جواب دیا۔ ”وہ جب بھی گاہکوں تک ہیرے پہنچاتا۔ پوری رقم لا کر دیتا تھا۔ میرے تمام لیجرز گواہ ہیں جنہیں ہر ہفتے چیک کیا جاتا تھا۔ چند مہینے پہلے مجھے شک ہوا کہ وہ ہر شپمنٹ پر چند ہیرے اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔“

”ہمارے گاہک ہم پر بھروسا کرتے ہیں۔“ سینئر ہیڈ آرنوف نے کہا۔ ”ان کے بغیر ہم ”کاروبار“ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ یہ ہماری ساکھ کا معاملہ تھا۔“

پرنس ابھی تک کھڑا تھا۔ ”بلاشبہ، اسی لیے مجھے اسے ختم کرنا پڑا۔“

”اور ہیرے؟“

”بدقسمتی سے انہیں کسی نے والٹر کی ملکیت سے چرا لیا...... میرے آدمی کام کر رہے ہیں اور ہیروں کے بہت قریب ہیں۔“

”ویری گڈ، بیٹھ جاؤ۔“

پرنس صوفے پر بیٹھ گیا۔ آرنوف کے سامنے میز پر سماوار سے خوشبودار بھاپ نکل رہی تھی۔ آرنوف نے کافی چائنا کپ میں انڈیلی۔ ”یہ لینن گراڈ سے برآمد کی گئی ہے۔ تم یقیناً پسند کرو گے؟“

”بہت شکریہ۔“ پرنس نے کہا۔

”جھوٹ!“ آرنوف غرایا اور سماوار اٹھا کر پرنس کی گود میں پھینک دیا۔ پرنس چیخ مار کے اُچھلا...... تیزی سے بیلٹ کھولی۔ اس کی پتلون ٹخنوں تک چلی گئی۔ گھٹنوں سے اوپر اور ناف سے نیچے کا بیشتر حصہ بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ کھولتی کافی کے اثرات اذیت ناک تھے۔ ”والٹر احمق تھا، ہم نہیں ہیں...... اس نے چوری کی اور تم نے اس کی مدد کی۔“ آرنوف نے قہرآلود نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں اپنی ماں کی قبر کی قسم کھاتا ہوں، یہ غلط ہے۔“

دوسری طرف وہاں موجود دوسرے افراد آرنوف کی تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

”میں نارتھ امریکن آپریشن چلا رہا تھا۔ میرے پاس ایسی حرکت کا کوئی جواز نہیں تھا۔“ پرنس کی حالت ابتر تھی۔

آرنوف چھٹے اجنبی ممبر کی طرف مڑا۔ ”تمہیں یقین ہے اس پر؟“

”نہیں۔“

آرنوف کھڑا ہو گیا۔ ”رین ٹوف گٹوف تمہاری جگہ نیا ممبر ہے۔“ اس نے اعلان کیا۔ ”تم گولڈن بوائے تھے۔ پانچ سال میں یہاں بیٹھے ہوتے...... تمہاری غلطی کی سزا دس ملین ڈالرز ہیں۔ اگر تم دے سکتے ہو تو روس واپس جا کے باقی دن گزارو...... یہ آفر تمہاری سابقہ خدمات کی وجہ سے ہے۔“

پرنس کی شان، دبدبہ اور خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ تاہم جان بچتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ”شکریہ...... شکریہ......“

☆☆☆

میں کیتھرائن کے لیے بے قرار تھا۔ خدشہ تھا کہ شکوف مجھ سے پہلے اس تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے فون کیے، پیغام دیے...... ای میل...... تاہم کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اس کی حفاظت ہر شے پر مقدم تھی۔

ہم پانچ منزلہ عمارت میں قلعہ بند تھے۔ وارن نے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اسٹیونز پہلی منزل پر تھا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں دشمنوں کا منتظر تھا۔ بنجامن اور میں اپنے اپارٹمنٹ میں ایک ساتھ تھے۔ ہم پوری طرح مسلح اور تیار تھے۔ اس مرتبہ میدانِ جنگ ”ہوم ٹرف“ تھی۔ ایک آدھ بار وہاں ہم نے غلط منصوبہ بندی کے باعث چند ساتھی کھو دیے تھے۔ یہاں اس مرتبہ ایسا نہیں ہو گا۔ شکوف کے ذہن میں کیا ہے...... ہمیں نہیں معلوم۔

”کیا ہمارا منصوبہ صحیح ہے؟“ بنجامن نے سوال کیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”یہ مردود کاکروچز کے مانند ہیں۔ اگر ہم جیت بھی گئے تو کل اور آ جائیں گے۔ پرسوں اور...... شکوف جانتا ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو۔“

”میرے پاس چوائس نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی توجہ کیتھرائن پر سے ہٹی رہے۔“

”گزشتہ برسوں میں گھوسٹ کی حیثیت میں تم کسی کے ریڈار پر نظر نہیں آئے۔ اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔ روسی مافیا میتھیو بینن کے پیچھے لگ گئی ہے۔ کیا بقیہ زندگی بھاگتے رہو گے۔“

''میں کہیں نہیں بھاگ رہا۔ جب تک کیتھرائن کو قائل نہ کرلوں اور وہ میرے ساتھ نکل جائے۔''
''اگراس نے ہاں کہہ دی؟''
''پھر کوئی ہم دونوں کو نہیں جکڑ سکتا۔ میرے پاس دولت ہے، تجربہ اور دنیا کے تین بہترین باڈی گارڈ۔''
میرے سیل فون نے آواز دی۔ میں نے کالر آئی ڈی دیکھی۔ وہ کیتھرائن تھی۔ میں چونک اٹھا۔ ''ہیلو''
دوسری طرف سے اس کے سسکنے کی آواز آرہی تھی۔
''کیتھرائن، کیا بات ہے؟''
''لیونارڈ...... انہوں نے لیونارڈ کارنس کو گولی مار دی۔''
یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔ مجھے کیتھرائن تک پہنچنا تھا۔
''تم کہاں ہو؟''
''سب اسٹیشن۔ میں پہنچی......'' رابطہ منقطع ہوگیا۔
''لعنت ہے......'' میں بنجامن کی طرف مڑا۔ ''انہوں نے آرٹ اسکول کے ایک آدمی کو شوٹ کر دیا ہے۔ ہمیں فوراً کیتھرائن تک پہنچنا ہے۔'' میں دوبارہ نمبر ملانے لگا۔ اسی وقت واکی ٹاکی نے متوجہ کیا۔
''بارٹینڈر ٹو ڈی جے، اوور۔'' چھت سے وارن کی آواز تھی۔
بنجامن نے جواب دیا۔ ''ڈی جے، گو بارٹینڈر۔''
''پانچ رقاص آرہے ہیں۔''
''راجر، ڈور مین سے کہو آنے دے۔ ہمارے ساز تیار ہیں۔ اوور اینڈ آؤٹ۔''

☆☆☆

وہ تین کاروں میں پہنچے تھے۔ تینوں کاریں سیاہ رنگ کی تھیں۔ انہوں نے پارکنگ ایک بلاک کے فاصلے پر کی تھی۔ نظر سے دور تھے لیکن کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ وارن کے پاس ٹاپ آف دی لائن کیمرا تھا۔ میں اور بنجامن وڈیو مانیٹر پر آئے۔
''پہلا جوڑا۔''
وہ دونوں کار سے برآمد ہوئے تھے۔ اور کار کے قریب کھڑے ہوگئے۔ وارن نے کیمرا 22x آپٹیکل زوم پر کیا۔ سیاہ آدمی کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان تھا۔ بائیں کان سے کالر تک۔ اروم کلارک، جمیکین ہٹ مین۔'' بنجامن نے کہا۔
کیمرے نے حرکت کی۔ ''روزاریو ورزی، سسی لین، شکوف انہیں لایا ہے...... اس کا مطلب وہ بہت بے چین ہے۔'' دوسری جوڑی کراؤن میں تھی...... ڈرٹی کاپس۔ نک بن زیٹی فیڈیکس کے گیٹ اپ میں ہے۔ پارٹنر جان رائس ساتھ ہے۔ تمہاری بے عزتی کے مترادف ہے۔ وہ تمہیں کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔''
''لیونارڈ کارنس نے مجھ پر قرض چڑھا دیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام آرٹسٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''
پانچواں آدمی مرسیڈیز میں بیٹھا رہا۔ کیمرے نے زوم بڑھایا...... ونڈ شیلڈ کی دوسری جانب شکوف کا چہرہ تھا۔
''میں پیچھے اسٹیونز کے پاس جاتا ہوں۔ انہیں یہاں آنے دو۔ عقب سے ہم دونوں گھیر لیں گے۔'' بنجامن نے کہا۔
وقتِ رست وخیز۔ رزم گاہ سج رہی تھی۔

☆☆☆

بن زیٹی، فیڈیکس کے روپ میں آیا اور فرنٹ ڈور کی گھنٹی بجائی۔
''کون ہے؟'' میں نے انٹر کام پر سوال کیا۔
''فیڈیکس، میتھیو بیٹن کے لیے؟''
''ہاں، لیکن میں شاور لینے والا ہوں۔ ڈور پر چھوڑ دو۔ میں بعد میں اٹھا لوں گا۔''
''نہیں، دستخط کی ضرورت ہے۔''
''کس کی طرف سے ہے؟''
''کیتھرائن سن بورن۔''
''اوپر آجاؤ۔'' میں نے کہا۔
وہ اندر آیا۔ اس کے عقب میں تین افراد بھی عمارت میں داخل ہوگئے۔ اسٹیونز کی کال آئی۔ ''تین اوپر گئے ہیں۔ ایک فرنٹ ڈور پر ہے۔''
تیس سیکنڈ بعد میرے دروازے پر دستک ہوئی۔
''فیڈیکس۔''
''دروازہ کھلا ہے۔'' میں نے کہا۔ وہ تینوں ایک ساتھ اندر آئے۔ سائلینسر کے ساتھ اسلحہ ہاتھوں میں تھا لیکن وہاں فائرنگ کے لیے کوئی ٹارگٹ نہیں تھا۔ وہ محتاط انداز میں لیونگ روم میں پھیل گئے۔
''ڈلیوری کا کیا کروں؟ کہاں ہو؟''
''باتھ روم میں...... آرہا ہوں۔'' میری آواز سنتے ہی ورزی نے بن زیٹی کو ایک طرف کیا اور باتھ روم کی طرف لپکا۔ لات چلی، ڈور ناب کے قریب اس نے بوٹ سے ٹھوکر لگائی تھی۔ دروازہ دھماکے سے اندر کی طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ دروازہ دیوار سے ٹکراتا۔ میں نے پلک

جھکتے ہی گولی اس کے سر میں اتار دی۔ اسے اندر آنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس نے فرش چوما۔ مجھے جمیکین لپکتا دکھائی دیا۔ میں نے فائر کیا...... لیکن وہ تیز تھا۔ سیدھا افقی انداز میں اُڑتا ہوا مجھ سے ٹکرایا۔ ہم دونوں زمین بوس ہوئے......

بن زیٹی گن فائٹنگ سے زیادہ گالم گلوچ اور ہاتھا پائی سے آشنا تھا۔ اس نے اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہم دونوں بال بال بچے۔ جمیکین، کلارک نے غراتے ہوئے گردن موڑی اور بن زیٹی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ گولی اس کی ران چیر کر نکل گئی۔ بن زیٹی بھدے انداز میں نیچے گرا۔ کلارک میری جانب متوجہ ہوا۔ ہم دونوں نے گن نہیں چھوڑی تھی۔ تاہم میرا گن والا ہاتھ اس کے گھٹنے کے نیچے تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گن والی کلائی جکڑی ہوئی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ میرے چہرے کے قریب آرہی تھی۔ چند انچ کے بعد گن بیرل کا رخ بدل جاتا اور وہ بے محابا فائر کرتا۔ اگر وہ اسمارٹ ہوتا تو زور لگانے کے بجائے میرے چہرے پر ضرب لگا کے مہلت حاصل کر لیتا پھر بہ آسانی میرا کھوپڑا اڑا دیتا لیکن اسے اپنی طاقت پر بھروسا تھا اور وہ اسی کا استعمال کر رہا تھا۔

یہ میرا طریقہ کار نہیں تھا۔ نہ ہی ڈیڈی کا۔ ڈیڈی کے سبق کے مطابق پہلا اصول یہ تھا کہ ''کوئی اصول نہ بناؤ۔'' فتح کے لیے جو کر سکتے ہو کرو۔ لات چلاؤ، بال کھینچو، آنکھوں میں انگلیاں مارو...... کاٹو...... جیتنے کے لیے کچھ بھی کرو۔ اس کا خالی ہاتھ میرے چہرے پر تھا۔ میں نے انگوٹھے کے جوڑ پر دانت گاڑ دیے۔ میں نے پوری طاقت صرف کر دی تھی۔ میرے دانت کھال اور گوشت پھاڑتے ہوئے جوڑ کے پار ہو گئے۔ میں نے انگوٹھے کی خون آلود پور اس کی آنکھ پر تھوک دی۔ اس کے حلق سے کریہہ چیخ برآمد ہوئی...... جسم عقبی سمت میں گیا۔ میرے گن والے ہاتھ پر سے دباؤ کم ہو گیا۔ ہاتھ کھینچ کر میں نے گولی اس کی ناک کے نیچے ماری، ہم دونوں اس کے خون میں بھیگ گئے۔ میں نے کروٹ لی اور اٹھ کر باتھ روم سے نکلا۔

میں بن زیٹی کے پیچھے تھا جو اپارٹمنٹ سے نکل کر لنگڑاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ سامنے چوتھی منزل کی لینڈنگ پر بنجامن ایستادہ تھا۔ بن زیٹی کی ٹانگ لہو سے تر تھی۔ تو ملی میٹر کی گلوک سے بنجامن نے فائر کیا۔ گولی بن زیٹی نے بھی چلائی تاہم فرق تھا۔ بن زیٹی گولی کھا کر سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔

فرسٹ فلور سے رائس چیخ رہا تھا۔ ''ٹک، ٹک...... تم ٹھیک ہو؟'' پھر دوڑتے قدموں کی آہٹ اوپر کی جانب آئی۔ دس بارہ قدموں کے بعد اسٹیونز کی گن نے سرگوشی کی...... گیم از اوور۔ سب نے ہی سائیلنسر استعمال کیا تھا۔ لہٰذا فائرنگ کی آواز دبی رہی۔

واکی ٹاکی نے سانس لی۔ ''بارٹینڈر ٹو ڈی جے۔ شگوف کو گڑبڑ کا علم ہو گیا ہے۔ غالباً اندر آنے والے وائر کنکشن کے ساتھ تھے یا پھر سیل فون کھلا رکھا تھا۔ شگوف مرسیڈیز کے ساتھ عمارت کے بالکل سامنے آگیا ہے۔ شوٹ کر دوں؟'' چھت سے وارن کی آواز تھی۔

''اٹینڈ ڈاؤن، بارٹینڈر...... گولی مت چلانا۔'' بنجامن نے کہا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وارن جواب دے گا۔ ''راجر دیٹ۔'' اس کے بجائے اس کی ہیجانی آواز آئی۔ ''اوہ نو...... میتھیو، وہ کیتھرائن ہے۔''

میں نے واکی ٹاکی لیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، وہ سیدھی یہاں آرہی ہے۔''

اسٹیونز نے کہا۔ ''میں اُسے لاتا ہوں۔''

''رک جاؤ۔'' وارن کی آواز آئی۔ ''شگوف کے پاس گن ہے۔''

''کیتھرائن کس طرف ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''عمارت سے تیس فٹ کے فاصلے پر...... اوہ نو۔ شگوف نے اسے دیکھ لیا ہے۔''

''اسے گرا دو۔'' میں چلایا۔

''ممکن نہیں ہے۔ اس نے کیتھرائن کو پکڑ لیا ہے۔''

''میں جا رہا ہوں، مجھے کور دو۔'' اسٹیونز نے کہا۔

''وہ اسے کار میں لے جا رہا ہے۔'' وارن کراہ اٹھا۔

☆☆☆

اسٹیونز بار بار معذرت کر رہا تھا۔ وہ واقعتاً افسردہ تھا۔

''مجھے چاہیے تھا کہ......'' میں نے ہاتھ پکڑ کر اُسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب لاعلم تھے کہ وہ آرہی ہے۔'' اب شگوف اسے سودے بازی کے لیے استعمال کرے گا۔ ہیرے لے کر اسے چھوڑ دے گا...... ممکن ہے کہ نہ بھی چھوڑے۔ وہ سب کافی نقصان اٹھا چکے ہیں اور بھرے بیٹھے ہیں۔''

سیل فون نے آواز دی۔ کال میرے نمبر پر آئی تھی۔ وہ کیتھرائن تھی۔

''تم کہاں ہو؟''

''نہیں معلوم۔ کسی کار میں ہوں...... نامعلوم آدمی کی گرفت میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کتیا۔'' شکوف کی آواز آئی۔ ''فون مجھے دو۔''

کیتھرائن کے رونے کی آواز آئی پھر شکوف کی آواز۔ ''بیشن سن رہے ہو، تمہاری گرل فرینڈ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

''اسے جانے دو۔ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے...... میں اور تم......''

''میں اور تم؟'' وہ پھنکارا۔ ''مجھے یہی نہیں پتا کہ تم ہو کون۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں شکوف ہوں۔ جس کے ہیرے تم نے چرائے ہیں۔ جو مجھے واپس چاہئیں۔''

''او کے، او کے...... اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرنا۔''

''اس وقت تک وہ محفوظ ہے۔ آرام سے میری گود میں سر رکھ کے لیٹی ہے۔''

''میں قسم کھاتا ہوں، اگر تم نے اسے چھوا بھی تو تمہاری گود میں کچھ بھی نہیں بچے گا۔ چاہے تم دنیا میں کہیں بھی چلے جاؤ۔''

''ٹف، ویری ٹف......'' وہ بولا۔ ''یقین نہیں آتا کہ کوئی آرٹ اسٹوڈنٹ بات کر رہا ہے...... تم مسٹر بیشن ہو؟''

''ہاں، اور مجھے کیتھرائن واپس چاہیے۔''

''مجھے ہیرے درکار ہیں۔''

''ہیرے یہاں ہیں۔ کیتھرائن کے بدلے تبادلہ کر لیتے ہیں۔ اسے چھونا مت نہ ہاتھ چلانا۔''

''ہوشیار مت بنو۔'' وہ بولا۔ ''ولیمز برگ برج کے نیچے ایک گودام ہے۔''

''نہیں، میں ہیرے وہیں لاؤں گا جہاں سے اٹھائے تھے۔''

''وہاں ہجوم ہوگا۔'' شکوف نے کہا۔

''مجھے بھیڑ بھاڑ پسند ہے۔ خطرہ کم ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ اگر تمہیں خدشہ ہے تو رات دس بجے تبادلہ کرتے ہیں۔ رش کم ہو جائے گا۔ اگر تم نے مہذب انداز اپنایا تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ ہم دونوں خوش رہیں گے۔''

''کیتھرائن کے ساتھ میں خوش ہوں، دس بجے۔'' وہ بولا۔

☆☆☆

فائنل کا فائنل ہونے جا رہا تھا۔ اسٹیج تھا گرینڈ سینٹرل ٹرمینل، جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی اور ہیرے میرے پاس نہیں تھے۔ شکوف خوش نہیں تھا۔ تاہم اس نے غالباً یقین کر لیا تھا آرٹ اسٹوڈنٹ بھیڑ میں خود کو محفوظ خیال کرے گا۔

حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے ٹرمینل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ گن فائٹنگ کے لیے وہی بہترین مقام تھا۔ میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر رزم گاہ کا رخ کرنے کے لیے بہترین منصوبہ بندی کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نازک، فیصلہ کن اور بھیانک صورت حال ہے۔ کیتھرائن کی موجودگی اور ہیروں کی غیر موجودگی میں ہنگامہ رست وخیز دھواں دھار اور خونخوار ہوگا۔ خون بہے گا۔ شاید یہ میری زندگی کی آخری جنگ ہو۔ کیتھرائن کے لیے مجھے جان لڑا دینی تھی۔ جاں نثاروں کے ذہن میں بھی ایک ہی بات تھی...... تیاری مکمل کرنے کے بعد ہم نے ایریل سرویلنس کا انتظام کیا۔ میں اپنی زندگی کے بدترین چیلنج سے دوچار تھا۔ مشن خودکشی کے مترادف تھا۔ آخری کام ڈیڈی کو فون کرنا تھا۔

مام سے بات کرنے کے بعد میں نے ڈیڈی کو بلوایا۔

''بوائے، کیا ہو رہا ہے؟'' ڈیڈی کی آواز آئی۔

آخری کال میں نے میلان سے کی تھی۔ اس سے آگے میں نے تمام کہانی سنائی۔

''میرے لیے کیا کام ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

میں نے ڈچ بینک کے بارے میں بتایا اور بتایا کہ رقم کیسے نکلوا کر کیسے تقسیم کرنی ہے۔ آدھی رقم وارن، بنجامن اور اسٹیونز کے حصے میں آئے گی۔ باقی نصف آپ اور مام کے لیے۔''

ڈیڈی ہنسنے لگے۔

''کیا ہوا؟''

''میں ایک پینی بھی نہیں دیکھ سکوں گا...... تمہارے مرنے پر تمہاری ماں پہلے مجھے ختم کرے گی۔ دوسری بات سنو، تم بڑی غلطی کر رہے ہو۔''

''کیسی غلطی؟''

''تم وصیت کر کے میدانِ کارزار میں اترو گے۔ یعنی ذہن میں شکست لے کر...... یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ہارنے کے لیے اترو گے تو ہارو گے۔ جیتنے کے لیے جاؤ گے تو فاتح رہو گے۔ لہٰذا جاؤ اور جیت کے آؤ تمہارے ساتھ کیتھرائن کی زندگی بھی لائن پر ہے اور تمہارے بوڑھے باپ کی بھی۔''

’’شکریہ ڈیڈی، آئی لو یو۔‘‘
’’لو یو ٹو، بوائے۔‘‘

☆☆☆

گزشتہ دھماکوں کے بعد سے گرینڈ سینٹرل پر سیکیورٹی بڑھا دی گئی تھی۔ ہم بائیکل جورڈن اسٹیک ہاؤس میں شمالی بالکونی پر تھے۔ ہم نے کھانے کا آرڈر دیا اور بیس فٹ نیچے کا نظارہ کرنے لگے۔
’’اس طرف دیکھو‘‘ میں نے نیچے ایک جانب اشارہ کیا۔ ’’تبادلے کے لیے وہ جگہ موزوں ہے۔‘‘
بنجامن مسکرایا۔ ’’کیسا تبادلہ؟ کیتھرائن اور ہیروں کا یا پھر گولیوں کا...... جو اس وقت برسنا شروع ہوں گی جس لمحے شکوف کو احساس ہوگا کہ بیگ میں رائن اسٹون (مصنوعی ہیرے...... سستی جیولری) ہیں۔‘‘
’’شکوف جلسازی سمجھنے میں کتنا وقت لے گا؟‘‘ وارن نے سوال کیا۔
فاصلے سے بظاہر سب ٹھیک معلوم ہوگا اور مجھے مدد ملے گی کہ میں کیتھرائن کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بیگ کھولتے ہی اسے معلوم ہو جائے گا۔‘‘
’’اور شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔‘‘ بنجامن بولا۔
’’شکوف پاگل ہو جائے گا۔ کوشش کے باوجود، کچھ عام افراد خوامخواہ مارے جائیں گے۔‘‘
’’یہ ہماری بدترین جنگ ہے، کیا کر سکتے ہیں؟‘‘ اسٹیونز نے مجبوری ظاہر کی۔

☆☆☆

اسٹیونز کو ہم نے عقب میں نگرانی کے لیے رکھا۔ باقی افراد نے مور چابندی کرتے ہوئے سب وے کو پشت پر رکھا۔ میں نے دہری بلٹ پروف پہنی ہوئی تھی۔ ساڑھے پانچ بجے اسٹیونز کی آواز کان میں آئی۔
’’دو جوان آدمی سوٹ میں ملبوس پہنچے ہیں۔ وہ علاقے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ انہیں تمہاری فکر نہیں۔ وہ پولیس اور کیمروں کی گنتی کر رہے ہیں۔‘‘
’’یہ میری توہین ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’نہیں، تم ان کے لیے آرٹسٹ ہو۔ انہیں پولیس کی زیادہ فکر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تین مقام ہیں، جہاں شکوف اپنے آدمی کھڑے کرے گا۔‘‘
’’تم کیسے کہہ سکتے ہو؟‘‘
’’وہ براڈ کاسٹنگ کر رہے ہیں۔ وہاں، وہاں اور وہاں۔‘‘
’’گڈ جاب۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کچھ غلط محسوس کرو تو کال کرنا۔‘‘ میرے پیٹ میں تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ جنگ سے پہلے یہ کیفیت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اگر کوئی فوجی انکار کرے تو وہ جھوٹا ہے۔
’’شکوف کے آدمی مجھے اناڑی لگتے ہیں۔‘‘ بنجامن نے تبصرہ کیا۔
’’میرے خیال میں.. یہ نکتہ ہمارے خلاف جاتا ہے۔ اناڑی جلدی بدحواس ہو جاتے ہیں اور فائرنگ شروع کر دیتے ہیں...... میں نہیں چاہتا کہ عام لوگ مارے جائیں جیسے ہی کیتھرائن خطرے سے باہر ہو، اسے لے کر نکل جانا، فاسٹ۔‘‘
’’فکر نہیں کرو۔‘‘

☆☆☆

سات بجے ہم اپنی اپنی پوزیشن پر تھے۔ ہمیں تین گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ وارن، بیتالیس ایسٹ، انٹری سے باہر لیکسنگٹن ایونیو سب وے پر تھا۔ بنجامن ٹرمینل کی جنوبی سمت کو کور کر رہا تھا۔ اسٹیونز، پینتالیس وینڈر بیلٹ پر موجود تھا۔ میں بیگ ہاتھ میں لیے ٹرمینل میں تھا۔ ہم چاروں وائرلیس کمیونیکیشن سسٹم کے ساتھ منسلک تھے۔ یہ سسٹم سیکرٹ سروس کے زیر استعمال رہتا ہے۔
دس بجے اور وقت گزر گیا۔ سوا دس...... ساڑھے دس۔ پونے گیارہ۔ شکوف کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ بالآخر پہلے بنجامن کی آواز کان کے مائیکروفون میں آئی۔ ’’کیا کرنا ہے؟‘‘
’’وہ آئے گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’وہ ہمیں تھکانا چاہتا ہے۔‘‘
اتنا انتظار کچھ بھی نہیں تھا۔ میدانِ جنگ میں ایک مرتبہ اسنائپر رائفل کے ساتھ میں نے ہلے بغیر بہتر (72) گھنٹے گزارے تھے لیکن یہ ’’کام‘‘ کیتھرائن کی وجہ سے دشوار لگ رہا تھا۔ وہ تھی بھی ایک جنونی کے ہاتھوں میں۔ میں انتظار گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ مسافر کم ہوتے چلے گئے۔ میں اور میری ٹیم تیار تھی۔
سوا گیارہ...... ساڑھے گیارہ...... پونے بارہ، بارہ سے چند منٹ قبل میرا اسیل فون بیدار ہوا۔ آئی ڈی بتا رہی تھی کہ کیتھرائن کا فون ہے لیکن سرد اور بے رحم آواز شکوف کی سنائی دی۔ میرے فون اٹینڈ کرنے پر اس نے کہا۔ ’’کھیل ختم۔‘‘

''کیا مطلب؟ کہاں ہو؟ میں کب سے یہاں انتظار کررہا ہوں۔''

''ہیرے بھون کے کھالو۔''

''کیا بکواس ہے، ہماری ڈیل کا کیا ہوگا؟''

''ڈیل ختم۔ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ ہیرے ایمسٹرڈم میں فروخت ہو چکے ہیں۔''

''پاگل مت بنو...... ہیرے یہاں میرے ہاتھ میں ہیں۔''

''جینئن، معلوم ہے، میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ سات انچ، کاربن اسٹیل چھری۔ جیسے ہی میرے آدمی تمہاری حسین چھوکری کے ساتھ کھلواڑ ختم کریں گے۔ میں چھری سے اس کا گلا تراش دوں گا۔'' اس نے فون بند کردیا۔

میں بُت بن گیا تھا۔ سانس لینا دشوار تر تھا۔ مسامات نے پسینہ اُگلنا شروع کردیا۔

☆☆☆

وارن کی کال پر میں نے بتایا کہ روسی نہیں آرہے۔ ڈیل ختم ہوگئی ہے۔ مجھے ادراک تھا کہ سب اذیت میں ہیں...... اکا دُکا مسافر بھی غائب ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد بنجامن نے سناٹے کا پردہ چاک کیا۔ ''تم نے کہا وہ نہیں آرہے لیکن مرسیڈیز ''گرینڈ حیات'' کے قریب ہے۔''

''حیات'' سینٹرل ٹرمینل کے قریب تھا۔ ''شہر میں بہت مرسیڈیز ہیں۔ تصدیق کرو کہ وہی ہے؟''

''ایک منٹ۔'' بنجامن نے کہا۔ میں نے تصور میں اسے تین ہزار ڈالرز کی تیرہ ایکس اسٹینر، اسنائپر گریڈ کی دوربین ایڈجسٹ کرتے دیکھا۔

''وہی ہے۔ فرنٹ سیٹ پر...... پسنجر سائڈ۔ عقبی نشست پر کم از کم دو آدمی ہیں۔''

فوراً بعد اسٹیونز کی کال آئی۔ وہ وینڈر بیلٹ پر تھا۔ ''میں تین آدمیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ان میں سے دو پہلے ہی نظر سے گزر چکے ہیں۔ چند سیکنڈ میں تم انہیں دیکھ لوگے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی تین آدمی وینڈر بیلٹ سے داخل ہوئے۔ تینوں علیحدہ ہوکر اس پوزیشن پر گئے۔ جہاں نقشے پر ہم نے پہلے ہی تین نشان لگائے تھے۔ منطقی اعتبار سے انہوں نے درست پوزیشن سنبھالی تھی۔ شکوف باہر ہی تھا۔ میں نے چہل قدمی بند کردی تھی۔ چند سیکنڈ بعد شکوف کی کال آئی۔ ''ایسا بہت اذیت ناک ہوتا ہے، ناقابلِ برداشت...... جب تم اپنے چاہنے والے کو کھوتے ہو۔ وہ بھی کسی قسائی کے ہاتھوں۔ مجھے بھی اذیت ہوئی تھی جب تم ہیرے چُرا کے بھاگے تھے لیکن میرے پاس اختیار ہے کہ تمہارا درد اتنا گہرا کردوں، جو قبر تک ساتھ جائے۔ سمجھ رہے ہو؟''

''سمجھ رہا ہوں۔''

''میرے ہیرے کہاں ہیں؟''

''یہاں میرے ہاتھوں میں۔ میں فروخت نہیں کرسکا۔''

''تمہارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ کیونکہ تمہاری کھوپڑی میں مغز نہیں ہے...... اس وقت کہاں ہو؟''

میں نے اسے صحیح لوکیشن بتائی۔ اس نے فون بند کردیا۔

کانوں میں بنجامن کی سرگوشی سنائی دی۔ ''مرسیڈیز سے دو آدمی نکلے ہیں...... اور ہاں وہ کیتھرائن ہے۔''

میری سانس رک گئی۔ شکوف کو ملا کر تین اور تین پہلے ہی آچکے تھے...... چھ۔ اگر ڈرائیور بھی شامل ہے تو سات...... آٹھویں کیتھرائن تھی۔ ''پوزیشن براوو۔'' میں نے ہدایت جاری کی۔

☆☆☆

شکوف...... پستہ قد، بھاری، جسم پر ٹیٹوز کے نشانات...... سانس کا مریض۔ ماربل کی رہ گزر پر اسٹریٹ بیالیس سے داخل ہوا۔ ایک بازو کیتھرائن کے بازو میں تھا۔ میری شریانوں میں دوڑتا خون گویا کھول اٹھا۔ میں نے بمشکل خود کو ٹھنڈا رکھا۔ کیتھرائن جو ہر حال میں گلاب کے مانند حسین اور تازہ دم دکھائی دیتی تھی۔ ذہنی اور روحانی اذیت نے اس کی روح کو زخمی کردیا تھا جبکہ شکوف پُراعتماد تھا۔ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ وہیں رک گیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے عقب میں دو روسی مستعد کھڑے تھے۔ شکوف نے گرینڈ سینٹرل کے وسیع احاطے کو دیکھا اور مضحکہ خیز انداز میں مجھے سیلیوٹ کیا۔ بعد ازاں فون نکال کر رابطہ قائم کیا۔

''ہیرے لاؤ۔'' اس نے گویا حکم جاری کیا۔

''کیتھرائن کو چھوڑ دو۔'' میں نے بیگ نیچے رکھ دیا۔

''وہ کہیں نہیں جائے گی۔ جب تک میں ہیرے نہ دیکھ لوں...... شرافت اور آہستگی سے ادھر آؤ۔ تین عدد گنز تم پر ہیں اور تین ہی تمہاری دوست پر۔''

میں نے سیل کی آواز بند کردی اور شکست خوردگی کے عالم میں سرکالر کی طرف جھکا کر بڑبڑایا۔ ''وقت آگیا ہے۔''

''ہم تیار ہیں۔''
میرے اور شکوف کے درمیان دو سوفٹ کا فاصلہ ہو گا۔ میں نے قدم اٹھایا اور ''آپریشن نائٹ ہاک'' کا آغاز ہو گیا۔ شہر جاگنے والوں کا تھا۔ سیکڑوں افراد میدان جنگ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ سیڑھیوں پر، ریسٹورنٹس میں...... کچھ لیٹ نائٹ میٹرو کے منتظر تھے۔

''وینڈر بیلٹ کی بالکونی میں ایک پولیس مین کھڑا ہے۔'' کان میں اسٹیونز کی آواز آئی۔ ''نہیں معلوم تمہیں دیکھ رہا ہے یا خلا میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔''

میں نے سر اٹھا کے نہیں دیکھا اور چلتا رہا۔ سوفٹ کے بعد کیتھرائن مجھے صاف نظر آنے لگی۔ اس کی پینٹ پر گند اور گریس کے دھبے تھے۔ بال اُلجھے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ جن میں دہشت کی آمیزش عیاں تھی۔ تیس فٹ کے فاصلے تک پہنچ کے میں رک گیا اور فون کی آواز کھول دی۔ ''شکوف، جہاں تک آسکتا تھا...... آ گیا۔''

فون اور بیگ دونوں میں نے نیچے رکھ دیے۔ بیگ کھول کر رائن اسٹون مٹھی بھر کے نکالے...... مٹھی کھولی۔ سستے مصنوعی ہیرے دوبارہ بیگ میں چلے گئے۔ میں نے بیگ بند کیا اور فون اٹھا لیا۔

''تم ہیرے دیکھنا چاہتے تھے۔ دیکھ چکے ہو۔ اپنے آدمی سے کہو کہ کیتھرائن کو لائے اور ہیرے اٹھا لے۔'' میں نے کہا۔

شکوف ہچکچایا۔

''تاخیر مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''مغربی بالکونی میں ایک پولیس مین کھڑا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اس ڈرامے میں دلچسپی لے، ہمیں نکل جانا چاہیے۔''

شکوف نے سر اٹھا کے پولیس کے آدمی کو دیکھا پھر مڑ کر ایک قوی الجثہ آدمی سے کچھ کہا۔ میں اس کا نام گریگور ہی سمجھ سکا۔ باقی الفاظ روسی زبان کے تھے۔ شکوف نے کیتھرائن کا بازو چھوڑ دیا۔ گریگور اور کیتھرائن میری طرف آئے۔ دو فٹ کے فاصلے پر گریگور رک گیا۔ کیتھرائن سر سے پیر تک خوف کی تصویر بنی تھی۔

''بیگ اٹھاؤ۔'' میں نے گریگور کو مخاطب کیا۔ ''شکوف کے حوالے کرو اور ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔'' میں نے انتظار کیا کہ وہ جھک کر بیگ اٹھائے گا لیکن نہیں۔ اس کے بجائے اس نے بوٹ کی مدد سے بیگ کی پوزیشن تبدیل کی اور کک ماری۔ بیگ ماربل پر پھسلتا ہوا شکوف کے قدموں میں رکا۔

بیگ کھولنے اور ہیروں کی اصلیت سمجھنے میں شکوف نے دس سیکنڈ لیے۔ گریگور خاموش کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ گن اور دوسرا کیتھرائن پر تھا۔

میں نے ''کالر'' سے کہا۔ ''شروع ہو جاؤ۔''

وہ اسموک گرینیڈ کا رک سیک بیگ تھا۔ اسٹیونز نے ریموٹ ڈیٹونیٹر کے ذریعے اسے اُڑا دیا۔ ٹرمینل سے دور سڑک کے پار ییل کلب کے باہر دھماکا ہوا۔ ہمارا مشن تھا کہ افراتفری گرینڈ سینٹرل کے باہر ہو...... قبل اس کے کہ ٹرمینل کے اندر جہنم کا دروازہ کھلے۔ کان بند کر دینے والا دھماکا ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ دھوئیں کا گھیراؤ فٹ بال گراؤنڈ کے برابر تھا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ گرینڈ سینٹرل میں کار کے بیک فائر کے مانند سنائی دیا۔ کسی نے توجہ نہیں دی لیکن پولیس کا ردِعمل توقع کے مطابق تھا۔ جو ہر روز، ہر شب، ہر گھنٹا ڈیوٹی پر آتے جاتے تھے۔ ان کے لیے یہی موقع تھا۔ حالانکہ نیویارک کی سڑکیں پوری طرح این وائی پی ڈی کے دائرہ اختیار میں آتی تھیں۔ اسٹیٹ کاپس نے اجتماعی دوڑ لگا دی۔ کیتھرائن نے بھی دھواں دیکھا اور آواز سنی۔ وہ پہلے ہی اعصاب زدہ تھی۔ اس کا بدن لرز اٹھا۔ رخساروں پر نئے آبدار موتی پھسلنے لگے۔ میں بے قرار ہو گیا کہ اسے بازوؤں میں لے کر معافی مانگوں، اس کے دکھ اور مشکلات کا ذمے دار میں تھا۔ پہلے اسے اپنی زندگی میں لایا پھر اپنے ''بزنس'' میں گھسیٹ لیا اور قسم کھاؤں کہ باقی زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزاروں گا لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ یہ وعدے اور قسمیں میں خود سے کر سکتا تھا۔ اس وقت اس کی جان بچانی تھی۔

میری توجہ شکوف کی طرف تھی دھماکے کی آواز یہاں اتنے زوردار انداز میں نہیں پہنچی تھی کہ اس کی توجہ بٹتی۔ وہ ہیروں کے لیے بے چین تھا۔ بیگ کھلنے پر اس نے مٹھی بھر کے چمکدار پتھر نکالے، ایک سیکنڈ بعد وہ چیختا ہوا اٹھا۔ کیا کہا؟ ترجمے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔

''لائٹ۔'' میں وائرلیس میں چلایا۔

شکوف نے مصنوعی ہیرے فرش پر دے مارے اور ہاتھ گن کی طرف بڑھایا۔ میں نے کیتھرائن کو کھینچا۔ ''آنکھیں بند کر لو۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ وہ حال سے بے حال تھی۔ میں اس کے بدن کے لیے ڈھال بن گیا تھا۔ اپنے دونوں بازو میں نے اس کے کانوں پر رکھ لیے۔ چہرہ اپنے سینے میں چھپا کر اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ پولیس مین اسموک گرینیڈ کے پیچھے چلے گئے تھے لیکن مکمل الٹرا فلیش

گرینیڈ کی بات اور تھی...... کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ سفید روشنی کھلی آنکھوں کو اندھا کرنے کے لیے کافی تھی۔ یہ ملٹری شاک تھا جو مختلف ٹیکٹیکل آپریشنز میں استعمال ہوتا ہے۔ بنجامن اور وارن نے ایک نہیں دو استعمال کیے تھے جس نے قیامت بپا کر دی۔ ہر کوئی کم از کم عارضی طور پر اندھا اور بہرا ہو گیا۔ ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ میری آنکھیں بند تھیں اور ہتھیلیاں کانوں پر...... پھر بھی میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اطراف میں چیخ و پکار کا طوفان تھا۔ مناسب وقفے سے قبل میں نے آنکھیں کھولیں اور چندھیائی ہوئی نظروں سے اسٹیونز کو اپنی جانب بھاگتے دیکھا۔

''تم محفوظ ہو، تم محفوظ ہو۔'' میں کیتھرائن کے کانوں میں چیخا اور اسے اسٹیونز کے حوالے کیا۔ ''اسٹیو، اسے اپنی نظروں میں رکھنا...... گو...... گو......!''

☆☆☆

اسٹیونز، کیتھرائن کو تقریباً کھینچتا، گھسیٹتا لے گیا۔ باقی ہم تینوں کو چھ روسیوں سے نمٹنا تھا۔ میرے لیے پہلی ترجیح گریگور تھا۔ وہ ابھی تک نابینا تھا۔ میں نے ہتھیلی کی آہنی ضرب اس کے نرخرے پر لگائی۔ بدحواس شخص کے لیے یہ اندھا حملہ خطرناک تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ منہ ماہیٔ بے آب کے مانند کھل گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا جبڑا پکڑا، دوسرا ہاتھ مخصوص انداز میں اس کی گردن میں ڈالا اور دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ گردن مڑتی گئی۔ چخ کی آواز آئی۔ گردن ٹوٹ گئی تھی۔ بے جان لاشہ فرش پر گرا۔ ''ون ڈاؤن۔'' میں نے وائرلیس کمیونیکیشن میں بتایا۔

گولیاں اندھا دھند برس رہی تھیں۔ وارن اور بنجامن جارڈن اسٹیک ہاؤس کی سیڑھیوں سے ہو کر شمالی بالکونی کی پوزیشن پر چلے گئے۔ ایک روسی بدمعاش بلاسٹ کے صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بنجامن کی گولیوں نے اس کا سینہ کھول دیا۔

''ٹو ڈاؤن۔'' آواز آئی۔

''تیسرا مغربی بالکونی پر ہے۔'' میں نے کہا۔

''نظر نہیں آ رہا، جنگلے کے پیچھے لیٹا ہے۔ چھٹے اور ساتویں کالم کے درمیان سے اس کے جسم کا کچھ حصہ جھلک رہا ہے۔ جنگلے کے رخنوں کا درمیانی فاصلہ انچوں میں تھا اور بنجامن دو سو فٹ دور تھا۔ اتنے فاصلے سے، ایسی پوزیشن میں اسے نشانہ بنانا بے حد دشوار تھا۔ ''کیا تم فائر کر سکتے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔ ہماری کوشش تھی کہ بلاسٹ کے اثرات ختم ہونے تک جتنے روسی گرا سکیں، گرا لیں۔

''تو......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں۔'' وارن نے کہا اور پے در پے تین فائر کیے۔

''تھری ڈاؤن۔''

''شاندار۔'' بنجامن کی آواز آئی۔

میدانِ جنگ میں دشمنوں کے درمیان میں نے فلیش گرینیڈ کی کارکردگی کئی بار دیکھی تھی۔ لیکن یہ میدانِ جنگ نہیں تھا نہ عوام دشمنی تھی۔ گرینیڈز کا ردِعمل سو گنا بڑھ کر سامنے آیا۔ ایک حشر بپا تھا۔ کوئی خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کوئی اَن دیکھے دشمن کو گالیاں دے رہا تھا۔ کوئی اپنے پیاروں کو آوازیں دے رہا تھا۔ اکثر یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ مستقل اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔ ماحول میں خوف و دہشت کی بُو رچ بس گئی تھی۔ صورتِ حال روسیوں کی سمجھ سے بھی بالا تھی۔ وارن اور بنجامن بہترین جگہ پر تھے۔ شکوف کے ساتھ آنے والا دوسرا روسی ادھ کھلی آنکھوں سے دیوانہ وار بالکونی کی جانب فائرنگ کر رہا تھا۔

وارن نے آڑ چھوڑ دی۔ یہ ایک سیکنڈ کا وقفہ رہا ہو گا۔ روسی نے دیکھ لیا اور فائر کیا۔ گولی سینے میں لگی۔ وارن نیچے گرا۔ چھ فٹ چھ انچ قد کے ساتھ وہ مغلظات بکتا ہوا اٹھا۔ بلٹ پروف نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ دوبارہ آڑ میں چلا گیا اور فائر کھولا۔ اس نے سینے اور سر کو نشانہ بنایا تھا۔ ''فور ڈاؤن......''

دو ابھی باقی تھے۔ ہماری منصوبہ بندی اب تک بہت اچھی گئی تھی...... دو روسی باقی تھے۔ شکوف اور اس کا ساتھی۔ جو گریگور کے ہمراہ تھا۔ دونوں بلاسٹ کے اثرات سے نکل رہے تھے۔

''اس کُتیا کو ختم کر دو۔'' وہ میری طرف مڑتے ہوئے چلّایا۔ گولیاں برسیں...... میں نے جست لگائی اور لڑھکتے ہوئے اپنی گن نکالی۔ کیتھرائن تیس فٹ دور جا چکی تھی۔ روسی لپک رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کے روکی اور گولی چلائی۔ گولی سیدھی، بھاگتے روسی کی گردن کے پار ہو گئی۔ وہ منہ کے بل گرا۔

''میٹ، تمہارے پیچھے!''

میں تیزی سے گھوما۔ شکوف کی پہلی گولی میرے سینے سے ٹکرائی۔ دوسری بائیں شانے میں اتر گئی۔ اذیت تڑپا دینے والی تھی۔ میں گرا۔ سچ یہ تھا کہ پہلے کبھی میں نے گولی کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ طوفانِ بدتمیزی میں بھی میں نے کیتھرائن کی چیخ سن لی۔ اس نے مجھے نشانہ بنتے دیکھ لیا تھا۔

''سکس ڈاؤن۔'' بنجامن کی آواز آئی۔

''اوہ، مین۔ یہ میں ہوں۔'' میں کراہ اٹھا۔
''باس کو کور دو...... کور دو......'' وہ چلایا۔
گولیوں کی بوچھاڑ نے شگوف کو آڑ لینے پر مجبور کر دیا۔ سینے پر لگنے والی گولی بلٹ پروف نے روک لی تھی لیکن گولی کے دھکے نے میرے پھیپھڑوں سے ہوا نکال دی تھی۔ یوں لگا جیسے پسلیاں چٹخ گئی ہوں۔ دوسری گولی شانے میں لگی تھی۔ طبی زبان میں یہ فلیش وونڈ تھا۔ ان کے لیے یہ سرسری اصطلاح تھی لیکن یہی زخم جب آپ کے گوشت میں ہو تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے...... میں لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوا۔

''میٹ، میٹ...... تم ٹھیک ہو؟'' وارن کی آواز آئی۔

''کیتھرائن کہاں ہے؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔
''بہت خوف زدہ...... لیکن محفوظ ہے...... اور تم؟''
''نہیں، اس وقت تک نہیں، جب تک شگوف ہاتھ نہ آ جائے...... کہاں ہے وہ؟''
''وہ جنوبی ریمپ کی طرف بھاگا ہے۔ میں اس مقام سے اسے نہیں گرا سکتا۔'' بنجامن نے کہا۔
''میں اُس کے پیچھے جا رہا ہوں۔''
''تم زخمی ہو۔''
''مجھے کام ختم کرنا ہے۔'' میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بیالیسویں اسٹریٹ کے ایگزٹ میں بھڑکے ہوئے ہجوم میں راستہ بنا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر مجھے آتا دیکھا۔ میرے شانے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایگزٹ ڈور سے بیک وقت زیادہ سے زیادہ دو آدمی نکل سکتے تھے۔ عوام دہشت زدہ تھی۔ شگوف تک پہنچنے میں مجھے دس سیکنڈ لگتے۔ کوئی دوسری راہِ فرار نہیں تھی۔ نیچے جانے کے لیے سب وے کا دوسرا ریمپ خالی پڑا تھا۔ کسی نے اُدھر کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ گرینڈ سینٹرل پر حملہ ہوا ہے...... عمارت سے نکلنے میں ہی عافیت ہے نہ کہ زیرِ زمین سب وے میں پھنس جانے کا خطرہ مول لیا جائے۔
معاً ایک پاگل آدمی بھیڑ سے الگ ہوا اور نیچے جانے کے لیے سب وے کے ریمپ پر بھاگا۔ وہ شگوف تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھیڑ کے ساتھ تنگ گزرگاہ سے نہیں گزر سکتا۔

دوسرا جنونی خون اور اذیت کے ساتھ اُس کے پیچھے گیا۔ وہ میں تھا۔

☆☆☆

گرینڈ سینٹرل کا سب وے اسٹیشن بھول بھلیوں کے مانند تھا۔ کئی امکانات تھے۔ اَپ ٹاؤن، ڈاؤن ٹاؤن اور کراس ٹاؤن۔ اس کے ساتھ ساتھ سسٹر اسٹیشن۔ پورٹ اتھارٹی بس ٹرمینل...... ٹائمز اسکوائر میں تھا۔ تمام سسٹم کے مصروف ترین اسٹیشنز۔ ان بھول بھلیوں میں کھو جانا آسان تھا۔

شگوف کے ذہن میں یہی بات تھی۔ جب تک میں نیچے پہنچا وہ غائب ہو چکا تھا۔ سب وے کے مسافر ٹرین سے اتر کے پیچ وے میں جا رہے تھے۔ اوپر جو قیامت کا سماں تھا، وہ اس سے بے خبر تھے۔ میں نے ایک آدمی کو روک کے اسے شگوف کا حلیہ بتایا۔ اس نے میری حالت دیکھی اور اسپتال جانے کا مشورہ دیا۔ تاہم اس نے بتا دیا کہ اس نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ وہاں درجن بھر پیچ اور سیڑھیاں تھیں۔ میں نے تیزی سے حساب لگایا۔ پیچ وے باہر جانے کے لیے اسٹریٹ پر نکلیں گے۔ لہٰذا وہاں دہانوں پر پولیس تاک میں ہو گی۔ سیڑھیاں شگوف کو سب وے پر لے جائیں گی جہاں سے وہ منٹوں میں میلوں دور نکل جائے گا لیکن کون سا سب وے؟

میں نے فیصلہ کیا اور ڈاؤن ٹاؤن کا رخ کیا۔ جب ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ ایک عورت مخالف سمت کی سیڑھیوں سے چیختی آ رہی تھی۔ ''بھاگو۔'' اُدھر ایک مسلح آدمی ہے۔''

میں پلٹ کر اَپ ٹاؤن کی سیڑھیوں کی سمت گیا۔ تین تین سیڑھیاں میں نے بیک وقت طے کیں۔ پلیٹ فارم سنسان تھا۔ شگوف یہیں تھا لیکن عورت کی چیخ پکار نے اسے جگہ چھوڑنے پر مجبور کیا ہو گا۔ مسافر، پولیس، اور نہ شگوف۔

ٹریکس...... وہ دیوانہ تھا۔ کیا وہ فرار کے لیے سرنگ میں گھسے گا؟ میں نے پلیٹ فارم کے کنارے سے سرنگ کی نیم تاریکی میں جھانکا۔ روشنی ناکافی تھی۔ تاہم اگر اس نے ہوشیاری سے کام لیا تو بہ حفاظت یہاں سے اسٹریٹ نمبر 51 اَپ ٹاؤن پر نکل جائے گا۔

''گھوم جاؤ۔'' دفعتاً ایک حیوانی آواز آئی۔
دھڑکن رک سی گئی۔ جنونی میرے عقب میں تھا۔ میری گن بیلٹ میں اٹکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کی گن کا نشانہ میرے اوپر کہاں ہونا چاہیے۔ میں آہستگی سے پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں کیمی آٹومیٹک مارکو، پی ایم تھی۔ جس کا رخ میرے سینے کی جانب تھا۔ آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔

سانس لیتے وقت اس کے پھیپھڑوں سے آواز آتی تھی۔ اس نے دو گولیاں مجھ پر چلائی تھیں۔ مجھے زخمی حالت میں دیکھ کر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ دھماچوکڑی میں دوسری گولی سینے پر نہیں لگی تھی۔ بصورت دیگر بلٹ پروف کا خیال ہوتا تو گن کا رخ میری کھوپڑی کی جانب ہونا چاہیے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ وقت کیوں لے رہا ہے؟ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مجھے صرف ایک آرٹ اسٹوڈنٹ خیال کرتا۔ پھر کیا بات ہے؟ کیا اسے اب بھی یقین ہے کہ ہیرے میری ملکیت میں ہیں؟ اچھا ہے، مجھے وقت درکار تھا کہ کیسے بچا جائے لیکن میری غلط فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ وہ کچھ نہیں بولا...... وہ ہر چیز بھلا چکا تھا۔ آرٹسٹ کو، کیتھرائن کو اور ہیرے بھی...... اس نے کچھ کہے بغیر میرے دل پر گولی ماری۔ میرا جسم پلیٹ فارم سے اٹھا اور ٹریکس پر جا کے گرا۔ شاک پلیٹ نے گولی کو تو اندر جانے سے روک لیا تھا۔ لیکن اتنے قریب سے چلائی گئی مہلک گولی کا دھچکا ہی دل بند کرنے کے لیے کافی تھا، تکلیف ناقابلِ برداشت تھی......

چند سیکنڈ بعد اس نے قدم بڑھا کے پلیٹ فارم سے نیچے دیکھا۔ ایک غلیظ گالی دی (روسی زبان میں) اور میرے سر کا نشانہ لیا۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے میری تمام...... پسلیاں ٹوٹ چکی ہیں...... توانائی کا ایک ایک ذرہ چن کر میں نے کروٹ لینی چاہی۔ تربیت کے مطابق مجھے گولی سے سر کو بچانا تھا لیکن جسم نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ میں بمشکل سانس لے پا رہا تھا۔ گولی کو دھوکا دینے کے لیے سانس کی آمدورفت ناکافی تھی۔

مجھ میں اور مردہ آدمی میں کوئی فرق نہیں تھا۔

میں نے گولی کا دھماکا سنا...... بیرل سے شعلہ بھی نکلا لیکن میں زندہ تھا۔ گولی کہاں گئی...... نہیں معلوم۔ تاہم شکوف لڑکھڑا کر سرنگ کی پٹریوں پر گرا۔ کوئی سیڑھیوں سے آیا تھا اور پورے وزن کے ساتھ عقب سے شکوف کو ٹکر ماری تھی۔ یہ کرشمے جیسا تھا۔ بنجامن، وارن یا اسٹیونز ہو سکتے تھے۔ میں ایک ہاتھ کے سہارے اٹھ کے بیٹھا اور جان بچانے والے کو دیکھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ کیتھرائن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آنے والے نے دور سے ہی شکوف پر فائرنگ نہیں کی تھی۔

”میتھیو، اس کی گن پکڑو...... گن لے لو۔“ وہ چلّا رہی تھی۔ میرے جسم میں اضافی توانائی عود کر آئی۔ شکوف کی گن تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اپنی گن نکالی۔ شکوف بھی اٹھ گیا تھا۔ اس نے ٹانگ چلائی جو میرے جبڑے پر لگی۔ وہی ٹانگ اس نے میرے خون آلود شانے پر رسید کی۔ میں نے گرنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پیچھے رکھے۔ شکوف نے میرا گن والا ہاتھ پکڑا۔ دوسرا ہاتھ میرے چہرے پر جما کر اس نے گن ہتھیانا چاہی۔ اذیت جیسے جان لیے جا رہی تھی۔ میں تقریباً بے ہوش ہو چلا اور گن کھو دی۔

اس نے پھر گالی دی اور گن کا رخ میرے چہرے کی طرف کیا۔ مجھے ادراک تھا کہ مجھے ختم کر کے وہ کیتھرائن کی جان لے گا۔ مجھے کیتھرائن کو وہاں سے بھگانا تھا۔ میں نے دھندلی نگاہ سے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں تھی۔ نیویارک سٹی ٹرانزٹ اتھارٹی کا ٹریش کین اس کے ہاتھ میں تھا۔ جو اس نے سر سے بلند کر کے شکوف کے چہرے پر دے مارا۔ ضرب کے پیچھے خوف کے ساتھ محبت کی طاقت تھی۔ سب سے بڑھ کر آگ کے مانند جلتا ہوا قہرناک غصہ شامل تھا۔ شکوف کا توازن بگڑ گیا۔ رخسار سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ عالم اشتعال میں میرے زخمی شانے کا سہارا لے کے اٹھا اور مجھے درد کے دریا میں ڈبو گیا۔

دفعتاً مجھے ٹرین نمبر 6 کی آواز آئی۔ آواز شکوف نے بھی سنی۔ اس نے مجھے پھر پلیٹ فارم کو دیکھا۔ مجھے ٹرین کے رحم و کرم پر چھوڑ کے اس نے اپنی جان بچانے کا فیصلہ کیا۔ میری گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ وزنی پہاڑ شیر کے مانند جست لگا کر پلیٹ فارم پر گیا۔

کیتھرائن کی چیخ بلند ہوئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کون سی چیز نے مجھے بے ہوش ہونے سے روکا ہوا تھا۔ میں کیونکر متحرک تھا؟ وہ مجھے نیم مردہ سمجھ کر اوپر گیا تھا۔ کیتھرائن کی چیخ نے مجھے ہر چیز سے بے نیاز کر دیا۔ مجھے ڈیڈی کے الفاظ یاد آئے۔ خود کو آگے کی جانب گراتے ہوئے میں نے شکوف کا بایاں ٹخنہ پکڑ لیا اور بچی کھچی طاقت سے جھٹکا دیا۔ وہ ایک بار پھر مجھے لیتا ہوا ٹریکس پر گرا۔ میں لڑھکنی کھا کر اس کے سینے پر آیا۔ بال پکڑ کر اس کا سر کئی بار لوہے کی پٹری سے ٹکرایا اور گن لینے کے لیے آگے جھکا۔ تاہم لگ رہا تھا کہ خونی جنگ ہم دونوں کی موت پر ختم ہوگی۔ اس کے بھاری سر کی ٹکر میری ناک پر لگی۔ بلاشبہ ناک چیخ گئی تھی۔

ٹریک پر برونکس جانے والی گاڑی نمودار ہوئی۔ فاسٹ۔ سیٹی کی چیخ بلند ہوئی۔ موٹر مین بھی چلّایا۔ تاہم ظاہر ہے، اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ اور دیگر دیکھنے والے سمجھ گئے تھے کہ کچھ بھی کر لیا جائے ٹرین کو بروقت روکنا

ناممکن تھا...... لوہے سے لوہا رگڑنے کی آواز ہیبت ناک تھی۔

میں اور شکوف زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ سیکنڈوں کی بات تھی۔ انجام سر پر تھا۔

☆☆☆

گن پر ہم دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ آئے۔ ہم دونوں کی لڑائی جس مقام پر تھی، وہاں فاتح ایک تھا۔ صرف ایک۔ ٹرین نمبر 6۔“

میں جان گیا تھا کہ وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں نے گن کی طرف سے دھیان ہٹالیا۔ دایاں شانہ پیچھے ہٹایا اور کہنی سے شکوف کی آنکھ میں ضرب لگائی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آنکھ کی نچلی ہڈی کریک ہوگئی ہے۔ میں اُچھلا گک مار کے گن اس کے ہاتھ سے چھڑائی اور گھٹنا اس کے حلق پر جما دیا۔ ساعت سے کیتھرائن کی چیخیں ٹکرا رہی تھیں۔ ”میتھیو اوپر آجاؤ۔“

میں نے نیم تاریک سرنگ میں دیکھا۔ سیکنڈ قبل ٹرین کی ہیڈ لائٹس نکتے کے مانند تھیں۔ اب بڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایمرجنسی بریک لگے ہوئے تھے لیکن ٹنوں وزنی ٹرین آگے ہی آگے چلی آرہی تھی...... شکوف اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری پوزیشن بہتر تھی۔

”میتھیو، پلیز...... وہ تمہاری زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ اوپر آجاؤ۔“ کیتھرائن چلائی۔ اس نے مجھے دوسرا چانس دے دیا تھا۔ مکمل تصدیق ہوگئی تھی۔ دکھ درد جیسے جادوئی انداز میں ناپید ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ میں نکلا تو وہ بھی نکل جائے گا...... اب نہیں تو کبھی نہیں...... مجھے اسٹیم روم میں بیٹھا شکوف یاد آیا اس کے پھیپھڑوں کی حالت یاد آئی۔ میں نے گھٹنا حلق سے ہٹا کر سینے پر جما دیا۔ وہ منہ کھول کے ہانپنے لگا۔ میں نے مٹھی بھر کے سیاہ مٹی لی اور اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ سانس لینے کی سعی میں مٹی بھی ساتھ چلی گئی۔ میں نے ایک اور مٹھی بھر کر ناک اور منہ پر ڈال دی۔ اس پر یکایک دمے کا شدید دورہ پڑا۔ آنکھیں خوف سے باہر آگئیں۔

میں اُس کے چہرے پر جھکا۔ ”کیا ہوا، واڈم شکوف؟ یوں لگ رہا ہے کہ تم نے ”گھوسٹ“ دیکھ لیا ہے۔“

اس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ آخری لمحات میں اسے علم ہوا کہ شروع سے اب تک کیا ہوتا رہا اور ”گھوسٹ“ کون ہے۔ میں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اٹھ کر بھاگا۔

”میتھیو، تیز اور تیز......“ کیتھرائن کی بلند آواز آئی۔

وسل متواتر شور مچارہی تھی۔ میں بھاگتے بھاگتے مڑا، ریل پر پھسلتے آہنی پہیے چنگاریاں اڑا رہے تھے۔ موٹرمین کی آنکھیں دہشت سے پھٹی جارہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر چڑھنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اسٹیشن پانچ سوفٹ کے فاصلے پر تھا۔ اگر میری دم ہوتی تو میں کہہ سکتا تھا کہ ٹرین میری دم سے لگی تھی۔ میں پانچ سو فٹ طے نہیں کرسکتا تھا۔ میں موت کے سفر پر تھا۔

☆☆☆

بہرحال مجھے اپنی، کیتھرائن اور ڈیڈی کی زندگی کے لیے دوڑنا تھا۔ میرا کافی خون ضائع ہوچکا تھا۔ کیتھرائن پلیٹ فارم پر میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ ”میرا ہاتھ پکڑو۔“ وہ چلائی۔ ”میتھیو، میں تمہیں اٹھالوں گی۔“

”نہیں۔“ میں چیخا۔ ”میں تمہیں نیچے کھینچ لوں گا۔“

”مجھے پروا نہیں ہے۔“

اس کے الفاظ بجلی کے مانند میرے تمام جسم میں سرایت کر گئے۔ اگر یہ آخری الفاظ ہیں...... میرے مرنے سے پہلے...... تو میں خوشی خوشی موت کو گلے لگاؤں گا۔

”میں ہر چیز کے لیے تم سے معافی مانگتا ہوں۔“ ظاہر ہے چیخ کر بات کرنی پڑ رہی تھی۔ پیچھے بس نہیں، ٹرین تھی۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

میں نے تمام طاقت مجتمع کر کے ”اسپرنٹ“ لگائی۔

گرینڈ سینٹرل کے چار ٹریک تھے۔ درمیان میں ڈبل ٹریک تھا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو کھڑا ہو کر ٹرین کو گزرنے دیتا لیکن بیرونی ٹریک، ڈیتھ ٹریک تھا...... جہاں ایک طرف پلیٹ فارم اور دوسری جانب دیوار تھی۔ ٹرین نے شکوف کی کہانی ختم کردی تھی اور بریک کے باوجود میرے پیچھے پھسل رہی تھی۔

بچت کی واحد امید، دیوار کا سروس ڈور تھا۔ میں اسے بیس فٹ کے فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ میں ڈور تک پہنچ گیا اور ہینڈل کھینچا، لاک۔

سوفٹ مزید بھاگنا تھا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی ہے اور اسی وقت میرا پیر اُلجھا۔ میں منہ کے بل ٹریک کے درمیان گند میں گرا۔ کھیل ختم۔ مجھے آرام محسوس ہوا۔ ساتھ ہی علم ہوا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ تاہم میری زندگی میں آنے والی حسین ترین لڑکی حیات تھی۔ محفوظ تھی۔ اسی مقصد کے لیے میں نیویارک آیا تھا۔

مشن مکمل ہوگیا تھا۔ ٹرین رک نہیں سکتی تھی۔

ناقابلِ شکست گھوسٹ ہار گیا تھا..... ٹرین ٹریک پر مر رہا تھا۔

☆☆☆

اسٹیونز پہنچا تو وہ پلیٹ فارم پر ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اسٹیونز نے اس کا چہرہ شانے میں چھپا لیا۔ کیتھرائن کا بدن شدت سے لرز رہا تھا۔

''اسٹیونز، میں خوش ہوں کہ تم نے کیتھرائن کو پالیا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میٹ (میتھیو) برا سلوک کرتا۔

''وارن.....'' اسٹیونز ہچکچایا۔

''وہاٹ؟ خاموش کیوں ہو؟''

''میٹ از ڈیڈ..... وہ اور شکوف ٹریک پر گتھم گتھا تھے..... ٹرین..... دونوں کو لے گئی۔'' اسٹیونز نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''ٹرین تو رکی ہوئی ہے؟'' وارن کی آواز اٹک گئی۔

''وہ بروقت نہیں رکی تھی۔''

وارن نے دیکھا۔ ٹرین کی تین کاریں اب تک سرنگ میں تھیں۔ ٹرین کے دروازے بند تھے۔ مسافر کھڑکیوں سے سمجھنا چاہتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ موٹر مین باہر اسٹیل کے کالم کے ساتھ پشت لگائے بیٹھا تھا۔ ایک کاپ گھٹنوں کے بل اس کے قریب جھکا ہوا تھا۔ ''اوہ گاڈ..... گاڈ..... یقین نہیں آتا۔''

''مسٹر پیریز، پُرسکون رہو۔'' کاپ نے تھپکی دی۔ ''پیرامیڈیکس آ رہے ہیں۔''

''کیوں؟ وہ دونوں مر چکے ہیں۔''

''مجھے بیان چاہیے کوئی مدد کرے گا۔'' پولیس مین نے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ موٹر مین کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کوئی کودا تھا؟ کسی نے چھلانگ لگائی..... کیا ہوا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے دیکھتے ہی بریک لگا دیے تھے۔ ایک نیچے گرا ہوا تھا۔ دوسرا شاید مدد کر رہا تھا۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ ''گرے ہوئے آدمی کے لیے کوئی چانس نہیں تھا۔ دوسرے آدمی نے بھاگنا شروع کر دیا جب ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی، وہ بھاگ رہا تھا۔ وہ بچ سکتا تھا لیکن اچانک گر گیا۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔''

پانچ پولیس مین اور آ گئے۔ ان میں ایک سارجنٹ تھا۔

''کوئی گواہ؟'' سارجنٹ نے سوال کیا۔

موٹر مین نے کیتھرائن کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت تک درجن بھر کے قریب مسافر اندر فرنٹ کار کے قریب آ گئے تھے۔ وہ کھڑکیاں بجا کے باہر آنے کے لیے شور کر رہے تھے۔

''میں مسافروں سے بات کر کے آتا ہوں۔'' سارجنٹ نے کہا۔

پولیس والے مصروف ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' بنجامن نے کیتھرائن کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں نہیں جا سکتی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میتھیو، وہاں اب تک نیچے ہے۔''

''کیتھرائن تمہیں چاہیے کہ تم اسے نہ دیکھو۔ وہ تمہیں بچانے آیا تھا۔ وہ اس دنیا سے کامیاب اور خوش گیا ہے۔ اب تمہاری حفاظت ہماری ذمّے داری ہے۔'' اسٹیونز نے کہا۔

تاہم کیتھرائن نے انکار کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ ''میتھیو آئی لو یُو..... لو یُو سو مچ۔'' وہ بولی۔

اچانک ٹرین کے نیچے سے ایک نحیف آواز آئی۔ ''تم لوگ کسی کو تلاش کرو جو یہ ٹرین مجھ پر سے ہٹا سکے۔ محبت والی بات تم میرے منہ پر کہہ سکتی ہو۔''

☆☆☆

میں دوسری کار کے نیچے ٹریک کے درمیان لیٹا تھا۔ چالیس ٹن وزن میرے اوپر سے گزر کر رکا۔ میں ساکت پڑا رہا۔ پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں ہوش میں آیا تو کیتھرائن کی آواز سنی جو اظہارِ محبت کر رہی تھی۔

پلیٹ فارم سے کیتھرائن کے رونے اور میرے آدمیوں کے شور مچانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ ہنس رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ تکنیکی وجوہات کی بنا پر مجھے نکالنے میں تیس منٹ مزید صرف ہوئے۔

میں اسٹریچر پر تھا۔ کیتھرائن مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ بمشکل اسے ہٹایا گیا۔ موٹر مین کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار معذرت کر رہا تھا کہ اس نے تاخیر سے دیکھا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آدمی خاتون کو مارنا چاہتا تھا اور مجھے بھی۔ وہ شیطان تھا۔ تمہارا شکریہ۔ تم نے ہم دونوں کو بچایا۔''

☆☆☆

میں بیلی ووا سپتال میں تھا۔ ایمرجنسی میں ڈاکٹرز نے خون چڑھایا اور شانے سے گولی نکالی۔ ناک اور پسلیوں کی

حالت سنبھلنے میں چھ ہفتے صرف ہوئے تھے۔ گولی نکالنے کے بعد مجھے دبا کے درد کش ادویات دی گئیں۔ کیتھرائن میرے کمرے میں کرسی پر سو رہی تھی۔ تینوں جاں نثار، باری باری کمرے کے باہر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ دو دن بعد دوپہر میں، پہلے ملاقاتی تشریف لائے۔ سراغ رساں گاربر اور این وائی پی ڈی کا ناتھن واٹ۔ انہوں نے خیر خیریت کے بعد سوالات کی اجازت چاہی۔

میں نے بتایا کہ وہ کوئی جنونی تھا۔ جس نے ہم دونوں پر حملہ کیا۔ میں نے مدافعت کی لیکن فیصلہ ٹریک پر ہوا۔ سب وے میں۔ کیتھرائن نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

''تم دونوں میں سے کوئی اسے جانتا تھا؟''

''نہیں۔''

واٹ مسکرایا۔ ''وہ واڈم شکوف تھا۔ جس کا مجرمانہ ریکارڈ دو براعظموں تک وسیع ہے۔ یہ بھیانک جرائم تھے لیکن پہلی مرتبہ اس نے کسی بے گناہ جوڑے پر حملہ کیا تھا...... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے اجنبی تھا؟''

''شیور، میں ایک آرٹ اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''ہاں، اور ایک وار ہیرو۔'' گاربر نے کہا۔ ''تم لوگوں کے علم میں ہے کہ شکوف نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرینڈ سینٹرل میں دہشت گردی کی تھی؟''

''ہاں، اخبارات کے ذریعے پتا چلا تھا۔'' کیتھرائن نے کہا۔

''مزید معلومات کے لیے ہمیں وڈیو دیکھنا پڑے گی۔''

کیتھرائن نے چونک کر میرا ہاتھ دبایا۔

''اوہ، نو۔'' گاربر نے کہا۔ ''یہ اسٹیٹ کاپس کا مسئلہ ہے۔ کیا تم دونوں کے پاس بتانے کے لیے کوئی اور بات ہے؟''

''نو، سر۔'' میں نے کہا۔

''گاربر، میرا خیال ہے کہ ہمیں وار ہیرو کو اپنی دوست کے ساتھ آرام کرنے دینا چاہیے۔'' وہ اٹھ گئے۔

☆☆☆

ستمبر کی شام تھی۔ پرنس ماسکو کی سڑکوں پر جاگنگ کر کے آرہا تھا۔ زندگی پُرسکون تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے پہلی بار مسرت محسوس کی تھی۔ خوشی اور سکون۔ بہت بڑی قیمت کے بدلے میں یہ دن اس کے لیے نعمت کے مانند تھے۔ اسے اور سنڈیکیٹ کو بھاماس میں ہی علم ہو گیا تھا کہ شکوف اور اس کے آدمی مارے جا چکے ہیں اور ہیروں کی برآمدگی کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں...... پرنس نے پارک سلوپ والا مکان فروخت کیا۔ اکاؤنٹس خالی کیے۔ دس لاکھ دینے کے بعد بھی ان کے پاس اتنا بچ گیا تھا کہ وہ ماسکو میں پُرسکون زندگی گزار سکیں۔ وہ دسویں منزل کے کشادہ اپارٹمنٹ میں مقیم تھے۔ تین مہینے گزر گئے تھے۔ سنڈیکیٹ کی جانب سے خدشات، پرنس کے ذہن سے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔

جاگنگ کے بعد وہ اپارٹمنٹ تک پہنچا۔ وہاں اس کے گمان کے برخلاف چار مسلح افراد پہلے سے موجود تھے۔ نتالیا ڈائننگ روم کی کرسی کے ساتھ بندھی تھی۔ منہ پر ٹیپ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ''تم لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی؟'' وہ چلایا اور نتالیا کو آزاد کرانے کے لیے کرسی کی طرف گیا۔ ایک آدمی نے گن کا دستہ اس کے منہ پر مارا۔ پرنس کا دانت ٹوٹ گیا۔ خون بہہ نکلا۔ پرنس نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن حملہ آور کے چہرے پر نشانات اور اسکین گرافٹنگ کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد اسے بھی کرسی میں جکڑ دیا گیا۔

''کون ہو؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

''کسی نے نہیں۔ ہماری مرضی...... ہماری پارٹی۔''

بدنما چہرے والے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ سب قہقہہ بار تھے۔

''میں ڈائمنڈ سنڈیکیٹ سے ڈیل کر کے آیا ہوں۔ وہ زکون کوڈ (روسی آرگنائزڈ کرائم/مافیا) کی خلاف ورزی پسند نہیں کریں گے۔''

''ہمارا سنڈیکیٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم صرف ''نکی تا پریما کوو'' کو جانتے ہیں۔''

کئی دہائیوں کے بعد پرنس نے اپنا اصلی نام سنا تھا۔

حملہ آور نے ایک اور بھرپور گھونسا پرنس کے چہرے پر مارا...... ٹیپ کے باوجود نتالیا کی چیخ نکل گئی۔ جس کے ردِعمل میں اسے گالی کے ساتھ تھپڑ بھی کھانا پڑا۔

''میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' پرنس نے خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی۔

''تمہارے مار دھاڑ کے دن ختم ہو چکے ہیں۔'' لیڈر نے گھونسا پرنس کے کان پر مارا...... کان سن ہو گیا۔ ''میرا نام میکم ڈیکی ٹروف ہے۔ ڈیکی ٹروف کیب کمپنی یاد ہے؟''

پرنس کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ آدمی سنڈیکیٹ کے نہیں ہیں...... پھر کون ہیں؟ حملہ آور نے بتا کے اس کا ذہن صاف کر دیا اور دہشت کی لہر جسم میں سرایت کر گئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ماضی بعید کے واقعات اس کے تصور میں گھوم گئے۔ ''تم نے میرے

باپ، بھائی، انکلز، کزنز سب کو ختم کردیا تھا۔ میں اس دن تاخیر سے پہنچا تھا۔ گیراج کی جگہ آگ کا الاؤ تھا۔'' لیڈر نے کہا۔ ''ستائیس افراد مارے گئے۔ میں نے بچانے کی ناکام کوشش کی۔ میری ہونے والی دلہن بھی ماری گئی۔ وہ وہاں کام بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ مجھے فوٹو دکھانے اور کیک لے کر آئی تھی۔ ہماری شادی میں دو دن رہ گئے تھے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔'' پرنس بلبلایا۔ ''واڈم شکوف ذمے دار تھا۔''

''شکوف...... وہ تمہارا پالتو کُتا...... وہ تمہارے حکم پر دُم ہلاتا تھا۔ تم نے تین نسلیں تباہ کردیں۔''

''تمہیں کیا چاہیے...... میں ادا کردوں گا۔''

''ہم یہاں پیسوں کے لیے نہیں آئے۔ شادی کی رسم ہوگی۔'' وہ چلّایا اور کیسٹ پلیئر نکالا۔ ''شروع ہوجاؤ۔'' سب نے فرضی گلاس اٹھائے۔ میوزک بجنا شروع ہوئی۔ چاروں بے ہنگم انداز میں ناچ رہے تھے...... نتالیا کی کرسی کے گرد۔

پرنس کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ نتالیا کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا گیا۔

''دلہن کو اوپر اٹھاؤ۔'' لیڈر نے کہا۔ انہوں نے ایک ایک پایہ پکڑ کر کرسی سر سے بلند کی۔ نتالیا دس فٹ اونچائی پر تھی۔ اس کی دہشت بھری چیخ سنائی دی۔ ''پاپا۔''

''پلیز۔'' پرنس گڑگڑایا۔ ''جو کچھ میرے پاس ہے لے لو...... تین ملین ڈالرز......''

لیڈر نے کک مار کے ٹیرس ڈور کھولا۔ نتالیا کو احساس ہوگیا۔ اس کا چہرہ چونے کے مانند سفید پڑ گیا تھا۔ ''پلیز۔''

کرسی باہر پھینک دی گئی۔ نتالیا کی چیخ پکار ناقابلِ برداشت تھی۔ پرنس نے قے کردی۔ ذہن میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے بھی اٹھا کر بلندی سے باہر پھینک دیا گیا۔ آخری الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔ نفرت بھرے الفاظ......

خوش قسمت تھا۔ آسان موت کا شکار ہوا۔

☆☆☆

ہم ایک بار پھر پیرس میں تھے...... ایک ہفتہ گزار کے واپس آئے۔ اس وقت اپارٹمنٹ میں وارن، بنجامن، اسٹیونز، میں اور کیتھرائن ایک ساتھ موجود تھے۔ پیرس کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''ہاں، کوئی 'جاب' نظر نہیں آرہی۔'' اسٹیونز بولا۔

''اسی لیے ہم یہاں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہت بڑی جاب ہے۔''

''ارشاد، ارشاد۔''

''کسی کو ٹھکانے لگانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کس کو؟'' بنجامن نے پوچھا۔

''پہلے یہ سنبھالو۔'' میں نے تین لفافے آگے بڑھائے۔ ''ایڈوانس پے منٹ۔''

انہوں نے لفافے جیبوں کی طرف بڑھائے۔

''نہیں، نہیں...... کھول کے دیکھو۔''

''کیا مطلب، ہم تیار ہیں۔''

''کھولو تو......''

ایک ایک کرکے انہوں نے لفافے کھولے اور یکے بعد دیگرے ردِعمل پیش کیا۔ جو ملتا جلتا تھا۔ منہ کھل گئے تھے۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟ کیا پریذیڈنٹ کو ختم کرنا ہے؟'' بنجامن نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''پھر کون ہے؟''

''گھوسٹ!''

''کیا کہہ رہے ہو؟ گھوسٹ کو ختم کرنے کے لیے ہر ایک کے لیے ملین ڈالرز؟''

''گھوسٹ میں ہوں۔ مجھے مارنا نہیں ہے۔ غائب کرنا ہے۔ گھوسٹ کا سفر ختم سمجھو۔ یہ گھوسٹ کی ریٹائرمنٹ پارٹی ہے۔ اور یہ بونس چیک ہیں۔''

''میٹ ملین ڈالرز۔'' وارن نے کہا۔

''یہ ڈائمنڈ سنڈیکیٹ کا پیسا ہے۔ مجھے شیئر کرکے خوشی ہوگی۔ مجھے مسرت کا احساس ہے کہ میں نئی زندگی شروع کرنے جارہا ہوں۔''

''کیوں میٹ؟''

''کیتھرائن کے لیے۔''

''تم ہمیں مس کروگے۔''

''تم لوگ کہیں نہیں جارہے، تم میرے دوست ہو اور رہوگے۔ ہم فشنگ شکار کریں گے...... پوکر کھیلیں گے۔''

کچھ دیر کے لیے وہاں خاموشی چھا گئی۔

بالآخر بنجامن نے جام اٹھایا۔ ''میتھیو اور کیتھرائن کی خوشی اور صحت کے نام پر۔''

''اور گھوسٹ کے نام پر۔'' میں نے کہا۔ ''ریسٹ اِن پیس۔''

❖❖❖

اجل گرفتہ

حسام بٹ

لالچ... طمع کسی بھی معاملے میں ہو... انجام بالآخر خسارے میں ہی نکلتا ہے... دولت کے حصول کے لیے انسان کیا کیا جتن نہیں کرتا... اسے حاصل کرنے کے لیے ہر طریقہ آزماتا ہے... مگر اتنی تگ و دو کے بعد اگر قسمت میں نہیں لکھی تو ساری محنت اور کارگزاری اکارت چلی جاتی ہے... لالچ... طمع کی گرہوں میں جکڑے ایسے ہی لوگوں کی عملی کارروائیاں... وہ سمجھتے تھے کہ اتنی ذہنی و جسمانی مشقت کے بعد ان کے نصیب میں راحت ہی راحت...

دوسرے کے حق پر ڈاکا ڈالنے والے بدفطرت لوگوں کا ماجرا...

نکاح کی رسم جیسے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی، مہمانوں کے لیے کھانا کھول دیا گیا۔ شادی کی تقریب میں یہ مرحلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس موقع پر عمدہ لباس میں ملبوس شائستہ اور تہذیب یافتہ دکھائی دینے والے افراد کی تمیز داری اور اوقات کو بہ خوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اس تقریب میں مدعو خواتین و حضرات میں سے اکثر اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے جیسے کسی دشمن کی فوج پر دھاوا بولا جاتا ہے۔ ان کی اضطراری حرکات وسکنات اور دھکم پیل کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، انہوں نے زندگی میں پہلی بار اشیائے خورونوش کی شکل دیکھی ہے یا پھر شاید وہ پکوان ہفت اقسام کو ٹھونسنے ہی کی غرض سے اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔

اسی افراتفری میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا ایسا بھی تھا جو بہ انداز دیگر ٹھونستے، چلنے اور ہڑپنے کے ساتھ ہی بڑی صفائی اور مہارت سے چھپرنگ کا عمل بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے شادی ہال

کے ایک دور افتادہ حصے کا انتخاب کیا تھا تا کہ ان کی غیر نصابی سرگرمیوں پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ایسا سوچا تھا ورنہ سچی بات تو یہ کہ اس ''میدانِ حشر'' میں سب کو ''اپنی اپنی'' پڑی ہوئی تھی۔ نظر اٹھا کر کسی دوسرے کو دیکھنے کی بھلا کس کے پاس فرصت تھی۔

شکورن اور عقیل کھا کم رہے تھے اور سمیٹنے پر ان کی زیادہ توجہ تھی۔ اس میز پر ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں بیٹھا ہوا تھا اس لیے انہیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ ویسے شکورن اپنے ہنر میں طاق تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہ بچا کر اپنا کام بہ طریق احسن انجام دینا اسے بہ خوبی آتا تھا۔

''کیا ہم نے گھر میں بھیڑ بکریاں پال رکھی ہیں جو تم دوبارہ پلیٹ میں سلاد بھر لائے ہو؟'' شکورن نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عقیل نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''یہ صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' شکورن نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تمہاری لائی ہوئی سلاد کی دو پلیٹوں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب تم بریانی، قورمہ، بروسٹ، مچھلی اور میٹھے پر دھیان دو اور ہاں...... نان اور تافتان ڈھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' عقیل فرمانبردار شوہروں کی طرح اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس تھیلیوں کا بندوبست تو ٹھیک ٹھاک ہے نا......؟''

''کبھی میرے انتظام میں کوئی کمی دیکھنے کو ملی ہے۔'' شکورن نے اسے گھورا۔ ''ویسے تم نے یہ پوچھا کیوں؟''

''میں نے وہاں دو قسم کا میٹھا رکھا دیکھا ہے۔'' عقیل نے جواب میں بتایا۔ ''شاہی ٹکڑے بھی ہیں اور خوبانی کا میٹھا بھی۔''

''اگر تم یہاں بیٹھے مجھے پکوانوں کی رننگ کنٹری سناتے رہے تو وہاں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' شکورن نے ڈانٹ پلانے والے انداز میں کہا۔ ''فوراً کام سے لگ جاؤ......''

عقیل کے جانے کے بعد وہ چھپرنگ کے انتظامات کا جائزہ لینے لگی۔ کھانے کی بھری ہوئی چھ پلیٹوں کو میز پر کچھ اس انداز میں سجا کر رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر یہی محسوس ہو کہ اس میز پر خوب پیٹ بھر کر کھایا پیا جا رہا ہے۔ اس حسنِ انتظام کو دیکھ کر شکورن دل ہی دل میں مسکرا دی پھر جھک کر میز کے نیچے، اپنے قدموں کے نزدیک رکھے ہوئے بیگ کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے اپنا پرس میز کے اوپر ہی رکھ چھوڑا تھا اور مذکورہ بیگ کو سب کی نظروں سے چھپا کر قدموں میں ڈال رکھا تھا۔ اس سلسلے میں حد سے زیادہ لٹکے ہوئے میز پوش نے بھی ان میاں بیوی کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ زمین بوس بیگ کے اندر کھانا پیک کرنے والی تھیلیوں کی کوئی قلت نہیں تھی۔ ابھی تک شکورن نے صرف چار پارسل تیار کیے تھے۔ اس کے سامنے کم از کم دس پارسل کا ٹارگٹ تھا۔ وہ لوگ شادی ہال میں سے انواع واقسام کا کھانا اتنی مقدار میں چھپر کر کے لے جانا چاہتے تھے جو تین افراد کی ہفتے بھر کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔

شکورن اور عقیل بڑے اصول پرست فنکار تھے اور ان کا یہی اصول تھا کہ وہ ہفتے میں صرف ایک بار خوب بن ٹھن کر، اپنی رہائش سے دور واقع کسی شادی ہال میں ایسے اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے تھے کہ لڑکی والے سمجھتے، وہ لڑکے والوں کے مہمان ہیں اور لڑکے والے انہیں لڑکی والوں کی جانب سے بلائے گئے خیال کرتے تھے۔ انسان کا حلیہ درست، لباس شاندار اور حرکات وسکنات سے بھرپور اعتماد جھلکتا ہو تو کسی بھی شادی کی تقریب میں گھس کر ٹھیک ٹھاک طور پر پیٹ پوجا کرنا نہایت ہی آسان کام ہے۔ باقی جہاں تک وہاں کے کھانے کو چھپر کرنے کا معاملہ ہے تو اس کے لیے انسان کے اندر ایک مخصوص بے شرمی بردار فنکارانہ صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اور...... یہ دونوں میاں بیوی اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ عرصۂ دراز سے اس روش کی مسافرت اختیار کیے ہوئے تھے اور مزے کی بات یہ کہ آج تک کسی کی نظر یا پکڑ میں نہیں آئے تھے۔ اس مسلسل کامیابی نے ان کے ہنر کی شمشیر کو صیقل کر دیا تھا۔

عقیل کے ''پھیرے'' وقفے وقفے سے جاری رہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کا بھرپور استعمال کر کے کھانے سے بھری ہوئی پلیٹوں کو میز تک پہنچانے میں مصروف رہا اور شکورن نے بھی اپنی ''ذمے داری'' سے لمحے بھر کی غفلت نہیں برتی تھی۔ انواع واقسام کے پکوان میز تک پہنچنے کے بعد تھیلیوں میں بند ہو کر نہایت صفائی کے ساتھ زمین پر رکھے ہوئے بیگ میں اپنی جگہ بناتے چلے جا رہے تھے۔

اس فن میں وہ جوڑا منصرم درجۂ اول ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ مہمانوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ دونوں شادی ہال سے نکل کر مین روڈ پر

کھڑے تھے اور کسی سواری کا انتظار کررہے تھے ''ریڈی راشن'' والا بیگ عقیل نے اٹھا رکھا تھا۔ شکورن کے ہاتھ میں اس کا اپنا بیگ تھا۔

''یہ تمہارا بھانجا کہاں رہ گیا؟'' شکورن نے برہمی بھرے انداز میں کہا۔ اس کی آواز اس قدر بلند تھی کہ قرب و جوار میں موجود لوگ بہ آسانی اسے سن سکتے تھے۔ ''لگتا ہے، آج کی رات سڑک کنارے کھڑے کھڑے گزارنا ہوگی۔''

''اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔'' عقیل نے آس پاس دور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اصغر کو فون لگاؤ۔'' شکورن نے کہا۔ ''ذرا پتا تو چلے کہ وہ ہمیں لینے آئے گا بھی یا نہیں تاکہ ہمیں کچھ پتا تو چلے۔''

''نالائق کو دو مرتبہ کال کرچکا ہوں۔'' عقیل نے بیزاری سے کہا۔ ''اس کا فون لگ نہیں رہا۔''

''میں تو کہتی ہوں، اصغر کے چکر کو چھوڑو اور گھر جانے کے لیے کوئی رکشا یا ٹیکسی دیکھ لو۔'' شکورن اپنے میاں کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''اصغر پہلے بھی وقت پر کہیں پہنچا ہے جو آج یہاں بھی آجائے گا۔ جیسے تم ویسا ہی تمہارا یہ بھانجا بھی......!''

''تمہیں تو جلی کٹی سنانے کے لیے بس کوئی موقع چاہیے۔'' عقیل نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس، شروع ہو جاتی ہو۔''

وہ دونوں اس وقت نارتھ ناظم آباد کے ایک ایسے حصے میں موجود تھے جہاں سڑک کی دونوں جانب شادی ہال اور میرج لان بنے ہوئے تھے اور ان کی رہائش وہاں سے کافی دور تھی۔ آئندہ دس منٹ میں عقیل نے تین چار رکشا والوں کو ٹرائی کیا مگر بات بن کر نہیں دی۔

''ان سالوں کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پسنجرز کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' عقیل نے شکورن کے پاس آتے ہوئے سٹپٹا کر کہا۔ ''آدھی رات کے بعد یہ کمینے کرائے میں سو فیصد اضافہ کردیتے ہیں۔ اُلّو سمجھ رکھا ہے عوام کو۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' شکورن نے پوچھا۔ ''کتنا مانگ رہے ہیں؟''

''آٹھ، نو سو سے کم کی کوئی بات ہی نہیں کررہا۔'' عقیل نے جھلاہٹ بھرے انداز میں بتایا۔ ''اور یہ آخر والا تو ہزار سے ایک روپیا کم میں جانے کو راضی نہیں ہوا......''

''کمینہ ہے کسی بے غیرت کی نسل کا!'' شکورن بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم بھی تو ایک سن کر نہیں دیتے ہو نا......!''

''اب رکشے والے کا غصہ تم مجھ پر نکال رہی ہو۔'' عقیل نے شاکی نظر سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے اگر کچھ کیا ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی......!'' وہ طعنہ مارنے والے انداز میں بولی۔ ''کب سے کہہ رہی ہوں کہ تم بھی ایک ٹچ والا موبائل خرید لو مگر مجال ہے جو تمہارے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔''

''ٹچ والے فون کا ہماری موجودہ مشکل سے کیا تعلق ہے؟'' عقیل نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''بہت گہرا تعلق ہے عقیل!'' وہ کسی فلسفی کے انداز میں بولی۔

''میں تو ٹچ والے موبائل فون کو مدِّ فاضل سمجھتا ہوں۔ جب بٹنوں والے موبائل فون سے کام چل رہا ہے تو خواہ مخواہ کا خرچہ کرنے کا فائدہ......؟''

''فائدہ ہے جب ہی تو کہہ رہی ہوں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''مگر تمہارے بھیجے میں کوئی چیز آسانی سے کہاں گھستی ہے۔ میری ہر کوشش کو تم ناکام بنا کر رکھ دیتے ہو۔''

''مناقشہ چھوڑو اور بتاؤ، اس وقت تم نے ٹچ والے موبائل کا ذکر کیوں نکالا؟''

''دیکھو...... اگر تمہارے پاس ٹچ والا فون ہوتا تو تم اس کی مدد سے فوراً ٹھنڈی مشین والی ٹیکسی منگوا سکتے تھے۔'' شکورن نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے، ایسی ٹھنڈی ٹھار ٹیکسیوں کا کرایہ تو رکشا سے بھی کم ہوتا ہے۔''

''ہاں، یہ بات مجھے بھی معلوم ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسی ٹیکسیاں ایئرکنڈیشنڈ ہونے کے علاوہ محفوظ بھی تصور کی جاتی ہیں کیونکہ ٹیکسی اور اس کے ڈرائیور کو کمپنی والے اپنے کمپیوٹر پر بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔''

''شکر ہے......'' شکورن کو یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ ''میری کوئی بات تو تمہاری سمجھ میں آئی۔''

''میں سب سمجھتا ہوں شکورن۔'' وہ بڑے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے ہلکا نہیں لیا کرو۔''

وہ دونوں دانستہ ماحول سے بے خبر ایسے گفتگو کررہے تھے جیسے وہ اس وقت اپنے گھر کے اندر بیٹھے ہوں لیکن

ماحول ہرگز اُن سے بے خبر نہیں تھا۔ وہاں موجود افراد بڑی دلچسپی سے ان کی چٹ پٹی بحث و تکرار کو سن رہے تھے۔ نتیجتاً ایک خوش پوش شخص ان کے نزدیک چلا آیا اور شائستہ لہجے میں گویا ہوا۔

''میں نے آپ لوگوں کی بات چیت سنی ہے۔ آپ سواری کے لیے پریشان ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا......؟''

''آپ بجا فرما رہے ہیں جناب۔'' عقیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''رکشا والوں کو بس کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے مسافروں کو لوٹنے کا۔ جیسے جیسے رات کا سفر آگے بڑھتا ہے، ان کی کمینگی کا گراف بھی بلند ہونے لگتا ہے۔ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ مرنا بھی ہے۔ جب وقت آئے گا تو سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا۔''

''آپ لوگوں کو جانا کہاں ہے؟'' اجنبی شخص نے سوال کیا۔

''کورنگی کراسنگ۔'' عقیل نے بتایا۔ ''مگر کوئی بھی حرام خور رکشے والا آٹھ سو، ہزار سے نیچے کی بات ہی نہیں کر رہا۔''

''اوہ...... ویسے کورنگی کراسنگ یہاں سے ہے بھی خاصے فاصلے پر......'' وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ ''میرا نام رفیق شیخ ہے۔ اگر آپ کو نارتھ کی سمت جانا ہوتا تو میں آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے چلتا اس طرح آپ کا کرایہ بھی بچ جاتا۔ گاڑی میں اتنی گنجائش تو ہوتی ہی ہے مگر آپ لوگوں کی منزل تو جنوب کا آخری کنارہ ہے......''

''ایک منٹ بھائی صاحب۔'' شکورن نے رفیق شیخ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ ہمیں کسی گاڑی میں بٹھانے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ تو خود ہماری طرح سڑک پر کسی سواری کے انتظار میں کھڑے ہیں؟''

''آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہے خاتون۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''میں اپنی سواری کا انتظار ضرور کر رہا ہوں مگر کسی رکشا اور ٹیکسی کا ہرگز نہیں۔ میرا ایک دوست اپنی کار میں مجھے پک کرنے آرہا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں......''

''نہیں بھائی۔'' عقیل اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''ہماری منزلیں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں واقع ہیں۔ آپ ہماری خاطر کسی تردد میں نہ پڑیں۔ اللہ مالک ہے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی۔''

''اگر آپ نے مجھے بات پوری کرنے دی ہوتی تو پھر آپ کو اس قسم کی وضاحت نہ دینا پڑتی۔ میرے کہنے کا مقصد کچھ اور تھا۔''

وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟''

''میرے پاس ٹچ والا سیل فون ہے۔'' رفیق شیخ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے شکورن کی جانب دیکھا۔ ''اور اس فون میں ٹھنڈی مشین والی محفوظ کار منگوانے کی ایپلی کیشن بھی موجود ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے وہ ٹیکسی منگوا دیتا ہوں؟''

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو منگوا دیں جناب۔'' عقیل نے منت پذیر لہجے میں کہا۔ ''بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مشکل میں کسی ضرورت مند کے کام آتے ہیں۔ اس نیکی کا اجر اللہ ہی آپ کو دے گا۔ ہمارے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ہے تو بہت کچھ......'' رفیق شیخ اپنے اسمارٹ فون کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''اگر آپ دینا چاہیں تو......''

شکورن اور عقیل نے چونک کر سوالیہ نظر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رفیق کی بات دونوں میں سے کسی کے پلے نہیں پڑی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ رفیق سے کسی قسم کا کوئی استفسار کرتے، وہ خوش خبری سنانے والے انداز میں بولا۔

''ایک راؤنڈ کے ساڑھے چار سو روپے آرہے ہیں۔ اگر کہیں رش میں پھنس گئی تو پانچ سو تک بن جائیں گے۔ پانچ منٹ میں گاڑی یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نے کورنگی کراسنگ کی لوکیشن ڈالی ہے۔ وہاں پہنچ کر آپ ڈرائیور کو گائڈ کر دیجیے گا کہ آپ کا گھر کس طرف ہے۔ ڈرائیور کا نام عرفان ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے سوالیہ نظر سے عقیل کی طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اوکے کر دوں؟''

''پہلی فرصت میں اوکے کر دیں جناب۔'' عقیل نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''آپ تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ ہم اس وقت کس مشکل میں تھے۔''

''اندازہ ہے اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' رفیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ میں نے تم لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ دنیا نیکی کی طاقت

سے چل رہی ہے۔ اگر ہم ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلانے کی عادت ڈال لیں تو چار دانگ اجالا ہی اجالا پھیل جائے گا۔ انسان کی زندگی سے مایوسی، دکھ اور درد کی تاریکی چھٹ جائے گی۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہورہا ہے کہ میں نے ایک ٹیکسی کو کال کر کے تمہارے اوپر احسانات کا بوجھ ڈال دیا ہے تو تم بھی کسی انسان کے ساتھ کوئی چھوٹی بڑی نیکی کر کے اس بوجھ سے نجات حاصل کر لینا...... لو، تمہاری گاڑی آگئی۔''

بات ختم کر کے رفیق نے ایک طرف دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر ایک وہائٹ کلٹس کار نظر آرہی تھی۔ رفیق نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلالیا۔ چند سیکنڈ کے بعد مذکورہ کار اُن کے نزدیک پہنچ گئی۔

شکورن اور عقیل، رفیق شیخ کا شکریہ ادا کر کے گاڑی میں بیٹھنے لگے تو شکورن نے اپنے اجنبی محسن سے استفسار کیا۔

''بھائی صاحب! آپ نے ٹیکسی بلانے سے پہلے کہا تھا کہ آپ کو دینے کے لیے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ پھر آپ نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ آپ کی اس بات کا مطلب کیا تھا؟''

''میری مراد دعا سے تھی۔'' رفیق نے متانت بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''دعا ایک ایسی انمول شے ہے جو ہر کس و ناکس کے پاس بڑی وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے لیکن دیکھنے میں عموماً یہی آیا ہے کہ لوگ اس کے معاملے میں بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر کبھی میں آپ لوگوں کو یاد آجاؤں تو میرے حق میں دعا کر دینا۔ دعا دنیا کی سب سے کم قیمت اور سب سے زیادہ اثر پذیر شے ہے۔''

شکورن نے اطمینان بھری سانس لی اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ اس معتبر و نفیس نظر آنے والے بندے نے ہمارے کھانے والے بیگ پر نیت لگا رکھی ہے۔''

انسانی ذہن بیت العنکبوت کے مانند ہے جس کی جکڑ میں ہر شخص اپنی اوقات اور ظرف کے مطابق سوچتا ہے۔

☆☆☆

وہائٹ کلٹس میں نصب ٹھنڈی مشین آن تھی جس کے طفیل کار کا اندرونی ماحول خاصا خوش گوار ہوگیا تھا۔ باہر حبس اور گرمی تھی مگر کار کے اندر وہ دونوں خود کو بہت مزے میں محسوس کر رہے تھے۔ آج وہ جس ہفتہ وار مشن پر نکلے تھے، اس کا پہلا مرحلہ انہوں نے بہ آسانی طے کر لیا تھا اور اب دوسرا اور آخری مرحلہ درپیش تھا جو پہلے مرحلے سے کہیں زیادہ حساس اور توجہ طلب تھا تاہم وہ دونوں بڑے پُراعتماد نظر آرہے تھے۔

''عرفان! تم کب سے یہ ٹیکسی چلا رہے ہو؟'' عقیل نے ڈرائیور سے سوال کیا۔ اس کے استفسار میں بے تکلفی پائی جاتی تھی۔

عقیل اور شکورن کار کی عقبی نشست پر براجمان تھے۔ ڈرائیور نے چونک کر بیک ویو مرر میں، پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے عقیل کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

''لگ بھگ ایک سال ہوگیا ہے مگر...... آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''انہی صاحب نے بتایا تھا جنہوں نے ہمارے لیے تمہاری گاڑی کو کال کیا تھا۔'' عقیل نے گھڑا گھڑایا جواب دیا۔ ''رفیق میرے سسرالی رشتے دار ہیں۔ وہ تمہاری آنٹی کے چچیرے بھائی لگتے ہیں۔''

''چچیرے نہیں پھپھیرے۔'' شکورن نے فوراً تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ زلیخا پھوپی کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔''

''چلو جو بھی ہے، وہ تمہارے ہی سگے ہیں۔'' عقیل نے سلگانے والے انداز میں کہا۔

''ہمیشہ میرے سگے ہی تمہارے کام آئے ہیں عقیل۔'' شکورن نے بڑی نخوت سے کہا۔ ''اگر ابھی رفیق بھائی نے ہمارے لیے یہ گاڑی نہیں بلائی ہوتی تو آج کی رات شادی ہال کے باہر روڈ پر کھڑے ہو کر گزارنا پڑتی۔''

''ہاں بھئی...... ہاں!'' عقیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہمارے گھر میں ہر ماہ راشن بھی تمہارے سگے ہی تو ڈلواتے ہیں......''

''اب میرا منہ نہیں کھلواؤ عقیل......'' شکورن نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو اتنا بھی احساس نہیں کہ اس وقت ہم اپنے گھر میں نہیں بیٹھے ہوئے...... بس، جہاں موقع ملا، شروع ہوجاتے ہو۔''

عقیل نے اس بحث کو طول دینے کے بجائے پسپائی اختیار کی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ان میاں بیوی کے مابین ہونے والی نوک جھوک سے ڈرائیور لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ صبح سے لے کر رات گئے تک شہر کی سڑکوں پر کار دوڑاتا رہتا تھا۔ اس کی گاڑی میں بھانت بھانت کے پسنجرز

سفر کرتے تھے لہٰذا اسے ہر نوعیت کی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ وہ کسی کے معاملات میں دخل دیے بغیر اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھتا تھا۔ یہ اس کے پیشے کا بنیادی اصول تھا جس کی پابندی کرنا وہ خود پر لازم سمجھتا تھا لیکن کبھی کبھی ایسے جھکی اور باتونی مسافر بھی اس کی گاڑی میں بیٹھ جاتے تھے جو اسے اپنی گفتگو میں اُلجھا لیا کرتے تھے۔ عقیل بھی اس کے لیے ایک ایسا ہی پسنجر ثابت ہو رہا تھا۔

''عرفان! تم نے گاڑی کو تو بہت صاف ستھرا رکھا ہوا ہے۔'' عقیل نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''یہ گاڑی تمہاری اپنی ہے یا بھاڑے کی ہے؟''

''بھاڑے کی سمجھ لیں۔'' عرفان نے جواب دیا۔

''گاڑی کا مالک مجھے تنخواہ دیتا ہے۔''

''اگر تمہیں بُرا محسوس نہ ہو تو میں تمہاری تنخواہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' عقیل نے نرم لہجے میں کہا۔

''دراصل اس وقت میں کچھ سوچ رہا ہوں۔''

''یہ کلٹس میں پچھلے دو ماہ سے چلا رہا ہوں اور گاڑی کا مالک مجھے تیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دیتا ہے۔'' عرفان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس سے پہلے دس ماہ تک میں نے آلٹو کار چلائی ہے۔ وہ مالک مجھے پچیس ہزار دیا کرتا تھا۔''

''تمہاری ڈیوٹی کتنے گھنٹے کی ہے؟'' عقیل نے پوچھا۔

''سولہ گھنٹے۔'' عرفان ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں صبح دس بجے گاڑی نکالتا ہوں اور پھر رات دو بجے تک آف کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کو منزل تک پہنچانے کے بعد میں قیوم آباد اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ سمجھ لیں، یہ میری آج کی آخری رائڈ ہے اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے اپنے روٹ کے پسنجر مل گئے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔''

''باقی سب تو ٹھیک ہے......'' عقیل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ڈیوٹی ٹائم بہت زیادہ ہے۔''

''وہ تو ہے مگر مجبوری ہے انکل۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''انسان کو رزق روزگار کے لیے پتا نہیں کیا، کیا... تکالیف اٹھانا پڑتی ہیں۔''

اس دوران میں شکورن ان دونوں کی گفت و شنید سے بے نیاز آنکھیں بند کیے سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ٹھنڈی مشین کی لوری بھری کولنگ نے اسے نیند کی حسین وادی میں پہنچا دیا تھا یا وہ محض ''ری لیکس'' کر رہی تھی۔

''میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں عرفان۔'' عقیل نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے پتا نہیں، انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو رزق کے حصول کی خاطر انسان، انسانیت کے مقام سے قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے...... اسے بالکل یہ احساس نہیں ہوتا کہ کب اس نے اخلاقیات کی حدود کو پھلانگ ڈالا ہے خیر......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تم مجھے بتاؤ، اگر یہ گاڑی تمہاری اپنی ہو تو سارے اخراجات نکال کر مہینے کا کتنا کما لو گے...... اتنی ہی محنت کر کے جو تم اس بھاڑے کی گاڑی کے ساتھ کر رہے ہو؟''

''کم از کم ستر ہزار روپے۔'' عرفان نے جواب دیا۔ ''اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ سے اوپر......''

''اوہ...... پھر تو تمہارا سیٹھ بہت ہی تھوتھا ہے۔ انسانیت سے ایک دم خالی، اندر سے گھن لگا ہوا۔'' عقیل نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''تم اس کے ظلم سے جان کیوں نہیں چھڑا لیتے؟''

''ایک سیٹھ کے چنگل سے نکلوں گا تو کسی دوسرے کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑے گا۔'' عرفان نے مایوسی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''جب تک اپنی گاڑی کا مالک نہیں بن جاتا، یہ سلسلۂ غلامی اسی طرح چلتا رہے گا انکل......!''

''جس گاڑی میں ہم سفر کر رہے ہیں، اس کی قیمت کتنی ہو گی؟'' عقیل نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''یہ دس سال پرانا ماڈل ہے۔'' عرفان نے بتایا۔ ''سات سے آٹھ لاکھ کے قریب مل جائے گی۔ میرا مطلب ہے، صاف ستھری اور اچھی حالت میں۔''

''اور زیرو میٹر کتنے کی ہے؟''

''میرا آئیڈیا ہے، پندرہ لاکھ کے آس پاس۔'' عرفان نے جواب دیا۔

''اوہ...... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' عقیل نے تعجیل آمیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا پانچ لاکھ کی رینج میں کوئی اچھی حالت کی گاڑی مل جائے گی؟''

''کیوں نہیں، ضرور مل جائے گی۔'' عرفان نے کہا۔ ''اگر میں غلطی پر نہیں تو انکل! آپ بھی کوئی گاڑی خرید کر

اسے اس بزنس میں ڈالنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں...... ہیں نا؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' عقیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''دراصل، میں نے پانچ لاکھ کی ایک بی سی (کمیٹی) ڈالی ہوئی ہے جو اگلے ماہ مل جائے گی۔''

''پانچ لاکھ میں تو آپ کو آلٹو اور کورے، اے ون کنڈیشن میں مل جائیں گی۔'' عرفان نے کہا۔ ''بس، کوئی بھروسے کا آدمی گاڑی دلائے تو ورنہ اس لائن میں دھوکا بہت ہے۔ آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک فنکار ملے گا۔''

''مجھے تو تم بھروسے کے آدمی نظر آرہے ہو۔'' عقیل نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''کیا اس سلسلے میں تم میری مدد نہیں کرو گے؟ ہوسکتا ہے، میں وہ گاڑی لے کر تمہیں ہی چلانے کو دے دوں اور وہ بھی چالیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر اور...... ڈیوٹی بھی صرف بارہ گھنٹے۔ میں سمجھتا ہوں، تمام اخراجات نکال کر مجھے بھی چالیس ہزار تک تو بچ ہی جائیں گے۔ زیادہ کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ اللہ مجھ پر خاصا مہربان ہے۔''

''آپ کو ڈراپ کرتے وقت ہم کانٹیکٹ نمبرز کا تبادلہ کرلیں گے۔'' عرفان نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ ''پھر جب آپ کی بی سی کھل جائے تو آپ مجھے کال کرکے بتا دیجیے گا۔ باقی کے معاملات ہم بعد میں طے کرلیں گے۔''

اِدھر عرفان کی بات مکمل ہوئی، اُدھر عقیل کے سیل فون کی خطرناک رِنگ ٹون والی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی کی آواز میں کسی برمے ایسی تیزی تھی جو سماعت کو چھیدتی چلی جارہی تھی۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ عقیل نے فوراً سے پیشتر کال ریسیو کرلی ورنہ پتا نہیں، اس پُرسکون اور ٹھنڈے ٹھار ماحول میں کون سا غدر مچ جاتا۔

''ہیلو۔'' کے جواب میں عقیل نے دوسری جانب بولنے والے کو پہچان لیا اور خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم کہاں مر گئے تھے......؟''

دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا ظاہر ہے، وہ صرف عقیل ہی نے سنا۔ ''ایک منٹ رکو...... ہم اس وقت گورا قبرستان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے، اختر کالونی میں وہ ہمیں اٹھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ، کیا کرنا ہے؟''

عقیل کے سیل فون کی صور پھونکنے والی گھنٹی نے شکورن کو ایک دم ہشاش بشاش کردیا تھا۔ وہ ترنت کر بولی۔ ''میرا کوئی دماغ خراب نہیں ہوا جو اس بہشتی ماحول کو چھوڑ کر اصغر کے پٹ پاتے ہوئے چنگ چی رکشے میں جا بیٹھوں گی۔ تم اسے انکار کردو......''

''تمہاری ممانی منع کررہی ہیں۔ ہم بیس پچیس منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے۔ تم ہماری فکر نہ کرو۔''

دوسری جانب سے اصغر نے کچھ پوچھا۔

''ہاں، ہاں...... کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔'' عقیل نے جواب دیا۔ ''سب کچھ پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ شادی ہال میں بھی سب ٹھیک رہا۔ تم نہیں پہنچے تو تمہاری ممانی کے کزن رفیق نے ہمیں اپنے بچے والے موبائل سے ایک ٹھنڈی مشین والی کار منگوا دی تھی۔ ہم ٹھیک ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ملتے ہیں۔''

سیل فون کو جیب میں رکھنے کے بعد عقیل نے عرفان کو بتایا۔ ''اصغر میرا بھانجا ہے۔ ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''اول درجے کا نالائق ہے۔'' شکورن نے جلے بھنے انداز میں نے لقمہ دیا۔ ''چنگ چی رکشا چلاتا ہے مگر مجال ہے، کبھی ہمارے کام آیا ہو۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ شادی ہال کے باہر ملے گا مگر نہیں پہنچا۔ عقیل نے کئی بار فون کیا لیکن کوئی خیر خبر ہی نہیں۔ یہ تو رفیق بھائی کا بھلا ہو کہ انہوں نے ہمارے لیے گاڑی منگوا دی ورنہ پتا نہیں، ہمارا کیا حشر ہوتا......''

''آپ لوگوں کی رہائش کورنگی کراسنگ پر ہے اور شادی اٹینڈ کرنے آپ نارتھ ناظم آباد پہنچ گئے۔'' عرفان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ آپ کے ایریا میں تو لائن سے، پچاس سے بھی زیادہ شادی ہال اور میرج لان بنے ہوئے ہیں۔''

''جانا پڑتا ہے میاں......'' عقیل نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''یہ کوئی ہمارے گھر کی تقریب نہیں تھی جو بغل میں رکھ لیتے۔ ہمیں جہاں بلایا گیا، چلے گئے۔ ہر بندہ اپنی سہولت دیکھتا ہے۔ نفسا نفسی کا دور ہے۔ کسی کو کسی کی پروا کہاں ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔'' عرفان نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ہمارے درمیان انسانیت صرف نام کی رہ گئی ہے۔''

ایک بار پھر ان کے بیچ عقیل کی پانچ لاکھ والی بی سی اور مستقبل قریب میں اس رقم سے خریدی جانے والی گاڑی کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ چل پڑا۔ اس مرتبہ شکورن بھی اس منصوبہ بندی میں ان کے پیش پیش تھی۔

☆☆☆

کورنگی کراسنگ پر پہنچنے کے بعد عرفان نے نہایت ہی شائستگی سے پوچھا۔ ''انکل! آپ کی رہائش گاہ کس طرف ہے، ذرا مجھے گائیڈ کردیں۔''

جب سے عقیل نے عرفان کو یہ نوید مسرت سنائی تھی کہ وہ عنقریب ایک کار خرید کر اس کی کسٹڈی میں دینے والا ہے، اس کے بعد سے عرفان کے لیے اس کے دل و دماغ میں احترام کے جذبات موجزن ہوگئے تھے۔ چالیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ میں بڑی کشش تھی۔

''ناصر جمپ کی طرف لے لو۔'' عقیل نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

دو بجنے میں چند منٹ ہی رہ گئے تھے۔ کراسنگ والے شادی ہالز اور میرج لانز کی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ وہ گہما گہمی اور چکا چوند اب کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی جو تین گھنٹے پہلے کراچی کے اس علاقے کو بیت العروس بنائے ہوئے تھی۔ وہ لوگ اس وقت جہاں سے گزر رہے تھے وہاں قدرے ویرانی اور تاریکی کا راج تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے، بجلی کے کھمبوں پر اسٹریٹ لائٹس نظر آتی تھیں۔ باقی گردونواح اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بس، بس...... یہیں سائڈ پر روک دو......'' عقیل نے معتدل انداز میں کہا۔

''مگر...... یہاں تو مجھے آبادی کے آثار نظر نہیں آرہے۔'' عرفان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ایسی ویران جگہ پر نہ اتریں۔ میں آپ کو گھر کے دروازے پر چھوڑ دوں گا۔ بتائیں، کس طرف جانا ہے......؟''

''ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔'' عقیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہاں سے ہم اصغر کے رکشے میں جائیں گے۔ وہ سامنے بلب والے کھمبے کی طرف دیکھو۔ تمہیں ایک رکشا ادھر آتا نظر آئے گا۔ میرا بھانجا اصغر ہمیں پک کرنے آرہا ہے۔ میں نے اسے یہیں پر بلایا تھا۔''

عرفان نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو عقیل کا بتایا ہوا رکشا اسے نظر آگیا۔ اس نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے گاڑی کو ویران سڑک کے کنارے روک دیا اور اندرونی لائٹ جلا کر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ عقیل کی بدلی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ موبائل کو گاڑی ہی میں چھوڑ دو اور چپ چاپ شرافت سے باہر نکل آؤ......''

عقیل کی تحکمانہ آواز سے سفاکی تو جھلکتی ہی تھی، اس کے ساتھ ہی عرفان نے عقیل کے ہاتھ میں ایک خطرناک گن بھی دیکھ لی تھی جس کی نال اس کی کھوپڑی کی سمت اٹھی ہوئی تھی۔ عقیل کسی گرگ گرسنہ کے مانند اسے گھور رہا تھا۔

عرفان کے رگ و پے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسے یہ تو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس وقت ایک خطرناک غنیم کے نشانے پر ہے جو کسی بھی لمحے گن کا ٹریگر دبا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا ہے۔ ان لمحات میں عقیل کے چہرے اور آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی۔ وہ پہلے والا انکل عقیل نہیں تھا جو راستے بھر اسے سنہرے مستقبل کے سہانے سپنے دکھاتا رہا تھا۔

عرفان ''...... پائے رفتن نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت سے دوچار ہو چکا تھا۔ عقیل کے حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس نے سیل فون کو اپنی سیٹ پر رکھ دیا اور نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔

''یہ آپ ٹھیک نہیں کررہے ہو...... یہ گاڑی سیٹلائٹ کے ذریعے ٹریک ہورہی ہے۔ آپ کا یہ جرم ریکارڈ پر آجائے گا پھر آپ کے لیے کوئی بھی مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔''

''تمہیں ہمارے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عقیل نے پھنکار بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے سیٹلائٹ ٹریکر سسٹم کی تو......'' اس نے ناقابل اشاعت بدگوئی کرنے کے بعد گن کو دھمکی آمیز انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''اب مزید کوئی بکواس نہیں، چلو...... باہر نکلو۔''

اس دوران میں اصغر کا رکشا بھی وہائٹ کلٹس کے برابر میں آلگا تھا۔ آئندہ پندرہ منٹ میں عقیل اور شکورن نے اصغر کی مدد سے اپنے ہفتہ واری مشن کے دوسرے مرحلے کو بھی مکمل کر ڈالا۔ عقیل، عرفان کو گن پوائنٹ پر رکھ کر جائے وقوعہ سے دو سو گز دور لے گیا تھا۔ اس عمل سے پہلے عرفان کی دن بھر کی کمائی مبلغ دو ہزار سات سو روپے اس سے ''وصول'' کر لیے گئے تھے۔ اس شب ظلمات میں شکورن اور اصغر نے عرفان اور اس کی گاڑی کو بڑی بیدردی سے مونڈ ڈالا تھا۔

موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اصغر نے شکورن کو اپنے رکشے میں بٹھایا اور وہ لوگ عقیل کے پاس پہنچ گئے۔ عقیل نے بڑی استادی کے ساتھ عرفان کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اصغر نے عقیل کے نزدیک رکشا روکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اندر آجاؤ......!''

عقیل، شکورن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ تاہم ابھی تک

اس نے عرفان کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ اصغر نے عرفان سے کہا۔ ''تم میرے برابر میں بیٹھ جاؤ۔''

''مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو......؟'' عرفان نے متوحش لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم لوگوں نے مجھے لوٹنا تھا، لوٹ لیا۔ اب کیا ہے!''

''اب تمہیں ڈراپ کرنا ہے، کسی مناسب جگہ پر۔'' اصغر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''جلدی آجاؤ۔ تمہاری رائڈ آن ہے۔ اگر میرا ارادہ بدل گیا تو ماموں ذرا آسرا نہیں کریں گے۔ میرے ایک اشارے پر تمہیں یہیں ٹھوک دیں گے۔''

عرفان نے سہمی ہوئی نظر سے گن کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اصغر کے برابر میں ٹک گیا۔ اصغر نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ جب وہ لوگ وہائٹ کلفٹس سے لگ بھگ پانچ سو گز کے فاصلے پر آگئے تو اصغر نے رکشا روک لیا۔

''نیچے اترو۔'' اس نے عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

عرفان کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جب وہ رکشا سے اتر... آیا تو اصغر نے اس کی گاڑی کی چابی اسے دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''چند گھنٹوں کے بعد سحر خیزی کے شائق لوگ مارننگ واک کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئیں گے۔ یہ اچھا موقع ہے ''نائٹ واک'' کا۔ تم خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچو اور اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔''

عرفان قسمت کی ستم ظریفی پر خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں تیزی سے تاریکی کا حصہ بنتے ہوئے منحوس رکشے کی طرف دیکھا۔ رکشے کی مخصوص ''ٹرٹراہٹ'' کے درمیان اسے مکروہ قہقہوں کی صدا بھی سنائی دی۔ یہ ان تین بدکاروں کے قہقہے تھے جنہوں نے آج اس کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی تھی۔

☆☆☆

تین بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ رات کا آخری پہر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ زمان ٹاؤن کے ایک گھر میں اس وقت تین افراد اپنی کامیابی کا جشن منانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنے ہفتہ واری مشن کو بہ خیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

''مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔'' اصغر نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ندیدہ نظر سے کھانے والے بیگ کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگوں نے تو شادی ہال میں پیٹ پوجا کر لی ہوگی لیکن میں نے لنچ کے بعد ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔''

''پہلے کام، پھر طعام اور اس کے بعد آرام۔'' شکوران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ممانی! تم بھی کمال کرتی ہو۔'' اصغر نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ''سب تو نمٹ گیا۔ اب کون سا کام باقی ہے؟''

''تمہاری ممانی کا اشارہ حساب کتاب کی جانب ہے۔'' عقیل نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''ہمارا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ مشن سے واپسی پر گھر آکر ہم سب سے پہلے مالِ غنیمت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچتے ہیں۔''

''سمجھ گیا ماموں......'' اصغر تائیدی انداز میں بولا۔

''تو شمار کرو، آج کتنی اگائی ہوئی ہے؟'' شکوران نے کہا۔

''بھئی، دو ہزار سات سو روپے تو کیش ہے۔'' عقیل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''باقی ٹیکنیکل چیزوں کا حساب تو اصغر ہی لگا سکتا ہے۔''

''ماموں! اسے بھی کیش ہی سمجھو۔'' اصغر نے ساڑھے سات ہزار والا ایک پرائز بانڈ عقیل کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے مسرور کن انداز میں کہا۔ ''کم بخت نے اسے ڈرائیونگ سائڈ والے دروازے کی لائننگ (استر) میں چھپا رکھا تھا۔ مجھ سے ہوشیاری......!''

''اس کا یہ ٹچ والا موبائل کتنے کا ہوگا؟'' عقیل نے پوچھا۔

''ہے تو بیس کے آس پاس مگر ہم چونکہ چور مارکیٹ میں بیچیں گے اس لیے سمجھ لو، دس ہزار تک چلا جائے گا۔'' اصغر نے بتایا۔

عقیل نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تم نے موبائل فون کو آف تو کر دیا تھا نا؟''

''پہلی فرصت میں ماموں۔'' اصغر نے فخریہ انداز میں عقیل کی جانب دیکھا۔ ''موبائل ہاتھ میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کا سوئچ آف کیا تھا تاکہ کار کی کمپنی والے یا کوئی اور ہمیں ٹریک نہ کر سکے۔''

''اور اس ٹیپ کی کیا ویلیو ہوگی؟'' عقیل نے پوچھا۔

''ماموں! یہ ڈیجیٹیل آڈیو سسٹم ہے۔'' اصغر نے عقیل کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے

اسپیکرز بھی نکال لایا ہوں۔ یہ بھی دس ہزار تک نکل جائے گا۔''

''تو کُل ملا کر آج ہم نے تیس ہزار روپے کا بزنس کیا ہے۔'' عقیل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہفتے بھر کا کھانا اس کے علاوہ ہے۔ میرے خیال میں ہم نے... کم از کم پندرہ دن کا دھندا کر لیا ہے۔ اب اگلے ہفتے ہمیں چھٹی کر لینا چاہیے۔''

''آمدنی اور بھی زیادہ ہو سکتی تھی......'' شکورن نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہارے بھانجے نے میری بات نہیں مانی۔''

''تو کیا تم نے اسے پوری گاڑی ہی اٹھا لانے کو کہہ دیا تھا؟'' عقیل نے سوالیہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

''نہیں ماموں......'' اصغر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے وضاحت کر دی۔ ''ممانی کا اصرار تھا کہ گاڑی میں فٹ ٹھنڈی مشین کو بھی نکال لیا جائے لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے ماموں، پولیس کی موبائلیں رات گئے تک گشت میں رہتی ہیں۔ میں خواہ مخواہ بنا بنایا کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔''

''تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے بھانجے......'' عقیل نے ستائشی نظر سے اصغر کی طرف دیکھا۔ ''انسان کو زیادہ لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ جو ہاتھ لگا ہے، اسے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر گزارہ کر لینا چاہیے......''

''ممانی! کھانے میں کیا ہے؟'' اصغر نے شکورن سے پوچھا۔

''چکن بریانی، مٹن قورمہ، بروسٹ، فش فرائی اور دو قسم کا میٹھا بھی ہے۔'' شکورن نے بتایا۔ ''خوبانی کا میٹھا اور شاہی ٹکڑے۔''

''میں سب سے پہلے چکن بریانی کی ایک ہلکی سی تہ لگانا پسند کروں گا۔'' اصغر نے کہا۔ ''اس کے بعد فش فرائی سے پورا انصاف کروں گا۔''

''میں ہال میں فش نہیں کھا سکا تھا۔'' عقیل نے کہا۔ ''تمہاری ممانی نے سب سے زیادہ مچھلی ہی بھری تھی۔'' پھر اس نے شکورن سے پوچھا۔ ''تم کیا کھاؤ گی؟''

''فش فرائی کے سامنے میری نگاہ میں اور کچھ جچ نہیں رہا۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''باقی سب کچھ تو ہال میں کھا لیا تھا۔ اب صرف اور صرف فش فرائی......''

اس کے بعد وہ تینوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔

اس دوران میں یہ بھی طے ہو گیا کہ اب جو پھیل کر سوئیں گے تو پھر اپنی مرضی ہی سے اٹھیں گے۔ اگر کسی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے باقیوں کو سوتے ہوئے پایا تو وہ انہیں جگانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس ہفتہ واری مشن نے ان تینوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر بُری طرح تھکا دیا تھا۔ انہیں ایک طویل اور پُرسکون نیند کی اشد ضرورت تھی۔

ان تینوں نے کسی کو ڈسٹرب نہ کرنے پر صاد کیا اور لمبی تان کر سو گئے۔

☆☆☆

آئندہ روز ہر اخبار نے اس سنسنی خیز اور افسوسناک خبر کو لگایا تھا...... ''گزشتہ رات ناظم آباد کے ایک شادی ہال میں زہریلی مچھلی کھانے سے پینتالیس افراد اسپتال پہنچ گئے۔''

تفصیلات کے مطابق، مذکورہ شادی ہال میں، شادی کی ایک تقریب چل رہی تھی جس میں مہمانوں کی تواضع کے لیے انواع و اقسام کے دیگر کھانوں کے ساتھ ہی تلی ہوئی مچھلی بھی رکھی گئی تھی۔ جس مہمان نے بھی مچھلی پر ہاتھ صاف کیا، اسے جلد یا بہ دیر اسپتال کی ایمرجنسی کا رخ کرنا پڑا تھا۔ بہرحال، اس نازک صورتِ حالات کو مختلف اسپتالوں کے ایمرجنسی اسٹاف نے بڑی مہارت اور تندہی سے فوری طبّی امداد کے ذریعے متاثرین کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ کہیں سے بھی کسی انسانی جان کے زیاں کی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی تاہم شادی ہال سے تھوڑے فاصلے پر واقع ایک کچرا کنڈی کے نزدیک چار آوارہ کتوں کی لاشیں پڑی ملی تھیں۔ ان چاروں کو اسپتال پہنچانے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ اپنی موت مر گئے۔ تحقیقات سے پتا چلا تھا کہ شادی ہال والے بچا کھچا کھانا اس کچرا کنڈی میں پھینک دیا کرتے تھے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ چاروں بدنصیب کُتّے شکم سیری کے لیے کچرا کنڈی کی طرف گئے ہوں گے۔

کسی اخبار کے ذرائع چاہے کتنے بھی باخبر کیوں نہ ہوں پھر بھی فروگزاشت کی گنجائش بہرطور موجود رہتی ہے۔ زمان ٹاؤن کے ایک گھر میں پڑی تین لاشوں کی جانب کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اُس رات چار نہیں، بلکہ سات آوارہ کتے لقمۂ اجل بنے تھے۔

اجل جب کسی شخص کو اپنی گرفت میں لیتی ہے تو وہ انسان ہوتے ہوئے بھی کُتّے کی موت مارا جاتا ہے......!

❖❖❖

تہذیب یافتہ معاشرے میں بعض ایسی برائیاں پائی جاتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا... ایسے ہی معاشرے میں رہنے اور مہذب دکھائی دینے والے چہروں کے پیچھے چھپے سفاک درندوں کی عکاسی... ان کے شوق سادہ و بے ضرر لوگوں کی زندگیوں کو دہشت ناک بنا رہے تھے...

شاطر مجرم اور معصوم بچی کے اغوا کا سنگین معاملہ......

شیطان

اعتزاز سلیم وصلی

مارلن نے اپنی گاڑی رہائشی علاقے کی طرف موڑی۔ وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ یہ جمعے کی شام تھی۔ اکثر لوگ اگلے دو دن کی چھٹی کا خیال دماغ میں لیے خوشی خوشی واپس گھر جا رہے تھے۔ یہ شہر کا آخری رہائشی علاقہ تھا۔ مارلن ایک بینک میں جاب کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ اور جولیا... بینک کے قریب ہی کسی علاقے میں گھر لینے کا سوچ رہے تھے مگر جولیا کا آفس اس علاقے سے قریب تھا اس لیے وہ ہچکچا رہی تھی۔ گاڑی گیٹ سے اندر لا کر گیراج میں

کھڑی کرنے کے بعد وہ گھر کے اندر بڑھ گیا۔ جولیا واپس آچکی تھی۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا...... الینا کی وہیل چیئر سامنے دکھائی دی۔ اس کے پورے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پورے دن کی تھکن کے بعد بیٹی کو یوں اپنے انتظار میں دیکھنا، اس کے لیے ہمیشہ خوشگوار لمحہ ہوتا تھا۔ ''پاپا آج آپ پورے بیس منٹ لیٹ ہوئے ہیں۔'' الینا نے اپنی مخصوص مدھم آواز میں شکوہ کیا۔ وہ اس کی وہیل چیئر کے قریب بیٹھ گیا۔

''آج آپ نے دیر کرائی ہے مجھے۔''

''کیسے؟'' اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

''میری پری نے آج صبح فرمائش جو کی تھی کہ میرے لیے چاکلیٹ اور کھلونے لے آنا اس لیے مارکیٹ جانا پڑ گیا ورنہ سیدھا گھر واپس آتا۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ اسے پکڑا دیا۔ وہ خوشی سے بیگ کھول کر اپنی پسند کی چیزیں دیکھنے لگی۔ جولیا کچن میں تھی۔ دونوں کی باتوں کی آواز سن کر باہر آگئی۔

''آگئے آپ...... اتنے سوال پوچھتی ہے یہ آپ کی بیٹی۔''

''تو کیا ہوا...... میرے بیٹی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کونسا تھک رہی ہو تم، سارا دن کسٹمرز کے سوالوں کا جواب بھی تو دیتی ہو۔'' اس نے جولیا کو کندھے سے پکڑ کر ساتھ لگا لیا۔ وہ ہنس پڑی۔

''وہ میری جاب ہے۔''

''اور یہ تمہاری ذمّے داری۔''

''کاش میرا ساتھ دے سکتی یہ بھی۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ الینا معذور تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی مسئلہ تھا اس لیے وہ چل نہیں سکتی تھی نہ زیادہ جسم حرکت کر سکتا تھا۔ اکلوتی اولاد کا یہ دکھ مارلن اور جولیا کے لیے بہت بڑا تھا مگر دونوں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ انہوں نے الینا کو کبھی اس کی معذوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ دونوں جاب پر ہوتے تھے اور الینا کو سنبھالنے کے لیے جولیا کی ماں کے ساتھ ایک نرس بھی گھر پر ہوتی تھی۔ یہ پُرسکون علاقہ تھا۔ شہر کا آخری رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں شہر جیسا شور ہرگز نہیں تھا۔

''آنٹی کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ماما کمرے میں ہیں۔'' جولیا جواب دے کر واپس کچن کی طرف بڑھ گئی۔ مارلن لباس بدل کر الینا کے پاس آگیا۔ جب تک اس کے سونے کا وقت نہ ہو جاتا تب تک پورے دن کی ایک ایک بات سننا اور بتانا مارلن کی ذمّے داری تھی۔ مکمل تفصیل بتانے کے بعد الینا نے فرمائش کی۔

''پاپا گیم کھیلیں؟'' مارلن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ گیم الینا نے خود ایجاد کیا تھا۔ مارلن باہر چلا گیا تو وہ وہیل چیئر سمیت دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ اب مارلن کو اسے ڈھونڈنا تھا......

''پاپا تمہیں ڈھونڈ لیں گے پری۔'' وہ باہر سے ہی بلند آواز میں پکارنے لگا۔

مارلن کی زندگی مکمل تھی۔ الینا کی معذوری کے باوجود وہ دونوں مایوس نہیں تھے۔ مارلن ایک مضبوط ذہنیت کا شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مشکلات کے آگے ہار نہیں مانتے۔ جولیا اور اس کی آپس میں اچھی بنتی تھی۔ دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سمجھ کر اپنایا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے باہر آکر مائیکل نے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ بائک گھما کر مائیکل اس کے پاس لایا۔ ''آجاؤ۔'' وہ چپ چاپ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ان کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مائیکل دوسرے شہر سے آیا تھا۔ وہ امیر باپ کی اولاد تھا اس لیے یہاں شان سے رہتا تھا۔ ایک مہنگا فلیٹ اس کی ملکیت تھا۔ اس کا دوست ابھی مستقبل بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد وہ مائیکل کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

''باقی سفر میں ٹیکسی کر لوں گا۔'' دوست کی بڑبڑاہٹ اس تک پہنچی۔

''فلیٹ پر آجاؤ...... کچھ کھا پی کر نکل جانا۔'' مائیکل نے دعوت دی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ مائیکل اسے بٹھا کر بیئر کا پیک لے آیا۔ پینے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں باتیں بھی کرتے رہے۔ مائیکل واش روم میں چلا گیا۔ وہ اٹھ کر اس کا فلیٹ دیکھنے لگا۔ یہاں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔

''پیسے کی طاقت۔'' وہ بڑبڑایا۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ مائیکل کے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس بچے کی طرح لگ رہا تھا جو اپنی پسند کا کھلونا دیکھ رہا ہو۔ وہ غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا جہاں ایسی سہولتوں کا بس خواب دیکھا جاتا تھا۔ مائیکل کے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب احساس ہوا۔ وہ چونک گیا۔ یہاں ہر طرف

تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ پوسٹر تھے...... کہیں کہیں ہتھیاروں کی تصاویر بھی تھیں۔ اسے تصاویر میں موجود افراد کو پہچاننے میں کوئی مشکل نہ ہوئی۔ ان میں سے بس دو تین ہی اس کے لیے انجان تھے۔ یہ اداکار تھے نہ فٹبال کے مشہور کھلاڑی...... یہ تاریخ کے خوفناک کردار تھے۔ جیک دا رپر، زودیاک داکلر، میری این کاٹن، سیموئیل لٹل اور ان کے علاوہ تاریخ میں موجود کئی مشہور ترین نفسیاتی قاتل جنہوں نے سیکڑوں لوگوں کی جان لی تھی۔ وہ ساکت رہ گیا۔ مشہور ترین پُراسرار قاتل جیک دا رپر کی تصویر کے اوپر ''آئی لو یو۔'' لکھا دکھائی دیا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اسے احساس ہوا، اس نے وہاں آکر غلطی کر دی۔ وہ پیچھے مڑا۔ بیڈروم کے دروازے پر مائیکل کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔

''ای...... یہ...... سب۔'' اس کے منہ سے عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ مائیکل اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ مائیکل سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مائیکل آگے بڑھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا خنجر کو ہوا میں لہراتا آگے بڑھنے لگا۔ اس کا شکار پیچھے ہٹنے لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ الٹے قدم لوٹتے ہوئے وہ بیڈ کو نہ دیکھ سکا، ٹھوکر لگی اور وہ بیڈ پر ہی گر گیا۔ مائیکل اس کے پاس لیٹ گیا۔

''مجھے جانا ہے مائیکل۔''

''کہاں؟''

''اپنے گھر۔''

''اتنی جلدی کیا ہے میرے پیارے دوست۔''

''یہ سب کیا ہے مائیکل؟'' وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی رفتار اس کے قابو میں نہیں رہی تھی......

''شوق...... میرا شوق۔'' مائیکل کی آواز میں سفاکی تھی......

☆☆☆

مارلن نے جولیا کی طرف دیکھا۔ ''وہ گھر میں اکیلی ہے اور تم اسے چھوڑ کر یہاں آگئیں؟'' بینک سے نکلتے ہی جولیا اسے دکھائی دی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔

''مارلن...... کیا ہو گیا ہے مام ہے وہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے ویسے بھی کافی خریداری کرنی تھی۔''

''آنٹی شیرن کیسے سنبھالیں گی اسے جولیا...... لنڈا بھی جا چکی ہوگی اب۔'' وہ پریشان ہو گیا۔ اسے جولیا سے اس بے پروائی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

''ایک تو آپ الینا کو لے کر کچھ زیادہ ہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا، سو رہی تھی وہ جب میں اِدھر آئی ہوں۔'' اس نے مارلن کو گاڑی اِن لاک کرنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے مارلن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''موڈ ٹھیک کرو، الینا نے دنیا سے لڑنا ہے اس کے لیے ہمیں ابھی سے اس کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے۔''

مارلن نے اثبات میں سر ہلا کر خود کو پُرسکون کیا۔ کچھ دیر بعد وہ مارکیٹ کی جانب بڑھ گئے۔ واپسی پر الینا کے لیے کافی ساری چیزیں لینے کے بعد انہوں نے گھر کے لیے کھانا پیک کروایا۔ گھر واپس آتے ہوئے مارلن کا موڈ خوشگوار تھا۔ باتوں کی وجہ سے سفر کا احساس نہ ہوا۔ گیٹ بند تھا۔ جولیا نے نیچے اتر کر گیٹ کھولا۔ مارلن گاڑی اندر لے آیا۔ خلافِ توقع الینا آج اس کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھی۔

''الینا۔'' اس نے پکارا۔ جولیا سامان رکھ رہی تھی۔ اسے بھی تبدیلی کا احساس ہوا۔

''مام۔'' اس نے پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہ شیرن کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر اس نے دیکھا۔ شیرن سو رہی تھی۔ مارلن، الینا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔

''جولیا...... الینا کمرے میں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے؟ مام تو اکیلی سو رہی ہیں۔'' وہ بوکھلا گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر شیرن کو جگایا۔ ''مام...... الینا کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہی تھی۔'' شیرن ابھی تک نیند میں تھی۔ ''لنڈا اس کے پاس تھی میری آنکھ لگ گئی۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''لنڈا ابھی نہیں ہے۔'' مارلن نے اطلاع دی۔

''دونوں باہر گئی ہوں گی۔'' جولیا نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی ورنہ وہ جانتی تھی لنڈا، الینا کو لے کر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ مارلن نے سیل فون نکالا اور لنڈا کو کال کی۔

''لنڈا...... الینا کہاں ہے؟'' دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سنتے ہی اس نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں تھی سر، مجھے کہا تھا چھٹی کر لو، آرام کر رہی تھی۔'' مارلن کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ جولیا اور شیرن نے پورا گھر چھان مارا۔ الینا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ مارلن بھاگ کر باہر نکل گیا۔ آس پاس کے گھروں میں

بھی معلوم کیا مگر کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ واپس الینا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کی مکمل تلاشی لینے کے بعد اسے بیڈ کے نیچے جو چیز ملی...... وہ اس کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھی۔ یہاں ایک گڑیا موجود تھی جس کی گردن آدھی کٹی ہوئی تھی۔ مارلن بیڈ پر گر گیا۔

☆☆☆

''مجھے جانے دو مائیکل۔'' وہ گڑگڑایا۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا...... تم تو میرے دوست ہو...... ہاں مگر میں دشمنوں کو نہیں چھوڑوں گا۔'' آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی آگئی۔ وہ حیرت سے مائیکل کو دیکھنے لگا۔

''مگر تمہارا دشمن کون ہے؟''

''تمہارے علاوہ سب۔'' اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ تھی۔ ''میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے مشہور ہونے کا۔''

''کیسا منصوبہ؟''

''ہم لوگوں کو قتل کریں گے...... عجیب طرح سے، خود تک پہنچنے کے لیے نشان چھوڑیں گے مگر ہمیں کوئی پکڑ نہیں سکے گا۔'' مائیکل کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوست نے سکون کا سانس لیا۔ مائیکل اسے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''مگر ہم لوگوں کو کیوں ماریں گے؟''

''مزے کے لیے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تکلیف دینا اور تکلیف سہنا میرا پسندیدہ کام ہے۔'' وہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی جس میں سرخ رنگ کا مشروب تھا۔ ڈھکن کھول کر اس نے ایک گھونٹ بھرا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے بوتل دوست کی جانب بڑھا دی۔ نہ چاہتے ہوئے اس نے بھی بوتل پکڑ کر منہ سے لگا لی۔ اس مشروب کا ذائقہ عجیب تھا۔ اسے حلق میں تلخی محسوس ہوئی مگر وہ پیتا چلا گیا۔ مائیکل اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے بوتل منہ سے ہٹائی۔ اس کے پورے جسم میں جوش بھر گیا۔ اس نے مائیکل کو دھکا دیا۔ دونوں کا قہقہہ گونجا۔ اگلے چند منٹ دونوں میں سخت مارا ماری ہوئی۔ وہ ہنس بھی رہے تھے اور لڑ بھی رہے تھے۔ کمرے میں موجود سامان بکھر گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں تھک کر بیڈ پر گر گئے۔

یہ اس کا معمول بن گیا۔ مائیکل اسے یونیورسٹی سے واپس سیدھا اپنے فلیٹ پر لے آتا تھا۔ مشروب کی کشش اسے کھینچ لاتی۔ تقریباً ایک ماہ لگا انہیں منصوبہ بنانے میں۔ مائیکل نے قریباً سو کے قریب مختلف کھلونے اکٹھے کر لیے۔ ان میں گڑیوں سمیت مختلف چیزیں شامل تھیں۔ ان کا پہلا نشانہ مارتھا بنی۔ چودہ سال کی مارتھا جو اسکول سے واپس آتے ہوئے ان کے ہاتھ لگ گئی۔ مشروب پی کر انہوں نے اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا۔ وہ تڑپتی رہی اور آخر ان کی ہوس نے اس کی زندگی لے لی۔ مائیکل اسے شہر سے دور پھینک آیا۔ اس نے مارتھا کی لاش کے پاس ایک گڑیا رکھ دی۔

''میں بنوں گا تاریخ کا مشہور ترین سیریل کلر۔'' واپس آتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

مارتھا کی لاش ایک دن بعد ملی۔ پولیس کی تمام تر کوششوں کے باوجود قاتل کا نشان نہ ملا۔ گڑیا کی وہاں موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ یہ کسی نفسیاتی قاتل کا کام ہے مگر وہ مائیکل تک نہ پہنچ سکے۔ اور سلسلہ چل نکلا......

☆☆☆

''مارلن...... مارلن۔'' جولیا نے اسے جھنجوڑا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ جولیا اس سے لپٹ گئی۔ ''حوصلہ کرو میری جان۔'' اس کے نرم ہونٹوں نے مارلن کے ماتھے کو چھوا۔

''وہ اسے مار دے گا۔'' الفاظ اس کے منہ سے پھسلے۔

''کون؟'' جولیا چونکی۔

''وہی جو اسے لے کر گیا ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر اپنا چہرہ صاف کیا۔

''کون لے کر گیا ہے؟'' جولیا نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے۔ ''باہر پولیس آئی ہے مارلن، ہمیں سب بتانا ہوگا انہیں۔'' مارلن نے چپ چاپ گڑیا اس کے سامنے کر دی۔ گڑیا کی کٹی گردن اسے پُراسرار بنا رہی تھی۔ جولیا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔

''یہ کیا ہے؟''

''تم نہیں جانتیں...... یہ بہت خطرناک چیز ہے۔'' اس نے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ جولیا اسے سنبھالتے ہوئے باہر لے آئی۔ باہر صوفے پر پولیس کے دو آفیسر بیٹھے تھے۔ مارلن کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہوئے۔ مارلن نے ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ دونوں تفصیل پوچھنے لگے۔ سب کچھ پوچھنے کے بعد آفیسر ماریو نے پوچھا۔

''کوئی نشانی؟ کچھ ایسا جس سے کوئی سراغ مل سکے؟''

''کچھ نہیں۔'' جولیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ہماری

کسی سے دشمنی نہیں...... ہم شریف لوگ ہیں، ہم......'' وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر مارلن نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہے، کچھ ایسا ہے جو آپ کی مدد کر سکتا ہے۔''

''کیا؟'' ماریو نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ اس کے تاثرات کو کوئی نام نہیں دے سکا۔

''یہ۔'' مارلن نے صوفے پر پڑی گڑیا اُن کو دکھائی۔

''الینا کی گڑیا؟'' ماریو نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''الینا کو گڑیا وغیرہ کا شوق نہیں، یہ دیکھیں۔'' اس نے گڑیا کی کٹی گردن سامنے کی۔ ماریو نے معنی خیز نظروں سے ساتھی آفیسر کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات واضح تھے۔

''سیریل کلر۔'' وہ بڑبڑایا۔ جولیا اُچھل پڑی۔

''کیا...... میری بیٹی کسی پاگل کے ہاتھ لگ گئی؟'' وہ چیخی۔ ''وقت ضائع کر رہے ہیں ہم لوگ...... وہ تو مار چکا ہو گا اُسے۔''

''ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے۔'' ماریو نے اسے تسلی دی اور پولیس اسٹیشن رابطے میں مصروف ہو گیا۔ مارلن صوفے پر ایسے پڑا تھا جیسے شکست تسلیم کر چکا ہو۔

پولیس کی تفتیش پوری رات جاری رہی۔ اگلی صبح جب جولیا کی آنکھ کھلی تو وہ اور مارلن صوفے پر ہی پڑے تھے۔ نیند کے نام پر بس تھوڑی دیر آنکھیں ہی بند ہوئی تھیں۔ مارلن جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیتا تھا۔ جولیا خود پریشان تھی مگر وہ اسے تسلی دینے میں لگ گئی۔

''پولیس اسے ڈھونڈ لے گی مارلن۔''

''پولیس اسے نہیں ڈھونڈ سکتی، جولیا......'' اس نے جواب دیا۔ ''اسے صرف ایک شخص ڈھونڈ سکتا ہے......''

''کون؟''

''میں......'' جولیا کو اس کی دماغی حالت پر شک ہوا۔ ''میں اسے کبھی اپنی بچی کی جان نہیں لینے دوں گا، وہ آج رات نو بجے ہمیں کال کرے گا۔'' جولیا کو یقین ہو گیا کہ مارلن پاگل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

مائیکل نے شروع اسکول اور کالج کی لڑکیوں سے کیا تھا۔ پہلے پانچ شکار کے بعد اس نے ارادہ بدل لیا۔ اب وہ دونوں کسی کال گرل کی تلاش میں نکلتے تھے۔ مشروب ان کے جسم میں ہیجان برپا کر دیتا تھا۔ تین ماہ میں شہر کے مختلف

حصوں میں پانچ لڑکیوں کا قتل پہلے ہی اس سیریل کلر کی دہشت ہر طرف پھیلا چکا تھا۔ لوگ اب سائے سے بھی ڈرتے تھے۔

مائیکل نفسیاتی قاتلوں کی تاریخ زبانی یاد کر چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوست کے ساتھ اس موضوع پر بات کرتا رہتا تھا۔ ''سیموئیل لٹل سے لے کر جیک دار پر تک، جتنے بھی ہم جیسے قاتل ہوتے ہیں، وہ کال گرلز پر ہاتھ ضرور صاف کرتے ہیں، پتا ہے کیوں؟'' آخری الفاظ کہتے ہوئے وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیوں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ دو دن پہلے ہی وہ ایک کال گرل پر رات بھر تشدد کرنے کے بعد اسے مار چکے تھے۔

''کیونکہ یہ معاشرے کے کرداروں میں سے وہ کردار ہیں جن کو کہانی سے نکال دیا جائے تو بھی کسی پر کچھ اثر نہیں پڑتا، کوئی تفتیش نہیں کرتا کہ یہ جسم بیچنے والی کہاں گئی؟'' آخری بات کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔ ''شہرت کا آسان ترین راستہ، کال گرل کو مار دو۔''

ان کی لسٹ آٹھ پر تھی جب پہلی بار دونوں میں اختلاف ہوا اور اس اختلاف کے بعد مائیکل اکیلا رہ گیا۔

☆☆☆

''یہ مخصوص نشان ہے اُس کا...... اس سے پہلے کئی کیسز میں ملا ہے۔'' ماریو نے سامنے بیٹھے مارلن کو وہ بات بتائی جو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ اس شام وہ یہ جاننے پولیس اسٹیشن آیا تھا کہ ان کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ ''ہم ایسی صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں جس میں سامنے ایک نفسیاتی مریض ہے وہ بچی کو مار چکا ہے یا کب مار دے، کچھ معلوم نہیں، وہ صرف اذیت دینا جانتا ہے بس۔''

''اس سے پہلے کتنے کیس آئے ہیں اس جیسے قاتل کے؟'' مارلن نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''بہت زیادہ...... یہ پچھلے دس پندرہ سالوں میں ایسے ہی کام کر رہا ہے۔ کچھ عرصہ غائب رہا ہے مگر اب دوبارہ آگیا ہے۔''

''آپ نے ہمارے رہائشی علاقے میں موجود کیمروں کی ریکارڈنگ حاصل کی ہے؟''

''ہاں...... تمام کیمروں کی ریکارڈنگ وہیں سے ایک گھنٹا غائب ہے کسی نے پورا سسٹم خراب کر دیا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا چالاک ہے۔'' ماریو کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا۔ یہ اس کے علاقے میں پہلا کیس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سلسلہ جلدی رکے گا نہیں۔

''وہ دیکھنے میں بالکل عام سا لگتا ہے۔ اس سے بات چیت کر کے آپ کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ اتنا خطرناک قاتل ہے۔ شکار کو اذیت دینا، لوگوں کی نفسیات کے ساتھ کھیلنا اس کا پسندیدہ کام ہے۔ وہ ہمیں پریشانی میں دیکھ کر خوش ہوگا۔ ہمارے آنسو اس کے قہقہوں کی وجہ ہوں گے......'' مارلن نے بولنا شروع کر دیا۔ ماریو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بالکل، یہی لکھا ہے اس کی فائل میں...... ماہر نفسیات اس کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں مگر آپ کو کیسے علم ہوا؟'' اس نے مارلن کی طرف دیکھا۔

''یہ ایسی کوئی رائے نہیں جو صرف ماہرِ نفسیات ہی قائم کر سکیں۔ یہ بالکل عام بات ہے۔ جتنے بھی سیریل کلر گزرے ہیں ان سب میں یہی خصوصیات تھیں۔ دنیا کا کامیاب ترین سیریل کلر اسے ہی سمجھا جاتا ہے جو عام لوگوں کی طرح، عام روٹین پر کام کرتا ہو۔'' اس کی بات سن کر ماریو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد مارلن باہر آ گیا۔ وہ گھر جانے کے بجائے ایک بار میں چلا آیا۔ یہاں ابھی زیادہ رش نہ تھا کیونکہ رات ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ مارلن نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''مجھے بگ بوائے سے ملنا ہے۔''

''باس موجود نہیں ہیں۔'' لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اسے کہو مارلن آیا ہے۔'' لڑکی اس کے اعتماد کی وجہ سے اُلجھ گئی۔ اس نے فون اٹھا کر کسی سے بات کی۔ مارلن کا نام سنتے ہی دوسری طرف سے اسے اندر بھیجنے کا کہہ دیا گیا۔ وہ اسے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئی۔ سیڑھی کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔

''دائیں طرف پہلا کمرا باس کا ہے۔'' مارلن اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دے کر اس نے زور ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔ بگ بوائے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ صرف نام کا بوائے تھا۔ حقیقت میں اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اس کا وزن بے تحاشا بڑھا ہوا تھا۔ مارلن کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

''شریف سے شریف انسان کو بھی زندگی میں میرے جیسے بُرے لڑکے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

''تم اب لڑکے نہیں رہے بگ......'' مارلن نے

گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''وقت ضائع نہیں کروں گا...... مجھے کام ہے تم سے۔''

''بولو...... کوئی بندہ قتل کرنا ہے؟'' وہ ہنسا۔

''نہیں، تمہارے لیے معمولی کام ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''ہمارے شہر میں جتنے فون بوتھ ہیں سب کی تفصیل، نمبر، وہاں موجود سیکیورٹی کیمروں کی آج رات نو بجے کی ریکارڈنگ درکار ہے۔''

''کب تک؟''

''رات دس بجے تک۔''

''مل جائے گی۔'' اس کا جواب سن کر مارلن نے اسے تمام تفصیل بھیجنے کا طریقہ سمجھایا۔ کچھ دیر بعد وہ اجازت لے کر باہر آگیا۔ اب اسے قاتل کی کال کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''ہم اسے نہیں ماریں گے۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ پہلی بار تھا جب اس نے مائیکل کی کسی بات پر انکار کیا تھا۔ مائیکل کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''یہ بھی نہیں ملے گا پھر۔'' اس نے مشروب کی بوتل اسے دکھائی۔

''نہ ملے...... وہ معذور ہے۔ اسے کیسے اتنی تکلیف دے سکتے ہیں؟'' اس کی نظروں کے سامنے بوڑھی عورت گھوم گئی جو وہیل چیئر پر تھی۔ وہ ان کی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی۔ آج اس نے مائیکل کی کلاس میں بے عزتی کی تھی' اس لیے مائیکل نے بدلہ لینے کے لیے اسے نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا مگر اس کا نام سنتے ہی اس نے انکار کر دیا۔

''باقی شکار بھی انسان تھے وہ بھی انسان ہے...... اور اس نے میری بے عزتی کی ہے...... ہم اسے ضرور ماریں گے۔'' وہ غرایا۔

''میں نہیں مار سکتا اسے......'' وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر مائیکل نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔

''میرا کہا حکم ہوتا ہے اور ماننا تمہارا فرض۔''

''مائیکل مجھے تکلیف......'' وہ کھانسنے لگا۔ مائیکل نے جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ کچھ دیر بعد دونوں مشروب کی بوتل پکڑے بلند آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ پروفیسر کو اغوا کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔

دو دن بعد رات نو بجے اس عمارت کے تمام سیکیورٹی کیمرے مائیکل بند کر چکا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کو چکما دے کر دونوں عمارت میں داخل ہوئے۔ پروفیسر کے فلیٹ تک پہنچنے میں انہیں تین چار منٹ لگے۔ فلیٹ کا دروازہ پروفیسر نے ہی کھولا تھا۔ وہ انہیں پہچانتی تھی۔

''آؤ بیٹا، اندر آجاؤ۔'' اس نے وہیل چیئر پیچھے کو گھمائی۔ مائیکل اور وہ اندر آگئے۔ ''کیسے آنا ہوا......؟'' وہ سمجھی تھی شاید انہیں کوئی کام ہے مگر وہ غلط تھی۔ مائیکل کی زوردار لات اس کی وہیل چیئر پر پڑی۔ وہیل چیئر گھوم گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ''یہ کیا...... کیا کر رہے ہو؟'' مگر انہوں نے کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ اگلا ایک گھنٹا اس معذور پروفیسر کے لیے قیامت تھی۔ انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اس پر تشدد کیا۔ اس کا منہ باندھ کر واش روم میں پھینک دیا اور اس پر پانی پھینکنا شروع کر دیا۔

''ڈیول...... ڈیول...... مجھے چھوڑ دو۔'' وہ بار بار چیخ رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ زندگی کی جنگ ہار گئی...... فلیٹ پر خاموشی چھا گئی۔ وہ اور مائیکل ایک عدد گڑیا اس کے پاس رکھ کر باہر آگئے......

اس بار پولیس مائیکل تک پہنچی تھی مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا۔ وہ دونوں بچ گئے لیکن جب مشروب کا نشہ اترا...... اس کے دماغ پر دھند چھانے لگی۔ وہ مائیکل کو چھوڑ کر دوسرے شہر چلا آیا۔ مائیکل نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ یہاں آکر اس کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ وہ راتوں کو اٹھ کر چیخنے لگتا تھا۔

''ڈیول...... ڈیول۔'' بہت جلد اسے ماہر نفسیات سے رابطہ کرنا پڑا مگر علاج ممکن نہ ہوسکا۔ آخر وہ ذہنی امراض کے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوگیا۔

☆☆☆

ٹھیک نو بجے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اور جولیا فون کے پاس ہی موجود تھے۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ ''ہیلو'' دوسری طرف سے بھاری آواز سنائی دی۔

''مارلن؟''

''بات کر رہا ہوں۔'' یہ آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔

''تمہاری بیٹی میرے پاس ہے۔''

''الینا۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ دوسری طرف موجود شخص ہنس پڑا۔

''ہاں الینا...... تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''کچھ نہیں...... بس مجھے ڈھونڈ لو...... چوبیس گھنٹے بعد الینا کو مار دوں گا تب تک ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈ

لو......'' اس نے یہ کہہ کر کال بند کر دی۔ مارلن نے دوبارہ ’ہیلو‘ کہا مگر کال کٹ چکی تھی۔ اس نے نمبر دیکھا اور لپک کر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف بڑھا جہاں شہر کے تمام فون بوتھ کے نمبر کا ریکارڈ موجود تھا۔ جولیا بے چینی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''یہ رہا......'' وہ چیخا۔ ''اس کے آس پاس موجود ہے وہ۔'' وہ علاقہ ان سے ساٹھ ستر کلومیٹر دور تھا۔ مارلن بھاگ کر باہر نکلا۔

''مارلن ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔''

''وہ ہوشیار ہو گیا تو الینا کو مار دے گا۔''

''میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔'' وہ ساتھ جانا چاہتی تھی مگر مارلن نے صاف انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی مخصوص پتے پر روانہ ہو چکی تھی۔ جولیا واپس آ کر صوفے پر گر گئی۔ الینا کے اغوا کے بعد مارلن کا رویہ عجیب ہو گیا تھا۔ اغوا کرنے والے کے بارے میں اس نے اب تک جو اندازے لگائے تھے، وہ سب ٹھیک تھے۔ جولیا اس کے ماضی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اسے مارلن کے رویّے نے شک میں ڈال دیا تھا۔ وہ بیڈروم میں آ گئی۔

''مجھے کچھ کرنا چاہیے۔'' اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک ایک اجنبی کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ مارلن نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ اس نے اب تک مارلن پر آنکھ بند کر کے اعتبار کیا تھا۔ اچانک وہ کھڑی ہوئی۔ وہ شیرن کو بتا کر پولیس اسٹیشن چلی آئی۔ آفیسر ماریو نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''پولیس تفتیش کر رہی ہے حوصلہ رکھیں۔'' اس نے اسے تسلی دی مگر وہ الینا کیس کے بجائے کچھ اور پوچھنے آئی تھی۔

''اس سیریل کلر کی تمام تفصیل آپ بتا سکتے ہیں مجھے؟ ہوسکتا ہے الینا سے پہلے میں اس سے کبھی ملی ہوں تو کیس میں مدد ملے گی......ایک الجھن ہے اس کا حل نکالنا ہے۔'' اس کی بات سن کر ماریو نے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک فائل لے آیا۔ یہ اس نے الینا کے اغوا کے بعد منگوائی تھی۔

''یہ کافی پرانا قاتل ہے بلکہ ہیں......'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''شروع کے کیسز میں پولیس نے حسبِ معمول یہی کہا کہ یہ کوئی ایک بندہ ہے جو شہرت کے لیے قتل کر رہا ہے سب کو مگر یہ غلط اندازہ تھا۔ کئی کیسز ایسے آئے جن میں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک نہیں، دو یا تین ہیں۔ پہلے یہ چپ چاپ لوگوں کو مارتے تھے......لڑکیوں سے زیادتی کرتے تھے پھر ایک پروفیسر قتل ہوئی۔ اس کے بعد ان کا طریقۂ واردات بدل گیا۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ کیس مزید اُلجھ گیا۔ اب یہ قتل کرنے سے پہلے شکار کو اغوا کرتا تھا۔ ان کے گھر کال کر کے چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا تھا۔ ان کیسز کے بعد پولیس آفیسرز نے دوبارہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ ایک ہی ہے...... پروفیسر کے قتل کے دو ماہ بعد تین مزید افراد اس کا نشانہ بنے اور پھر اچانک وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد یہ الینا کے کیس میں سامنے آیا ہے۔ یہ گڑیا رکھنا اسی کا کام ہے ہوسکتا ہے آپ کو کال بھی موصول ہو۔'' جولیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر مزید اس مسئلے پر بات کرنے کے بعد جولیا واپس چلی آئی۔ آفیسر ماریو کی باتیں سن کر اس کی اُلجھن مزید بڑھ گئی۔ ایک سوچ مسلسل اس کے دماغ میں گھوم رہی تھی۔

''کیا سیریل کلر کا دوسرا ساتھی مارلن ہے؟'' اس خیال کی وجہ سے اس کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے مارلن کو کال کی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اٹھی۔ اس نے پہلے اپنے بیڈروم کی مکمل تلاشی لی۔ یہاں مارلن کے متعلق کچھ موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسٹور روم میں داخل ہو گئی۔ یہاں پرانا سامان پڑا تھا۔ اسے تقریباً ایک گھنٹا لگا۔ جس چیز کو وہ تلاش کر رہی تھی، وہ اسے مل گئی۔ یہ مارلن کے پرانے کپڑوں کا بیگ تھا، اس بیگ سے سارے کپڑے نکالنے کے بعد اسے مارلن کی کئی سال پرانی ڈائری ملی۔ یہ مخصوص لاک والی ڈائری تھی۔ کچن سے چھری اٹھا کر اس نے لاک الگ کر دیا۔ ڈائری کے پہلے صفحے پر لکھا لفظ پڑھ کر ہی اس کا سر گھوم گیا۔ وہاں سرخ رنگ میں ’ڈیول‘ لکھا تھا۔ پوری ڈائری میں کئی مرے ہوئے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ ان کے ساتھ ان کا نام اور موت کے وقت کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ جولیا کے ہاتھ پیر کانپنے لگے......

☆☆☆

مارلن نے آس پاس کا پورا علاقہ گھوم لیا۔ اس علاقے کے سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ نہ مل سکی۔ اس فون بوتھ کے آس پاس سارا علاقہ کاروباری دفاتر کا تھا۔ یہاں کسی کو اغوا کر کے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اغوا کرنے والا چالاک تھا۔ اپنی گاڑی گھما کر وہ سڑک کی دوسری جانب لے آیا۔ یہاں

آئے اسے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ مایوسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے وہ گھر واپس آ گیا۔ جولیا صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے جولیا سے بات کیے بغیر فریج کھول کر کولڈ ڈرنک نکالی اور پینے لگا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس قابو میں آئے تو اس نے جولیا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

''جولیا۔'' مارلن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''اس علاقے میں ایلینا نہیں ہے..... مگر میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''تم اسے ڈھونڈ ہی لو گے مارلن۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''مطلب؟'' مارلن کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ جولیا نے چپ چاپ ڈائری اس کی گود میں پھینک دی۔ مارلن کو جھٹکا لگا۔

''یہ کہاں سے ملی تمہیں؟''

''تمہارے پرانے سامان سے.....'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے صدمے سے اس کا دماغ بند ہو گیا ہے۔ ''تم خود پولیس کو گرفتاری دو گے یا میں کال کروں ڈیول؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔

''مجھے بھی مار دو مارلن، یا خود کو پولیس کے حوالے کر دو، تم مارلن نہیں..... تم کئی انسانوں کے قاتل ڈیول ہو..... میری بیٹی بھی تم نے خود اغوا کی ہے۔''

''جولیا بکواس بند کرو۔'' اس نے ڈائری اٹھا کر دور پھینکی۔

''مجھے دکھ ہے..... میں نے کئی سال ایک اجنبی انسان کے ساتھ گزار دیے..... ایک اجنبی درندے کے ساتھ۔'' مارلن کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی گنگنا رہا تھا۔

''دور کہیں جنگل میں..... پہاڑی کے آس پاس..... ایک پری ہے، ایک شیطان اس کی جان لینے لگا ہے، کچھ کھیلے گا اس سے، اچھی گیم ہے، ڈھونڈ لو مجھے، ابھی کافی وقت ہے۔'' کال بند ہو گئی۔ مارلن نے چند منٹ میں نمبر کا پتا معلوم کیا۔ جولیا ابھی تک صوفے پر بیٹھی تھی۔

''میں اپنی بیٹی کو بچا لوں..... اس کے بعد خود تمہیں حقیقت بتا دوں گا پھر چاہے پولیس کے حوالے کرنا یا اپنے ہاتھوں سے مار دینا۔'' مارلن یہ کہہ کر باہر آ گیا۔ اسے لمبا سفر طے کرنا تھا۔

☆☆☆

پہاڑی کی دوسری جانب بہتے پانی کی گہرائی کتنی تھی، یہ ایلینا کو معلوم نہیں تھا۔ وہ بس خوفزدہ نظروں سے اس پاگل شخص کو دیکھ رہی تھی جو اسے دو دن سے ڈیل کر رہا تھا۔ کبھی اس کے ماتھے پر پستول رکھ دیتا، کبھی گردن پر خنجر تو کبھی اسے لٹکا دیتا تھا۔ پہاڑی کے پیچھے موجود جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا۔ سڑک اس سے بس کچھ ہی دور تھی۔ ایلینا رو رو کر تھک چکی تھی۔ مزید رونے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔

''مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔'' یہ بات اُس نے دو دن میں مسلسل کئی مرتبہ دہرائی تھی۔

''چلے جانا، ابھی انکل تمہارے ساتھ کھیل رہے ہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔

''آپ گندے انکل ہو۔''

''یہ بات..... کتنا سکون ملا ہے مجھے یہ سن کر کہ میں گندہ ہوں۔'' وہ بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ شکل وصورت اور لباس سے وہ ایک کاروباری شخص لگتا تھا۔ ایلینا کو نہیں معلوم اس نے اسے کیسے گھر سے نکالا تھا۔ اسے جب ہوش آیا تھا، تب وہ جنگل میں تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ ایلینا کو اسی طرح باتوں سے تنگ کرتا رہا۔ اس کی نظر مسلسل سڑک کی جانب مرکوز تھی۔ اس نے ایلینا کی وہیل چیئر کو رسی سے باندھا۔ ایلینا کے جسم کے گرد بھی رسی لپیٹ کر اسے مضبوطی سے وہیل چیئر پر باندھ دیا۔ ندی کے پانی کی طرف جاتی ڈھلوان پر وہیل چیئر روک کر اس نے ایک مضبوط درخت سے رسی باندھ دی۔ رسی کھلتے ہی وہیل چیئر پانی میں جا گرتی۔ ایلینا کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ خوف کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ ابھی وہ یہ سب کام کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی کنپٹی پر کسی نے ریوالور رکھ دیا۔

''ہلنا مت۔''

''کون ہو تم؟'' اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ رسی کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔

''مارلن..... ایلینا کا باپ.....'' مارلن کی آواز سنتے ہی وہ ایک جھٹکے سے مڑا۔ اس سے پہلے کہ..... مارلن گولی چلاتا، اس کی بھرپور ضرب مارلن کے ہاتھ پر پڑی۔ ریوالور نکل کر دور جا پڑا۔

''تم تو میرے پرانے دوست ہو مارلن۔'' وہ غرایا۔ اس نے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپنا چاہا مگر وہ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی بھرپور لات اس کے منہ پر پڑی۔ وہ الٹ کر گرا۔ یہاں مارلن کو اس کی پھرتی نے حیران کر دیا۔ اس نے چند سیکنڈ ہی لگائے تھے..... اور چاقو

سے رسّی کاٹ دی۔ مارلن سب بھول گیا۔ وہ ہوا میں اُچھلا اور رسّی پر آ پڑا۔ اس کے ہاتھوں نے رسّی کو تھام لیا تھا۔ وہیل چیئر نیچے جانے سے رک گئی۔ قاتل ہنس رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں قہقہے لگانے لگا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور مارلن کے ہاتھوں پر مارنا شروع کر دیا۔ مارلن اپنی گرفت کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بیٹی کی جان تھی اس میں...... وہ گھسٹ کر آگے جانے لگا۔ قاتل کا نشانہ اس کا سر تھا۔ وہ بمشکل بچا۔ اس نے اسی طرح نیچے پڑے ہوئے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے جسم کے نازک حصے کو نشانہ بنایا۔ قاتل کے منہ سے آہ نکلی۔ وہ نیچے گر گیا۔ وہ گہری سانسیں لے رہا تھا۔ الینا کی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

''میں آ گیا ہوں الینا...... میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا پری۔'' مارلن نے چیخ کر کہا۔ اسے الینا کی گیم یاد آ گئی مگر یہ زندگی کی گیم تھی۔

''پاپا...... میں یہاں ہوں۔'' وہ اُسے بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مارلن نے رسّی اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ اس کے جسم پر لاتعداد خراشیں پڑ چکی تھیں۔ ہاتھوں پر پتھر کی ضربوں کی وجہ سے زخم بن چکے تھے اور خون رِس رہا تھا۔ قاتل دوبارہ اٹھنے لگا۔ مارلن کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے ایک بھاری پتھر اٹھا کر اس کے سر میں مارا...... وہ نیچے گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ مارلن پوری طاقت لگا کر الینا کو اوپر کھینچنے لگا۔ ڈھلوان سے اوپر پانی کی مخالف سمت میں اسے کھینچنا ایک مشکل کام تھا۔ اس نے پوری طاقت لگا دی۔ الینا کی وہیل چیئر اوپر آ گئی۔ اس نے الینا کو کھول کر وہیل چیئر سے نکال لیا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر واپس آیا اور کچھ دور ایک درخت کے نیچے اسے بٹھا دیا۔ واپس آ کر اس نے اسی رسّی سے قاتل کی گردن میں پھندا ڈال دیا۔ اسے لٹکانے سے پہلے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر وہ اسے ہوش میں لے آیا۔

''مجھے معلوم تھا مائیکل...... تم میرے ہاتھوں ہی مرو گے۔'' مائیکل نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔

''بزدل...... تب تم ملک سے ہی بھاگ گئے تھے۔'' مارلن اسے گھسیٹ کر پہاڑی پر لایا...... اور رسّی کا دوسرا سرا درخت سے باندھ کر اسے نیچے لٹکا دیا...... چند منٹ لگے تھے مائیکل کی کہانی ختم ہونے میں۔

وہ الینا کو اٹھا کر گاڑی میں لے آیا جو اس نے بہت پیچھے کھڑی کی تھی۔

☆☆☆

الینا اور وہ دونوں اسپتال میں تھے جب جولیا بھاگتے ہوئی آئی اور الینا سے لپٹ گئی۔ وہ اس کا سر اپنے ساتھ لگا کر اسے مسلسل چوم رہی تھی۔ مارلن آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر پٹیاں تھیں۔ جسم کا درد کے مارے بُرا حال تھا۔ الینا کو چھوڑ کر جولیا نے مارلن کو دیکھا۔ اس کے دل میں موجود محبت نے جوش مارا۔ الینا کے پاس سے اٹھ کر وہ مارلن کے قریب آ گئی۔ اس نے اس کا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ہونٹ مارلن کے ماتھے پر رکھ دیے۔ لمس محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا دیا۔

''مجھے سچ جاننا ہے مارلن۔'' جولیا کے دماغ میں کئی سوالات تھے۔ مارلن تھکا ہوا تھا مگر بیوی کے سوال نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔

''مائیکل ایک بہت ظالم شخص تھا...... اس میں احساس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا جب اس نے اپنے ایک دوست فرگوسن کو بھی ساتھ ملا لیا اور انہوں نے کئی افراد کو قتل کیا۔ یہ ایک عجیب قسم کا مشروب پیتے تھے...... یہ دونوں مما کی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور ایک دن انہوں نے مما کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالا۔ وہ بھی الینا کی طرح معذور تھیں۔ میں تب گھر سے باہر تھا۔ مما مجھے پکارتی رہیں...... وہ مجھے ڈیول کہتی تھیں...... یہ بچپن سے ہی میرا نام رکھا ہوا تھا انہوں نے...... مگر ان کا ڈیول انہیں بچا نہ سکا۔ ان کی لاش دیکھ کر میں نے بدلے کی ٹھان لی۔ میں نے دن رات ایک کر کے قاتلوں کو ڈھونڈا۔ ایک ایک کیس کی تفصیل اکٹھی کی۔ بگ بوائے میرا تب ہی دوست بنا تھا۔ اس نے اس کام میں میرا ساتھ دیا اور ہم ان میں سے فرگوسن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے...... بہت بُری موت دی تھی میں نے اسے۔ وہ ویسے بھی پاگل ہو چکا تھا۔ مما کو مارنے کے بعد وہ انہی کی طرح ہر وقت 'ڈیول، ڈیول' چیختا رہتا تھا۔ میں نے اسے زندگی سے نجات دے دی۔ مائیکل نے خطرہ محسوس کیا اور وہ ملک سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد یہ الینا کے کیس میں سامنے آیا۔ گڑیا رکھنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے اس لیے میں نے اسے ڈھونڈ نکالا کیونکہ میں اس کے منصوبے کو مکمل جانتا تھا۔'' مارلن پوری تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔

جولیا کے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ بول رہا ہے...... اس کے دل سے تمام خدشات دور ہو چکے تھے۔

❖❖❖

آزادی

عائشہ احمد

اپنے وطن سے ہر کسی کو پیار ہوتا ہے... مگر ان کی جذباتی کیفیت ہر درجہ جدا ہوتی ہے... جنھوں نے آزادی کی قیمت ادا کی ہوتی ہے... سرزمینِ وطن کے حصول میں ان کا جسم ہی نہیں روح بھی گھائل ہوئی ہوتی ہے... آزاد وطن میں پیدا ہونے والے اس کی اصل قدر و قیمت سے قطعی ناآشنا ہوتے ہیں... حصولِ پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی ایک دل دکھاتی تحریر...

اس شخص کا قصہ جس کے لیے وطن...... ہر تعلق ہر رشتے سے اول تھا......

سورج آہستہ آہستہ اپنی اوٹ میں چھپ رہا تھا اور چاند کی سفیدی نمایاں ہونے لگی تھی۔ بازاروں میں روشنیاں اپنے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ بڑی بڑی عمارتوں اور دکانوں پر چودہ اگست کی خوشی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ ہر طرف سبز اور سفید پرچموں کی بہار تھی۔ بازاروں میں رش تھا۔ لوگ باہر گھومنے پھرنے کو نکلے تھے۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ میں بھی اپنے گھر جا رہا تھا۔ میرے کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ آج چودہ اگست تھی تو اس

خوشی میں مالک نے مجھے جلدی چھٹی دے دی تھی۔ اس لیے میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ گھر میں صرف میرا بیٹا، بہو اور پوتا تھا، میری بیوی آج سے پانچ سال پہلے ہی فوت ہوگئی تھی۔

دل دل پاکستان، جان جان پاکستان
دل دل پاکستان، جان جان پاکستان

میرے پاس سے ایک گاڑی تیزی کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی۔ جس میں چند نوجوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے اونچی آواز میں یہی ملی نغمہ لگایا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا تو سڑک کی دوسری طرف ون ویلنگ ہورہی تھی۔ منچلے نوجوان آزادی کا جشن منا رہے تھے۔

کیا ہم آزاد ہیں؟ کیا اس لیے ہم نے آزادی حاصل کی تھی؟'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میرا پوتا بھی ایسا ہی تھا، پتا نہیں وہ کیوں غلط راہوں پر چل نکلا تھا، پڑھائی اس نے چھوڑ دی تھی اور سارا دن دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا۔ میں اس کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتا تھا۔ میں نے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور بڑے بازار سے نکل کر اپنے محلے کی گلی کی طرف روانہ ہوا، اچانک میں نے ایک چیخ سنی۔ یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے گھر کی گلی سے ایک لڑکی تیزی کے ساتھ بھاگتی چلی آرہی ہے اور ساتھ بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی ہے۔ وہ لڑکی سیدھی میرے قدموں میں آگری۔ میں نے ایک ہاتھ سے رائفل سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے اس لڑکی کو اٹھایا۔

''بابا مجھے بچالو...... بابا مجھے ان درندوں سے بچالو...... بابا وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ بابا وہ مجھے نوچ ڈالیں گے۔'' وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے روتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

''ٹھاہ...... ٹھاہ......'' گولی میرے کندھے پر لگی تھی۔ میں پھر بھی آگے بڑھ رہا تھا۔

''بابا مجھے بچالو...... بابا مجھے بچالو...... ان درندوں سے مجھے بچالو۔'' وہ چیخ رہی تھی اور چلا رہی تھی اور میں بے بسی کے ساتھ اسے خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ درندے اسے گھسیٹتے ہوئے لے کر جارہے تھے اور میں اپنی ہمت مجتمع کیے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بابا مجھے بچالو...... بابا مجھے بچالو...... اس کی کرب زدہ آوازیں میرے دل ودماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

''ٹھاہ...... گولی کی آواز آئی جو میرے سینے پر لگی اور میں زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس لڑکی کی آوازیں اب مدھم ہوتی جارہی تھیں، اور میں اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوچکا تھا۔

☆☆☆

13 اگست 1947

''بابا، پاکستان کب بنے گا؟'' میری دس سالہ گڈو نے اپنی گول گول آنکھیں مٹکا کر مجھ سے سوال کیا اور میں ہمیشہ کی طرح اس کے سوال پر مسکرا دیا۔

''بابا کی جان۔'' میں نے اس کے ماتھے پہ پیار کیا۔

''مسلمان کہہ رہے ہیں کہ آج کسی بھی وقت فیصلہ ہوسکتا ہے، بس تم دعا کرو۔''

''بابا میں تو روز نماز کے بعد دعا کرتی ہوں کہ ہم جلد سے جلد آزاد ہوجائیں اور اپنے پاکستان میں جا کر آزادی کے ساتھ سانس لیں۔'' وہ ایسی ہی بڑی بڑی باتیں کرتی تھی۔ گڈو کا اصل نام گلشن تھا۔ میں اسے پیار سے گڈو کہتا تھا۔ وہ ہماری اکلوتی اولاد تھی اور بہت ہی لاڈلی تھی، لاڈلی تو ہم دونوں کی تھی لیکن میں اس کے کچھ زیادہ ہی لاڈ اٹھاتا تھا جس پر اس کی ماں بعض اوقات چڑ جایا کرتی اور کہا کرتی تھی۔

''گڈو کے ابا، اس کے اتنے لاڈ مت اٹھایا کر۔ کل کو اس نے اپنے گھر بھی جانا ہے۔''

''ہے نا پاگل...... ابھی تو میری گڈو بہت چھوٹی ہے۔ اسے میں پڑھاؤں گا، استانی بناؤں گا۔'' میں کہتا۔

میں گڈو کو تحریک پاکستان کے ہر جلسے میں لے کر جاتا تھا تاکہ وہ جان سکے کہ پاکستان کتنی مشکلوں اور قربانیوں سے حاصل ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی بہت جوش وخروش کے ساتھ قائداعظم اور دوسرے رہنماؤں کی تقریریں سنتی تھی، میں اسے ہمیشہ ایک بات کہتا تھا۔

''دیکھ میری گڈو...... کیا پتا میں نہ رہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا جب پاکستان بن جائے تو تو اس کی حفاظت دل و جان سے کرنا اور اس کا قرض اتارنے کی کوشش کرنا اور وہ میری بات سمجھ کر اپنا سر ہلا دیتی۔ یہ بات میں اس لیے کہتا تھا کہ پاکستان بننے کا اعلان کسی وقت بھی ہوسکتا تھا اور یہ بات ہندو بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت اب پاکستان کو بننے سے نہیں روک سکتی۔ اس لیے انہوں نے پاکستان جانے والے مختلف راستوں اور سرحدوں پر شر پھیلانا شروع کردیا تھا۔ جس میں سکھ، ہندوؤں کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ یہ سب اس لیے کیا جارہا تھا کہ مسلمان اپنے موقف سے ہٹ جائیں لیکن ایسا ممکن نہیں

تھا۔ مسلمان، ہندوؤں اور انگریزوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے تھے۔ اور آخر کار انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب ریڈیو پاکستان پر پاکستان بننے کا اعلان کیا گیا۔ پورے برصغیر کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شکرانے کے نفل ادا کیے گئے۔

☆☆☆

مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور صرف دو کپڑوں میں پاکستان کی طرف ہجرت کرنا شروع کی۔ لیکن آگے ایک بڑا امتحان تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان جانے والے راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ جو بھی ہاتھ آتا اسے بھارتی فوجی درندے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے۔ میں بھی اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ ایک ٹرین میں سوار کیا۔ وہاں تمام مسلمان لٹے پٹے اور سہمے ہوئے تھے۔ انہیں ہندوؤں کی درندگی کا علم تھا۔ پھر وہی ہوا۔ سکھوں کے ایک دستے نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔ ایک سکھ نے ٹرین کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ٹرین میں ایک افراتفری تھی۔ لوگوں نے چلتی ٹرین سے چھلانگیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ سکھ درندے مردوں کو قتل کر رہے تھے اور بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا رہے تھے۔ میں نے گڈو کو کندھے سے لگایا اور اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما اور ٹرین کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ گڈو کی ماں وہیں مر گئی، اس کے سر میں چوٹ لگی اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں گڈو کو لے کر بھاگا لیکن سکھوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے تھے۔ ہم بھاگے جا رہے تھے۔ ایک قیامت کا سا منظر تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اپنی اپنی جانیں بچا رہے تھے۔ دشمن ہمارے سروں پر پہنچ گیا تھا۔

''ٹھاہ......ٹھاہ......'' گولی میرے کندھے پر لگی اور میں اوندھے منہ گر گیا اور گڈو کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ہندو فوجیوں نے گڈو کو پکڑ لیا تھا۔

''بابا مجھے بچا لو...... بابا مجھے بچا لو...... ان درندوں سے مجھے بچا لو۔'' وہ چیخ رہی تھی اور چلا رہی تھی اور میں بے بسی کے ساتھ اسے خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ درندے اسے گھسیٹتے ہوئے لے کر جا رہے تھے اور میں اپنی ہمت مجتمع کیے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بابا مجھے بچا لو...... بابا مجھے بچا لو...... اس کی کرب زدہ آوازیں میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

''ٹھاہ......ایک اور گولی کی آواز آئی جو میرے سینے پر لگی اور میں زمین پر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔

''بابا مجھے بچا لو...... بابا مجھے بچا لو......اس کی آوازیں اب مدھم ہوتی جا رہی ہیں، اور میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک بیڈ پر لیٹے پایا۔ میرے بازو پر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ایک نرس مجھ پر جھکی پوچھ رہی تھی۔

''آپ ٹھیک ہیں......؟'' میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولتے ہوئے پہلے نرس کو دیکھا اور پھر اردگرد دیکھا تو حواس بحال ہونے پر پتا چلا کہ میں اسپتال میں ہوں۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' نرس پھر گویا ہوئی۔ میں نے

دھیمے سے سر ہلایا، وہ مسکرائی اور میری ڈرپ میں ایک اور انجکشن ڈال دیا اور مجھے آرام کا مشورہ دے کر چلی گئی۔ درد سے میرے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور نقاہت بھی ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور گزشتہ واقعات میرے ذہن میں کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ مجھے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ گڈو کی چیخیں میرے رگ و پے میں آگ بھڑکا رہی تھیں لیکن میں بے بس تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔ نرس یقیناً نیند کا انجکشن دے کر چلی گئی تھی۔

ایک ہفتے بعد مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ کیونکہ میرا کوئی نہیں تھا اس لیے ابھی مجھے مہاجر کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ وہاں میری طرح اجڑے ہوئے کئی لوگ تھے۔ کسی کی بہن بچھڑ گئی، کسی کی بیٹی، کسی کا بیٹا، کسی کی بیوی، کسی کا شوہر کسی کی ماں، کسی کا باپ، اور کسی کا پورے کا پورا خاندان۔ ان سب کے چہروں پہ ایک خوف کا سایہ تھا، انہیں خوف تھا کہ ابھی ہندو آ کر انہیں بھون ڈالیں گے۔ ہمارے فوجی بھائی دن رات مہاجرین کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح بھی کئی مہاجر کیمپوں کا دورہ کر چکے تھے۔ مجھے اس کیمپ میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ میری داڑھی اب کافی بڑھ گئی تھی۔ کافی دنوں سے اسے تراشا نہیں تھا۔ وہاں رہنے والوں سے میری شناسائی ہو گئی تھی۔ وہاں میری طرح کا ایک آدمی تھا، اس کی بیوی اور بیٹا بھی ہندو درندوں کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی اس کے ساتھ تھی، جسے وہ ہر وقت سینے سے لگائے رکھتا تھا، اس کی عمر کوئی چودہ سال ہو گی۔ بہت ہی معصوم اور پیاری سی تھی۔ میری اس کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ اس کا نام فاطمہ تھا، مجھے لگا میری گڈو مجھے واپس مل گئی ہے۔ فوجی جوان اب مہاجرین کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے، اس لیے کہ بڑی تعداد میں مہاجرین اپنا گھر بار سب وہیں چھوڑ آئے تھے، اب ان کو نئے سرے سے گھر آباد کرنے کے لیے پلاٹ الاٹ کیے جانے تھے۔ ہمارے کیمپ میں بھی کچھ لوگ آئے، ساتھ میں کوئی سیاست داں تھا۔ حکومت نے تمام سیاست دانوں کو سختی کے ساتھ حکم دیا تھا کہ مہاجر کیمپوں میں جا کر مہاجرین کی مشکلات کا ازالہ کریں اور فوج کے ساتھ بھرپور تعاون کریں، دو فوجی اور ایک سیاستدان ہمارے کیمپ میں آئے، یہ وہ سیاستدان تھے جو پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اور اب مصلحت کا لبادہ اوڑھ کر خود کو اچھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اور فاطمہ دونوں پنجہ آزمائی کر رہے تھے اور باقی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر ہم اپنا کام کرنے لگ گئے۔ باقی لوگوں سے معلومات لینے کے بعد وہ ہمارے پاس آئے، مجھ سے وہ مختلف قسم کے سوالات کرتے رہے۔ اور فاطمہ پاس بیٹھی ساری کارروائی دیکھتی رہی، جب وہ جانے لگے تو اس سیاستداں نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ... میری طرف دیکھا ہے لیکن یہ میری غلط فہمی تھی وہ اصل میں فاطمہ کو دیکھ رہا تھا، اور پھر آگے بڑھ گیا۔

میرا خون کھول اٹھا، جن گندی نظروں سے اپنی بیٹیوں کو بچانے کے لیے ہم نے یہ وطن حاصل کیا، آج اپنے ہی مسلمان اپنی ہی بیٹیوں کو ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد سے میں محتاط ہو گیا، کوشش کرتا کہ ہر وقت فاطمہ کے ساتھ رہوں اور اسے کیمپ سے باہر نہ جانے دوں۔ اس لیے کہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ کیمپوں سے بچے اغوا ہو رہے ہیں، خاص کر نوعمر بچیاں، میں یہ سب سنتا تو بس آنسو بہا کر چپ ہو جاتا۔

☆☆☆

کیمپ میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ فاطمہ کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ اس کا باپ یہ خبر سن کر نیم پاگل ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی گڈو سے دور ہو گیا تھا۔ ”یہ کیسی اندھیر نگری ہے؟ ہم اپنی بیٹیوں کو درندوں کے چنگل سے چھڑا کر لائے تھے کہ وہاں ان کی عزت غیر محفوظ ہے لیکن یہاں تو اپنے ہی بیٹیوں کے سروں سے چادر نوچ رہے تھے۔“ میں نے سوچا۔ اس طرح کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی، فاطمہ کا باپ پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے اب فاطمہ کو خود ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے مل جائے گی۔ اس کے لیے میں نے کیمپوں میں ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ میں میلوں پیدل چلتا اور ہر کیمپ میں جاتا اور فاطمہ کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا۔

”پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی؟“ یہ سوچ کر میری روح تک کانپ جاتی۔ ”یا اللہ اس کی حفاظت کرنا۔“ میرے دل سے دعا نکلتی۔

ایک دن میں سوچوں میں غلطاں مہاجر کیمپوں سے بہت دور نکل آیا اور ویران سی گلی میں داخل ہو گیا۔ مجھے کچھ

خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ بس ایک ایک کتا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں فاطمہ کو سوچتے ہوئے آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

''بچاؤ......'' میں خیالات کی دنیا سے چونکا تو مجھے لگا کوئی چیخ رہا ہے لیکن میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔

''چھوڑو مجھے...... جانے دو مجھے......'' آواز پھر آئی، آواز نسوانی تھی۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ سو فیصد فاطمہ کی آواز تھی۔ میں یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ میں نے آواز کی سمت کا اندازہ لگایا اور جہاں میں رکا تھا۔ اس کے دائیں طرف والا مکان چھوڑ کر ساتھ والے مکان کی دیوار کود گیا۔ میرا شک صحیح تھا۔ فاطمہ زخمی حالت میں پڑی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی آہیں اور سسکیاں جاری تھیں۔ وہی سیاستدان ایک کرسی پر بیٹھا شراب پی رہا تھا اور دو آدمی فاطمہ پر جھکے اپنی حیوانیت کی تسکین کر رہے تھے۔ ایک گن مین کھڑا تھا۔ میں نے جست لگائی اور اس پر جھپٹ پڑا، گن چھین کر پہلے اسے ٹھکانے لگایا اور پھر تڑتڑا سیاستدان اور دونوں آدمیوں کو بھون ڈالا۔ گن پھینک کر میں فاطمہ کے پاس پہنچا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''بابا......'' اس نے آخری ہچکی لی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

''نہیں......'' میں چیخ اٹھا۔

☆☆☆
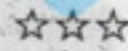
''نہیں، میں اب ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھ پر لاکھوں بیٹیوں کا قرض ہے۔ لاکھوں گڈو مجھ سے قیامت کے دن سوال کریں گی، میرا گریبان پکڑیں گی۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اسی اثنا میں تین نوجوان بھاگتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے۔ وہ لڑکی سہم کر میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے جلدی سے رائفل کو سیدھا کر لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ پانچ دہائیوں سے میں چوکیداری کر رہا تھا۔ رائفل میرے لیے اب کھلونا تھی۔ میرے پیروں تلے زمین نکل گئی، وہ میرا اکلوتا پوتا حیدر تھا۔ جسے بڑی مرادوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میرا اپنا خون اتنا گندا نکلے گا کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے لیے خطرہ بن جائے گا، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

''اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دے بڈھے اور چلا جا یہاں سے۔'' حیدر اپنی پسٹل نکال چکا تھا اور اس کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے پسٹل پکڑنے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اناڑی ہے۔ ویسے بھی جس قوم کے نوجوانوں کو بے حیائی اور فحاشی کی لت لگ جائے، وہ کیسے ملک چلانے کی ذمے داری سنبھالے گی۔ اس کے ہاتھ ہتھیار اٹھاتے وقت کانپیں گے۔ اس کے الفاظ نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

''اس لڑکی کو چھوڑ دے۔'' وہ پھر غرایا۔

یہ میری بیٹی ہے، میری گڈو ہے۔ اور اس کی حفاظت کرنا میری ذمے داری ہے۔'' وہ پھر غرایا تو میں نے ٹریگر پر اپنی انگلی مضبوطی سے جما دی تھی۔ باقی دونوں لڑکے خاموش کھڑے تھے۔ وہ میری آنکھوں میں سفاکیت دیکھ چکے تھے۔

چل چھوڑ یار...... لڑکی اور مل جائے گی۔ جان پھر نہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔ دوسرے نے بھی اس کی تائید کی۔

''کیسے دوست ہو تم لوگ، اسے سمجھانے کے بجائے غلط راستے پر چلنے کا مشورہ دے رہے ہو، کل کو اگر تمہاری بہن کے ساتھ یہ سب ہو تو کیا برداشت کرو گے؟'' میں درشت لہجے میں بولا۔ ان دونوں نے اپنی گردنیں جھکا لی تھیں۔ میں نے اپنی عقابی نگاہیں حیدر پر بھی جما رکھی تھیں کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔

''یہ لڑکی میری ضد ہے، بہت تڑپایا ہے اس نے۔ اسے حاصل کر کے رہوں گا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''اپنی جان پیاری ہے تو یہاں سے چلا جا...... ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔'' میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ میں آپ کا اور ابا کا سہارا ہوں، آپ کے گھر کا اکلوتا وارث، میں اس ملک کا مستقبل ہوں، مجھے ابھی اس وطن کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔'' وہ مکاری سے ہنسا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میرے ذہن میں گڈو اور فاطمہ کی چیخیں گونج اٹھیں۔

''میں اب ایک اور گڈو کو درندگی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔''

''ٹھا...... ٹھاہ......'' اور پستول حیدر کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور گر گیا۔ وہ میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ زمین پر اوندھے منہ گر گیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی اور ایک لمبی سانس لی...... دور سے کہیں نغمہ گونج اٹھا۔

اے وطن پیارے وطن پاک وطن

❖❖❖

گیارہویں قسط

الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے ...، قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاؤ کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاؤ ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے
جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں
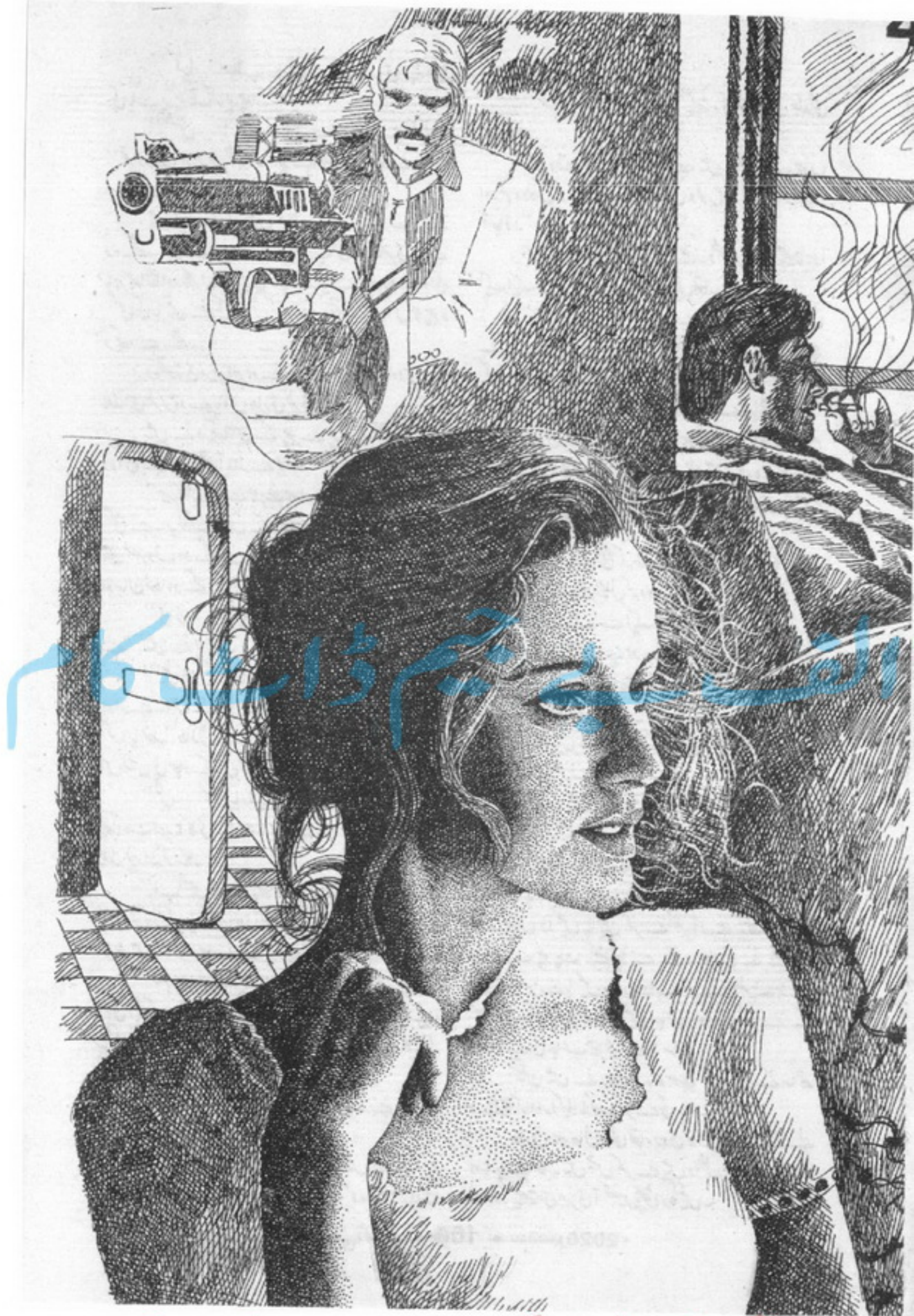
"کیا...... مطلب ہے تمہارا......؟" رومی نے طارق کی بات پر چونک کر پوچھا۔

"ششش......!" اس نے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ "تم دونوں اِدھر ہی ٹھہرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ دبے پاؤں دروازے کی جانب بڑھا۔

میں اور رومی آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر، جھری بنا کے باہر جھانکا اور پھر اپنا سر یوں ترچھا کر لیا جیسے باہر ہونے والی کسی کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہم مستقل اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

وہ تھوڑی دیر باہر ہونے والی سن گن لیتا رہا، اس کے بعد اسی طرح دبے پاؤں ہماری طرف آیا۔

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر گہری تشویش تھی۔ وہ اسی لہجے میں مدھم آواز سے بولا۔

"میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ پولیس ریڈ کی مخبری ہو گئی ہے۔ یہ لوگ پولیس کے چھاپے سے پہلے ہی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔" اس کی بات سن کر میرے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ رومی کا بھی یہی حال تھا۔

"ی ی...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہیلی کاپٹر گوہر شاہ نے بھیجا ہے اور اس میں تاج بھی سوار ہے۔ اس کے آدمی نے انہیں پہلے سے ہی فون پر مطلع کر دیا تھا۔" طارق بتانے لگا۔ "لگتا ہے، سیف! تمہارے اس ایس پی سجاد کے ہاں بھی کالی بھیڑوں کی کمی نہیں۔"

"لل...... لیکن یار! یہ......" میں کہتے کہتے رک گیا۔ جھلاہٹ اور ناکامی کے احساس سے میں گھٹ کر رہ گیا اور جملہ پورا نہ کر سکا۔

"اب ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" طارق بولا۔ "ان لوگوں کو ایسے نہیں بھاگنے دیں گے۔ جبار ماہی اسی ہیلی کاپٹر میں... فرار ہونے کے پر تولے ہوئے ہے۔"

"ہم بھلا اب ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں؟" رومی اُلجھ کر بولی۔ "یوں بھی ہمیں تھوڑا انتظار کر لینا چاہیے، یہ ممکن نہیں کہ اتنی جلدی یہ لوگ یہاں سے اپنے کالے کرتوتوں کے نشان مٹا کے کہیں اور لے جا سکیں۔"

"میرا خیال ہے کہ رومی کی بات ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔

"نہیں، کم از کم جبار ماہی کو فرار نہیں ہونے دینا چاہیے۔" طارق نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "وہ اپنا ضروری سامان سمیٹ رہا ہے۔ جلدی نکلو......"

"مگر تم......؟" رومی کہتے کہتے رکی تو طارق جلدی سے بولا۔

"یہ وقت اگر مگر کا نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں اور تم دونوں کو اس عمارت کے محلِ وقوع کا اتنا علم تو ہے، آ جاؤ۔"

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ دشمنوں سے چھینا ہوا ایک ایک پستول ہمارے ہاتھوں میں تھا۔

"اس طرف......" ہم کمرے سے باہر نکلے تو طارق نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ "جو نظر آئے اس پر بلا سوچے گولی چلا دو، ورنہ خود گولی کھانے کے لیے تیار رہو۔" وہ ایک جوش کی سی کیفیت سے ہمیں ہدایت دے رہا تھا۔

اس کی حالت کافی سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ہم کوریڈور کی دیوار سے چپکے ہوئے تیز تیز مذکورہ سمت میں بڑھنے لگے۔ چند قدموں بعد راہداری دائیں جانب کو گھوم رہی تھی۔

اس کے سرے پر پہنچ کر طارق نے ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود سر ذرا باہر نکال کر دوسری جانب جھانکنے کی کوشش کی تھی کہ اس طرف سے ایک شور مچا۔ میں اور رومی گڑبڑا گئے۔ طارق نے مضروب ہونے کے باوجود غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا پستول والا ہاتھ اس جانب گھمایا اور تلے اُوپر دو تین فائر داغ ڈالے۔ ایک سے زائد افراد کی چیخیں ابھریں، طارق نے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا اور خود بھی اسی طرف کو مڑا۔

رومی اور میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں لگائی اور دوسری جانب گھومتے ہی...... ہمیں دو لاشیں کوریڈور کے فرش پر پڑی نظر آئیں، یوں اس حصے کو کوریڈور تو نہیں کہا جا سکتا تھا، ایک بڑا سا لاؤنج نما حصہ تھا۔ جہاں دائیں بائیں کمرے نظر آ رہے تھے جن کے دروازے چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ طارق نے مجھے اور رومی کو دوسرے بائیں جانب والے کمرے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود دائیں جانب والے کمرے کے دروازے کی جانب تیزی سے بڑھا۔

لیکن میں نے رومی کو کچھ سوچ کر طارق کے ساتھ رہنے کا کہا اور اکیلا مذکورہ کمرے کی جانب لپکا۔

طارق بہر حال زخمی تھا، رومی کو اس کی مدد کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ میں جس کمرے میں داخل ہوا تھا، وہاں کا نظارہ دیکھتے ہی میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

یہ ایک ہال نما کمرا تھا اور وہاں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، وسط میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک میز تھی، اس پر بڑے بڑے شیشے کے جار دھرے پڑے تھے۔ شیشے کی ٹیوبیں، کیمیکلائزیشن میں مستعمل ہونے والی بیکرز، ربر کی منسلک نلکیاں اور سلور راڈیں اور نجانے کیا کیا، اس پر پھیلا ہوا تھا۔ دیواروں میں قدِ آدم شیشے کی الماریاں اور ان کے اندر رکھے ہوئے انسانی جسم، اعضا اور بھی بہت کچھ جو ملگجے اور دھندلائے ہوئے محلول میں گم تھے۔

اسی طرح سرجیکل آلات کی اَن گنت ٹیبلیں، اسٹریچر اور چھت پر نصب بڑے بڑے کنٹوپ والی فلیش لائٹس۔ کئی آہنی اور اسٹیل کی الماریاں بھی وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

مجھے حیرت تھی کہ یہ سب ابھی تک سمیٹا کیوں نہیں گیا تھا؟ اور اگر انہیں ابھی پتا چلا بھی تھا تو یہ لوگ کیسے اتنے قلیل وقت میں ان سب کو غائب کر سکتے ہیں؟ بھگدڑ تو خیر مچ گئی تھی مگر لگتا نہیں تھا کہ اتنی جلدی یہ سب ہٹا دیا جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔

اچانک کئی دوڑتے قدموں کی آواز اُبھری۔ میں چونکا اور لپک کر ایک آہنی الماری کے عقب میں چلا گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے ذرا سر اُبھار کے دیکھا، وہ چار افراد تھے۔ جنہوں نے مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی اور ہاتھوں میں دستانے تھے۔ ان میں دو افراد لمبی لمبی ٹرالیاں گھسیٹے لا رہے تھے۔ پھر یہ لوگ ان ٹرالیوں پر انسانی اعضا والے جار اُٹھا اُٹھا کر رکھنے لگے۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسی وقت مجھے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ لوگ بُری طرح بدکے...... غالباً دوسرے کمرے میں طارق اور رومی نے بھی ایسا ہی کوئی منظر دیکھ کر ان میں مزید افراتفری اور تاخیر پیدا کرنے کی غرض سے وہی کچھ کیا تھا جو اَب میں یہاں ان چاروں کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، لہٰذا بلا تاخیر میں نے ان پر تلے اُوپر دو تین گولیاں چلا دیں، دو گرے دو بدحواس ہو کر بھاگے۔ ان کا تعلق شاید اسٹاف ملازمین سے تھا، یہ لوگ لڑنا نہیں جانتے تھے اور انہیں یہ سب خرافات سنبھالنے یا کہیں اور لے جانے کا حکم ملا تھا۔

جنہیں گولیاں لگی تھیں، وہ فرش پر پڑے چیخ چلّا رہے تھے۔ میں دوڑ کر باہر نکلا تو وہاں بھی کوریڈور میں دوسرے کمرے کے دروازے کے باہر دو تین مخصوص یونیفارم پہنے افراد کو زخمی پڑے اور تڑپتے پایا۔

طارق اور رومی مجھے وہاں نظر آگئے۔ قریب پہنچ کر میں نے ان سے پھولی ہوئی سانسوں کے دوران پوچھا۔

''میں نے ان کی کوشش ناکام بنا دی ہے، یہاں کیا رہا؟''

''یہاں بھی ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔'' طارق نے جوش سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''لیکن ...... ہمارا شکار راہِ فرار اختیار کر رہا ہے۔ اس کا اسی جگہ پر قانون کے ہاتھوں گرفت میں آنا زیادہ ضروری ہے۔ آگے بڑھو۔''

میں اور رومی اس کی راہنمائی میں دوڑتے ہوئے ایک نسبتاً چھوٹے اسٹور نما دروازے سے باہر آگئے۔

سامنے ہیلی پیڈ تھا اور اس پر ایک ہیلی کاپٹر تیار حالت میں کھڑا تھا۔ ساتھ ہی ہم نے دو افراد کو ہیلی کاپٹر کے کھلے دروازے سے اندر سوار ہوتے دیکھا، ایک شکار کو تو ہم پہچان گئے تھے، وہ جبار ماہی تھا، جبکہ دوسرا انجانے کون تھا۔

ان کے سوار ہوتے ہی دروازہ بند ہوا اور ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ اس کے دیوہیکل پنکھے بھی تیزی سے گردش کرنے لگے۔

''فائر۔'' طارق نے چلّا کر کہا اور ہم تینوں نے پوزیشنیں سنبھال کر اپنے پستولوں کے منہ کھول دیے اور جتنے بھی راؤنڈز ان میں بچے تھے، وہ سب داغ ڈالے۔

ہیلی کاپٹر اُوپر اٹھنے لگا تھا کہ اچانک اس نے جھٹکا کھایا اور دوبارہ زمین پر آن پڑا، اس کے اندر دھواں سا اُٹھنے لگا، اندر بیٹھے ہوئے دو تین افراد بوکھلائے ہوئے انداز میں باہر جمپ مار کے اُترنے لگے۔

ہم نے ان کے فرار کی کوشش ناکام بنا ڈالی تھی، ادھر ہم پر بیک وقت دو سمتوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ماری گئی، اس ممکنہ حملے کے لیے ہم پہلے ہی ذہنی ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی تیار تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے ہی ہم پھرتی کے ساتھ جھک گئے اور تیزی سے ایک طرف رینگتے چلے گئے۔

یہی وہ وقت تھا، جب پولیس سائرنوں کی آواز سے فضا گونج اُٹھی۔ ساتھ ہی ایک ہیلی کاپٹر بھی فضا میں منڈلاتا دکھائی دیا۔

طارق اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انگوٹھے کا اشارہ دیا۔ رومی نے بھی ایک تھکی تھکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''ان کے درمیان رن پڑ سکتا ہے، اب اندر چلو، ہمارا کام ختم......'' طارق نے کہا اور اس کی بات درست ثابت ہوئی۔

عمارت کی فصیلوں اور منڈیروں سے پولیس گاڑیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی جبکہ میگافون کے ذریعے مجرموں کو ہتھیار پھینکنے کی ہدایات بھی دی جارہی تھیں۔

بقول طارق کے یہ گھمسان کا رن بھی پڑ سکتا ہے، یعنی مجرم پولیس سے مقابلے میں آخری حد تک جاسکتے تھے مگر زیادہ دیر ٹکے رہنے کی ان میں سکت نہیں رہی تھی۔

ہم اس جنگ اور کراس فائرنگ کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے اندر چلے گئے۔

وہاں سے مختلف راہداریوں اور نیم تاریک گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے طارق ہمیں ایسی جگہ لے آیا جہاں اس سارے شور شرابے کی آوازیں کم آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ہم اس .... محفوظ جگہ پر دبک کر بیٹھ گئے۔

طارق کی بات درست نکلی، کچھ دیر تک پولیس اور مجرموں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا اور اس کے بعد...... بتدریج یہ سارا شور شرابا سرد پڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عمارت کے اندرونی گوشوں میں بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دینے لگی۔

''احتیاط سے باہر آؤ۔'' طارق نے سرسراتی سرگوشی میں کہا اور اس کے بعد ہم اپنی محفوظ اور مختصر سی کمین گاہ سے باہر آئے اور...... اچانک ایک گرج دار آواز سن کر وہیں جامد ہوگئے۔

''ہالٹ......! ہاتھ کھڑے کردو۔''

ہم نے ایسا ہی کیا۔ آواز عقب سے آئی تھی پھر ہمیں آہستہ آہستہ گھوم جانے کا کہا گیا تو انہیں دیکھتے ہی بے اختیار ہمارے منہ سے گہری سانس خارج ہوگئی۔

وہ اسپیشل پولیس فورس کے مسلح اہلکار تھے، ان کی تعداد چھ کے قریب تھی۔ ان کی کمانڈ... مخصوص رینک کی وردی میں ملبوس ایک نوجوان افسر کررہا تھا۔

''ہم لوگ وہی ہیں جنہوں نے ایس پی سجاد صاحب کو مطلع کیا تھا۔'' طارق نے ہاتھ کھڑے رکھتے ہوئے جواب میں کہا تو اس نوجوان پولیس افسر نے کوئی تاثر دیے بغیر اپنے دو ماتحت اہلکاروں کو ہماری تلاشی لینے کا حکم دیا۔

ہم نے اپنی تلاشی دے ڈالی۔ پستول ہم پہلے ہی پھینک چکے تھے کیونکہ وہ خالی ہوچکے تھے۔

نوجوان پولیس افسر کو ابھی تک ہماری بات کا یقین نہیں آیا تھا، تاہم اس کا رویہ اب ہمارے ساتھ سخت یا تحکمانہ نہ تھا۔

''ایس پی صاحب ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے، کیا وہ نہیں آئے اس آپریشن میں......؟'' میری بے چینی نے مجھے خاموش رہنے نہیں دیا تھا۔

''ہاں! وہ...... باہر موجود ہیں۔ چلو...... تم لوگوں کی شناخت پریڈ کروائی جائے گی۔'' اس نوجوان نے کہا۔ اس کے سینے پر لگے نیم ٹیگ پر اس کا نام انسپکٹر محمود درج تھا۔

ہم ان کے ساتھ آگے بڑھنے لگے، راستے میں اور بھی پولیس اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہوئی اور ان مجرموں سے بھی جو زخمی حالت میں تھے اور انہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

ہم باہر آگئے تو ایس پی سجاد نے ہمیں پہچانتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلائے اور ہماری جانب بڑھے۔ ہم پر اٹھی ہوئی گنز یک دم جھک گئیں۔

''تم...... تینوں خیریت سے تو ہونا......؟'' انہوں نے خوش دلی سے پوچھا۔

''بالکل جناب! ایک دم چاق و چوبند۔''

''میں اس کامیابی کا کریڈٹ تم تینوں کو دیتا ہوں۔'' وہ فراخ دلی سے ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا جبار ماہی گرفت میں آگیا؟'' طارق نے پوچھا۔

''ہاں......! وہ پکڑا گیا ہے اور دیگر مجرم بھی''

''قیدیوں کا کیا ہوا؟''

''انہیں بھی نکال لیا گیا ہے، کچھ گاڑیاں منگوائی گئی ہیں اور...... اخباری نمائندوں کو بھی کال کیا ہے۔ یہ سب لائیو دکھانا چاہتا ہوں میں...... یہ سارا گھناؤنا کاروبار، اس کا سراغ اور اس کی بربادی کا نظارہ سب کو کرنا چاہیے، تاکہ مجرم عبرت پکڑیں۔'' ایس پی سجاد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''تب پھر ہماری آپ سے ایک گزارش ہے، ہمارا نام نہیں آنا چاہیے بلکہ آپ یہ کریڈٹ اپنے سر لیں اور ہماری اسی وقت خفیہ طور پر روانگی کا بندوبست کردیجیے، آپ کا یہ احسان ہوگا ہم پر۔'' طارق نے ان سے درخواست کرڈالی۔

ایس پی سجاد نے کچھ دیر سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

اگلے تقریباً ایک گھنٹے میں ہم تینوں گل بادشاہ کے گھر میں موجود تھے۔ گل بادشاہ کے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھ میں ہی کئی گھنٹوں سے رہا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا تھا وہ فون پر بیک وقت محترمہ ڈالی اور ایس پی سجاد سے رابطے میں رہا تھا، اسی سبب اسے ہماری بھی خیر خبر مل گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم اس کے ہاں پہنچے تو وہ وفورِ جذبات سے ہم سے لپٹ گیا۔ وہ ہمارا دل سے قدرداں

تھا۔ اس کی زبان سے بار بار ایک ہی جملہ ادا ہوتا تھا۔
''کاش! کاش! میں پہلے ہی تم لوگوں کی بات مان لیتا، کاش!''
طارق اور میں نے بڑی مشکلوں سے اس کی جذباتی کیفیات میں اسے سنبھالا تب کہیں جا کر وہ آرام سے اپنے مخصوص موڑھے پر بیٹھا۔ ہماری آمد کا اسے علم ہو گیا تھا اسی لیے اس نے ہمارے لیے ایک زبردست ڈنر کا پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ بھوکے تو ہم تھے ہی مگر اس سے زیادہ تھکے ہوئے تھے۔
''اب میں جبار ماہی کو نہیں چھوڑوں گا اور...... میرے بیٹے کا اصل قاتل گوہر شاہ تو سمجھو گیا لمبے عرصے کے لیے اندر......'' وہ جیسے خود کو خوش خبریاں سنانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ پھر جیسے اسے اچانک ایک اہم بات یاد آ گئی۔
''ارے ہاں! وہ بانو کا کیا ہوا؟''
''وہ ہم سے چھین لی گئی تھی، یہ ہماری بدقسمتی تھی۔'' میں نے جواب میں کہا۔
''کیا؟ مگر کیسے؟ کس نے چھینا؟'' وہ ایک دم چونک کر بولا تو میں نے اسے ایس ایچ او شعیب کی کارگزاری بتا دی۔
''اوہ...... یہ بہت غلط ہو گیا، وہ ایس ایچ او ضرور اس مردود گوہر شاہ کے لیے کام کرتا ہو گا۔ یہ بہت برا ہو گیا'' گل بادشاہ پریشان ہو کے بولا۔ ''مجھے کسی کو اس کے بارے میں مطلع کرنا چاہیے۔'' وہ سوچتا رہ گیا۔
''اب کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ بانو اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی، ہمارا کوئی حق نہیں بنتا کہ اسے ان سے واپس لے سکیں۔'' طارق نے کہا۔
میں نے محسوس کیا تھا کہ طارق، بانو اور فیکے والے معاملے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ یہی حال اب رومی کا بھی ہونے لگا تھا، مگر بانو اور فیکے والا گمبھیر ''معاملہ'' تقریباً مجھ سے ''ٹچ'' رہا تھا اور میں ہی اس کی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔
''مجھے تمہاری بات سے سخت اختلاف ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بانو اور گوہر شاہ میں اب باپ بیٹی والی بات نہیں رہی تھی، وہ اب بھی اپنے باپ کو فیکے کا بے رحم قاتل سمجھتی ہے۔ وہ اس کے خلاف ہمارے لیے ایک مضبوط ہتھیار بن سکتی تھی۔''
''مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے سیف!'' گل بادشاہ فوراً ایک جوش کی سی کیفیت میں بولا۔ ''توفیق میرا ایک ہی پتر تھا، میں کیسے اس کے قاتل کو بھول جاؤں گا۔ بانو اگر اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دیتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اسے بھی اپنے بیٹے کے قتل کا برابر قصوروار سمجھوں گا۔''
گل بادشاہ یہ سب کہنے میں حق بجانب تھا۔ آگے بولا۔ ''میں ابھی ایس پی صاحب سے رابطہ کر کے انہیں بتاتا ہوں، تم نے کیا نام بتایا تھا ایس ایچ او کا؟''
''شعیب۔'' میں نے بتایا۔ گل بادشاہ نے اسی وقت پہلے محترمہ ڈالی سے فون پر رابطہ کر کے اسے... جبار ماہی کے قلع قمع کی خبر دی، پھر مشورہ لیا۔
ڈالی نے بھی اس سے یہی کہا کہ وہ یعنی گل بادشاہ...... ایس پی سجاد سے ابھی اس سلسلے میں اس کے حوالے (ڈالی) سے بات کرے اور فوری ایکشن لے اور بانو کو ہر قیمت پر گوہر شاہ کے قبضے سے چھڑا کر اس کا توفیق کے سلسلے میں بیان قلم بند کرے۔ کیونکہ جبار ماہی پہلے ہی قانون کی گرفت میں ہے۔
مشن کا دوسرا مرحلہ بھی تیزی سے نمٹایا گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ گل بادشاہ اب نچلا بیٹھنے والا نہیں۔ اس نے فون پر ایس پی سجاد سے پوری صراحت سے باتیں کرنے کے بعد اپنی کرسی چھوڑ دی اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے تھے۔
رات گہری ہو رہی تھی۔ ہمارا نیند اور تھکن سے برا حال تھا۔ ہمیں آرام کی سخت ضرورت تھی اور اعصاب بُری طرح شل ہو رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔
گل بادشاہ نے ہمیں آرام کرنے کا کہا اور ہمیں الگ الگ دو کمروں میں پہنچا دیا۔ میں اور طارق ایک کمرے میں اور رومی کو ساتھ والا کمرا دیا گیا تھا۔
اگلے دن چڑھے ہم سوتے رہے، شاید ملازموں کو منع کر رکھا تھا کہ جب تک ہماری خود آنکھ نہ کھلے ہمیں جگایا نہ جائے۔
سب سے پہلے رومی کی آنکھ کھلی اسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی تھی۔ دروازہ اندر سے کھلا ہوا ہی تھا، جبکہ میں اور طارق گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہے تھے۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر بھی ہماری آنکھ نہیں کھلی تھی، دروازہ اندر سے ہم نے بند نہیں کیا تھا، اسی لیے جب رومی کو جواب نہ ملا تو وہ دھڑ سے دروازہ دھکیلے اندر گھس چلی آئی اور ہمیں جھنجھوڑ کر جگا دیا۔
غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے تو گھر کے دو ملازمین ناشتے کا اعلان کرنے کے لیے ہمارے سامنے آن موجود ہوئے۔

ہم نے ناشتا کیا اور اسی دوران ایک ملازم نے پوچھنے پر بتایا کہ گل بادشاہ صبح سے ہی کہیں گئے ہوئے ہیں اور ہمارے لیے یہ پیغام دے کر گئے تھے، ہمارے جاگتے ہی انہیں فون پر بتا دیا جائے، ضرورت پڑی تو وہ ہم سے فون پر بات کر لے گا بہ صورت دیگر ہم ادھر ہی اس کی واپسی کا انتظار کریں اور کہیں نہ جائیں۔ وغیرہ۔

بارہ بجے کھانا نما ناشتا یا ناشتا نما کھانا کھا کر ہم چائے کا دوسرا کپ تھامے کمرے میں آن موجود ہوئے۔

''اب کیا کرنا چاہیے؟ گل بادشاہ کا انتظار یا اس سے فون پر حال واحوال کر لیا جائے؟'' طارق نے رائے طلب لہجے میں باری باری رومی اور میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چائے ختم کرتے ہیں، دو ایک سگریٹ پی کر وقت گزارتے ہیں...... تب تک ہوسکتا ہے، گل بادشاہ کا فون آجائے، ورنہ ہم رابطہ کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ذرا دیر گزری تھی کہ ایک ملازم فون ہاتھ میں لیے ہمارے کمرے میں آگیا۔

''لو جی! سائیں وڈے کا فون آگیا، وہ آپ لوگوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' ملازم میں نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مطلع کیا۔

یہ ملازم درمیانی عمر تھا اور اس کا نام قیصر تھا۔ جب سے ہم یہاں تھے یہی ہماری پیش بندی میں تھا۔

''مجھے دو فون، میں کرتا ہوں بات۔'' میں نے کہتے ہوئے اس کی جانب اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ چائے میں ختم کر چکا تھا۔ فون ملازم قیصر نے میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بھی وہیں موجود رہا۔

''جی سائیں! میں سیف بات کر رہا ہوں، کیا خبریں ہیں......؟'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا تو دوسری جانب سے گل بادشاہ کی پُرجوش سی آواز اُبھری۔

''جبار ماہی تو گرفت میں آگیا ہے اور اس کے گماشتے بھی، ان سے پوچھ گچھ جاری ہے، بانو کے سلسلے میں ایس پی سجاد نے ایس ایچ او شعیب سے باز پرس کی ہے اور اسے لائن حاضر کر دیا گیا ہے، اس کی جگہ نئے ایس ایچ او جمال شاہ کو تعینات کرتے ہوئے اسے فوری حکم جاری کیا ہے کہ وہ میرے بیٹے توفیق (فیکا) مرڈر کیس سے متعلق گوہر شاہ کی بیٹی بانو کا بیان قلم بند کرے، مگر گوہر شاہ کے اثر ورسوخ کے سامنے نئے ایس ایچ او جمال شاہ کی ایک نہ چل سکی، یوں ایس پی صاحب نے حکامِ بالا سے اسپیشل اختیارات کی درخواست کی اور اپنی گزارشات میں گرفتار ملزمان جبار ماہی وغیرہ کے گھناؤنے کاروبار کے سلسلے کا بھی ذکر کیا کہ گوہر شاہ کا مذکورہ ملزمان سے کاروباری گٹھ جوڑ رہا ہے...... وغیرہ۔''

اتنا بتا کر وہ ذرا سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر کیا اب ایس پی صاحب کو خصوصی اختیارات تفویض کر دیے گئے ہیں؟''

''ہاں!''

''پھر؟'' میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ طارق اور رومی کی دھڑکتی نظریں میرے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئیں اور سماعتیں ہماری گفتگو پر......

وہ ایک ذرا سانس لینے کے بعد پھر بتانے لگا۔ ''گوہر شاہ بڑا مکار اور چالاک آدمی ثابت ہوا۔ اس نے اپنی بیٹی بانو کی طبیعت کی ناسازی اور ایک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے ذریعے اس اہم قانونی پیش رفت کو سردست جام کروا دیا ہے۔''

اس کے بعد اس نے باقی باتیں اور تبادلہ خیال کے لیے گھر آنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔'' فون قریب باادب کھڑے قیصر کو تھمانے کے بعد میں نے کہا۔ ''کسی بھی ایسے بیان سے بچنے کا یہ سہل طریقہ ہوتا ہے۔'' میرے لہجے میں تلخی اُتر آئی۔

''اس طرح تو پولیس کبھی بھی بانو سے بیان نہیں لے پائے گی۔ اور کیا خبر بانو کو کسی دواؤں کے زیر اثر رکھا جانے لگا ہو تا کہ وہ نارمل حالت میں نہ آئے۔'' طارق نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''گوہر شاہ جانتا ہے کہ اسی کی بیٹی اس کے گلے کا پھندا بننے والی اور جبار ماہی بھی اب رنگے ہاتھوں گرفتاری کے بعد اس کے لیے لٹکتی تلوار بن گیا ہے۔'' رومی بولی۔

''پولیس کا کام آسان کرنے کے لیے لگتا ہے اس بار بھی ہمیں حرکت میں آنا پڑے گا۔'' طارق بولا۔ وہ فطرتاً مہم جُو واقع ہوا تھا۔ کم از کم میرا اس کے بارے میں یہی خیال تھا۔

''قانون بعض حالات اور کچھ قانونی پیچیدگیوں کے سبب بے بس ہو جاتا ہے۔ ہمیں بھی تو آخر اس میں حصہ ڈالنا چاہیے۔''

''وہ تو ہم ڈال ہی رہے ہیں۔'' رومی بولی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا اب ہمیں گوہر شاہ کے ٹھکانے پر ہلا بولنا چاہیے؟'' میں نے طارق کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہلا نہیں اور نہ ہی گوریلا بننا ہے، صرف سراغ رساں بننا ہوگا۔'' طارق بولا۔

''ذرا کھل کر کہو۔'' رومی اُلجھ کر بولی۔

''ہم خفیہ طور پر منصوبہ بنا کر گوہر شاہ کے ٹھکانے پر نقب لگائیں گے۔ اندر کی صورتِ حالات دیکھیں گے، اگر بانو وہاں کسی کمرے میں موجود ہوئی تو اس سے بات کرنے کی کوشش کریں گے، وہ اگر راضی ہوتی ہے تو ہم اسے اپنے ساتھ لے آئیں گے اور پولیس کے سامنے پیش کر دیں گے۔''

''تاکہ بعد میں گوہر شاہ کو ایک اور قانونی پوائنٹ مل جائے کہ ہم نے اس کے گھر میں سیندھ لگا کر اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا؟'' میں نے کہا۔

''وہ بعد کی بات ہے، کوئی بھی تدبیر کرلیں گے، بانو ہمارے ہی کہنے میں تو ہوگی، وہ گھر سے بھاگ بھی تو سکتی ہے۔ مجھے طارق کی یہ منصوبہ بندی پسند آئی۔'' رومی نے کہا۔

''پھر ٹھیک ہے ہمیں اس لائحہ عمل کو آزمانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' طارق بولا۔

''گل بادشاہ کا کیا کریں؟'' رومی نے یاد دلایا۔ ''وہ آنے والا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے اس کے آنے کا پہلے انتظار کرلینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ آنے پر کوئی نئی بات بتائے، جو ہمارے لیے سودمند ہو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

طارق اور رومی نے میرے مشورے پر صاد کیا اور ہم نے تب تک کے لیے قیصر سے چائے کی فرمائش کر ڈالی۔ سگریٹ موجود تھے۔

میں اور طارق سگریٹ سلگا کے بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ طارق تو اکثر پی لیا کرتا تھا، باقی میں بھی کبھار ہی پی لیتا تھا۔

اسی دوران مجھے حمیرا کا بھی خیال آتا رہا، نجانے وہ کہاں ہوگی؟ لندن تو وہ جا چکی تھی۔ بقول اس کے اس کے باپ یعنی امجد صاحب کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے ماجد کی ہلاکت اور بعد میں انہی خونی سوداگروں کی مسلسل دھمکیوں (جن میں میرا حوالہ بھی حمیرا کے ساتھ سب سے پہلے ہوتا تھا) سے تنگ آکر یا خوف زدہ ہو کے وہ اپنا کاروبار یہاں سے وائنڈ اپ کرنا شروع کر چکے تھے اور اب یو کے اپنے رشتے کی کسی سالی کے ہاں جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔

حمیرا کا خیال آتے ہی میں اپنے مسوس کیے سینے میں ہی ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

میں اب اسے تصور کی آنکھ سے لندن کے سرد اور برستے بارانی ماحول میں بھیگتا ہوا دیکھنے لگا۔ چونکا اس وقت جب قیصر نے چائے آنے کا اعلان کیا۔

میں نے دیکھا، رومی ایک ٹک ..... تھوڑی دیر پہلے میرے کھوئے کھوئے چہرے کو گھورتی رہی تھی۔ یوں مجھے اپنے ''آپ'' میں آتا دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرا دی۔

مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری کیفیاتِ دروں سے واقف ہو۔ پتا مجھے تب چلا اس حقیقت کا کہ ایک عورت کا نسوانی وجدان کس قدر تیکھا اور تیز ہوتا ہے، جب رومی نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر ہولے سے مجھ سے کہا۔

''حمیرا یاد آرہی تھی؟''

میں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے بے تاثر سی مسکراہٹ سے اپنا سر جھٹک دیا اور چائے کی جانب ہاتھ بڑھا دیا، جو قیصر ہمارے سامنے رکھ چکا تھا۔

رومی اور طارق شاید سمجھ گئے تھے کہ میں حمیرا والے موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اسی لیے وہ بھی خاموشی سے چائے پینے لگے۔

ایک گھنٹے بعد گل بادشاہ کی واپسی ہوئی مگر بغیر کسی نئی اطلاع کے لہٰذا مزید موجودہ حالات پر تھوڑا اظہارِ خیال کرنے کے بعد بالآخر طارق نے اسے اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا، جسے سن کر گل بادشاہ کے چہرے پر بھی یک دم خوش کن تاثرات اُبھرے۔

''پہلے یہ بات کنفرم ہونی چاہیے کہ اس رذیل نے اپنی بیٹی کو کہاں رکھا ہوگا؟'' وہ بولا۔

''پاکپتن میں اس کی آبائی جاگیر اور رہائش ہے، بچے وہیں رہتے تھے جنہیں وہ اپنے کالے دھندوں اور اسی طرح کے کرتوتوں سے دور رکھتا ہے۔ بانو بھی ظاہر ہے وہیں لائی گئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''یہ ضروری تو نہیں۔'' گل بادشاہ بولا۔ ''لیکن میں تمہارے اس خیال کو رد بھی نہیں کروں گا سیف! ہمیں اس خفیہ راستے کو آزما تو لینا چاہیے، کیونکہ ایس پی رندھاوا نے جتنا کرنا تھا وہ کر چکے ہیں۔ اس مکار گوہر شاہ نے ایک ایسی قانونی چال چلی ہے کہ وہ بھی گویا کچھ دیر کے لیے بے بس نظر آنے لگے ہیں تاہم انہوں نے تسلی دی ہے کہ وہ جلد ہی اس کا حل تلاش لیں گے مگر مجھے ڈر ہے کہ تب تک دیر نہ ہو جائے۔''

''بس، ٹھیک ہے، اب ہمیں اجازت دو..... ہم ابھی

پاک پتن کی طرف روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم تم سے فون پر رابطے میں رہیں گے۔'' طارق اس سے بولا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔

رومی اور میں نے اثبات میں اپنے سروں کو جنبش دی تھی۔

''اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو ایک بار ذرا اس سلسلے میں محترمہ ڈالی صاحبہ سے ایک مشورہ کرلیں......؟'' گل بادشاہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''بالکل اعتراض ہے۔'' طارق بہ یک ٹرنت بولا۔ ''پولیس تک ابھی ہم یہ بات نہیں جانے دینا چاہتے۔ کیا تم نے کراکوٹ والی مہم میں ملاحظہ نہیں کیا کہ ''ریڈ'' کی کس قدر جلد مخبری ہوگئی تھی۔ یہ تو ہماری چابک دستی تھی کہ ہم نے مخبری کا علم ہوتے ہی ملزموں میں افراتفری ڈال دی تھی، ورنہ تو جبار ماہی قانون کے ہاتھ لگتا اور نہ ہی کراکوٹ میں ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت......''

''ہم......'' طارق کی اس ٹھوس دلیل نے گل بادشاہ کو لاجواب سا کردیا۔ تاہم تھوڑا بہت جتانے کی غرض سے اتنا ضرور بولا۔ ''ویسے اس میں ایس پی صاحب کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔''

''ہم بھی یہی سمجھتے ہیں۔'' طارق نے بھی فوراً اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، پولیس میں بھی کالی بھیڑیں ہوتی ہیں۔''

''تمہیں پاک پتن میں گوہر شاہ کی رہائش گاہ کا علم ہے؟'' گل بادشاہ نے فوراً موضوع بدلا۔

''صرف مجھے ہے۔'' طارق نے ایک نظر رومی اور مجھ پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، مجھ سے جس قسم کی مدد درکار ہے میں حاضر ہوں۔ اسلحہ، آدمی، کیا چاہتے ہو؟'' گل بادشاہ نے آخر میں کہا۔

''صرف دعائیں۔'' طارق سکون سے بولا۔

''وہ تو اب ہر وقت ہی تم لوگوں کے ساتھ رہیں گی لیکن پھر بھی، تم ایک خطرناک آدمی کی خطرناک کمین گاہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''ایک گاڑی کا بندوبست کردیں، ایک چاقو، ٹارچ، سیل فون...... اور ہو سکے تو ایک بھرا ہوا پستول، فاضل راؤنڈ کی ضرورت نہیں۔''

''مل جائیں گی یہ چیزیں۔'' گل بادشاہ نے کہا۔

☆☆☆

حاصل پور کے اس علاقے سے پاک پتن بائی روڈ تقریباً دو سے ڈھائی گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ پاک پتن اور عارف والا سے چند کلومیٹر دور اندر کی طرف اس کی آبائی جاگیر تھی۔ ایک کچی پکی روڈ کہلانے والی لڈن روڈ بھی تھی۔ اس پر ہم نہیں جا سکتے تھے۔ یہ اندرون کے اریب قریب دیہاتوں کے لیے مستعمل تھی۔

یہ سب ٹھیک ٹھیک راستہ طارق ہی کو معلوم تھا۔ پھر بھی گوگل میپ پر اس کی لوکیشن ٹریس کرنے کی ڈیوٹی اس نے رومی کے سپرد کردی تھی اور خود وہ اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا جبکہ پسنجر سیٹ پر رومی خوب آرام سے بیٹھی تھی۔ تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان رکھ لیا گیا تھا۔

گاڑی فور وہیل، ڈرائیو جیپ تھی اور جس کچے کے علاقے میں ہم اپنے اگلے سفر کے دوسرے مرحلے میں داخل ہونے والے تھے، اس میں جیپ ہی کی سواری بہتر ہو سکتی تھی۔

گل بادشاہ نے ایک گھنٹے میں ہی یہ مطلوبہ ''اسٹف'' ہمیں فراہم کردیا تھا۔

اس وقت شام کے سات بج چکے تھے۔ ہوا بند تھی اور حبس کی سی کیفیت طاری تھی۔ جیپ میں اے سی نہیں تھا۔ گرمی بہت تھی اور ابھی تک گرم تھپیڑے چہروں پر محسوس ہو رہے تھے، سورج غروب ہونے کے باوجود مغربی اُفق پر اس کے ڈوبنے کی باقیات سرخ اور نارنجی روشنی کے جلوؤں میں موجود تھیں۔

''جبار ماہی کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں گوہر شاہ اس وقت اپنا پورا زور لگانے میں مصروف ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا خیال ہے وہ اپنی بیٹی بانو کو کہیں چھپانے یا بالفاظ دیگر ٹھکانے لگانے کی تگ و دو میں نہیں ہوگا؟'' طارق میری بات کا ٹھیک اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

''یقیناً!''

''یہ خوش فہمی ہے تمہاری پیارے ڈاکٹر!'' طارق بے تاثر مسکراہٹ تلے بولا۔ ''سب سے بڑا پھندا اس کی گردن کا اسی کی بیٹی ہے اس وقت......''

''اور جبار ماہی؟'' رومی نے اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''وہ بھی اپنی جگہ خطرناک ہے اس کے لیے، لیکن پھر بھی اس کی جانب سے غافل نہیں ہوگا، ضمانت کے لیے اب تک اس نے نجانے کتنے ماہر اور گھاگ وکیلوں سے رابطہ کیا

ہوگا۔"

"وہ جبار ماہی کو پولیس کی حراست میں ہی مروا بھی تو سکتا ہے؟" رومی نے پیشہ ورانہ خیال ظاہر کرتے ہوئے یوں کہا جیسے اسے خود بھی اپنے اس خیال پر شبہ ہو۔

"یہ آخری وار ہوگا لیکن ابھی گوہر شاہ یہ بے وقوفی نہیں کرسکتا۔" طارق بولا۔ اس کی نظریں بدستور جیپ کی ونڈاسکرین کے پار سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

جیپ کی رفتار بھی وہ اسّی کلومیٹر اور کبھی سو کلومیٹر فی گھنٹا تک کردیتا۔ مغربی اُفق پر سرخیوں کو اب تاریکی نے نگل لیا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ فضا میں چولستان کی طرف سے آنے والی بادِسموم اب کافی حد تک کم ہونے لگی تھی۔ ہوا چلنے لگی تھی اور اس میں ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔

ہم بہاول نگر کے قریب قریب تھے۔ میرا اور رومی کا ارادہ ادھر ہی کہیں روڈ سائڈ ہوٹل پر چائے وغیرہ پینے کا تھا مگر طارق نے انکار کردیا۔ وہ نان اسٹاپ ڈرائیونگ موڈ میں تھا اور چائے وغیرہ کا پروگرام اس نے منزل پر پہنچنے تک موقوف کر رکھا تھا۔

جس رفتار سے اور مسلسل وہ ڈرائیونگ کررہا تھا اس سے اندازہ تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے قبل ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے لیکن ہمیں تاخیر ہوئی۔ وجہ راہ میں چیکنگ اور ٹریفک کا جام ہونا تھا، کوئی آئل ٹینکر اُلٹ گیا تھا اور ٹریفک جام ہوگیا تھا، متبادل راستہ ویسا نہ تھا، لہٰذا ایک جگہ تو چیونٹی کی رفتار سے گاڑی کو مجبوراً چلانا پڑا تھا۔

"تاخیر تو ویسے بھی ہوگئی، اس سے تو اچھا تھا ہم پہلے ہی کہیں رُک کر چائے وغیرہ پی لیتے۔" میں نے کہا۔

"تب اور زیادہ تاخیر ہوجاتی۔" طارق نے بڑے سکون سے جواب میں کہا۔

"تمہاری کوئی منطق اسے قائل نہیں کرسکتی، سیف!" رومی نے کہا۔ وہ بھی میری طرح چائے کی موالی تھی، نہ ملنے پر اندر سے اب تک جلی کُڑھی بیٹھی تھی۔

جیپ ہم نے اب ایک روڈ سائڈ ہوٹل پر روک لی تھی، یہ عارف والا پاک پتن روڈ تھی۔ جس کے وسیع احاطے میں چارپائیاں، چوبی میزیں بچھی ہوئی تھیں، کچھ ٹرک، لاریاں اور کوچز وہاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ یہاں پولیس کا ایک ناکا اور رینجرز کا پکٹ بھی دکھائی دیتا تھا۔ ہماری سمت والے ہوٹل سے چند فرلانگ آگے ایک پیٹرول پمپ تھا۔

چائے اور کیک پیس وغیرہ کا آرڈر دے دیا گیا تھا۔

ہم ذرا الگ تھلگ جگہ پر بیٹھے تھے، تاکہ آئندہ صورتِ حالات پر بہ آسانی تبادلۂ خیال کرسکیں۔

"وہ دیکھ رہے ہو، پیٹرول پمپ کے ساتھ والی نشیبی روڈ...... اب باقی کا دس پندرہ منٹوں کا ہمارا سفر یہاں سے شروع ہونے والا ہے۔" طارق نے کیک کا ٹکڑا منہ ڈالتے ہوئے اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک اُنگلی سے اشارہ کرکے بتایا۔

"ہم...... یہ خاصی ویران روڈ نظر آتی ہے۔" میں نے اس طرف ایک نظر ڈال کے کہا۔

"ہاں! جلدی سے چائے ختم کرو اور نکلو۔" طارق بولا۔

ہم نے مشکل سے پندرہ بیس منٹ کا ہی اسٹے کیا تھا، اس کے بعد طارق نے ہوٹل والے جگ سے ہی جیپ کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور پھر ہم روانہ ہوگئے۔

مذکورہ روڈ پر آتے ہی طارق نے دس منٹ کی درمیانی رفتار کے بعد جیپ کی رفتار مزید آہستہ کرتے ہوئے کچے میں اُتار دی۔

"ہوشیار باشد! ہم ریڈ زون میں داخل ہو چکے ہیں۔" دفعتاً ہی طارق نے ہولے سے سرسراتے لہجے میں مطلع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک جھنڈ کے پاس جیپ روک لی۔

انجن بند کرکے وہ نیچے اُتر آیا۔ رومی اور میں نے بھی اس کی فوراً تقلید کی۔

جیپ طارق نے کیکر کے جھنڈ کے پیچھے کھڑی کردی تھی۔ بعد میں ہم نے کچھ مزید ادھر اُدھر سے جھاڑ باں اور شاخیں اکٹھی کرکے اسے ڈھانپ کر جیپ کو "کیموفلاج" سا کردیا۔

میں اپنے اور رومی کے بارے میں کہہ سکتا تھا کہ ہم دونوں اس وقت پوری طرح فارم میں تھے لیکن طارق زخمی تھا، اگرچہ اس کی حالت پہلے سے قدرے بہتر ہوگئی تھی تاہم وہ ذہنی طور پر پوری طرح چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔

ہم اس کی سربراہی میں چند قدم نامعلوم سمت کی جانب بڑھے تھے اور پھر ایک مقام پر طارق رک کر گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ ٹارچ ہمارے پاس تھی مگر ابھی اسے جلانے کی ضرورت نہیں تھی۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ اردگرد سناٹا تھا، آسمان صاف تھا اور اس کے تاج پر چمکتے نگینے کی طرح چاند "سُپر مون" کا سا منظر پیش کررہا تھا، اس کے گرد تاروں کی

فوج ظفر موج نے ماحول پر ایک طلسماتی سا سحر طاری کر رکھا تھا۔ یوں چاند تاروں کی تابنا کی میں اردگرد کا علاقہ کسی حد تک روشن نظر آرہا تھا۔ ہمارے دائیں جانب تو کچے راستے کی دو پگڈنڈیاں سی دور تک چلی گئی تھیں، وہاں جھاڑی دار میدان تھا اور بائیں جانب مٹی اور ریت کے ٹیلے سے بنے دکھائی دیتے۔ ان کے پار کھیتوں کا سلسلہ دور تک جارہا تھا، اسی سمت میں چند محافظ کتوں کے کبھی کبھی بھونکنے کی آواز دم بہ خود سے ماحول میں سحر سا طاری کر دیتی تھی۔

تھوڑی دیر ٹھہر کر آخر الذکر سمت کا جائزہ لینے کے بعد...... ہم اسی سمت کو بڑھ گئے۔

اگلے چند منٹوں بعد جب ہم کھیتوں کے درمیان بنے کچے راستے پر چلنے لگے تو سامنے ذرا دور ملگجی سی چاندنی میں ہمیں گھروں کی بے ترتیب قطاریں دکھائی دینے لگیں۔ اس طرف کسی کسی مکان سے پیلی روشنی بھی پھوٹتی نظر آرہی تھی۔

کھیتوں کا سلسلہ خاصا طویل تھا اور ہمیں محافظ کتوں کے پیچھے پڑنے کا خدشہ ہونے لگا۔ میں اور رومی یہی سمجھ رہے تھے کہ طارق ہمیں آبادی کی سمت ہی لیے جارہا ہے، لیکن اس نے نصف راستہ طے کرنے کے بعد اچانک بائیں جانب نکلنے والی ایک اور کچی پگڈنڈی کا رخ کر لیا۔

اس طرف ہم دس پندرہ منٹ تک پیدل چلتے رہے اور ایک مختصر سے میدانی حصے میں آگئے۔ یہاں تک کھیت زمینوں کی حد بندی تھی شاید کیونکہ اس کے بعد کا رقبہ صاف میدان جیسا نظر آتا تھا، وہاں گھنے پیڑ تھے، چندایک کے نیچے موٹے موٹے نقشین پایوں والی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، جو اس وقت خالی تھیں۔

یہاں شاید گاؤں کے لوگ چوپال وغیرہ لگاتے تھے۔ اسی میدانی حصے سے آگے سامنے کی جانب ایک خاصا کشادہ راستہ آگے تاریکی میں جا کر گم ہو رہا تھا۔ بادیٔ النظر میں یہ کسی کچی بڑی سڑک کا ہی منظر پیش کرتا تھا۔

ہم چوپال والے ڈیرے کے درمیان سے چوروں کی طرح گزرنے لگے، کسی کی اگر ہم پر نگاہ پڑ جاتی تو وہ ہمیں ”مچ چور“ سمجھ کے شور مچا دیتا، مگر خدا کا شکر ہوا کہ ابھی تک ایسا کوئی سین پارٹ نہیں ہوا، اگرچہ ذرا آگے جا کر ایک چند گھروں کی قطار یہاں تک بھی نظر آرہی تھی، جہاں سرکنڈوں اور ترپالوں کے چھپر سے بنے ہوئے تھے اور ان کے نیچے گائے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

”کون ہے؟“

دفعتاً ایک پاٹ دار آواز پر ہم بُری طرح چونک پڑے۔ رات کے اس دم بخود سناٹے میں یہ آواز ہمیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگی تھی۔

”خبردار! جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔“ پھر وہی آواز اُبھری۔ ہم رک گئے۔ آواز کی سمت دیکھا، بائیں جانب ایک چھپر تلے دھری پڑی چارپائی سے کوئی لمبا سا موٹا ڈنڈا اُٹھا کے اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین لیے ہماری جانب لپکا۔ اس طرف پیال اور سرکنڈوں کا جھنڈ بھی دکھائی دیا۔

”ہولا رہ، چاچا شکورے! یہ میں ہوں...... صابرہ دا پتر......“ طارق نے آہستہ سے کہا۔ میں اور رومی چوکیدار کی آواز سے زیادہ طارق کی بات پر چونک کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شاید اس نے واقعتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش چاہی تھی۔

”کون ڑ...... چاچا شکور؟ کیڑا صابرہ دا پتر......؟ اوئے...... کون ہو تسی لوکی؟“ چوکیدار نے ٹھیٹ پنجابی زبان میں پھر بڑک لگائی تھی۔ گویا طارق کا ہوا میں چھوڑا ہوا تیر ہوا ہی کر دیا اور ڈنڈے کو کسی گنڈاسے کی طرح تھام کردہ ہمارے قریب آگیا۔

وہ خاصا ہٹا کٹا اور قدآور تھا۔ اس نے بغیر بازوؤں کی بنیان اور چارخانوں والی لنگی پہن رکھی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے سلطان راہی کی طرح ہم پر پل ہی پڑے گا مگر اس سے پہلے...... ہی طارق نے ایک عجیب سی حرکت کر ڈالی، رومی اور میری آنکھیں جو ابھی تک پھیلی ہوئی تھیں، انہی کی روشنی میں ہم نے ایک مضحکہ خیز منظر بھی دیکھ لیا۔ طارق کسی موٹے چوہے کی طرح بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکا جھکا اس کی لنگی...... میں جا گھسا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے...... گرانڈیل چوکیدار کو ہم نے اکڑوں ہوتے اور تیسرے لمحے میں دھڑام سے نیچے کچی زمین پر گرتے دیکھا۔ میں تو اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلنے لگا جبکہ رومی نے اپنی جگہ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور چوکیدار کا گرا ہوا گنڈاسا نما ڈنڈا اُٹھا کر اس کے سر پر اس زور سے ”وجا“ دیا کہ مجھے اس ہولناک منظر کو دیکھنے کی تاب نہ ہو سکی اور آنکھیں بند کر لیں۔

یوں رات کے اس پہر اور دم بہ خود سناٹے میں اس ”اوغ“ کی مخصوص آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

طارق اور رومی چوکیدار کو انٹا غفیل کر چکے تھے۔

”یہ مرتو نہیں گیا......؟“ میں نے ہولے سے پوچھا۔

مجھے اس کے سر سے پھوٹنے والے خون بہنے...... کی

بکھر مٹی میں ملتی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔
''جہنم میں جائے، ہمارا راستہ کھوٹا کررہا تھا کم بخت!'' طارق نے سفا کی سے کہا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا، چوکیدار اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ ہمیں چور یا ''بج چور'' سمجھنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔
میں نے طارق کی پروا کیے بغیر چوکیدار کی نبض چیک کی، وہ مجھے سست محسوس ہوئی۔
''ہم اسے اس وقت کوئی میڈیکل ٹریٹمنٹ نہیں دے سکتے۔'' رومی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ ''آؤ...... طارق آگے بڑھ چکا ہے۔''
''نہیں رومی! جس طرح یہ بے چارہ محض اپنا فرض نبھا رہا تھا میں بھی اپنا فرض نبھائے بغیر آگے ایک قدم نہیں بڑھاؤں گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں اور سنجیدگی سے کہا۔
''یار! کم از کم اس کے پٹی ہی باندھ لینے دو، جریانِ خون تو رکے۔''
لہٰذا میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہا اور بے ہوش چوکیدار کی لنگی کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر، جو مجھے کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی، اس کے سر کی چوٹ پر پٹی باندھ دی۔
''کہاں رہ گئے تم دونوں......؟'' کہیں دور سے طارق کی ہانک اُبھری۔
''چلو جلدی، سیف!'' رومی بولی۔ میں اُٹھا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ طارق نے کس سمت کا رخ کیا ہے۔
''کہاں رہ گئے تھے تم دونوں......؟'' اس نے جل کر پوچھا۔
''ڈاکٹر صاحب، اپنا فرض نبھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ چوکیدار کے زخم کی پٹی کر رہے تھے موصوف۔'' رومی نے بتایا اور طارق کو میں نے مدھم روشنی کے باوجود آنکھیں پھیلائے اپنی طرف گھورتے پایا تو میں نے گہری متانت سے کہا۔
''وہ بے قصور تھا، میں اُسے اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔''
''گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے، کیا تم نے یہ مثال نہیں سنی؟'' طارق نے مجھے سرزنش کرنے کے انداز میں کہا۔
''آنکھوں دیکھا گھن نکال بھی لیا جانا چاہیے۔'' میں نے جواب میں ایک مثال کے طور پر کہا۔

''یہ تم دونوں کس بحث میں اُلجھ گئے، آگے بڑھو۔'' رومی نے ہمیں ٹوکا۔
ہم ایک بار پھر تاریکی کا حصہ بننے کے لیے آگے بڑھ گئے۔
طارق کی رہنمائی میں بیس پچیس قدم چلنے کے بعد ایک عمارت کے قریب پہنچے۔ یہ دو منزلہ تھی۔ خوب صورت مگر قدیم طرزِ تعمیر کی اس حال عمارت پر کسی حویلی کا گمان ہوتا تھا۔ اس پر سرخ اور قرمزی اینٹوں کا کام زیادہ نظر آرہا تھا۔ سامنے بڑا سا احاطہ تھا، پھر عمارت کے گرد باڑھ تھی۔ اندر سے حویلی چہار اطراف باغ میں گھری ہوئی تھی۔
اُوپر دو دریچے روشن تھے، باقی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ احاطے کا بڑا سا چوبی گیٹ بند تھا، وہاں دو گن بدست آدمی سگریٹ بیڑی پیتے دکھائی دیے۔ ساتھ ہی ایک سرکنڈوں کا جھونپڑا سا بنا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔
''اوئے، طفلئے! تو چا بنا رہا ہے یا پائے...... ایڈی دیر......؟'' اول الذکر دو محافظوں میں سے ایک نے مذکورہ جھونپڑ کی طرف منہ کر کے ہلکی سی ہانک لگائی تو اندر سے جواب ملا۔
''بس، تیار ہے، ابھی لایا۔''
ہم اس گیٹ سے تقریباً کوئی آٹھ دس قدموں کے فاصلے پر پیپل کے ایک گھنیرے اور چھتنار پیڑ کے موٹے تنے کے عقب اور اس کی جڑوں سے اُبھری ہوئی جھاڑیوں کے جھنڈ میں دبکے ہوئے تھے۔
''کیا یہی گوہر شاہ کا آبائی ٹھکانا ہے؟'' میں نے طارق کے کان میں ہولے سے سرگوشی۔
''ہاں!'' اس نے جواب میں کہا۔
''اب کیا کریں؟ اندر کیسے جانا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
''سوالوں کی یلغار روکو گے تو کچھ سوچوں میں......؟'' طارق جل کر بولا۔
میں خاموش ہو رہا۔ طارق نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔
اسی وقت اندر کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز اُبھری۔
''اوہو، شاید ہماری بُو سونگھ لی ہے اس نے......'' طارق بولا۔
''محافظ نے؟''
''نہیں، کُتّے نے......''

''تو اب......؟''

''بائیں جانب کی سمت سے آگے بڑھتے ہیں، شاید وہاں کوئی کتا موجود نہ ہو اور ہم بہ آسانی اندر حویلی میں نقب لگا سکیں۔'' طارق نے سوچنے کے سے انداز میں کہا۔

''تمہارا خیال ہے دائیں سمت بھونکنے والے کتے کو پتا نہیں چل سکے گا؟'' میں نے سوال اُٹھایا۔

''ممکن ہے۔'' طارق بولا۔ ''جب تک اسے پتا چلے، ہم عمارت کے اندر ہوں گے۔''

''چلو پھر۔'' میں نے کہا۔

ہم ذرا چند قدم پیچھے ہٹ کر قریب کی جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے مذکورہ سمت بڑھے اور مقررہ مقام پر پہنچ کر...... رک گئے۔

اس سمت سے حویلی کا یہ حصہ نقب لگانے کے لیے موضوع لگا، لیکن جب باڑھ کا جائزہ لیا گیا تو وہ ایسی نہیں لگ رہی تھی کہ ہم آسانی سے اسے پھلانگ سکتے۔ ایک تو اس کی اُونچائی چار فٹ تھی، جو اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا، دوسرا یہ کانٹے دار تھی اور تیسرا بہت چوڑی تھی۔

''اسے تو کاٹنا پڑے گا۔'' رومی گومگو سے انداز میں بولی۔

''میرا خیال ہے اس سلطان راہی ٹائپ چوکیدار کی جھونپڑی میں...... ایسا کوئی اوزار مل سکتا ہے، جس سے باڑھ گزارے لائق کاٹی یا اُدھیڑی جاسکے۔'' طارق بولا۔

''میں جا کر دیکھتی ہوں۔'' رومی بولی۔

''نہیں، تم ٹھہرو، میں جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم ہی جاؤ پھر، اپنے مریض کا بھی معائنہ کر لینا۔'' رومی بولی۔ میں کوئی جواب دیے بغیر تاریکی میں پلٹ گیا۔

ہر سُو جنگل سی تاریکی کا راج تھا۔ چاند تاروں کی باراتی روشنی جانے کیوں ماندی سی پڑنے لگی تھی۔ جلد ہی عقدہ کھلا کہ بادلوں کی کئی آوارہ ٹکڑیاں اس طرف نکل آئی تھیں۔

میں وہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا، میرے سامنے ایک خوفناک منظر تھا۔

☆☆☆

وہ منظر خوف ناک کم اور عبرت ناک زیادہ محسوس ہوا تھا۔

چہار اطراف تاریکی تھی، درمیان میں آسمانی روشنی کی کچھ کرنیں پڑ رہی تھیں، چوکیدار زخمی حالت میں کچی زمین پر ہنوز بے سُدھ سا پڑا تھا اور اس کے قریب دو گیدڑ نما سے جانور کھڑے دکھائی دیے۔ دونوں اپنے تھوتھنے بار بار بے

ہوش پڑے چوکیدار کے زخم سے لگاتے، پھر اُوپر اُٹھا لیتے تھے۔

اللہ کو بھی زندگی بچانا تھی اور اسی میں کوئی بہتری تھی کہ مجھے ہی دوبارہ یہاں آنا پڑا۔ خدا نے شاید اسے میرا مریض ...... بننا قبول کر لیا تھا اور اس کی زندگی بچانا بھی...... ورنہ یہ جنگلی جانور اس کا زخم چاٹ چاٹ کر اس غریب کو بے ہوشی کی حالت میں ہی مار ڈالتے۔

میں نے ''ہشکارا'' دے کر ان دونوں جنگلی گیدڑوں کو بھگایا اور چوکیدار کے بے سُدھ وجود کو کاندھے پر لاد کر چھپر تلے آ گیا جدھر اس کا مڑھی نما جھونپڑا بھی تھا، اندر سے بہت ہی ہلکی یرقان زدہ سی روشنی پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ اس طرف ایک ہینڈ پمپ بھی لگا نظر آیا اور مستقل پانی وغیرہ گرنے کی وجہ سے وہاں ایک چھوٹا سا ''گھڑا'' بھی بن گیا تھا۔

بہرکیف...... میں اسے اندر لے آیا اور اسے چارپائی پر لٹا دیا، جس پر پہلے سے ہی ایک میلی چیکٹ سی گدڑی بچھی ہوئی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ اس کے سر کا خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ اُدھیڑ عمری کے باوجود یہ مجھے ساٹھا پاٹھا نظر آیا، تنومند تھا مگر چہرہ کھردرا، گھنی مونچھیں، سر کے بال لمبے اور تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے چھوڑ کر میں نے مڑھی کا معائنہ کیا۔ وہ خالی تھی، زمین کچی اور نہیں سے اُوپر نیچی تھی، قریب صراحی رکھی تھی، قریب ہی مجھے پودے اور کیاریاں برابر کرنے والی بڑی سی قینچی پڑی نظر آ گئی اور میں طارق کی ذہانت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ ایک بدنما بانس سے لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کی ہلکی سی لو ٹمٹما رہی تھی، نجانے اس کا 'گل' دھیما کیا ہوا تھا یا تیل ختم تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر قینچی اُٹھا لی۔ وہ زنگ آلود تھی، مگر کام کی تھی۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا...... یہ کراہتی ہوئی آواز تھی۔ میرا دل یکبارگی یہ دیکھ کے زور سے دھڑکا تھا کہ چوکیدار ہوش میں آنے لگا تھا۔

''کیا کروں؟ اسے اسی طرح چھوڑ کر نکل بھاگوں؟ کام تو ہو گیا تھا میرا۔'' میں نے لحہ بھر کو سوچا، لیکن یہ بعد میں ہمارا اچھا بھلا آگے بڑھتا ہوا معاملہ کھوٹا کر سکتا تھا، شور وغل مچا کر۔ پھر سوچا، اس کے سر پر قینچی کا آہنی دستہ مار کے پھر سے اسے اٹاغفیل کر ڈالوں، تب خیال آیا کہ دوسری بار پٹی بھی مجھے ہی باندھنا پڑے گی، یوں میری نظروں نے اس کی اُدھڑی ہوئی لنگی کو ملاحظہ فرمایا، میں اور کہاں تک اسے

پھاڑتا؟ لیکن کچھ تو کرنا تھا۔ تب پھر یہی وہ وقت تھا جب 'یک نہ شُد دو شُد' والا معاملہ ظہور پذیر ہو گیا۔

باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میری دھڑکتی نظریں مڑھی کے داخلی حصے کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہاں مدھم سی آسمانی روشنی میں مجھے کسی کا سایہ دراز ہوتا نظر آیا۔

پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ کہیں رومی یا طارق نہ ہوں، مگر مجھے اتنی کچھ زیادہ دیری تو نہیں ہوئی تھی، انہیں مجھے دیکھنے کے لیے یہاں آنا پڑے؟

''بلو!...... اوئے بلو! جاگ رہا ہے؟'' اچانک سائے نے آہستہ سے پکارا۔ وہ ٹھہر گیا تھا اور میں چونکا تھا کہ یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ میں بُری طرح ششش و پنج کا شکار تھا۔ اُدھر وہ سلطان راہی ٹائپ چوکیدار ہوش میں آرہا تھا اور اِدھر اس کی کوئی 'ہوتی سوتی' رات کے اندھیرے میں اپنا بستر چھوڑ کر اس سے یہاں ملنے آن پہنچی تھی۔ ان دونوں کے درمیان میں خود کو ایک ایسا اُلو محسوس کرنے لگا... جسے سوچ بچار کرنے کے لیے کوئی شاخ نصیب نہیں ہوئی تھی اور وہ زمین پر گھبرایا اور بدکا ہوا سا موجود ہو۔

''آ...... آہ...... شش...... شگو......!'' معاً ہی بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں لوٹتے ہوئے سلطان راہی نے بھی جیسے 'سُر' ملا دیا۔ سُروں کے ملنے کی دیر تھی کہ ہلکی سی چھما چھم کے ساتھ پازیب کھنکناتے ہوئے دو مضبوط سڈول اور گورے چٹے صحت مند پاؤں کی جھلک اندر پڑی، اس مختصر سی مڑھی کے اندر میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، پل کے پل ایک خیال ذہن میں اُبھرا اور میں نے قینچی رکھ کر منجی کی راہ لی اور اس کے سرہانے ٹک کر چوکیدار کو بہ ظاہر ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگا۔

''ہائے ربا! تُو کون ہے؟ یہ...... یہ بلو کو کیا ہو گیا؟''

گورے سڈول پاؤں کے ساتھ اب اس کا پورا وجود بھی نمایاں ہو چلا تھا۔ وہ ایک قاتلہ ہی تھی۔ الہڑ پنجابی مُٹیارن جیسی، اس نے دیہاتی طرز کا پھول دار گھا گھرا پہن رکھا تھا۔

ہلکے عنابی رنگ کا یہ گھا گھرا اس کے جوان اور صحت مند جسم پر خوب جچ رہا تھا۔ اسی رنگ کی تنگ سی کُرتی بھی اس نے پہن رکھی تھی، بلکہ 'پھنسا' رکھی تھی کہنا زیادہ مناسب ہو گا، قد کاٹھ مناسب تھا، لمبے اور قدرے بھورے سے سیاہی مائل بالوں کی چُٹیا بنائی ہوئی تھی، چتون تیکھے تھے۔

وہ، یعنی شگو شاید اپنی خفیہ ملاقات کو بھلا بیٹھی اور ایک نرالی چھب کے ساتھ منجی کے پاس آ گئی۔ تب ہی اس کے بدن کی مسحور کُن خوشبو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ قدرت کی دین تھی۔ بلو، نام کے اس سلطان راہی ٹائپ کے چوکیدار سے ایسا ہی لگتا تھا جیسے کوئی انجمن اس سے ملنے آ گئی ہو۔

''اسے کچھ لوگ زخمی کر کے بھاگ گئے تھے...... شاید چور تھے وہ......'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں نے اس کے سر پر پٹی باندھ دی ہے۔ تُو صراحی سے پانی بھر لا۔''

وہ مجھے اپنی کجراری آنکھوں سے دیکھتی رہی جس میں شکوک کے سائے رقصاں تھے، لگتا تھا کہ میں ان دونوں کو مشکل سے ہی بے وقوف بنا سکوں گا، وقت ایسا تھا کہ وہ مجھ سے سرِدست بحث نہ کر سکی اور میرے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔

میں نے پانی کے چھینٹے بلو کے چہرے پر مارے اور اسے ہوش آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہڑبڑایا اور ایک دم چاق و چوبند سا نظر آنے لگا۔ میں اندر سے پریشان ہوا۔

''کتھے گئے اوبے غیرت...... اور چور دے پتر؟''

اس نے بڑک ماری، وہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے ایک ''بے غیرت'' اور ''چور دا پتر'' اس کے ساتھ بیٹھا اس کی، مجبوراً سہی، دل جمعی میں مصروف ہے، ظاہر ہے اس نے رومی، طارق اور میری شان میں ہی یہ نازیبا کلمات ادا کیے تھے۔

غصہ اسے اس قدر تھا کہ اسے اپنی ''شگو'' اور شاید میری موجودگی کا بھی ہوش نہیں رہا۔ وہ اِدھر اُدھر گردن گھما کر اپنا شاید گنڈاسا نما ڈنڈا دیکھنے لگا، جو منجی سے ہی لگا ہوا تھا۔ وہ میں نے کسی فرماں بردار شاگرد کی طرح اُٹھا کر اسے تھما دیا، اپنا ہر دلعزیز ڈنڈا پکڑتے ہی وہ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر منجی سے اُٹھنے لگا تھا کہ اچانک اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور وہیں رُک گیا۔ میں اپنے حلق میں آئی ہوئی رقیق شے کو نگل کر رہ گیا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''اوئے...... تُو کون ئے؟''

''میں شبیر ہوں، یہاں سے گزر رہا تھا، تمہیں باہر زخمی حالت میں گرے پایا، جہاں دو جنگلی بھگیاڑ تمہارا زخم چاٹ رہے تھے، میں نے انہیں بھگایا اور تمہاری لنگی پھاڑ کر پٹی کی اور اندر لے آیا۔ باہر گیدڑوں کے پنجوں کے نشان موجود ہیں۔'' میں نے گویا ایک ہی سانس میں اسے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری جانا تھا، مبادا یہ گنڈاسے کو میرے سر پر ہی نہ آزما ڈالے۔ یہی نہیں میں نے احتیاط کے پیشِ نظر ٹھوس ثبوت بھی پیش کر دیا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ بلو، طیش میں

میرے لیے واقعی 'سلطان راہی' ثابت نہ ہو جائے، اس پر مستزاد اس کی 'انجمن' بھی موجود تھی یہاں......

''ہالا......! پر ابھی تُو ایتھے ہی رک، میں ہُنی ای آناواں......'' (تم اِدھر ہی رکو میں ابھی آتا ہوں) وہ مجھے گویا حکم دے کر خود ڈنڈا اور اپنی پھٹی ہوئی لُنگی سنبھالے تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اب مڑھی کے محدود اور نیم روشن ماحول میں شگو اور میں تنہا رہ گئے۔

میرے سامنے منجی پر وہ اپنے بھرپور صحت مند وجود کو قیامت خیز انداز میں خم دیے ٹکی بیٹھی ہنوز میری طرف اشتباہ انگیز نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ جوانی اور شباب سے لبالب بھری ہوئی یہ دیہاتی حسینہ ایسے رنگین و سنگین پُرانگیز ماحول میں کسی کا بھی ایمان لے ڈوبنے کے لیے کافی تھی مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں خود پھنسا ہوا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچوں میں گم تھا اور دوسری طرف مجھے طارق اور رومی کی فکر ستا رہی تھی، جو مشن کے آخری مرحلے میں میری واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے، اس پر مستزاد بلو بھی گنڈاسا سنبھالے روانہ ہو چکا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو میری طرف......؟'' میں نے جھلا کر شگو کو ٹوک دیا۔ دفعتاً ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے سرخ گولڈن سیبوں جیسے گال پر ڈمپل بن گیا، لیکن میں ان گڑھوں کو نظرانداز کرتا ہوا بھونچکا... سا رہ گیا۔

پل کے پل وہ یوں بدل گئی جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہو۔ تاہم مجھے اس بڈھے بلو کی قسمت پر رشک بھی آ رہا تھا کہ شگو جیسی رانی اس سے خفیہ ملاقاتیں کرتی تھی اور جانے کب سے کرتی آ رہی تھی۔

''تو اتنا ڈر کیوں رہا ہے؟'' اس نے مترنم آواز میں پوچھا۔ بھرپور جوانی اور شباب کے ساتھ اس کے گلے کا سُر سنگیت بھی کم نہ تھا۔ میں اس کی مترنم ہنسی کی سنگیت کو خاطر میں لائے بغیر بولا۔

''ظاہر ہے، شریف آدمی ہوں، ڈر تو لگے گا، نیکی کبھی کبھی گلے جو پڑ جاتی ہے۔''

''تو اس کی فکر نہ کر۔'' وہ اپنے بھرے بھرے گداز ہونٹوں کی دلنواز مسکراہٹ سے بولی۔ ''اپڑاں بلو، کسی کا احسان نہیں مارتا، لیکن تجھ سے وہ کچھ کھرے سوالات ضرور کرے گا۔ بس! تو اس کا جواب دے دینا۔ ویسے مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تو اس کا محسن ہے۔''

''تیرا بلو کوئی تھانیدار ہے، جو مجھ سے سوالات پوچھے گا۔'' میں نے غصے سے اسے گھور کر کہا۔ ''مجھے دیر ہو رہی ہے، میں جا رہا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں منجی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''خبردار! یہاں سے نکلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' وہ اچانک پھر بدل گئی اور ہوشیار بلی کی طرح وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے گھورنے لگی۔

وہ سینہ تان کر میرے قریب...... بہت قریب آن کھڑی ہوئی تھی اور اپنے دونوں ہاتھ پہلو پر یوں ٹکائے میرا راستہ روکے کھڑی ہو گئی جیسے دیوار ہو۔

میں نے فوراً قیامت بنی سامنے کھڑی شگو کو پوری تسلی کے ساتھ کہا۔

''دیکھو، میرا راستہ مت روکو، مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ ہٹو آگے سے......'' کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے آگے سے ہٹانے کے لیے ایک ہاتھ بڑھایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نہیں چھوئے گی مگر اس نے بھویں اور چتونیں چڑھاتے ہوئے میرا وہ ہاتھ زور سے جھٹک دیا، یہی نہیں اس نے اپنے بازوؤں کی آستینیں بھی چڑھا دیں۔ اب اس کے جلتے سلگتے گورے توانا سڈول بازو میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ان میں گہری سرخ اور ہری چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ ایک موٹا کنگنا بھی جھلملا رہا تھا۔

''مجھے ہلکا مت لینا تم، سمجھے......'' اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے تہدید آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تم جیسے شہری بابوؤں سے نمٹنا خوب جانتی ہوں، یہ پنڈ ہے پنڈ، شہر نہیں ہے...... یہاں کا بچہ بچہ دلیر، کھرا اور مشکل پسند ہوتا ہے۔''

''یہ تم کیا پاگلوں جیسی گفتگو کر رہی ہو؟'' میں نے گھور کر کہا اور پھر ایک لمحہ توقف سے اس کے صحت مند سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''میں تم جیسی بھاری بھرکم خاتون کو ہلکا لے بھی نہیں سکتا اور تم بھی میرے ساتھ یہ غلطی مت کرنا، میرا تعلق بھی پہلے کسی پنڈ سے ہے پھر شہر سے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے......'' اس نے ہاتھ نچایا۔ ''بلو کو ذرا آ لینے دے۔''

''وہ میرا تھانے دار نہیں ہے، میں کہتا ہوں ہٹ جاؤ میرے راستے سے...... ورنہ میں تمہارے عورت ہونے کا لحاظ بھی نہیں کروں گا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ اصل طیش مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ وہ اپنے بلو کو تھانے دار سمجھے ہوئے تھی۔

''نہیں ہٹوں گی، اگر تو نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تو یاد رکھنا میرا بلو تجھے......''

"تیرے بلو کی تو ایسی کی تیسی......" میں نے اس کی بات کاٹی۔ اس کی اس بات نے جلتی پر تیلی کا کام کیا تھا۔ غصے میں آکر میں نے ایک ہاتھ سے اسے بائیں جانب منجی پر دھکا دیا، اگلا لمحہ میرے لیے غصے سے زیادہ گھبراہٹ پر مبنی تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور شاید کوئی دھوبی پٹخا لگانے کی کوشش چاہی تھی کہ پھر ہم دونوں ہی منجی پر آن گرے۔ رات کے گمبھیر تاسنانے میں منجی ہمارے دہرے وزن سے احتجاجاً بڑے خوف ناک انداز میں چرچرائی۔

منجی پر ہم دونوں کے گرنے کا انداز بڑا ہی رنگین سنگین تھا۔ وہ یوں کہ میں نیچے تھا اور وہ میرے اُوپر تھی۔ اس کے نرم وگرم اور شباب آگیں بوجھ نے میرے وجود میں ہی نہیں بلکہ دماغ میں بھی تھرتھلی مچادی۔ اس کی تیز تیز چلتی گرم سانسوں کا تموج الگ قیامت ڈھا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کی صحت مند کمر کے گرد جیسے بندھ سے گئے تھے۔ سر سے پاؤں تک وہ اپنی تمام تر جسمانی و جمالیاتی جزئیات سمیت میرے اُوپر "پڑی" ہوئی تھی اور اس پر مستزاد اس کا اعصابی ہلچل مچادینے والا بوجھ...... میں تو ویسے ہی خود کو اب بے بس سا محسوس کرنے لگا تھا کہ اب کیا کروں کہ اچانک...... مڑھی میں سلطان راہی جیسی بڑک گونجی۔

"یہ کیا ہورہا ہے شگو......؟"

یہ آواز اسی گنڈاسا بردار گرانڈیل چوکیدار بلو کی تھی۔ میں تو پہلے ہی بے بس تھا البتہ شگو تڑپ کر مجھ پر سے اُٹھی اور منجی سے اُتر کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میں اسی طرح گویا خالی الذہنی کی حالت میں پشت کے بل منجی پر پڑا، آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا اور دیکھا کہ بلو کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے والے منظر پر اختلاجِ قلب کے سے آثار طاری تھے۔ شگو بوکھلا گئی۔ پھر اپنا لباس درست کرتے ہوئے ہکلانے والے انداز میں چوکیدار سے بولی۔

"ی ی...... یہ بھاگنے کے چکروں میں تھا...... مجھ سے لڑ رہا تھا اور...... لیکن میں نے اسے جانے نہیں دیا...... ہم لڑتے لڑتے منجی پر جا گرے تھے، اچھا ہوا تو آگیا اور اب اسے خود ہی سنبھال، میں چلی......"

"ٹھہر جا ابھی......" بلو نے اسے سخت لہجے میں رُکنے کا کہا۔ میں جو ابھی تک منجی پر پشت کے بل لیٹا اپنی آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا، یکدم اُٹھ کھڑا ہوا۔ بلو نے فوراً اپنا ڈنڈا دونوں ہاتھوں میں لے لیا جیسے مجھے مارنے لگا ہو۔ پھر وہ بڑی ہی تیز اور تُرش نگاہی سے مجھے گھور کے بولا۔

"اوئے...... سچ سچ بتا تیرے باقی چور ساتھی کیسے نس گئے نیں؟" (کہاں بھاگ گئے ہیں)

"میرے ساتھی؟ کون ساتھی بھائی؟" میں نے مکاری کی تو وہ ڈنڈا لہراتے ہوئے بولا۔

"اوئے زیادہ چالاکی نہ دکھا۔ میں نے کھُرا لبھ (ڈھونڈ) لیا ہے۔ تیرے نال ہور دو ساتھی بھی تھے۔" میں اندر سے ڈر گیا، کم بخت نے کھُرا بھی ڈھونڈ نکالا تھا، پھر بھی میں نے ہار نہیں مانی اور بولا۔

"تو نے کھُرا لبھ ہی لیا تھا تو باقی دو کا تعاقب کیوں نہیں کیا؟" یہ میں نے جانچنے کے لیے سوال پوچھا تھا کہ کہیں یہ واقعی کھُرا لبھتا ہوا طارق اور رومی کے پاس تو نہیں جا نکلا تھا۔

"گیا تھا پیچھے میں...... ان دونوں کھُسروں کے...... مگر وہ ہاتھ نہیں آئے۔"

"وہ پھر ضرور چور ہوں گے۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "ان کا اور میرا کھُرا ایک ساتھ ہونا محض اتفاق ہی ہوسکتا ہے، تم ذرا اپنا یہ گنڈاسا ایک طرف رکھ کے دماغ لڑا کے سوچو، اگر میں بھی چور یا ان کا ساتھی ہوتا تو تمہاری جان کیوں بچاتا۔ تم بجائے میرا احسان ماننے کے اُلٹا میرے ہی گلے پڑ رہے ہو، گویا...... وہ کیا مثال ہوتی ہے، گناہ لازم...... نیکی برباد وغیرہ......"

"یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، بلو!" دفعتاً ہی اس کے قریب کھڑی شگو نے میری حمایت میں اپنے بلو سے کہا۔ "اسے جانے دے اور مجھے بھی...... خواہ مخواہ ہی بات نہ بڑھا، میرا خصم (شوہر) جاگ نہ جائے......" اس کی بات پر گنڈاسا بردار بلو نے نہایت ہی خشمگیں نظروں سے شگو کو گھورا تھا گویا کہہ رہا ہو کہ "خصم" والی بات کرنے کی اِدھر کیا ضرورت تھی۔ اب شگو کے چہرے سے بھی غلطی کا احساس جھلکنے لگا تھا، مگر بات زبان سے اور تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"لیکن میرے حلق سے یہ بات نہیں اُتر رہی ہے کہ کھُرا جن تین آدمیوں کا ہے اس میں سے ایک یہ بھی شامل ہے۔" بلو نے کہا۔ اسے یقین بھی تھا اپنی بات پر لیکن وہ اُلجھا ہوا بھی محسوس ہورہا تھا۔ اُلجھن میں اسے یہی بات ڈالے ہوئے تھی کہ پھر میں نے اس کی جان جنگلی بھگیاڑوں سے کیوں بچائی اور پٹی کیوں باندھی تھی۔ یہ میرے حق میں ایک پلس پوائنٹ تھا۔

"چل پھر تو اپنے بارے میں بتا کہ تو ہے کون اور یہاں کیا کرنے آیا ہے؟" وہ مجھ سے بازپرس کر کے اب اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنے لگا مگر میں نے

بھی ان دونوں کی چوری پکڑ لی تھی بلکہ میرے اندر بھی راہِ مفر کا جواز پیدا ہوگیا تھا۔ لہٰذا طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''بلو بادشاہو! اب چھوڑو اس بحث کو، ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، میں بھی یہاں کسی سے خفیہ ملاقات کرنے آیا تھا۔ وہ کر کے واپس لوٹ رہا تھا۔''

''اوئے عاشق بامراد دے پتر! تُو یہاں کس کڑی سے ملنے آیا تھا؟'' وہ اڑا رہا، شگو پریشان ہو رہی تھی۔ وہ یقینی طور پر اپنے خصم کو گھر میں سوتا چھوڑ آئی تھی اور اب اسے واپسی کی جلدی ہو رہی تھی ادھر یہ ناہنجار بلو تھانیدار بنا ہوا تھا جو خود بھی چور تھا۔

اس پر بلو کے چہرے پر بیک وقت غصے اور جھلاہٹ کے آثار طاری ہوگئے مگر وہ بھی ایک اکڑ باز تھا، بولا۔

''مجھ پر ان حرام زادوں نے حملہ کیا، مجھے زخمی کیا اور جنگلی بھگیاڑوں کے سامنے ڈال دیا، میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا انہیں، لبھ کر ہی رہوں گا۔ مجھے یقین ہے تُو بھی ان کا ساتھی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر جو کرنا ہے کر لے، میں بھی تیار ہوں، سیاپا ڈالنا چاہتا ہے تو میں بھی تیرا اور تیری اس شگو رانی کا پول اِدھر ہی کھول دیتا ہوں، مچا شور اور پورے پنڈ والوں کو یہاں اکٹھا کر لے۔'' میں نے بھی جی داری سے کام لیا۔ اس نے جلتی پر تیلی کا اثر دکھایا۔ بلو کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی، اسے یقین سا ہوگیا کہ مجھے وہ جو سمجھ رہا تھا، وہ ہی ٹھیک تھا۔ گنڈاسا لہرا کر اس نے بڑک ماری۔

''اوئے یہی تو یہی سہی، میں بھی کسی بات سے نہیں ڈروں گا، تُو بھاگ جا شگو یہاں سے...... اور تو آجا میرے مقابلے پر...... دیکھتا ہوں تجھے بھی۔'' اس نے گنڈاسا تولا، میں پریشان سا ہوگیا۔ شگو مجھ سے زیادہ پریشان نظر آنے لگی۔ اب وہ بھی جان چکی تھی کہ بھاگنے سے بھی اس کے خصم والا معاملہ خراب ہو جائے گا، وہ اس قسم کی عورتوں کی طرح پوری رازداری کی قائل تھی، تب ہی میں نے ایک چونکا دینے والا اور حیران کن منظر دیکھا۔ اس پر یقیناً بلو کے سر پر بھی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے لیکن مجھے اس کی چنداں پروا نہ تھی، میں تو حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک ناقابلِ ہونی منظر دیکھ رہا تھا۔

شگو نے دانت پیسے اور اسی وقت اس نے اپنے بلو کو اڑنگا لگا دیا۔ بلو بادشاہ کے خواب و خیال میں بھی اپنی شگو رانی سے ایسی جرأت کی توقع نہ ہوگی، تھی وہ بھی مردم مار، بلو اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا' وہ دھڑام سے گرا تو اس کا سر منجھی کے پائے سے بڑے زور سے ٹکرایا اور بدنصیبی یہ...... کہ ٹکرایا بھی سر کا وہی حصہ جہاں پہلے سے ہی ایک عدد زخم موجود تھا، شکر تھا کہ زخم کھلا مگر اس کا سر نہیں کھلا، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ بلو دوبارہ ہوش و حواس کی دنیا سے بے خبر ہو کر گر پڑا۔ اس کے سر سے خون جاری ہوگیا تھا۔

اسے لمبا ڈالنے کے بعد شگو رانی نے کسی پنجابی لڑاکا ہیروئن کی طرح میری طرف گھورا، میں ایک دم محتاط ہوگیا۔

''چل اوئے! تُو تو بھاگ یہاں......'' اس نے مجھ سے کہا۔ اس سے حملے کی توقع نہ ہوتے دیکھ کر میں نے کہا۔

''لیکن یہ مر جائے گا، اس کی پٹی کر دے، خون بہہ رہا ہے۔''

''تجھے اس کی بڑی فکر ہے، تیری پھپھی دا پتر لگتا ہے یہ...... چل بھاگ یہاں سے...... میں بھی جاتی ہوں، مرتا ہے تو مرنے دے اِسے۔''

مجھ پر دوبارہ نیکی کا بھوت سوار ہوا تھا مگر پھر بلو کی سابقہ احسان فراموشی یاد آگئی، پھر بھی میرا جی نہیں کیا کہ اسے اس طرح مرتا چھوڑ جاؤں۔ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں کم از کم اس کے سر سے خون بہنا ضرور بند کروں گا، آگے اللہ مالک ہے۔'' کہتے ہوئے میں اکڑوں بیٹھ گیا اور انٹا غفیل پڑے بلو کی لنگی کی پٹی بنانے کی غرض سے اسے دوبارہ تختۂ مشق بنایا اور ایک طرف سے پھاڑا تو کچھ قابلِ اعتراض مناظر کی جھلک نظر آنے لگی اور میں نے شگو کو منہ پھیرتے دیکھا۔

''تُو بھی جھلا ہی ہے۔'' اس نے پھُسپھُسے لہجے میں کہا۔ میں اپنا کام نمٹا چکا تھا۔

بلو کی لنگی دو بار پھٹنے کے بعد اب کافی اونچی ہو چکی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس بار ہوش میں آتے ہی وہ بجائے چوروں کے پیچھے لپکنے کے اپنی آدھی بچی لنگی کے بارے میں ضرور سوچے گا پھر کوئی دوسرا قدم اٹھائے گا۔

ابھی ہم دونوں مڑھی سے باہر نکلنے کا قصد کیے ہوئے ہی تھے کہ اچانک شگو ٹھٹکی اور وہیں ٹھہر گئی، ساتھ ہی اس نے مجھے بھی روک دیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے ہولے پوچھا۔

''ششش...... باہر کوئی ہے۔'' اس نے سنسنی پھیلانے والے انداز میں کہا اور میں دھک سے رہ گیا۔

''کک...... کون ہے باہر؟'' میں نے نیچی آواز میں دریافت کرنا چاہا مگر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مڑھی کے کونے کی

جانب بڑھی، جھک کے پڑا ہوا گنڈاسا اُٹھایا اور مجھے بھی وہی قینچی اُٹھانے کا اشارہ کیا جسے لینے کے لیے میں اس مصیبت گاہ میں آیا تھا اور بدقسمتی سے اس سارے سیاپے کا شکار ہوگیا۔ اس نے دیوار سے پشت لگادی۔ مجھے بھی یہی کرنے کا اشارہ کیا۔ شاید اس کے کان بڑے تیز تھے۔ اس نے کوئی آہٹ باہر سنی تھی، جو میں شاید اس ہڑبونگ میں نہیں سن سکا تھا۔

وہ اپنی ملائم جلد والی صحرائی دار گردن موڑے مڑھی کے داخلی راستے کی جانب تکے جارہی تھی۔ اچانک ہی دو گیدڑ اندر داخل ہوئے۔

دھت تیرے کی...... کھوتے دے پتر......!'' شگو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''گیدڑ دے پتر......'' میں نے ہولے سے تصحیح کی۔

''ہش...... ہش......'' وہ انہیں گنڈاسا لہرا کر باہر بھگانے لگی۔ مگر گیدڑ شاید بھوکے تھے اور شیر بن گئے تھے۔

اپنے بدہیئت چہرے والی تھوتھنی اُٹھا کر ایک نے شگو کے سامنے غرانے کی جرأت کر ڈالی جو اسے خاصی مہنگی پڑ گئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے شگو نے اپنے بلو کا گنڈاسا اس کی تھوتھنی میں مارا، دونوں چیختے ہوئے پلٹے اور باہر کو دوڑ کر کہیں تاریکی میں گم ہوگئے۔

''چلو نکلو......'' وہ بولی۔ گنڈاسا اس نے پھینک دیا۔ میں نے قینچی تھامے رکھی۔ ہم دونوں مڑھی سے باہر آئے تو وہ ابھی تک میرے ہاتھوں میں دبی ہوئی اس بڑی سی قینچی کو دیکھ کر بولی۔

''کیا اب کسی کا گلا کاٹنا ہے تُو نے...... پھینک اس کو۔ ثبوت لیے ہاتھ میں گھومے گا؟'' اس نے کہا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ یہ سارا کھٹ راگ اسی کم بخت قینچی کے حصول کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ تاہم میں نے اس کی بات کو نظرانداز کردیا اور خاصے تفکر سے بولا۔

''مڑھی کا راستہ بند کردینا چاہیے، اندر تیرا بلو بے ہوش پڑا ہے، کہیں یہ جنگلی بھگیاڑ دوبارہ نہ اس پر حملہ کر دیں، بعد میں پولیس کیس بن سکتا ہے۔''

اس نے جھلا کر اپنی دمکتی پیشانی پر... دوہتڑ مارا اور غصے سے بڑبڑائی۔

''یہ بلو کم بخت تو مصیبت ہی بن گیا ہے۔ چل خیر اندر...... کوئی بھاری چیز دروازے پر رکھ چھوڑتے ہیں۔''

مڑھی کا دروازہ ایسا نہ تھا کہ اسے مضبوطی سے بند کیا جاتا۔ وہاں داخلی چوکھٹ پر بس دروازے کے نام پر ایک ٹاٹ ہی جھول رہا تھا۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح کچھ اِدھر اُدھر سے بھاری چیزیں، جن میں منجی سرفہرست تھی، وہ کسی نہ کسی طرح دروازے پر رکھ دی اور خود بھی پھنس پھنسا کر باہر نکل آئے، پھر جب ہم اپنا اپنا راستہ اپنانے لگے تو میں نے کسی خیال، بلکہ خطرے کے پیش نظر...... اس سے پوچھا۔

''یہ بتا، بعد میں یہ بلو کہیں تیرے لیے مصیبت تو نہیں بن جائے گا؟'' یہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ کہیں کم بخت ہوش میں آتے ہی میری ڈھنڈیا نہ ڈال دے، اور اُدھر میرے انتظار میں سوکھتے ہوئے میرے دونوں ساتھی رومی اور طارق بعد میں مجھے کوسیں کہ میں معاملہ بنانے گیا تھا اور بگاڑ لایا۔ تاہم مجھے حیرت بھی ہوئی تھی ان دونوں پر کہ...... مجھے یہاں اتنی دیر ہوگئی تھی اور رومی یا طارق میں سے کوئی ابھی تک میری خیر خبر لینے نہیں آیا تھا یہاں؟ کیا وہ ابھی تک وہیں بڑی استقامت سے بیٹھے ہوئے میرے منتظر تھے؟ شاید یہی بات ہو، بار بار جگہ بدلنا ان کے لیے بھی تو ٹھیک نہ تھا۔

''میں اسے سنبھال لوں گی بعد میں، تُو بھاگ جا، یہ موٹے دماغ کا آدمی ہے۔ میں بھی چلی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف تاریکی کی جانب بڑھ گئی اور میں قینچی سنبھالے اپنے راستے کی طرف لپکا۔

☆☆☆

رات کچھ اور آگے سرک چکی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ تاریکی بھی گہری ہوگئی تھی۔ آسمان پر شاید بھولے بھٹکے بادل تیرنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی کشاکشی نے میرے اعصاب پر بڑا گہرا اثر چھوڑا تھا، جس سے ذہن ہی نہیں، جسم بھی تھکا تھکا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

شگو کے غائب ہوتے ہی میں نے بھی فوراً اپنی راہ لی تھی، رومی اور طارق بے چینی سے نہ صرف میرے منتظر تھے بلکہ مجھے بُری طرح کوس بھی رہے ہوں گے۔ کیونکہ اس ساری صورتِ حال میں مجھے کم از کم نصف گھنٹا تو ہو ہی گیا ہو گا، جبکہ جو کام طارق اور رومی نے مجھے سونپا تھا، وہ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹوں کا تھا۔ تاہم مجھے ایک بات پر ہنوز حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اگر مجھے ان تک پہنچنے میں تاخیر ہو بھی گئی تھی تو وہ دونوں کیوں کر چپکے بیٹھے رہے ہوں اب تک......؟ ان میں سے کسی کو تو آ کر میری تاخیر کی وجہ یا میری خیر خیریت کے لیے آہی جانا چاہیے تھا۔ یوں، وہاں تک کا فاصلہ بھی کچھ اتنا زیادہ نہ تھا جہاں وہ دونوں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

میرے پاس اپنے سوال کا کوئی جواب نہ تھا اسی لیے میں بدستور درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان بنے اس کچے سے راستے پر چلا جارہا تھا۔

مجھے وہاں تک پہنچنے میں کوئی خاص دیر نہیں لگی، مذکورہ راستے پر آتے ہی مجھے وہی حویلی نما عمارت کا ہیولا دکھائی دے گیا تھا، لیکن اس وقت میں بُری طرح چونک پڑا۔

طارق اور رومی دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھے۔

میں چند ثانیے تو چھپا کھڑا اسی مخمصے کا شکار رہا کہ کہیں مجھ سے جگہ کے سلسلے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی یا پھر عین ممکن تھا رومی اور طارق کو اس دو منزلہ سرخ اور قرمزی اینٹوں والی عمارت کے اندر گھسنے کا جب تک کوئی اور موقع میسر آچکا ہو، یوں میرا انتظار کیے بغیر وہ آگے بڑھ گئے ہوں۔

لیکن مجھے اپنے یہ دونوں خیال رد کرنا پڑے۔ کیونکہ ایک تو جس باڑھ کو کاٹنے کے لیے مجھے قینچی کے حصول کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ اسی طرح صحیح سالم تھی، دوسرے یہ کہ رومی اور طارق میری طرف سے تسلی کیے بغیر کبھی بھی خود ہی اس طرح مہم کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔

''تو پھر کہاں گئے یہ دونوں...... زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

دفعتاً ہی ایک چرچراتی آواز پر میں چونکا اور یک دم جھکے جھکے سے انداز سے میں جھاڑی دار زمین پر جنگلی بلے کی طرح بیٹھ گیا اور سرتاپا اسی سمت ساعت بنا بیٹھا تاریکی میں آنکھیں پھاڑے تکتا رہ گیا جہاں سے یہ سرسراتی ہوئی اسرار بھری سی آواز اُبھری تھی۔

باوجود کوشش کہ مجھے وہاں کچھ دکھائی نہیں دیا جبکہ وہ آواز بھی آنا بند ہوگئی۔ میں پھر بھی ایسے ہی دُبک کر بیٹھا رہا۔ لگتا مجھے ایسے ہی تھا جیسے اسے بھی میری احتیاط کا علم ہوگیا ہو، جبکہ میں اس کی نظروں میں آچکا ہوں۔

دو تین منٹ اسی طرح خاموشی اور گویا ایک دوسرے کی گھات میں مزید آگے کو سرک گئے، پھر دوبارہ چرمراہٹ کی آواز اُبھری، میرے کان کھڑے تھے۔ میں ساکت تھا مگر آنکھوں کے ڈیلوں کو میں نے آخر اللہ کر آواز کی جانب گھمایا، وہاں تاریکی تھی اور کچھ ادھ ٹکیلے کٹے بانس اُگے نظر آئے، پھر یہی وہ وقت تھا جب شاید چاند یا تاروں کے کسی جھنڈ کے آگے سے بادلوں کی کوئی ٹولی کھسک گئی اور اسی کی مقدور بھر روشنی میں مجھے خود سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر ایک عجیب و غریب ہیولا نظر آگیا۔

اس عجیب الخلقت ہیولے کو دیکھ کر میری سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ کیا بلا تھی؟

بلا...... کا خیال ذہن میں آتے ہی میں ایک لمحے کو اندر سے کانپ سا گیا۔ جنوبی پنجاب کے ایسے اندرون اور قدرے دور اُفتادہ جھاڑی دار گھنے علاقوں میں بلاؤں کی موجودگی کے قصے کہانیاں میں اپنے پنڈ کے پرانے لوگوں سے سنتا آیا تھا اور بعد میں ہنستا بھی تھا، مگر آج اس عجیب و غریب ہیولے کو دیکھ کر میں نامعلوم سے ڈر اور خوف کا شکار ہونے لگا، لامحالہ اس میں وقت اور ماحول کی بھی اثر پذیری کارفرما تھی۔

میں نے اپنی نظریں اس ہیولے سے نہیں ہٹائی تھیں، آسمان سے اُمڈتی کچھ روشنی میں اسے مکمل طور پر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ذرا حرکت کرنے کے بعد یوں رک گیا تھا جیسے میری ٹن گن یا بُو پانے کی کوشش کر رہا ہو، تب ہی اس نے حرکت کی اور...... اسرار کے پردے میں لپٹا وہ پُراسرار ہیولا کچھ اور واضح ہوا اور میں بری طرح ٹھٹکا، وہ جھکے جھکے انداز میں دو تین قدم میری جانب بڑھنے کے بعد رک کے دائیں بائیں دیکھنے لگا تو مجھ پر عقدہ کھلا کہ وہ کوئی بلا نہیں بلکہ ایک انسان ہی تھا، مگر اپنی پشت پر اُبھرے ہوئے کوہان یا کُب کی وجہ سے تاریکی میں عجیب الخلقت دکھائی دے رہا تھا۔

ایک اور انکشاف تب ہوا جب وہ اور قریب آیا اور پھر رک گیا۔ مجھے اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لمبے پھل والا چھرا بھی دکھائی دیا، جو مدھم روشنی میں لشکارے مار رہا تھا۔

''خون......'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں اُبھرا اور میں ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔

یہ کسی کو قتل کر کے آیا تھا اور اب اسے شاید اپنے کسی اگلے شکار کی تلاش تھی۔ وہ کون تھا؟ یا جسے قتل کیا تھا، وہ بھی کون تھا؟

کہیں اس مردود نے رومی یا طارق کو تو نہیں...... اس سے آگے مجھے سوچنے یا کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

وہ پلٹ گیا۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مجھے جا کر دیکھنا چاہیے تھا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔

رومی اور طارق تو مجھے دوبارہ نہیں دکھائی دیے تھے اسی لیے میں نے سوچا کہ اس سے کوئی کھوج مل جائے ان دونوں کا۔

میں اُٹھا اور نہایت گربہ قدمی کے ساتھ اس کُبڑے قاتل کے پیچھے چل پڑا۔

چہار سُو ہُو کا عالم تھا۔ آسمان پر چاند تاروں کی بادلوں کی ٹکڑیوں سے آنکھ مچولی جاری تھی۔

وہ کبڑا اب یوں تیز تیز قدموں سے چلا جارہا تھا جیسے اسے کسی جگہ پہنچنے کی جلدی ہو۔ تب ہی میں بُری طرح چونک گیا۔ اس کا رخ حویلی کی عمارت کی عقبی جانب تھا۔ وہ کانٹے دار باڑھ کے ساتھ ساتھ چلا جارہا تھا اور ایک جگہ رک کر اس نے کسی کھڈے میں وہ خون آلود چاقو بھی پھینک دیا تھا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ بجز اس کے کہ میں اس کے تعاقب میں رہتا اور وہی میں کررہا تھا۔

حویلی کے پچھواڑے مختصر سا جنگل تھا، وہ اُدھر رک گیا اور پھر عمارت کی جانب بڑھا، اب میں نے دیکھا کہ اس طرف سے باڑھ کاٹ کر راستہ بنایا ہوا تھا، مگر نہیں...... وہ راستہ دوبارہ بند بھی کیا جاسکتا تھا، جو اس پُراسرار کبڑے نے میری آنکھوں کے سامنے کیا، ایک لکڑی کے بدنما سے فریم میں کانٹے دار جھاڑی کا عارضی پھاٹک سا بنایا ہوا تھا، جو لوہے کے تاروں سے کھول یا بند کرنے کے بعد دوبارہ باندھ دیا جاتا تھا۔

میں نے اسے یہ عمل کرتے ہوئے غور سے دیکھا اور پھر وہ اندر چلا گیا۔ یہاں سے میں دبک کر حویلی کا پچھلا حصہ بہ آسانی دیکھ سکتا تھا، عمارت کے اس حصے کی دیوار پر مجھے چند کھڑکیاں، جو بند تھیں اور ایک سنگل پٹ والا دروازہ نظر آرہا تھا۔ وہ اسی دروازے کے قریب پہنچا اور اسے کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

یہ ساری کارروائی دیکھنے کے بعد میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے بعد اردگرد پر ایک نظر ڈالی اور میں نے بھی یہی کیا۔

باڑھ کے اس عارضی پھاٹک کے قریب بڑھتے ہوئے میرا دل بُری طرح دھڑدھڑا رہا تھا۔ میں ہمت کیے بڑھتا رہا اور پھر باڑھ کے پھاٹک کے پاس پہنچ کر رک گیا، ایک بار پھر محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور اسی پھاٹک کے فولادی تار کو توڑ مروڑ کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا، اس کم بخت کبڑے نے اسے بہت ہی مضبوطی سے لپیٹ رکھا تھا۔ جسے کھولتے ہوئے میری اُنگلیاں اور ہاتھ بھی زخمی ہوگئے، مجھ پر اس وقت جوش سا طاری تھا میں لگا رہا اور بالآخر لوہے کے تار کو کھول دیا اور پھاٹک کو آہستگی سے دھکیلا، وہ کھل گیا، میں نے دھڑکتے دل سے اندر قدم رکھا۔

میں دروازے کے قریب آیا اور اس کی ایک موٹی سی متوازی جھری سے آنکھ چپکا کر اندر جھانکا، مگر گھپ تاریکی کے سوا مجھے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ میں نے ہمت کرکے دروازہ کھولنا چاہا لیکن سخت مایوسی ہوئی۔ ظاہر ہے وہ کبڑا جب اندر داخل ہوا تھا تو اس نے اسے یقیناً اندر سے کنڈی لگادی ہوگی۔

میرے پاس اسے کھولنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ہونٹ بھینچے وہیں کھڑا سوچنے لگا، دفعتاً مجھے عمارت کی اُوپری منزل سے ایک تیز چیخ سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی، دوسرے ہی لمحے مجھے کہیں قریب ہی ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز بھی سنائی دی۔ میں لرز سا گیا، کیونکہ آواز میرے بہت ہی قریب اور دائیں جانب سے آئی تھی، بلاارادہ میری گردن بھی اسی سمت کو گھومی، وہاں مدھم مدھم روشنی میں مجھے گھاس پر کسی کا آڑا ترچھا وجود گرا پڑا نظر آیا، اس وجود کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی، یوں جیسے کوئی انسانی پتلا بلندی سے گرا ہو اور اس کے ہاتھ، بازو اور ٹانگیں وغیرہ ٹیڑھے میڑھے ہوگئے۔

زمین کا وہ حصہ ناپختہ اور بھربھری مٹی سے اٹا پڑا تھا، تاہم زمین کی سختی اور انسانی جسم کے بلندی سے گرنے کے سبب اس کی ایسی حالت یقینی امر تھی۔

میں ہک دک سا کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ میرے ساتھ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے سے ہو کیا رہا تھا؟ پہلے بلو اور شگو سے سنسنی خیز ٹاکرا، پھر وہ خون آلود چھرا بردار پُراسرار کبڑا، طارق اور رومی کا اچانک غیاب اور اب یہ کسی عورت کا حویلی کی بلندی سے یوں گرنا۔ بڑے اُلجھے ہوئے اور بکھرے بکھرے سے پے در پے واقعات رونما ہوئے تھے۔

دفعتاً میں خیالات کے بھنور سے اُبھرا۔ ایک شور سا سنائی دیا، پھر یکایک یہ شور تھم بھی گیا، اس کے بعد دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں اور کسی کے زور زور سے بولنے کا شور سنائی دیا۔

میں جو ابھی تک حویلی کی اس عمارت کے اندر گھسنے کے ناکام جتن میں مصروف تھا، یک دم...... ایک طرف کو درختوں کے گھنے جھنڈ کی طرف چلا گیا، وہاں جڑواں تنوں والے درختوں کی بہتات تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سفیدے اور یوکلپٹس کے درخت قطار در قطار حویلی کے داخلی گیٹ تک جاتے نظر آرہے تھے، اس کے ساتھ جو روش سی بنی ہوئی تھی، میں نے اسی پر ہلکی روشنی میں کچھ لوگوں کو بھاگ

بھاگ اس طرف آتے دیکھا۔

میں نے ایک بار پھر سر اُٹھا کر حویلی کی بلند فصیلوں کی جانب دیکھا تھا، وہاں مجھے اب چند ایک سر، نیچے جھانکتے دکھائی دیے۔ میں درخت کی جڑوں کے قریب اُبھری ہوئی خودرو جھاڑیوں میں دبکا ہوا تھا۔

اپنے دیکھ لیے جانے کا خدشہ بھی میرے سر پر کسی انجانے خوف کی طرح سوار تھا۔ طارق یا رومی ساتھ ہوتے تو اور بات تھی۔

یا اللہ! یہ کیا ماجرا تھا؟ رومی اور طارق کہاں غائب ہو گئے تھے، اس حویلی میں اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی؟ کچھ پتا نہیں تھا۔

چند قدموں کے فاصلے پر ہونے سے اب نہ صرف میں ان بھاگتے ہوئے آئے افراد کو دیکھ سکتا تھا بلکہ ان کی باتیں بھی سننے کے قابل تھا۔ وہ ملازم ٹائپ ہی افراد نظر آتے تھے، جن میں ایک جوان اور ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور باقی مرد تھے۔ دو گن بردار بھی تھے۔ دو ایک کے ہاتھ میں ٹارچیں بھی تھیں۔

عورتوں نے سر پیٹ ڈالا اور سینے پر دوہتڑ مار کے رونے لگیں۔

''ہائے، بڑی بیگم جی...... ہائے بڑی بیگم جی...... یہ کیا ظلم کر دیا خود پر......''

''او...... ہائے! شور مت کرو اور اندر جاؤ......'' ان میں ایک مرد نے انہیں جھڑکا، دوسرا بولا۔

''وے رامو! ان دونوں کو اندر لے جا۔'' پھر وہ باقیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لاش کو اُٹھاؤ اور اندر لے چلو، کہیں پنڈ والوں کو خبر نہ ہو جائے۔''

''لیکن غفورے! چوہدری صاحب کو تو فون کر کے اطلاع کر دے......؟ اور جا کے تاج صاحب کو بھی جگا، وہ اندر لمبی تان کے سو رہا ہے، شکر ہے کہ وہ یہاں موجود ہے، اب وہی یہ سب سنبھالے تو سنبھالے، اس سرے نورے نے سارا کام خراب کر دیا، کہا بھی تھا چوہدری صاحب سے کہ اسے مار بھگاؤ اور اتنی اہم ذمے داری نہ اسے دو، اسے اب دورے پڑنے لگے ہیں پاگل پن کے۔''

''اوئے راکھے! تُو نے کیا بڑ بڑ کرنا شروع کر دی، کام نمٹاؤ کام...... جلدی۔'' ایک نے کہا۔ ''چوہدری صاحب کی غیر موجودگی میں ہم نے ہی اب یہ معاملہ ٹھیک کرنا ہے۔''

''چلو چلو...... جلدی کچو لاش تو، وڈی بی بی! گزر چکی ہے بے چاری!'' ایک نے کلمہ افسوس ادا کیا۔

''اللہ رحم ہی کرے، حویلی میں تو اندھیر سا مچ گیا میرا تو دم ہی نکلا جا رہا ہے۔''

ہر کوئی اپنے اپنے مطابق تبصرے کیے جا رہا تھا۔

مجھے یہ سارا معاملہ سنسنی خیز اور چونکا دینے والا ہی محسوس ہو رہا تھا، تاج صاحب کے نام پر میں چونکا تھا، گویا وہ مردود بھی یہاں موجود تھا۔ لیکن گوہر شاہ کہیں گیا ہوا تھا۔ اب تک یہی اندازہ ہو پایا تھا۔ مجھے یہ معاملہ خودکشی کا بھی لگتا تھا اور قتل کا بھی......

وہاں اب اور لوگ بھی آن موجود ہوئے تھے۔ ان کا تعلق پنڈ کی آبادی سے نہیں حویلی سے ہی لگتا تھا، ظاہر ہے یہاں آس پاس کوئی زیادہ آبادی نہیں تھی، ماسوائے جنوبی سمت کی طرف جہاں میں بھی کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب قطاروں کے خاکے دیکھ چکا تھا۔

یہ لوگ معاملہ رازداری سے نمٹانا چاہتے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ انہیں چوہدری صاحب نے اس طرح کی سچویشنز میں ایسے احکامات دے رکھے تھے۔ گویا اسے بھی شبہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے وغیرہ۔

یہ سارے اندازے اور قیاسات، پل کے پل میرے ذہن میں از خود اُبھرتے چلے گئے۔ نیز یہ بھی سننے میں آیا کہ پولیس کو ابھی ہرگز مطلع نہ کیا جائے، یوں ان لوگوں نے کسی چادر میں لاش کو اُٹھایا اور بڑے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

انداز چوروں جیسا تھا کہ کوئی باہر کا فرد یہاں موجود نہ ہو یا دیکھ نہ رہا ہو، یہی وجہ تھی کہ میں اس بدنصیب عورت کی شکل کو دیکھنے یا پہچاننے کی کوشش بھی نہ کر پایا۔

اس سارے کھٹ راگ کے بعد ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر ایک بار پھر رومی اور طارق کے بارے میں سوچا۔ کھرا لبھنے کا ماہر وہی سلطان راہی ٹائپ چوکیدار بلو تھا، لیکن بدقسمتی سے میرے اس سے ''تعلقات'' ٹھیک ہوتے تو اسے یہاں کھینچ لاتا اور کہتا کہ میرے دونوں ساتھیوں کے کھُرے لبھ کے دے کہ وہ گئے کدھر؟

میں اس طرح اکیلے میں بُری طرح جھنجلا سا گیا۔ مجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ آیا ان دونوں کی تلاش میں سر کھپاؤں یا پھر حویلی کے اندر نقب لگا کر اکیلے ہی بانو والے

مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اسے یہاں سے سیدھا گل بادشاہ کے پاس لے بھاگوں......؟ (بشرطیکہ یہ میرے لیے آسان ہوتا)

میں وہیں جھاڑیوں اور تاریکی میں چھپا یہی سب سوچتا رہا اور بالآخر ایک فیصلے پر پہنچ کر دل کچھ مطمئن ہوا۔

میں نے حویلی کے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت موقع بھی قدرے بہتر تھا۔

لہٰذا یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ راستہ انہی لوگوں نے مجھے نادانستگی میں ہی سہی، سجھا دیا تھا۔

میں حویلی کی مشرقی دیوار کی آڑ لیے، تاریکی کے جلو میں...... بڑے دروازے کے قریب پہنچ ہی گیا، پہلے والے دو محافظ اب نظر نہیں آ رہے تھے، ایک دو کی آواز سنائی دی تھی اور وہ دور سے آئی تھی۔ وہ احاطے کے پھاٹک کی جانب تھے۔

بڑے دروازے پر کوئی نہ تھا، میں وہاں سے اندر داخل ہوا اور سامنے ہی مجھے کھلا اور لمبا چوڑا احاطہ نظر آ گیا۔ وہاں دو تین گاڑیاں کھڑی نظر آئیں، کوئی بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ بائیں جانب البتہ ایک گلیارا تھا، وہاں مدھم روشنی تھی۔ کتّے کا بھی مجھے ڈر تھا مگر چونکہ اس کے بھونکنے یا غرانے کی آواز مجھے دوسری سمت سے آئی تھی، اسی لیے میں محتاط روی سے آگے بڑھتا رہا۔

اس طرف حویلی کے اندر کے کمروں کی کھڑکیاں تھیں، جو سب ہی بند نظر آ رہی تھیں۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، بقول صائمہ کے، یہاں گوہر شاہ کی دونوں بیویاں رہتی تھیں، اپنے اپنے بچوں کے ساتھ، اب خدا جانے بانو کس کی بیٹی تھی، پہلی والی کی یا دوسری کی...... خیر، مجھے پہلی، دوسری سے کیا۔ صائمہ نے مجھے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ کوئی فلاپ اداکارہ بھی آیا کرتی تھی۔ گویا گوہر شاہ کا اپنی دونوں بیویوں پر خاصا رعب داب تھا۔ اس ڈر سے قطع نظر کہ اداکارہ یہاں کی ''تیسری'' بھی بن سکتی تھی، پہلی اور دوسری بیویوں نے اپنے بچوں سمیت حویلی کو آباد رکھا ہوا تھا۔

بھاڑ میں گیا یہ سب...... میں نے جھنجلا کر سوچا اور...... اپنی روش پر کامیاب رہا۔

''شش......'' اچانک ایک آواز پر میں بُری طرح ٹھٹک کر رک گیا۔

''سیف......'' ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میرا نام لے کر پکارا گیا تھا۔ آواز سرگوشی میں تھی اسی لیے میں پہچان نہ پایا لیکن پکارنے والا اشنا سا ہی ہو سکتا تھا۔

میں قدرے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''اس طرف...... اُوپر۔'' نیچی آواز میں کہا گیا، میں نے اِدھر اُدھر ہلنے جلنے کے بجائے اب صرف سر اپنا اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو ایک بڑے سے دریچے کے چھجے پر مجھے کسی کا ہیولا نظر آیا، یوں جیسے کوئی چھوٹا جنگلی جانور مچان پر شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہو۔

''کون؟'' میں نے بھی ہولے سے کہہ دیا۔ دیکھ تو لیا ہی گیا تھا اب ڈرنے سے کیا۔

''ششش...... آہستہ، میں...... رومی!''

''او میرے خدا......!'' بے اختیار میرے اندر ابھرا۔

''کیا کروں میں؟''

''اُوپر آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''کیسے؟''

''اسی دریچے کے دائیں جانب رخنے ہیں، اس پر جلدی سے اوپر چڑھ آؤ۔'' رومی نے کہا۔

رومی یا طارق سے اس قدر اچانک اور یوں غیر متوقع ملنا، مجھے بُری چونکا گیا تھا۔ بہرکیف! خوشی بھی تھی، میرا حوصلہ سوگنا بڑھ گیا، میں نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا اور چھجے پر چڑھ آیا تو رومی تب تک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس نے سر کے اُوپر چند فٹ کے فاصلے پر ایک دوسرے دریچے پر دونوں ہاتھ دیے اپنے بقیہ جسم کو اُوپر کھینچ لیا۔

میں نے بھی اس کی تقلید کی اور چند لمحوں بعد ہم دونوں ایک کمرے میں تھے، جہاں خاصی روشنی تھی اور وہاں میں نے طارق کو دیکھا۔

میں اسے سامنے کرسی پر یوں اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر بھونچکا...ر...ہ گیا۔ یوں جیسے وہ یہاں ایک خطرناک مشن پر نہیں بلکہ دعوت پر آیا ہو۔

''یہ یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ تم دونوں کہاں چلے گئے تھے؟'' جھلّائے ہوئے ذہن میں اسی طرح کے جو سوالات ابھرے تھے، وہ میں نے زبان کی بندوق سے سیدھے بہ یک وقت طارق اور رومی پر فائر کر دیے۔

''اچھا! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔'' طارق نے مجھے گھورا۔

''اوہو......! یہ تم کس بحث میں پڑ گئے......'' رومی جھلّا کر بولی۔ ''ہم اس وقت دشمن کی گود میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں قصور کسی کا بھی نہیں ہے۔'' پھر وہ مجھ

سے مخاطب ہو کر بولی۔
"ویسے سیف! تم کہاں رہ گئے تھے؟ ہم کس قدر اہم مشن میں پھنسے ہوئے تھے اور تمہارے منتظر تھے؟"
"یہ باتیں بعد میں کرلیں گے، یہ بتاؤ، یہاں کے کیا معاملات ہیں؟ کسی نے اُوپر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ کون تھی یہ؟ اور بانو کا کچھ سراغ ملا؟" میں نے دونوں کی جانب مستفسرانہ نظروں سے باری باری دیکھا۔
طارق سامنے ایک کرسی پر یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے یہاں دعوت پر آیا ہو۔
"بانو مر چکی ہے۔" طارق نے جھٹکے دار انکشاف کیا۔
مجھے اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا۔
"کک...... کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" مارے احساسِ شکستگی اور مایوسی سے میرے منہ سے کچھ تیز آواز میں یہ برآمد ہوا تو رومی ایک دم "شی ی ی ی......" کر کے میری جانب آنکھیں پھاڑے تکنے لگی۔
"آواز دھیمی رکھو، آگے اور بھی انکشافات سننا ہیں تمہیں۔"
"اور کیا؟" میں نے جیسے ہونقوں کی طرح ایک بار پھر ان کی جانب دیکھا تھا۔
"اُوپر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے والی، گوہر شاہ کی اہلیہ اول، نفیسہ بیگم تھیں، یعنی بانو کی سگی ماں......!" طارق بتدریج انکشاف کرتا رہا۔
"میرے خدا......! ہمیں تو ہر جگہ ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ یہ بہت برا ہو گیا، میں تو جبار ماہی کے بعد اب گوہر شاہ کو بھی قانون کی گرفت میں دیکھنے لگا تھا۔" میں نے اظہارِ افسوس کیا۔
طارق ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھا اور بولا۔ "نکل چلو اب یہاں سے...... اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں رہا۔ باقی باتیں کسی محفوظ ٹھکانے پر چل کر کریں گے۔"
"کیا؟" میں اس کی بات پر چونکا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ وہ مردود تاج بھی یہاں موجود ہے، جبکہ خود گوہر شاہ کہیں گیا ہوا ہے، مزید یہ کہ ان لوگوں نے یہ سب پولیس سے چھپانے کا ارادہ کیا ہوا ہے، ہمیں ابھی پولیس کو مطلع......"
"وہ میں کر چکا ہوں۔" طارق نے پوری تسلی سے جواب میں کہا۔ "کیا بھول گئے تم، گل بادشاہ سے ہم نے دیگر سازوسامان کے ساتھ ایک عدد سیل فون بھی لے رکھا تھا، میں سب کچھ گل بادشاہ سے رابطہ کر کے بتا چکا ہوں۔ پولیس کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والی ہے۔ اسی لیے نکل چلو اور انہیں اپنا کام کرنے دو، بہ صورت ہماری یہاں موجودگی انہیں کوئی گل کھلانے کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔"
میرا دل نہیں کر رہا تھا کہ یوں ناکام و نامراد یہاں سے لوٹا جائے۔ وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ وہ مردود تاج بھی اسی حویلی میں موجود تھا۔
ہماری منصوبہ بندی اب تک بالکل ٹارگٹ کی جانب تھی، جس کے ایک مرحلے میں جبار ماہی اور دوسرے مرحلے میں گوہر شاہ کو قانون کی گرفت میں پہنچانا تھا مگر یہاں کھیل بگڑ چکا تھا بلکہ اُلٹا ہو چکا تھا۔
"تم آؤ رومی! اسے یہاں کھڑا سوچتا رہنے دو، وقت نہیں ہے۔" کہتے ہوئے طارق کھڑکی کی جانب بڑھ گیا تھا۔
میں نے دانت پیس لیے۔ ذہن پر جھلاہٹ طاری ہونے لگی۔
"آ جاؤ سیف! فکر مت کرو، بازی اب بھی ایک طرح سے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" رومی نے جیسے مجھے بچہ سمجھ کر پچکارا۔
طارق کھڑکی کے راستے باہر تاریکی میں چھجے پر اُتر چکا تھا اور اب رومی تیاری کر رہی تھی، پھر اس کے بعد ناچار میں نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔

☆☆☆

اگلے چند منٹوں بعد ہم حویلی سے باہر قریب ہی گھنیرے درختوں اور جھاڑیوں میں تاریکی کا حصہ بنے دم بہ خود سے ایک جانب کو چلے جا رہے تھے۔ ہمارا رخ اسی طرف تھا جہاں ہم نے اپنی جیپ کو جنگلی جھاڑیوں میں کیموفلاج کیا ہوا تھا۔
"خبردار......! وہیں رک جاؤ۔"
اچانک ایک بھاری آواز پر ہم ٹھٹک کر رک گئے پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد روشنی ہو گئی اور تقریباً پندرہ بیس افراد لالٹینیں، لاٹھیاں تھامے کھڑے نظر آ گئے۔
یہ سب لوگ مقامی دیہاتی دکھائی دیتے تھے مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی گمنام جزیرے میں پھنس گئے ہوں اور ہمیں اچانک آدم خور جنگلیوں نے گھیر لیا ہو۔
انہی میں مجھے کم بخت، وہی سلطان راہی ٹائپ شینہ چوکیدار بلو بھی کھڑا نظر آیا۔ اس کے سر پر ہنوز اسی کی لنگی کی پٹی بھی بندھی نظر آتی تھی اور گنڈاسا بھی اس کے ہاتھ میں وہی دبا ہوا تھا جسے ہم پر آزمانے کی حسرت باقی رہ گئی تھی۔

میں نے دیکھا، چند ایک کے ہاتھ میں بندوقیں بھی تھیں، ان کی نال کا رخ ہماری جانب ہی تھا۔

جس آدمی نے بھاری آواز میں ہمیں للکارا تھا، وہ ایک درمیانی عمر کا خوب گھٹے ہوئے جثے کا مالک شخص تھا، اس نے ذرا ڈھنگ کا لباس، یعنی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، باقی تقریباً سب ہی لنگیوں اور اُوپر شلوکے نما قمیصوں میں تھے۔

وہ بلو کے ساتھ ہی کھڑا ہماری جانب گھورے جارہا تھا۔

''یہی تھے سائیں یعقوب! میں انہیں پہچان گیا۔'' بلو نے بڑک ماری۔ اول الذکر آدمی کو اس نے یعقوب کے نام سے پکارا تھا۔ وہ ہمیں ایک اور دھمکی دیتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔

''اگر تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو سب لوگ تم پر لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے ٹوٹ پڑیں گے۔''

مجھے اس کی بات سے اتفاق تھا۔ وہ ہماری تکا بوٹی کر سکتے تھے۔ سائیں یعقوب نامی بندہ ان کے پنڈ کا کوئی نمبردار یا چوہدری ہی محسوس ہوتا تھا۔

رومی اور طارق کو اس بات پر حیرت نہ ہو مگر مجھے بلو چوکیدار کی اس حرکت پر ضرور تھی کہ وہ کس ڈھٹائی سے اپنے جرم پر پردہ ڈالے ہوئے تھا اور کس دلیری سے وہ کم بخت ابھی تک ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا، نجانے اس کی کون سی مردانہ انا آڑے آرہی تھی کہ اسے اس بات کی بھی مطلق پروا نہ تھی کہ اس طرح میرے ذریعے اس کا شگو والا ''راز'' بھی افشا ہوسکتا تھا۔

''یہ خود سب سے بڑا چور ہے..... اپنا جرم چھپانے کے لیے یہ ہم پر الزام لگا رہا ہے۔'' بالآخر مجھے بھی اس کی ڈھٹائی پر غصہ آگیا اور میں بلو چوکیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر بولا۔

رومی اور طارق کو اب مجھ پر حیرت ہوئی، کیونکہ وہ کچھ ایسی ہی نظروں سے گردن گھما کر میری جانب تکنے لگے تھے۔

''یہ فیصلہ پنچایت یا پولیس کرے گی، تم تینوں خود کو ہمارے حوالے کر دو۔'' سائیں یعقوب نامی شخص میری جانب گھور کر برہمی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، پھر اس میں اسے اور شگو کو بھی شامل کیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے اور انصاف پر مبنی ہو۔'' بالآخر میں نے بلو چوکیدار کو دبانے کی غرض سے اپنے تئیں ایک داؤ کھیلا اور فاتحانہ نظروں سے بلو کی طرف دیکھا کہ ذرا اس کی متوقع پریشانی اور گھبراہٹ کے تاثرات سے محظوظ ہوسکوں، لیکن اس کے برعکس وہ کم بخت بڑے ہی سکون اور اعتماد کے ساتھ مسکرایا تو اُلٹا مجھے اس کا اطمینان دیکھ کر پریشانی اور گھبراہٹ ہونے لگی۔

اِدھر جب طارق نے .... دیکھا کہ میری دال نہیں گل رہی تو اس نے انہیں سمجھانے کی غرض سے کہا۔

''دیکھو، تم غلط آدمی پر الزام لگا کر اصل چور کو بچنے اور فرار ہونے کا موقع دے رہے ہو۔ یہ ہم پر الزام تراشی کر کے اپنا جرم چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' اس کے بعد طارق نے میری جانب دیکھا اور کہا۔

''تم انہیں اصل بات تفصیل سے بتا کیوں نہیں دیتے؟ تمہارے ساتھ کیا پیش آیا تھا؟''

میں طارق کی زود فہمی پر ایک لمحے کو حیران سا رہ گیا، حالانکہ اسے یا رومی کو تو ابھی تک میں نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا، نہ ہی...... مجھے کچھ بتانے کا موقع ملا تھا، تاہم وہ میری جوابی کارروائی اور ''شگو'' کے ذکر پر کچھ اندازہ لگا چکا تھا کہ اندر معاملہ کچھ اور ہے۔

لہٰذا طارق کے ہمت دلانے پر میں نے صرف اسی حد تک انہیں بتایا کہ ہم یہاں سے گزر رہے تھے اور اس نے ہمیں چور سمجھ کر حملہ کر دیا۔ تھوڑا سا جھوٹ میں نے یہ شامل کر لیا کہ میں اپنے ساتھیوں (طارق اور رومی) سے ذرا دور ہو گیا تھا، جب یہاں سے گزرا تو اسے زخمی پڑا دیکھا اور اسی کی لنگی پھاڑ کر اس کی پٹی بھی کر ڈالی، اسی دوران اس کی کوئی ہوتی سوتی، شگو نام کی خوب صورت سی عورت اس سے ملنے آئی تو یہ پھر میرے گلے پڑ گیا۔ بعد میں اس کی ضد کی وجہ سے شگو کو بھی بھانڈا پھوٹنے کا ڈر ہوا تو اس نے موقع تاک کر بلو پر حملہ کر کے اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا۔

میری یہ کتھا سنتے ہی وہاں آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پھر سائیں یعقوب نامی آدمی نے طنزیہ انداز میں ایک لرزہ خیز انکشاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''ہمیں معلوم تھا کہ تم یہی جھوٹ بول کے خود کو بچانے کی کوشش کرو گے، یہ باتیں ہمیں بلو بتا چکا ہے، کیونکہ اسی نے پہلے شگو کو رات کی تاریکی میں نکلتے ہوئے کہیں جاتے دیکھا تو وہ بھاگ گئی۔ بعد میں اس کے شوہر نورے کو بھی اپنی بیوی کی بے وفائی کی بھنک پڑی تو اس نے چھرے سے اسے ہلاک کر ڈالا، اب شگو کی لاش وہیں پڑی ہوئی ہے۔ ہم نورے کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارے دو

آدمیوں نے اُسے اپنی بیوی شگو کا بے رحمی سے قتل ہوتے دیکھ لیا ہے، چلو اب ہمارے ساتھ......"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ شگو مر گئی، وہ نورے کی بیوی تھی، نورا...... تو کیا جس کبڑے آدمی کو میں نے خون آلودہ چھرے کے ساتھ دیکھا تھا، وہی نورا تھا، یقیناً وہ گوہر شاہ کی حویلی کا ملازم تھا۔ ممکن تھا تہ خانے کا ملازم ہو...... بات جتنی کھل رہی تھی اُتنی ہی پُراسرار بھی ہوتی جا رہی تھی۔ پولیس کی نظروں میں اس وقت ہمارا آنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور اس کا فائدہ ..... بلو چوکیدار سے زیادہ گوہر شاہ اُٹھا سکتا تھا۔

"بھاگو......" دفعتاً طارق زور سے چلّا کر بولا۔ اس وقت شاید اسی نعرے کی ضرورت پر میں بھی غور کر رہا تھا کہ طارق اور رومی نے اس پر عمل کر ڈالا۔

وہ دونوں اُلٹے پاؤں بھاگے اور میں ان کے پیچھے دوڑا۔ عقب میں ہمارے ایک..... شور اُبھرا اور جنگل میں گویا منگل بچ گیا۔ ایک ڈڑکی سی لگ گئی۔

عقب میں بندوق چلنے کا دھماکا بھی ہوا، لیکن ہم نہیں رکے اور اندھیرے اور جنگل کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھاگتے چلے گئے۔

ہمارے عقب میں ہنوز روایتی سی آوازیں اور چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

"پکڑو، چور...... چور...... جانے نہ پائیں......"

میں ان آوازوں پر غور کیے بغیر طارق اور رومی کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ اس میراتھن میں طارق سب سے آگے، درمیان میں رومی اور سب سے آخر میں، میں تھا۔

"تم نے ہمیں شگو اور بلو کے اس چکر کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

ایک موقع پر جب رومی اور میں ساتھ ہوئے تو اس نے دوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بتانے کا ابھی تک موقع کہاں مل سکا ہے؟ سرِدست دوڑ پر توجہ رکھو۔" میں نے اسے ٹوک دیا اور ساتھ ہی اپنی رفتار بھی تھوڑی سی بڑھا کر اس سے آگے نکل گیا۔

اب ایک میدانی سا علاقہ آ گیا تھا۔ یہاں بھی اگرچہ جا بجا چھدری چھدری جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، مگر خطرہ یہ تھا کہ اس طرح ہم ان پنڈ والوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔ یہی نہیں یہاں ایک اور عذاب بھی ہم پر نازل ہو گیا، محافظ کتے جو غالباً اپنی شبینہ ڈیوٹیوں پر تھے، اس مخصوص شوروغل پر یکلخت ان کے فرائضِ منصبی کی رگ پھڑک اُٹھی اور وہ بھی جانے کہاں کہاں سے بھونکتے ہوئے ہمارے پیچھے ہو لیے۔

"کتے ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں، ہم ان سے ریس کا مقابلہ نہیں جیت سکتے۔" میں چلّایا۔

"بھاگتے رہو، ہماری جیپ نزدیک ہی ہے۔" طارق نے بھی جواب میں چلّا کر کہا اور یکا یک میرا اندر مسرت سے بھر گیا، جیپ کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔

جلد ہی ہم جیپ تک جا پہنچے۔ اچانک مجھے عقب میں تلے اُوپر دو فائر سنائی دیے۔ میں نے دیکھا، یہ رومی کا کارنامہ تھا۔ دو کتے قریب آ گئے تھے۔ یہ وہی پستول تھا جو مہم کی روانگی کے وقت، گل بادشاہ نے ہمیں دیا تھا۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ہم کیموفلاج جیپ پر سے جھاڑیاں، پتے اور ٹہنیاں ہٹاتے، دروازوں والی جگہ سے ہم اندر جا گھسے اور اگلے ہی لمحے ہم سیٹوں پر تھے۔ طارق نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی، میں اس کے برابر بیٹھ چکا تھا اور رومی بھی یہی کچھ کرتے ہوئے عقبی سیٹ پر براجمان ہو چکی تھی۔

بندوق والے کنجوسی سے کام لے رہے تھے یا پھر ان کے پاس کارتوسوں کی کمی تھی، وہ چند ہی فائر داغ سکے تھے۔

ہماری جیپ پاور فل ہارس پاور رکھتی تھی، یہی وجہ تھی کہ طارق نے اس کا انجن اسٹارٹ کرتے ہی اسے گیئر ڈال کر دوڑا دیا۔

جیپ، جھاڑیوں، پتّوں کی جھالروں سمیت دوڑ پڑی۔ طارق موٹر کار کا ماہر شہسوار تھا، چشم زدن میں ہی نیم پختہ راستوں پر جیپ دوڑاتا ہوا وہ مین روڈ پر آ گیا۔

کچھ جھٹکوں اور ہچکولوں کے سبب، جیپ پر سے "جھالریں" اب کافی حد تک گر گئی تھیں۔ مین روڈ پر آتے ہی وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

"کیا اب واپسی کا ارادہ ہے؟" رومی نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" طارق نے فوراً یوں جواب میں کہا جیسے اسے رومی کی عقل پر شبہ ہو یا اس... بات کی اسے توقع نہ ہو۔

"ہمارا مشن اُدھورا ہے ابھی۔" میں نے اپنے تئیں گرہ لگائی۔ "لیکن...... پھر اب جا کہاں رہے ہیں؟ ہمیں فوری طور پر کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے اسی ٹھکانے کا رخ کیا ہے۔" طارق جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے خیال میں وہ محفوظ ٹھکانا کہاں ہوسکتا ہے؟'' رومی نے پوچھا۔

''ہم اس وقت دیپالپور روڈ پر ہیں اور ابھی ہمیں اسی کے آس پاس رہنا ہے۔ میں ادھر روڈ کے ساتھ ہی کسی آبادی کو دیکھ کر جیپ تھمالوں گا، شاید کوئی چھوٹا موٹا سہی، اقامتی ہوٹل نظر آجائے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''لیکن ہمیں پولیس کا خطرہ درپیش ہوگا یہاں......'' میں نے مبہم سے انداز میں خیال ظاہر کیا۔

''ان سے نمٹ لیں گے۔ کسی ہوٹل پہنچ کر گل بادشاہ اور ایس پی رندھاوا سے رابطہ کر کے مدد لینے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔'' طارق نے کہا۔

اس مختصر سے سفر کے دوران میں ہی طارق کے کہنے پر رومی نے مجھے اپنے اور طارق کے پیش آمدہ حالات سے آگاہ کیا۔ میرا انتظار کرنے کے بعد وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ میں کسی اور چکر میں آ گیا ہوں، طارق نچلا بیٹھنے والا کب تھا، اسی دوران کسی طرح انہیں حویلی کے اندر داخل ہونے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آ گیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

پتا چلا کہ اندر بانو کی آمد کے بعد اس کی ماں نفیسہ بیگم نے زبردست بپڑاں (رونا دھونا، چیخ و پکار) مچا رکھا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ گوہر شاہ نے آتے ہی بانو کو حویلی کے تہ خانے میں بند کروا دیا تھا جہاں اسی کبڑے نورے کو جو شگو کا خصم تھا، پہرے پر لگا دیا تھا۔ وہ خود کسی ضروری کام سے کہیں چلا گیا تھا اور اپنے مقرب خاص تاج......کو وہیں چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گوہر شاہ کے بعد تاج ہی اس کا ایک ایسا حواری تھا، جس کا حویلی میں گوہر شاہ کے بعد حکم چلتا تھا۔ لہٰذا ادھر جیسے ہی بدنصیب بانو کی ماں نفیسہ بیگم کو بیٹی کے بارے میں پتا چلا تو وہ اس سے تہ خانے میں ملنے کے لیے بے تاب ہو گئی، لیکن وڈے چوہدری (گوہر شاہ) نے سختی سے اس کی ممانعت کر رکھی تھی اسی لیے نفیسہ کو بھی بانو سے نہ ملنے دیا گیا۔

وہ رونے پیٹنے لگی اور اسی دوران اندر تہ خانے میں بانو کی اپنی حالت بھی غیر ہوئی جا رہی تھی، ایک تو کبڑے نورے سے وہ بری طرح خوف زدہ تھی، دوسرے اسے اپنی زندگی سے بھی مایوسی ہو چلی تھی۔ شاید اسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ اب اپنے باپ کے ہتھے چڑھ چکی ہے اور اب شاید اس کی باقی زندگی حسرتوں اور عبرت ناکیوں کا نمونہ بن جائے، اس نے دل برداشتہ ہو کر تہ خانے میں ہی خودکشی کر لی۔ نفیسہ بیگم کو جیسے ہی اپنی بیٹی کا پتا چلا، اس نے بھی غم سے چُور اور مایوس ہو کے حویلی کی چھت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ طارق نے گل بادشاہ سے صاف کہہ دیا تھا کہ پولیس اس بات کا اہتمام کرے کہ وہ تہ خانے کا بھی اچھی طرح جائزہ لے جہاں بانو کو رکھا گیا تھا۔ وغیرہ۔ اس کے بعد رومی کو میں نے بھی اپنے حالات سے مختصراً آگاہ کر دیا۔

راکھ پل پر آ کر طارق نے جیپ جامع مسجد کی طرف والی ذیلی روڈ پر موڑلی اور اس سے ذرا آگے ہی.... دو تین ہوٹل نظر آ گئے۔

طارق نے نسبتاً بہتر نظر آنے والے ہوٹل کے احاطے میں جیپ روک لی اور ہم نیچے اُتر آئے۔ مختصر سامان سنبھالے ہم ہوٹل کے اندر استقبالیہ پر پہنچے، وہاں ایک درمیانی عمر کا سانولا آدمی موجود تھا۔ ہم نے ایک بڑا کمرا لے لیا۔

ایک ویٹر ہمارے ساتھ کمرے تک آیا تھا۔ طارق نے بعد میں اسے ٹپ دے کر شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ہوٹل ٹھیک ٹھاک ہی تھا، تین بیڈ تھے اور کمرا کشادہ تھا، اس کی تین کھڑکیاں تھیں، یہاں سے ذرا ہی دور واقع مین روڈ بھی نظر آتی تھی اور عقبی سمت آباد گھروں کی گلیاں اور کچھ دکانیں، ایک چھوٹی مارکیٹ بھی نظر آتی تھی۔ جامع مسجد کے گنبد پر بھی نگاہ پڑتی تھی۔

''تم سیل فون پر گل بادشاہ سے بات کرو اور اسے اب تک کی ساری صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کرو، جلدی......اور یہ بھی پوچھ لینا کہ ہمارے لیے یہاں پولیس کیس کی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ وغیرہ۔'' طارق نے مجھ سے کہا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ان لوگوں نے گل بادشاہ سے بات کر لی تھی، لیکن اب تازہ کار حالات اور اپنی موجودگی وغیرہ کے بارے میں دوبارہ رابطہ کرنا بھی طارق نے ضروری سمجھا تھا۔

رومی نے مجھے سیل دیا اور میں ایک کرسی پر بیٹھ کر گل بادشاہ کا نمبر ملانے لگا، لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا، پتا نہیں سگنلز کا مسئلہ تھا یا کچھ اور...... طارق نے کہا تھوڑی دیر بعد رابطہ کر کے دیکھ لینا۔

رومی سامان سیٹ کرنے لگی، ہم باری باری غسل میں مصروف ہو گئے، تب تک رومی نے روم سروس فون کر کے ناشتا منگوا لیا، نیند اور تھکن کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا اور میں بستر پر یونہی دراز ہو گیا، مجھے یاد بھی نہ رہا کہ مجھے گل بادشاہ کو فون بھی کرنا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ ہم تینوں ہی بُری طرح تھکے ہوئے تھے اور پھر طارق اور رومی بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے بستروں پر دراز ہوئے تو ہماری آنکھ... لگ گئی۔

جاگے تو دوپہر سے سہ پہر کا وقت ہو چلا تھا۔ ہم گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ میں نے دوبارہ گل بادشاہ کا نمبر ملایا تو اس بار رابطہ ہو گیا۔

دوسری جانب سے گل بادشاہ کی آواز سنتے ہی میں نے...... اسے طارق کی ہدایت کے مطابق سب بتا ڈالا۔

''اوہو...... یہ بہت بُرا ہو گیا......'' دوسری جانب سے حسبِ توقع اس کی تشویش زدہ آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ وہاں پھر کیوں رُک گئے ہو، واپس چلے آؤ۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''وہ ہم دیکھ لیتے ہیں ابھی۔'' میں نے کہا۔ ''رات بھر کے تھکے ہوئے اور رت جگا کیے ہوئے تھے، اسی لیے سو گئے تھے۔ اب جاگے ہیں تو کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ آپ ایک کام کریں، ایس پی سجاد کو مطلع کر دیں، تا کہ یہاں ہمارے لیے پولیس کا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔''

''اس کی فکر نہیں کرو تم لوگ۔'' گل بادشاہ نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ایس پی صاحب نے یہاں کی پولیس سے رابطہ کر کے ایک ہی سلسلے کی کڑی کے طور پر یہاں کا کیس بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے لہٰذا تم لوگ آرام کرنے اور کوئی فیصلہ کرنے کے بعد وہاں سے نکل آؤ۔''

رابطہ منقطع کر کے میں نے فون دوبارہ رومی کو تھما دیا، اسے سنبھالنے کی ذمے داری اسی کی تھی۔ اس کے بعد ہم سر جوڑ کر اگلے لائحہ عمل کا منصوبہ طے کرنے لگے، لیکن جب تک گوہر شاہ اور پولیس کی حویلی میں بروقت کارروائی کا کوئی کھوج تیل برآمد نہیں ہو جاتا ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

''گل بادشاہ کو دوبارہ فون کرو اور اس سے پوچھو کہ پولیس نے اب تک کیا کارروائی کی ہے؟'' تھوڑی دیر بعد طارق نے مجھ سے کہا۔

میں ابھی رومی سے سیل فون دوبارہ لینے ہی والا تھا کہ اس کی بیل گنگنا اُٹھی۔ طارق نے اسے سیل فون مجھے دینے کا اشارہ کر دیا ساتھ ہی مجھے فون کا اسپیکر بھی وائڈ کرنے کا کہا۔

رومی نے فون میری جانب بڑھا دیا، اسکرین پر گل بادشاہ کا نام آرہا تھا اور نیچے اس کا سیل نمبر......

''پولیس نے کامیاب چھاپا مارا ہے۔'' دوسری جانب سے گل بادشاہ نے جیسے چھوٹتے ہی کہا۔ ''بانو اور اس کی ماں یعنی گوہر شاہ کی پہلی بیوی کی لاشوں کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے فوراً پوچھا، میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

''لیکن...... سیف! گوہر شاہ ہاتھ نہیں آیا ہے ابھی تک، ویسے پولیس اس کی تلاش میں ہے۔'' گل بادشاہ نے بتایا۔

''ذرا مجھ سے بات کراؤ۔'' طارق نے کہتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔

''جی گل بادشاہ! یہ طارق آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں نے فون طارق کی جانب بڑھا دیا۔

''پولیس اس سے رابطہ کرنا چاہتی ہے یا گرفتار......؟'' طارق نے فون لیتے ہی پوچھا۔ دوسری جانب سے فون کے وائڈ اسپیکر پر میں اور رومی بھی گل بادشاہ کی آواز بڑے غور سے سننے لگے۔

''دونوں ہی باتیں ہیں، ظاہر ہے پولیس اس کی حویلی میں ہونے والی اس واردات کے بارے میں ہی اس سے باز پُرس کرنا چاہتی ہے۔''

''ایس پی رندھاوا صاحب کا اس بارے میں کیا خیال ہے، کیا گوہر شاہ کسی قسم کے رابطے میں آئے گا؟''

''اسے آنا ہی ہوگا، دوسری صورت میں پولیس اسے اشتہاری قرار دے دے گی اور کیس اس کے خلاف اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔''

''ہم......'' طارق کے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا پھر گل بادشاہ کی دوبارہ آواز آئی۔

''ایک منٹ ذرا، یہ محترمہ ڈالی کی کال آرہی ہے، شاید کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں، میں تمہیں کال بیک کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ہم منتظر ہیں۔'' طارق نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

چند منٹوں بعد گل بادشاہ کی کال آگئی جو طارق نے ہی ریسیو کی تو گل بادشاہ نے ایک لرزہ خیز انکشاف کیا۔

''انسپکٹر شعیب کو نامعلوم افراد نے گولیوں سے چھلنی کر کے مار ڈالا ہے۔''

یہ سن کر طارق ایک لمحے کے لیے سن سا ہو کر رہ گیا، میں اور رومی فق زدہ چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

''ک...... کب کی بات ہے یہ......؟'' طارق کے منہ سے پھنسے پھنسے الفاظ برآمد ہوئے۔

''ابھی ایک گھنٹے پہلے کی خبر ہے۔'' گل بادشاہ نے بتایا۔

''یہ اسی کا کام ہے، تاکہ بانو والا معاملہ دب جائے اور وہ پولیس کو کہہ دے کہ بانو کو قانون کے کسی اہلکار نے نہیں بلکہ وہ خود دشمنوں سے جان چھڑا کے باپ کے گھر لوٹ آئی تھی، وہ اسی قسم کی کہانی اب تک بنا چکا ہوگا اور اب وہ یقینی طور پر اپنا یہ گراؤنڈ بنانے کے بعد پولیس کے رابطے میں آجائے گا۔''

طارق نے کسی تجزیہ نگار کی طرح، پیش آئند صورت حالات کے بارے میں بتادیا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس کا پیشگی یہ کہا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

اسی وقت کسی سگنلز کی خرابی کی وجہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آتا، گوہر شاہ نے اس غریب انسپکٹر شعیب کو کیوں مروا دیا؟ وہ اسے خرید بھی تو سکتا تھا؟ بلکہ خرید ہی چکا تھا۔''

''غریب؟'' طارق نے میری طرف دیکھ کر بھویں اُچکائیں۔ ''وہ اس کا پہلے ہی راتب خور بن چکا تھا، اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔''

''میری بات کا کیا جواب ہے؟'' میں نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کاندھے اُچکا کر جواب میں کہا۔

''یہ معمولی اور روایتی امر ہے، اسے مایا جال کی مجبوری بھی سمجھ لو، دولت ایک حد تک کام کرتی ہے۔ معاملہ پھر بھی بگڑتا نظر آسے یا حالات مزید خرابی کی جانب گامزن رہیں تو، پھر گوہر شاہ جیسے خطرناک مجرم ایک ذرا سا بھی رسک نہیں لے سکتے۔ ہاں! اگر وہ یہ بات سرے سے ہی کرنے سے مکر جاتا تو پھر شاید گوہر شاہ کو اسے قتل کروانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہم پر بانو کے اغوا کی منصوبہ بندی اس کے گلے پڑ گئی اور وہ جان سے مارا گیا۔''

''حالات بدستور مایوس کن سمت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ گوہر شاہ اب راہِ فرار اختیار کرے گا اور اشتہاری قرار دیا جائے گا، یوں اس کے گرد قانونی گھیرا تنگ ہوتا چلا جائے گا، مگر...... یہ بہت سفاک ہی نہیں، چالاک آدمی بھی ہے۔'' رومی نے تھکے تھکے اور مایوسانہ انداز میں تبصرہ کیا۔

''اب ہم کیا کریں؟'' میں نے طارق کی طرف دیکھا جس کا چہرہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''دیکھتے ہیں، گوہر شاہ کے رابطے کے بعد کیا ہوتا ہے؟''

''میرا مطلب تھا کہ اب ہمیں واپس حاصل پور کا رخ کرنا چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں۔'' اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے دیکھتے ہیں یہ گوہر شاہ کے رابطے والا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد ہم اپنا آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے ابھی آرام ہی کیا جائے۔'' رومی نے کہا اور ساتھ ہی ایک جماہی بھی لی، اسے دیکھ کر مجھے بھی جماہی آگئی، نفسیات کی رُو سے یہ از خود ردِعمل ہوتا ہے...... میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔

طارق ہونٹ بھینچے خاموش رہا۔ وہ ہنوز کسی گہری سوچ میں تھا اور لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ...... کوئی نیا حکم نامہ صادر کرنے والا ہو۔ رومی آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی اور میں بھی اُٹھ کر بستر پر نیم دراز سا ہو گیا۔

چند گھنٹے کچھ اسی طرح کی کشش و پنج جیسی کیفیات میں بیت گئے۔ اس کے بعد ہمارے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ (ہمارے، اس لیے کہ یہ اکلوتا سیل فون تھا اور ہم تینوں ہی اسے استعمال کررہے تھے)

ہم سب گویا بیک وقت چونک اُٹھے۔ فون طارق کے پاس تھا، اسی نے فوراً کال وصول کی، میں اور رومی بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اس کی جانب تکنے لگے۔

''ہیلو، ہاں! گل بادشاہ، کوئی نئی خبر؟'' طارق نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے اسپیکر آن کردیا تھا۔

دوسری جانب سے ہمیں گل بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ ''گوہر شاہ نے پولیس سے رابطہ کرلیا ہے اور اسے فوراً پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچنے کا کہا گیا ہے۔''

''کیا کہا جارہا ہے اس کے متعلق؟ کیا اُسے گرفتار کر لیا جائے گا؟'' طارق نے دریافت کیا۔

''ایس پی صاحب سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔'' گل بادشاہ بتا رہا تھا۔ ہمارے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

''وہ کہہ رہا تھا اگر گوہر شاہ ان کے سوالوں کے جواب تسلی بخش نہ دے پایا تو اسے گرفتار کرلیا جائے گا اور

تفتیش بھی جاری رکھی جائے گی۔‘‘
’’اور یہ انسپکٹر شعیب کے قتل کا کیا ہوگا؟‘‘ طارق نے دریافت کیا۔
’’اس کے نامعلوم قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے آئی جی صاحب نے ایک تفتیشی کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ اُمید ہے جلد ہی انسپکٹر شعیب کے قاتلوں کا سراغ مل جائے گا۔‘‘
’’اوبادشاہو! اس کا بھی قاتل ایک ہی ہے یعنی گوہر شاہ عرف شاہ جی......‘‘ طارق ہلکے سے طنز سے بولا۔’’اسی شبہے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر اس انسپکٹر کے قاتلوں کو تلاش کیا جائے تو یہی نام سامنے آئے گا، کیونکہ حالات سے صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ...... بانو کی حوالگی کا معاملہ دبایا جائے۔‘‘
’’یہ تو اب گوہر شاہ کے بیان پر منحصر ہے کہ وہ بانو کے سلسلے میں پولیس کو کیا بتاتا ہے؟‘‘
’’وہ یہی بتائے گا کہ انسپکٹر شعیب نے اسے میرے حوالے کیا ہی کب تھا؟ اور سچ بتانے کے لیے شعیب زندہ نہیں رہا اب......‘‘
طارق کی آخری بات پر دوسری جانب سے گل بادشاہ کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ طارق اسی جوش سے آگے بولا۔’’ایس پی صاحب سے اس اہم موضوع پر ڈسکس کر لینا ضروری ہے۔ ان سے یہ بھی پوچھنا ہوگا کہ اگر گوہر شاہ بیٹی کی حوالگی کے سلسلے میں جھوٹا بیان دیتا ہے تو پھر میرے دونوں ساتھیوں سیف اور رومانہ کے بیانات کی اس تناظر میں کیا حیثیت واہمیت ہوگی۔ کیونکہ شعیب نے ہی ان سے بانو کو چھین کر اس کے باپ کے حوالے کیا تھا۔‘‘
’’بہتر ہوتا کہ تم لوگ یہاں آجاتے، میں ویسے محترمہ ڈالی کے ہاں جا کر ان کی وساطت سے ایس پی صاحب سے ملتا ہوں اور ان سے یہ ساری بات کروں گا۔‘‘ گل بادشاہ نے کہا۔
’’ہم بھی آجائیں گے، لیکن سب سے پہلے آپ فوراً سے پیشتر یہ ساری باتیں انہیں دوبارہ بتادیں...... کیونکہ انہیں یہ سب پہلے ہی سے معلوم تو تھا مگر اب حالات اور صورت اختیار کیے ہوئے ہیں اور...... دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب یہاں گوہر شاہ کی آبائی حویلی میں پولیس کا چھاپا اور یہ سب کچھ ہوا تو ہم اندر ہی تھے، یہ انہیں ضرور بتادینا تاکہ انہیں بھی اندازہ ہو جائے کہ ہمارے بیانات کی کیا قانونی حیثیت ہو سکتی ہے۔ بہرحال......‘‘ طارق نے انکشاف کے بعد گفتگو کو سمیٹتے ہوئے سنجیدگی سے مزید کہا۔
’’مجھے بعد میں اس میٹنگ کی رپورٹ اور نتیجے سے آگاہ کرو، میں منتظر رہوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر طارق نے رابطہ منقطع کر دیا۔
’’میرا خیال ہے کہ ہم ہی ایس پی صاحب کو صحیح طریقے سے اپنا مافی الضمیر سمجھا اور بتا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ میرا اشارہ، اپنی اور رومی کی طرف تھا۔
’’اب یہاں رہنے کا کیا فائدہ ہے؟ ہمیں حاصل پور لوٹ جانا چاہیے۔‘‘ رومی نے گرہ لگائی اور طارق کی جانب بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔
’’ابھی نہیں۔‘‘ طارق نے بدستور نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔’’جب تک ہمیں یہ اطلاع نہیں مل جاتی کہ گوہر شاہ...... پولیس وغیرہ کے رابطے میں آیا ہے یا نہیں، میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں......‘‘
’’پھر ضرور اس میں تمہاری کوئی منطق ہوگی۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر اعتراف کیا۔ رومی بھی اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بولی۔
’’ٹھیک ہے، انتظار کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔‘‘
☆☆☆
ہمیں اسی ہوٹل میں رات ہو گئی۔ ہم تینوں گل بادشاہ کے فون کا انتظار کرتے رہے۔
مجھے اور رومی کو زیادہ ہی بے چینی تھی، میں نے گل بادشاہ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا تو طارق نے روک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ گل بادشاہ ابھی تک اسی تگ و دو میں ہوگا، میٹنگ ہو جانے کے بعد وہ خود ہی ہم سے رابطہ کرلے گا، اس لیے بلاوجہ ابھی اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔
طارق کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ساتھ رہتے ہوئے بھی بڑا گھنا بنتا تھا۔ اس کے دل میں کیا ہوتا تھا، اس کا وہ ہمیں صرف پچاس فیصدی آگاہ کیا کرتا تھا اور باقی اپنے تک ہی محدود کر رکھتا تھا، میں یہ نہیں کہتا...... کہ اس میں اس کی کوئی بدنیتی کا دخل تھا۔ وہ ایسا اپنی کسی حکمت عملی اور مصلحت کے تحت کرتا ہو، لیکن بہرحال مجھے اور رومی کو اس کا یہ پُراسرار انداز پسند نہیں تھا جس کا ہم چند ایک بار اس سے اظہار بھی کر چکے تھے، جس پر وہ محض مسکرا کر رہ جاتا اور ہم دونوں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔
کمرے کا وال کلاک اب رات کے بارہ بجا رہا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ رومی کا بھی یہی حال تھا، البتہ طارق زبردستی جاگنے کی کوشش میں، گاہے بگاہے کمرے میں ٹہل لیتا تھا اور پھر کرسی پر براجمان ہو جاتا۔ گل بادشاہ کا فون

ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رومی بھی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی، مگر اب وہ بیڈ پر آ کر نیم درازسی ہو گئی تھی اور اس کی آنکھیں موندنے لگتیں تو اسے جھٹکا لگتا اور وہ آنکھیں کھول لیتی۔

میں بیڈ پر ہی بیٹھا تھا اور تکیے کا سہارا لیے ہوئے نیم دراز تھا اور اسی طرح نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جاگا، تو صبح ہو چکی تھی۔ رومی بیڈ پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔

طارق بے چارہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ سیل فون اس کی گود میں پڑا ہوا تھا۔ میں طارق کی اس قربانی پر بے اختیار ہو کر رہ گیا۔ یہ مشن کس کا تھا؟ کس کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا؟ میرے لیے...... طارق اور رومی کا عزم اپنی جگہ، لیکن...... میں نے تو اپنے معصوم اور بے گناہ بھائی عادل کی قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ اس کے سفاک درندہ صفت قاتلوں کو میں بھیانک انجام سے دوچار کروں گا اور میں اب تک اسی میں مصروف بھی تھا۔ لیکن طارق اور رومی تو مجھ سے پہلے ہی ان خونی سوداگروں کی بھنک پا کر ان کی بیخ کنی کے لیے پورے تن، من، دھن کے ساتھ عمل پیرا ہو چکے تھے اور دیکھا جاتا تو اب تک میں نے ان خونی سوداگروں کے ایک بڑے ڈان...... گوہر شاہ کو ناکوں چنے چبوا رکھے تھے تو اس میں بھی انہی دونوں کی مدد اور ساتھ کا دخل تھا۔

صبح کے دس بج چکے تھے۔ میں دل ہی دل میں ان دونوں کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوا بیڈ سے اُترا اور آگے بڑھ کر طارق کی گود سے فون اُٹھا لیا۔ اسے دیکھا، ابھی تک کوئی کال نہیں آئی،...... تھی، اس کے بعد میں باتھ روم میں گھس گیا۔

غسل وغیرہ کر کے نکلا تو ان دونوں کو ہنوز اسی حالت میں پایا۔ میں نے انہیں باری باری جگا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں روم سروس سے ناشتا منگوا رہا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم نے آخری کپ چائے کے تھامے تو میں نے کہا۔

''کیا بات ہے؟ ابھی تک گل بادشاہ کا فون نہیں آیا؟ پتا نہیں، کل اس کی میٹنگ ایس پی صاحب سے ہوئی کہ نہیں؟''

''اب تم رابطہ کرو اس سے...... سیف!'' طارق نے مجھ سے کہا۔ میں نے گل بادشاہ کے سیل کا نمبر ملایا۔ نجانے کیوں میرا دل عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

رابطہ ہوتے ہی اور دوسری جانب سے گل بادشاہ کی آواز سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ وجہ یہی تھی کہ انسپکٹر شعیب کے قتل کے بعد میرے دل کو ایک نامعلوم سے خدشے نے گھیرے رکھا تھا۔ گوہر شاہ اس وقت زخمی ہی نہیں بلکہ ایک زہریلا سانپ کی مثل بن چکا تھا۔ اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے وہ ہر طرح کا ہتھکنڈا استعمال کرنے پر تُلا بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا گل بادشاہ؟ تم نے فون ہی نہیں کیا اور ہم رات بھر تمہاری کال کا انتظار ہی کرتے رہ گئے، خیریت تو ہے نا......؟'' میں نے اس سے کہا۔ ساتھ ہی میں فون کا اسپیکر...... آن کر چکا تھا۔ طارق اور رومی بغیر آنکھیں جھپکائے میری جانب تکے جا رہے تھے۔ جانتا تھا میں کہ انہیں بھی گل بادشاہ کی طرف سے ہونے والی گفتگو سننے کا کس قدر تجسس تھا۔

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد دوسری جانب سے گل بادشاہ کے کھنکھارنے کی آواز اُبھری اور پھر بولا۔

''مجھے اور محترمہ ڈالی کو ایس پی رندھاوا صاحب کے ہاں کافی رات ہو گئی تھی۔ ہم رات دو بجے تک وہیں تھے، پھر واپس لوٹے تو محترمہ ڈالی نے اتنی رات گئے مجھے جانے نہیں دیا اور یوں اب بھی میں اِدھر ہی ہوں، بس نکلنے والا ہی تھا۔'' ایک لمحہ متوقف ہونے کے بعد دوبارہ بولا۔

''رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے میں کال نہ کر سکا اور کوئی ایسی ضروری بات بھی نہ تھی، سوچا، تم لوگ بھی سو چکے ہو گے، صبح ہوتے ہی آرام سے بات کر لی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے، کیا کہا اُنہوں نے......؟'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے رندھاوا صاحب نے؟''

''وہ تو یہی کہہ رہے ہیں کہ تم تینوں کو واپس لوٹ آنا چاہیے اور...... ایسے حالات میں پولیس کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے...... تم تینوں کی حاضل پور موجودگی زیادہ بہتر ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم آپس میں صلح مشورہ کرنے کے بعد آپ کو بتاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''تم دونوں فوراً سے پیشتر چلے جاؤ۔'' طارق نے رومی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بہ یک ٹُرنت کہا۔

''کیا مطلب؟'' رومی نے چونک کے اس کی جانب اُلجھی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟''

''ابھی نہیں......'' طارق نے کہا اور خالی کپ میز پر

رکھنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ میں اور رومی ابھی تک میز پر ہی تھے۔

"ویسے بھی میری وہاں اتنی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی مناسب وقت دیکھ کر جلد حاصل پور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی یار...... ! سسپنس کیوں پیدا کرتے ہو؟" میں نے کہا۔ "آخر تم اب یہاں رہ کر کرو گے کیا؟"

"جھک ماروں گا" وہ جھلا کر بولا۔ "یار تم اور رومی خوامخواہ ہی ہر بات پر جرح کرنے لگ جاتے ہو۔" رومی ہولے سے مسکرا دی۔ میں نے منہ سا بنایا۔ طارق سر جھٹک کر کچھ سوچنے میں مستغرق ہو گیا۔

دن کے بارہ بج گئے۔ میں اور رومی روانہ ہو گئے۔ طارق ہوٹل میں ہی رہا۔

جیپ کا اسٹیئرنگ میں نے سنبھالا ہوا تھا اور رومی میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اکلوتا سیل فون ہم نے طارق ہی کے کہنے پر اسے "سونپ" دیا تھا تاکہ اس کی خیریت سے ہمیں آگاہی رہے۔ وہ کم از کم گل بادشاہ کے نمبر پر کال کر ہی سکتا تھا۔

"طارق کی طبیعت بڑی عجیب سی ہوتی جا رہی ہے، یا پھر مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ تم کیا کہتی ہو رومی؟ تم تو خاصے عرصے سے اس کے ساتھ ہو؟" میں نے اس کی جانب ایک نظر دیکھا اور سامنے ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر دوبارہ نظریں جما دیں۔

"وہ شروع ہی سے ایسا ہے۔" رومی نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ میں اس وقت عارف والا روڈ سے ایک بڑے کریانہ اسٹور کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہاں خاصا رش تھا۔ اس کے بعد رش کم ہوتے ہی میں نے جیپ کی رفتار بتدریج بڑھا دی۔

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی اس کے ذہن میں کچھ پل رہا ہے، لیکن وہ بتا نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"مثلاً؟" رومی نے مختصراً سوالیہ کہا۔

"یہی کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں دوبارہ حویلی جانے کا قصد رکھتا ہے۔"

"اس کا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔" رومی بولی۔ "اس وقت بھی وہ وہیں چھپ کے رہنا اور ہم دونوں کو واپس بھیج دینے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، لیکن مجبوراً اسے بھی ہمارے ساتھ ہوٹل آنا پڑا تھا۔"

"پھر بھی یار! اسے ہمیں تو آگاہی میں رکھنا چاہیے۔" میں منہ بنا کر بولا۔

"جب وہ اس کی خاص ضرورت سمجھے گا تب بتا دے گا۔" رومی کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا۔

"بھاڑ میں جائے۔" میں جھلا گیا۔ رومی ہنس دی۔

"ارے...... ! یہ تم طارق سے کیوں بغض رکھنے لگ گئے ہو اچانک؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے ایسا آدمی یا ساتھی پسند نہیں، جو ہر معاملے میں ساتھ رہتے ہوئے کچھ باتیں اپنے تک ہی محدود رکھتا ہو۔" میں نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا اور ایک یونہی ذرا گردن موڑ کر رومی کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تو تم بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی لگتی ہو۔" میرے دل کی بھڑاس ابھی کم نہیں ہوئی تھی اور میں نے اسے بھی طارق کے ساتھ رگید ڈالا۔

"اچھا!" وہ طنزاً بولی۔

"ہاں! سوری تو سے...... میرے اندر منافقت نہیں ہے، جو میرے دل میں تھا وہی زبان پر لے آیا۔ اب تم کچھ بھی سمجھو۔"

"لگتا ہے، حمیرا کی دیار غیر روانگی نے تمہیں تلخ بنا دیا ہے۔" رومی نے گردن موڑ کر میری جانب دیکھا۔

"یہ حمیرا درمیان میں کہاں سے آ گئی؟" میں نے ایک لمحہ اسے گھورا۔

"یہ حقیقت ہے...... مائی ڈیئر سیف! جب انسان کی دل پسند شے نہ چاہتے ہوئے بھی دور ہو جائے تو لاشعوری طور پر انسان کو وہ تلخ سا بنا دیتی ہے اور وہ اپنوں سے بھی چڑ جایا کرتا ہے کبھی کبھی۔" رومی فلسفیانہ لہجے میں بولی۔

مجھے ایک جھٹکا لگا، میری عادت ہے کہ میں اپنا محاسبہ ضرور کرتا ہوں، خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے اڑا نہیں رہتا، اسی لیے مجھے اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی محسوس نہیں ہوئی تھی، ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے علم نفسیات سے بھی زیادہ نہیں تو بنیادی آگاہی ضرور تھی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں نے میڈیکل کے دیگر اسٹوڈنٹس کی طرح صرف دو ہی شعبوں میں ہاؤس جاب نہیں کی تھی، کیونکہ عموماً ہوتا ایسا ہی ہے کہ ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد، چھ ماہ میڈیسن اور چھ ماہ سرجری میں ہاؤس جاب کی جاتی ہے، یا کسی اور ایسے شعبے میں جس میں آئندہ مہارت کے لیے ہائر اسٹڈی کی جاتی

ہو، لیکن میں نے مزید نالج گین کرنے کے لیے تین تین ماہ کا ہاؤس جاب چار مختلف شعبوں میں کیا تھا، ان میں سرجری اور میڈیسن کے علاوہ شعبۂ نفسیات اور پلاسٹک سرجری بھی شامل تھا۔

المختصر...... حمیرا سے مجھے محبت تھی بلکہ ہے۔ وہ جن حالات میں اور اچانک مجھ سے دور ہوگئی تھی، میرے دل و دماغ نے اسے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ ساری عمر تو میں نے پڑھائی میں کھپا دی تھی، ایک محبت کرنے والی دل پسند لڑکی ملی تھی تو وہ بھی دور چلی گئی تھی۔ حمیرا تھی ہی ایسی لڑکی کہ کوئی بھی اسے حاصل کرنے کے خواب دیکھ سکتا تھا اور جسے مل جاتی وہ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا۔ مجھ سے تو مل کر وہ دور ہوگئی تھی، یہ اس سے بھی زیادہ اذیت ناک صورتِ حال تھی۔

میں خاموش ہوگیا۔ حمیرا کے ذکر سے میرا دل گھٹ کر رہ گیا تھا۔ جس سے محبت ہو اس کی جدائی سہنے والا اپنے اندر ایک خلا ہی محسوس کرتا ہے اور خود اس میں ڈوب جاتا ہے، میں نے بھی یہی کیا تو رومی ندامت سے معذرت کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''سوری! میں نے تمہاری دکھتی رگ چھیڑ دی۔''

میں تب بھی خاموش ہی رہا۔ میرے دونوں ہاتھ میکانیکی انداز میں اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور سپاٹ سی نظریں ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر مرکوز رہیں۔

''ویسے حمیرا نے باہر جانے کا اچانک ہی فیصلہ کرلیا تھا، اُسے سوچنا تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے ایک پیار کرنے والے......کو اکیلا......''

''پلیز، رومی!'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹ کر اسے ٹوک دیا۔ ''خاموش رہو۔''

میری آواز اور لہجہ تلخ تھا۔ رومی ایک دم چُپ ہوگئی، یوں باقی سفر خاموشی میں بیت گیا اور ہم حاصل پور پہنچ گئے۔ اسی تلخی کی وجہ سے ہم نے راستے میں کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔

گل بادشاہ ہمارا ہی منتظر تھا۔ اس نے طارق کے بارے میں استفسار بھی کیا اور میں نے اسے بتادیا کہ وہ ابھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ نیز میں نے وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے عندیہ بھی دیا کہ وہ اب ہماری ایس پی رندھاوا سے جلد ملاقات کروادے وغیرہ۔ لہٰذا اس نے فوراً ان سے ٹیلی فونک رابطہ کیا اور ان کے پاس ہمیں لے کر جا پہنچا۔

رومی اور میں نے اسے وہ سب تفصیل کے ساتھ بتا دیا جو حالات ہم پر پاک پتن میں بیتے تھے، بالخصوص حویلی والے دُہرے سانحے کے بارے میں جس میں بانو اور اس کی ماں نے مبینہ طور پر خودکشی کی تھی۔ نیز مقتول انسپکٹر شعیب کے بارے میں بھی جب اس نے بانو کو ہماری دسترس سے چھین کر اس کے باپ گوہر شاہ کے حوالے کردیا تھا۔ باقی اس سے پہلے کے حالات توفیق وغیرہ کا مرڈر، اس کے علم میں تھا ہی۔ دیکھنا یہ تھا کہ اب ان ساری باتوں اور حالات کے تناظر میں گوہر شاہ کے خلاف کس قسم کی کارروائی عمل میں لاتا ہے؟ لہٰذا سب سے آخر میں، میں نے ایس پی سے پوچھا۔

''اب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ گوہر شاہ کے خلاف آپ قانونی کارروائی کی کسی واضح پوزیشن میں ہیں؟''

ہم اس وقت انہی کی رہائش گاہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ گل بادشاہ ساتھ تھا۔ درمیان میں گلاس ٹاپ کی میز پر چائے کے نفیس برتن دھرے تھے۔

میں نے اپنے سوال کے جواب میں ایس پی صاحب کے سوچتے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ ابھی انہیں ایسے سوال کی کوئی توقع نہ تھی یا وہ اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

''فی الحال تو نہیں۔'' بالآخر انہوں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے مبہم سے لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی ان کی حویلی اور وہاں کے لوگوں سے تفتیش باقی ہے۔''

''گوہر شاہ سے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا؟ جبکہ اس نے تو کہا تھا کہ وہ جلد پولیس سے اپنے جسمانی رابطے کو ممکن بنائے گا؟'' رومی نے بھی اسی سلسلے میں سوال پوچھا۔

''اس کا براہِ راست مجھ سے تو نہیں البتہ متعلقہ تھانے کے انچارج سے رابطہ ہوا تھا، اسی نے ہی مجھے آگاہ کیا تھا۔'' ایس پی نے جواب میں کہا۔ ''تاہم تھانہ انچارج کہیل سے میں نے کہہ دیا ہے کہ گوہر شاہ سے میرا ہی رابطہ کروایا جائے۔''

مجھے لگا جیسے ایس پی ٹالنے کے چکروں میں ہے، لیکن گل بادشاہ کے بیٹے کا بھی وہ قاتل تھا اسی لیے وہ بے چین ہو کر بولا۔

''لیکن ایس پی صاحب! اسے تو فوراً گرفتاری کے احکامات جاری کردینے چاہئیں آپ کو۔''

اس کی بات پر ایس پی نے گل بادشاہ کو گمبھیر سی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

''کسی بھی بڑے مجرم پر ایسا ہاتھ ڈالنا چاہیے کہ پھر

اسے اپنی جان چھڑانے کا کوئی موقع نہ مل سکے...... میں پوری تفتیش کرنے کے بعد ہی اس پر ہاتھ ڈالوں گا، ابھی فی الحال اسے رابطے میں آلینے دو۔ میں اس کے خلاف گھیرا بتدریج تنگ کرتا جاؤں گا۔''

اس کی بات پر میں نے گل بادشاہ کی طرف دیکھا تھا، وہ ایس پی کی باتوں سے کچھ مطمئن نظر آرہا تھا، لیکن میرا معاملہ اور تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں ایس پی کی نیت پر شک کر رہا تھا، ممکن تھا کہ بعض قانونی موشگافیوں اور پیچیدگیوں کے سبب وہ بھی ابھی مجبور ہوں۔ بجز اس کے میرا اپنا ذاتی خیال یہی تھا کہ گوہر شاہ جیسے...... سانپ کو موقع نہیں دینا چاہیے تھا، جبکہ اس کا دستِ راست جبار ماہی بھی پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔

گوہر شاہ کے خلاف چارج شیٹ بننے میں کتنی دیر لگنا تھی، لیکن میں سمجھتا تھا کہ گوہر پولیس سے رابطہ کرنے تک کسی ماہر وکیل سے اپنی بریت کا بندوبست بھی کروا چکا ہوگا۔

میرا اب مزید وہاں ٹھہرنے کو دل نہیں کیا اور اٹھنے کی اجازت چاہی۔ جاتے سمے ایس پی صاحب نے گل بادشاہ اور مجھے ایک بار پھر تسلی اور پُرامید رہنے کی تلقین کی، جب ہم ان کی رہائش گاہ سے نکلنے لگے تو میرا اندر شکست وریخت کی کیفیات کا شکار تھا۔ سارے راستے میں خاموش رہا۔ گل بادشاہ کی رہائش گاہ پہنچ کر بھی مجھے ایک چپ سی لگی رہی۔

میں آرام کرنے کے بہانے اپنے کمرے میں آگیا۔ شام ہوچکی تھی۔ طارق نے ابھی تک فون پر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ روحی بھی بستر پر نیم دراز سی تھی۔ اس نے مجھ سے حمیرا والی بات پر سوری کرلیا تھا اور میں نے بھی درگزر سے کام لیا تھا۔ اس وقت روحی اور طارق کا ساتھ بھی غنیمت ہی تھا۔ ورنہ میں کیا تھا؟ اور کیا کرسکتا تھا، یہ مجھے پتا تھا۔ لیکن طارق کا یہ عمل مجھے اب چڑانے لگا تھا۔

رات آٹھ بجے اس نے گل بادشاہ کے فون پر رابطہ کیا اور اس سے کوئی بات نہ کی، اس کا ملازم ہمیں فون دے گیا۔ فون میں نے لیا تھا۔ روحی بھی بستر پر اُٹھ بیٹھی تھی۔

''ہیلو، ہاں، طارق! بولو، میں سیف بات کر رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''کیا ہوا؟ تم لوگ آج ایس پی صاحب سے ملے؟'' دوسری جانب سے طارق نے سوال کیا تو میں نے اسے سب بتا دیا۔ چند ثانیے دوسری جانب پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی پھر اس کی ایک گہری ہمکاری بھرنے کی آواز اُبھری اور وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''مجھے پہلے ہی اسی بات کا اندازہ تھا۔''

''تمہیں ہر بات کا پہلے سے ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے مگر تم کچھ بتاتے ہی نہیں ہو......'' میں جیسے اس پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ میری ترش روئی کو بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا اور بولا۔

''کیا بات ہے یار! بڑے تلخ ہو رہے ہو؟''

''تو اور کیا کروں؟ اتنی جھک ماری کی ہم نے مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ ہو وہی کچھ رہا ہے، جو گوہر شاہ کے حق میں جاتا ہے۔ ہم تو بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے ہیں۔ اس پر تم بھی خوامخواہ ہی پُراسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' میں لحہ بھر کو رکا تو طارق نے کہا۔

''نکالتے رہے ہو اپنا غبار...... جب تمہارے دماغ سے دھواں نکل جائے گا... تب ہی تم میری بات سمجھ پاؤ گے۔''

''مجھے کوئی بات سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے یار! میں اب واپس لاہور جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''لاہور اب جا کر کیا کرو گے؟ حمیرا تو جا چکی بیرونِ ملک......'' طارق بولا اور میرا پارا پھر آسمان کو چھونے لگا۔

''حمیرا...... حمیرا...... ! یار! تم نے اور روحی نے تو اسے میری چڑ بنالیا ہے۔'' میں تقریباً چلا کر بولا۔ ''تم دونوں کیا سمجھتے ہو کہ اس کے چلے جانے سے میں مایوس اور چڑچڑا ہوگیا ہوں؟ ہرگز نہیں...... مجھے تو اس کا اندازہ پہلے ہی سے تھا کہ میرے اور حمیرا کے راستے شاید جدا ہیں اور میں خود بھی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ یہاں نہ رہے، جب تک میں اپنے بھائی عادل کے قاتلوں کو ان کے انجام تک نہ پہنچادوں۔ لیکن تم اور روحی...... ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے ہو۔''

''کیا روحی نے بھی یہی کچھ کہا تھا؟'' طارق نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''ہاں! اس نے بھی میرا موڈ خراب کردیا تھا۔'' اسے جواب دیتے ہوئے میں نے روحی کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

''اس سے پوچھو کہ وہ کب آئے گا؟ اور وہاں کیا کر رہا ہے؟'' روحی نے درمیان میں مجھے ٹوک دیا۔ وہ بھی شاید حمیرا کے موضوع کو طرح دینا چاہتی تھی۔

''لو تم خود ہی بات کرلو۔'' کہتے ہوئے میں نے سیل فون اس کی جانب بڑھا دیا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

میں اپنے کمرے میں کاؤچ پر لیٹا ہوا فٹ بال کا میچ دیکھ رہا تھا کہ میرے لینڈ لائن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گو کہ میرے پاس موبائل فون بھی ہے لیکن میں قدیم ٹیکنالوجی کو قابل بھروسا سمجھتا ہوں۔

"یس۔" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"سراغ رساں بوٹ رائٹ۔" دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

"کوپر، یہ تم ہو؟ اس وقت فون کرنے کی ضرورت کیوں

خودنمائی

تنویر ریاض

سکون، زندگی کی ضرورت ہے... اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں... محض وقتی سکون کے لیے دائمی اطمینان کو قربان کرنا عقل مندی نہیں... ایسے ہی بے حال شخص کی حماقت... لمحاتی کیف وسُرور کی خواہش نے اس کا سکون برباد کردیا تھا...

پیش آئی؟ اور تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''میرے پاس تمہارے سارے نمبر ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ، میری بات سن لو۔ یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔''

اب میرا متوجہ ہونا فطری تھا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''کوس گریو فارمز وائنری، ہمیں یہاں ایک لاش ملی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے کام نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک چیف مولکے کا فون نہیں آتا اور وہ مجھے چھٹی کے دن کام کرنے پر مجبور نہیں کرتا، میں فٹ بال کا میچ دیکھتا رہوں گا۔''

''میں نے چیف سے بات کر لی ہے اور خاص طور پر کہا ہے کہ یہ کیس تمہیں دیا جائے۔''

''اسکائی بیگز اسے دیکھ سکتا ہے۔ اگر ضروری ہوا تو میں کل صبح اس کی مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔ فی الحال تو یہ میچ دلچسپ مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔''

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ ''چیف کا فون ہو گا۔'' کوپر نے کہا۔

''تم پھر جاسوسی کرنے لگے؟''

''نہیں، میں نے تمہارے سیل فون کی گھنٹی سنی تھی۔ تم سے جلد ملاقات ہو گی۔ میں ایک بار پھر تمہارے ساتھ کام کرنے کا منتظر ہوں۔''

میں نے ریسیور رکھ کر سیل فون اٹھایا۔ ''یس چیف، کوپر نے تمہیں کوس گریو فارمز میں ملنے والی لاش کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں ویک اینڈ پر بلانا پڑ رہا ہے۔'' چیف نے کہا۔

''کیا یہ کوپر کی خواہش ہے؟'' میں نے کہا۔

''بالکل نہیں، میسن کوس گریو چاہتا ہے کہ تم اس کیس کو دیکھو۔ سراغ رساں بیگز وہاں کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور میڈیکل آفیسر کے دفتر سے بھی کوئی وہاں موجود ہو گا۔ میں آج کی چھٹی کے بدلے اگلے ہفتے تمہیں تین چھٹیاں دے دوں گا۔''

''کم از کم چار ہونی چاہئیں۔ تم جانتے ہو کہ کوپر کے ساتھ کام کرنا کتنا مشکل ہے۔''

''اس کے ساتھ نرم رویہ رکھنا۔ کوس گریو اس پر بہت بھروسا کرتا ہے۔ ہم اس جیسے شخص کو ناراض نہیں کر سکتے۔ کوپر کی بے تکی حرکتوں کی وجہ سے ہجوم کی توجہ تمہارے کام سے ہٹ جائے گی۔''

''کیسا ہجوم؟''

''جس وقت لاش دریافت ہوئی تو وہاں ایک امدادی پروگرام ہو رہا تھا۔ پولیس والوں نے تمام لوگوں کو پوچھ گچھ کے لیے روک رکھا ہے اور ہاں ڈھنگ کا لباس پہن کر جانا۔ وہاں کوس گریو کے علاوہ اور بھی شخصیات ہوں گی۔ تمہاری ٹائی پر کوئی دھبا نہیں ہونا چاہیے۔''

چیف کے کہنے پر مجھے اپنے بہترین سوٹ کے ساتھ ٹائی لگانا پڑی۔ خوش قسمتی سے میں نے کچھ دیر پہلے ہی اپنے جوتوں پر پالش کی تھی۔ اس لیے بالکل ہی گنوار نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے پارکنگ لاٹ پر متعین باوردی پولیس والوں کو اپنا کارڈ دکھایا اور وکٹورین طرز کی اس عمارت کی طرف بڑھ گیا جس میں فیکٹری کا ہیڈ کوارٹر اور سوشل کلب تھا۔ مورگن پولیس کا جونیئر سراغ رساں فرنٹ پورچ پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں پہلے بھی اس شراب بنانے والی فیکٹری کا دورہ کر چکا تھا اور اس کے بار میں بیٹھ کر میں نے مفت میں وائن کے چند گلاس پیے تھے۔ میں جب بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا تو یوں لگا جیسے انیسویں صدی کے کسی قدیم مکان میں آ گیا ہوں۔ میسن کوس گریو کو تاریخی ورثہ اور قدیم طرز رہائش سے دلچسپی تھی۔ اس لیے اس عمارت کو بھی قدیم رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ پورے گھر میں روشنی کے لیے جابجا گیس لائٹ نصب کی گئی تھیں۔ وال پیپر، فرنیچر وغیرہ سب قدیم دور کی یاد دلاتے تھے۔ سارے بڑے کمروں میں آتش دان بنائے گئے تھے۔ البتہ اس عمارت میں جدید دور کی نشانی صرف مرکزی ائرکنڈیشننگ سسٹم تھا جو کہ نارتھ کیرولینا کے گرم موسم میں ایک عیاشی نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

موسم گرما ابھی دور تھا لیکن کرسمس میں صرف تین ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ اسی مناسبت سے گھر کو پھولوں اور روشنیوں سے سجایا جا رہا تھا۔ ایک آٹھ فٹ اونچا کرسمس ٹری، روشن کمرے میں ایستادہ تھا جس میں ہزاروں قمقمے اور جھلملاتی پنیاں لہرا رہی تھیں۔ ہم بار میں پہنچے تو وہ خالی تھا۔

''میں نے سنا تھا کہ وہاں ایک ہجوم ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سب لوگ کہاں ہیں؟''

''باہر لان میں ایک بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا ہے۔'' اسکائی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہیں پر پارٹی اور

نیلام ہو رہا ہے۔ اس نیلام سے حاصل ہونے والی آمدنی مورگن میں بچوں کے اسپتال کی تعمیر میں خرچ ہوگی۔ ہیرالڈ نامی ایک مہمان شراب بنانے کی فیکٹری دیکھنا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ کوس گریو کا پرسنل اسسٹنٹ ہوورڈ فرک اسے فیکٹری دکھانے لے گیا۔ جب وہ اس ایریا میں پہنچے جہاں شراب کی پرانی بوتلیں الماریوں میں رکھی جاتی ہیں۔ اسے امیجنگ والٹ کہا جاتا ہے تو وہاں انہیں فرش پر ایک عورت لیٹی ہوئی نظر آئی۔ ہیرالڈ خود بھی ایک سرجن ہے اور پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے اس نے فوراً ہی یقین کرلیا کہ عورت مر چکی ہے۔''

اسی وقت کوپر دو آدمیوں کے ساتھ وہاں آیا۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ میسن کوس گریو تھا۔ کوپر نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''سراغ رساں بوٹ رائٹ، بالآخر تم آ ہی گئے۔ آؤ، میں تمہارا تعارف کرواؤں۔ مسٹر میسن کوس گریو۔ یہ مورگن پولیس کا سراغ رساں ایموئے بوٹ رائٹ ہے۔ اس کے دوست اسے پیار سے بوائے کہتے ہیں۔''

میں نے کوس گریو سے ہاتھ ملایا۔ اس کی عمر ستر کے قریب تھی۔ لمبا قد، دبلا پتلا، سفید بال اور بھینگی آنکھیں۔ اس نے کہا۔ ''کوپر نے تمہاری مہارت کی بہت تعریف کی ہے۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں نے تمہیں چھٹی کے روز بلا لیا۔ میرے اسسٹنٹ ہوورڈ فرک نے یہ لاش دیکھی تھی۔''

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ لاش امیجنگ والٹ میں پڑی ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں پہلے فیکٹری آچکا ہوں لیکن مجھے یاد نہیں آرہا کہ وہاں کیسے جایا جائے۔ مسٹر فرک! کیا تم مجھے وہاں لے جاسکتے ہو؟''

''کیا میں بھی ساتھ چلوں؟'' کوپر نے کہا۔

''یہ اچھا رہے گا۔'' کوس گریو بولا۔ ''کوپر روحانی علوم کا ماہر ہے۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ یا محسوس کرسکتا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

امیجنگ والٹ ایک پہاڑی کے کنارے اندر کی جانب کھدائی کرکے بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں گرینائٹ اور ٹائلوں کی تھیں۔ اس کی چھت پندرہ فٹ اونچی تھی۔ اس کی دیواروں کے ساتھ لکڑی کے ڈرم ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے اور اس کے اختتام پر ایک عورت کی لاش کنکریٹ کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک میڈیکل ایگزامنر سفید لیب کوٹ پہنے اس پر جھکا ہوا تھا اور دوسرا لاش کے ایک طرف کھڑا ہوا تصویریں لے رہا تھا۔ کوپر نے حیرت انگیز طور پر لاش کو نظرانداز کردیا۔ اس کے بجائے وہ ٹہلتا ہوا شراب کے ڈرم دیکھتے چلا گیا۔

''کیا تمہیں اس کی کوئی شناخت معلوم ہوسکی؟'' میں نے اسکائی سے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تصویریں لینے کے بعد میں نے اس کے کچھ فنگر پرنٹس لیے تھے۔ انہیں شناخت کے لیے بھیجا جارہا ہے۔ شاید اس سے کچھ معلوم ہوسکے۔ اس کے پاس ایسا کوئی کاغذ نہیں تھا جس سے اس کی شناخت ہوسکے اور نہ ہی کوئی پرس۔ اس کے باوجود یہ نہیں لگتا کہ اسے لوٹا گیا ہو۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اسے پہچانتے ہو مسٹر کوس گریو؟ کیا یہ بھی تمہاری پارٹی کے مہمانوں میں تھی؟''

''میں پہلے ہی چیک کرچکا ہوں۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پارٹی میں نہیں آئی تھی۔ ہماری پارٹیوں میں ہمیشہ مقررہ تعداد سے زیادہ مہمان ہوتے ہیں۔''

''یہاں کوئی سیکیورٹی کیمرا ہے؟''

''بہت ہیں۔'' فرک نے کہا۔

''یہاں امیجنگ والٹ میں بھی ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں؟''

''ہم نے یہاں بھی سیکیورٹی کیمرے نصب کیے تھے۔'' فرک نے کہا۔ ''لیکن شاید وہ زیادہ مددگار نہ ہوں۔ یہاں کے درجۂ حرارت اور رطوبت کی وجہ سے ان کے لینس دھندلا جاتے ہیں۔ ہم نے اس کے لیے کئی ترکیبیں آزمائیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔''

''اسکائی۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کیمرے کی فوٹیج دیکھنا۔ شاید یہ عورت کسی فریم میں نظر آجائے۔''

میڈیکل ایگزامنر بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس نے اسکائی اور مجھ سے بات کرنا چاہی۔ ہم اس جگہ سے کئی گز دور چلے گئے۔ ''بلنٹ فورس ٹراما'' اس نے سرگوشی کی۔ ''کھوپڑی میں ضرب لگی ہے یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن شاید پوسٹ مارٹم کے دوران ریڑھ کی ہڈی کے اس حصے میں فریکچر نظر آجائے جو کھوپڑی کے قریب ہوتا ہے جس سے فوراً اس کی موت واقع ہوگئی۔ لگتا ہے کہ کسی سخت چیز سے اس عورت کی کھوپڑی پر ضرب لگائی گئی ہے۔''

''اس کی موت کب واقع ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بتانا مشکل ہے۔ یہ جگہ ایک فریج کے مانند ہے۔ میرے اندازے کے مطابق گزشتہ تین سے پانچ گھنٹوں کے

درمیان اس کی موت ہوئی ہے۔ اس میں کچھ نیلاہٹ تھی۔ اس کا مطلب......''

''میں جانتا ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں یہی کہوں گا کہ جب اس کی لاش دریافت ہوئی تو اسے وہاں دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ یعنی پانچ بجے سے پہلے شاید پونے پانچ بجے اور اگر اسے وہاں لایا گیا تھا تو موت کا وقت اس سے بھی پہلے ہو سکتا ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ مرنے کے آدھے گھنٹے بعد نیلاہٹ شروع ہوتی ہے لیکن اگر اسے وہاں لایا گیا تھا تو غالباً اس کی موت چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کی لاش کو وہاں لایا گیا تھا؟''

''میرا جھکاؤ اسی جانب ہے۔''

میں واپس کوس گریو اور فرک کے پاس گیا۔ ''تمہارا امدادی پروگرام کب شروع ہوا؟'' میں نے کوس گریو سے پوچھا۔

''لوگ چھ بجے کے قریب آنا شروع ہو گئے تھے۔''

''یعنی یہ قتل پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہوا۔'' میں نے کہا۔ اسکاٹی، سیکیورٹی کیمرے کی فوٹیج کو دوپہر سے چیک کرو۔ ضرورت پڑی تو ہم اسے اور پیچھے سے چیک کریں گے۔''

''میں اسے سیکیورٹی آفس میں وہ فوٹیج دکھا دوں گا۔'' کوس گریو نے کہا۔

میں نے فرک سے کہا۔ ''مجھے بالکل صحیح بتاؤ کہ تم لاش تک کیسے پہنچے؟''

''ڈاکٹر ہیراللہ نے فیکٹری دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اس کے بارے میں توقع کی جا رہی تھی کہ آج نیلام میں وہی سب سے اونچی بولی لگائے گا۔''

''اس طرح کے نیلام سے کوس گریو کتنی رقم اکٹھی کر لیتا ہے؟''

''گزشتہ نیلام میں پانچ لاکھ ڈالر سے زیادہ آمدنی ہوئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آج رات یہاں پیسے کی ریل پیل ہو گی۔''

''نہیں، یہاں نقد ادائیگی نہیں ہوتی۔ کامیاب بولی دہندہ کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں۔''

''میں لوگوں کے والٹ کی نہیں بلکہ خود ان کی بات کر رہا ہوں۔''

''کیا ان کی دولت کی اہمیت ہے؟''

''دولت ہمیشہ معاملے کو پیچیدہ بناتی ہے۔ کیا ڈاکٹر ہیراللہ نے بتایا تھا کہ وہ اس خاص موقع پر فیکٹری کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے پہلے کبھی فیکٹری نہیں دیکھی تھی اور وہ اس بارے میں متجسس تھا۔ کیا تم اس سے یہ بات پوچھو گے؟''

''ہاں، اب ہمیں واپس گھر میں جانا چاہیے تاکہ اس سے بات کر سکیں۔''

''کیا؟'' فرک نے پوچھا اور میرے عقب میں دیکھنے لگا۔

کوپر نے لاش سے کئی فٹ دور پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور سر پیچھے کی جانب۔ اس نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ گھومتے ہوئے وہ ہلکے ہلکے کراہ رہا تھا یا شاید بڑبڑا رہا ہو گا۔

''یہ کیا کر رہا ہے؟'' فرک نے پوچھا۔

''پریشان مت ہو یہ ایسے ہی کرتا ہے۔ وہ اپنے روحانی علم کے ذریعے فضا میں مرتعش لہروں کو سُن رہا ہے۔''

''لگتا ہے تم مسٹر کوپر کو پسند نہیں کرتے۔'' فرک نے کہا۔

''کہہ سکتے ہو۔''

''لیکن وہ تو تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔''

''ضروری نہیں کہ میں بھی اس کی تعریف کروں۔''

کوپر نے گھومنا بند کر دیا تھا اور وہ تیزی سے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ''وہ یہاں قتل نہیں ہوئی۔'' اس نے کہا۔

''تم مذاق کر رہے ہو؟''

''تم پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے ہو۔''

''یقیناً لیکن مجھے بتاؤ کہ تمہاری لہریں کیا کہتی ہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ کوئی مہمان تھی۔ میرا تاثر یہ ہے کہ وہ نیلام شروع ہونے سے ایک دو گھنٹے پہلے ہی آ گئی تھی اور وہ پارٹی کے لیے آنے والی کیٹرنگ ٹیم کا حصہ تھی۔ وہ اس عمل کی توقع نہیں کر رہی تھی جو اس کی موت کا سبب بنا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس کے سر میں چوٹ آئی اور ممکن ہے کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی موت فوراً ہی واقع ہو گئی۔''

''یہ بے معنی بات ہے۔'' فرک نے کہا۔ ''یہ تمہارا اندازہ ہو سکتا ہے۔''

''اچھا اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس عورت کی لاش دیکھو۔ اس نے سوئٹر، سفید بلاؤز اور گہرے رنگ کا اسکرٹ پہنا

ہوا ہے۔"

"پھر؟" فرک نے پوچھا۔

"اس کا سوئٹر اتار کر ایپرن پہنا دو اور اس پر نام کی تختی لگا دو۔ وہ کیٹرنگ اسٹاف کی ممبر نظر آئے گی۔ جائے وقوعہ کے حوالے سے میں کوپر سے متفق ہوں۔ اس عورت کا پرس غائب ہے اور اس جگہ کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آرہا۔ پارٹی عقبی لان میں لگے شامیانہ میں ہو رہی ہے اس لیے کیٹرنگ ورکر کی یہاں موجودگی سمجھ میں نہیں آتی اور قاتل بھی یہاں کیوں آیا ہوگا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ اسے کسی اور جگہ قتل کر کے لاش یہاں ڈال دی گئی۔"

"میں نے بھی بالکل یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔" کوپر نے کہا۔

"پھر بھی تمہیں اس کی چوٹوں کے بارے میں کیسے معلوم ہوا" میں نے پوچھا۔ "تم اس وقت والٹ کی دوسری جانب تھے جب میڈیکل ایگزامنر مجھے بتا رہا تھا۔"

کوپر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "روحانی قوت۔"

اسی وقت کرائم انوسٹی گیشن ٹیم بھی وہاں پہنچ گئی اور انہوں نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ "ہم واپس مکان میں چلتے ہیں۔" میں نے فرک سے کہا۔ "میں ڈاکٹر ہیرالڈ اور کیٹرنگ منیجر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر ٹام ہیرالڈ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ مضبوط کسرتی جسم، سنہرے بال اور نیلی آنکھیں۔ جب کوس گریو اسے بار میں لے کر آیا اور اس سے میرا تعارف کرایا تو وہ کچھ بے چین لگ رہا تھا۔

"جب فرک اور میں نے لاش دیکھی تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔ لگتا ہے کہ میں ابھی تک گھبرایا ہوا ہوں۔"

"فرک کے کہنے کے مطابق تم نے فیکٹری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ پہلے کبھی شراب کی فیکٹری نہیں دیکھی اس نے مجھے فیکٹری دکھانے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔"

"کیا تم سیدھے ایجنگ والٹ گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ پہلے مجھے پروسیسنگ روم میں لے گیا۔ جہاں وہ انگوروں کو ٹہنی سے الگ کر کے کچلتے ہیں پھر ہم نے لیبارٹری دیکھی اور سب سے آخر میں والٹ گئے۔"

"یعنی جب تم نے لاش دیکھی تو تم فیکٹری کا دورہ کر رہے تھے۔ اس میں کتنی دیر لگی؟"

"شاید چالیس منٹ۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس سے مجھے وقت کا تعین کرنے میں مدد ملے گی۔"

"کیا یہ بوڈی کوپر ہے..." ہیرالڈ نے میرے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس کی یہاں موجودگی پر حیرت ہو رہی ہے۔ میں نے اسے چند مرتبہ ٹی وی پر دیکھا ہے۔ بہت دلچسپ شخصیت ہے۔"

"ہاں، وہ بھی اس پارٹی میں شرکت کرنے آیا تھا۔ کیا تم نے عورت کی لاش اچھی طرح دیکھی تھی؟"

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا اسے دیکھ کر مجھے شاک ہوا لیکن دو سیکنڈ بعد میں اس کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کی اہم علامات چیک کیں۔ اس کا سانس نہیں آرہا تھا اور نبض ڈوب چکی تھی، اس کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں اور جسم نیلا پڑ رہا تھا۔"

"تو تم نے اس سرسری معائنے کے بعد یہ یقین کر لیا کہ عورت مر چکی ہے اور اس کی موت کو زیادہ دیر نہیں ہوئی؟"

"مرنے کے آدھے گھنٹے بعد جسم پر نیلاہٹ آنے لگتی ہے لیکن عام طور پر یہ دو گھنٹے سے پہلے نظر نہیں آتی۔"

"تم نے وہ لاش کب دیکھی تھی؟"

"تقریباً پونے سات بجے۔"

"تم یہاں چھ بجے آئے تھے؟"

"ہاں اور اس کی لاش کم از کم دو گھنٹے سے ایجنگ والٹ میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر اس کا قتل پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہوا تو یقیناً یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ تم کسی مہمان سے سوالات کرو۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم اس بارے میں جلد ہی فیصلہ کریں گے۔ میں چاہوں گا کہ تم کچھ دیر یہاں رکو۔ شاید تم سے مزید سوالات کرنا پڑیں۔"

ہیرالڈ کے جانے کے بعد اسکائی بیگز ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کئی کاغذ تھے۔

"مسٹر فرک نے والٹ میں لگے ہوئے کیمرے کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی فوٹیج اتنی دھندلی ہے کہ کچھ بھی صاف نظر نہیں آتا لیکن بہرحال میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔ مکان کے عقب میں لگے ہوئے سیکیورٹی کیمرے نے اس کی تصویر لے لی جب وہ تقریباً سوا تین بجے یہاں آئی تھی۔

کیٹرنگ کے تمام لوگوں کو تین بجے بلایا گیا تھا۔“

اس نے مجھے تصویروں کے پرنٹ دیے۔ یہ وہی عورت تھی جس کی لاش اسپنگ والٹ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے وہی سوئٹر پہن رکھا تھا اور وہ ہاتھ میں ہلکے رنگ کا پرس لیے ہوئے تھی۔

”۔۔۔ یہ دیکھ سکتا ہوں؟“ کوپر نے کہا پھر اس ۔۔۔ دن کو غور سے دیکھا اور مجھے واپس کردیں۔

”تمہارا روحانی علم کیا کہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں تمہیں ایک ڈالر دوں گا اگر تم مجھے اس کا نام بتا سکو۔“

”مجھے یقین ہے کہ کیٹرنگ کا عملہ یہ کام کرسکتا ہے۔“ کوپر نے کہا۔

فرک ایک عورت کے ہمراہ بار میں داخل ہوا۔ اس نے شیف کی سفید جیکٹ پہن رکھی تھی جس پر ایک مقامی کیٹرنگ کمپنی کا لوگو بنا ہوا تھا۔ اس کا نام شرلے تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ویسے ہی ہمارے دو آدمی کم ہیں اور مجھے واپس کچن جانا ہے۔“

میں نے اپنا کارڈ دکھایا تو اس کا رویہ بدل گیا۔ ”تمہارا نام؟“ میں نے پوچھا۔

”شرلے سلوراسٹین۔“

”تو یہ کیٹرنگ کمپنی تمہاری ہے؟“

”کاش ایسا ہوتا۔ میں اس پارٹی کے لیے کیٹرنگ منیجر ہوں۔ کیا اس پوچھ گچھ کا تعلق ملنے والی لاش سے ہے؟“

”تم اس بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”میں نے صرف یہ سنا کہ دو مہمانوں کو اس عمارت میں کسی جگہ ایک لاش ملی ہے۔ اسی وجہ سے کچن میں ہماری مصروفیت بڑھ گئی۔ نیلام شروع ہونے میں دیر تھی اور ہمیں مہمانوں کے لیے ہلکے پھلکے لوازمات اور سلاد وغیرہ تیار کرنا تھے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں نے اسے تصویر پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس عورت کو پہچانتی ہو؟“

اس نے اپنی جیب سے نظر کا چشمہ نکالا اور آنکھوں پر لگاتے ہوئے بولی۔ ”بالکل، یہ ڈورس ہے لیکن آج کام پر نہیں آئی۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اس نے تصویر کو دوبارہ دیکھا اور اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ ”ایک منٹ یہ تصویر یہاں لی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آئی تھی۔ کیا تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ وہ لاش اسی عورت کی ہے؟“

”ہاں مجھے افسوس ہے کہ یہی وہ عورت ہے جس کی لاش چند گھنٹے قبل ملی تھی۔“

”کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟“ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بیٹھ گئی۔ ”میں پندرہ سال سے کیٹرنگ کا کام کررہی ہوں لیکن کبھی کسی ملازم سے محروم نہیں ہوئی۔ بظاہر یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔ کچن میں تھوڑی بہت تنگی ہوئی ہے لیکن اس کی زد میں کوئی بھی آسکتا ہے۔“

”واقعی؟“ میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”ایک منٹ...... کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ میرے کسی آدمی نے اسے قتل کیا ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ نئی آئی تھی۔ یہاں تک کہ میں بھی اسے نہیں جانتی۔ سوائے اس کے کہ میں نے اس کا انٹرویو کیا تھا۔ آج اس کا ہمارے پاس پہلا دن تھا۔ اس کے علاوہ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ سہ پہر میں یہاں پہنچ گئی تھی لیکن اس نے ڈیوٹی پر رپورٹ نہیں کی۔“

”ہم تمہارے اسٹاف سے پوچھ گچھ کرنا چاہیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کیا تم نیلام کے ختم ہونے کا انتظار کرسکتے ہو۔ اس وقت وہ سب مصروف ہیں۔“

”تم مجھے اپنے اسٹاف کی مکمل فہرست مع ایڈریس اور فون نمبر دے دو تاکہ اگر کوئی ہم سے بات کیے بغیر چلا جائے تو اس سے بعد میں رابطہ ہوسکے۔“

”ایسی ایک فہرست وین میں ہے۔“ اس نے کہا اور جانے لگی۔

”ایک منٹ۔“ میں نے اس کے سامنے تصویر کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس عورت کا نام ڈورس بتایا۔ اس کے علاوہ تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔ اس کا نام ڈورس سوئٹرز ہے اور وہ مورگن میں ہی کہیں رہتی ہے، اس کے کاغذات وین میں رکھے ہیں۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ نئی آئی تھی اور اس کا آج پہلا دن تھا۔ میں فہرست لے کر آتی ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد کوپر دوبارہ بار میں آیا۔ ”سراغ رساں بوٹ رائٹ، مجھے ایک اہم بات معلوم ہوئی ہے۔ اس عورت کا نام مارلین بیچ ہے۔“

”تمہیں اپنی کرسٹل بال کی ٹیوننگ کرنی چاہیے۔“ میں

نے کہا۔ ’’اس کا نام ڈورس سوئٹرز ہے اور وہ کیٹرنگ کے لیے کام کررہی تھی۔ میں نے اس کی شناخت کرلی ہے۔‘‘

’’کیا وہ سرکاری طور پر تصدیق شدہ ہے؟‘‘ اس نے کہا اور مجھے نارتھ کیرولینا کا ڈرائیونگ لائسنس پکڑا دیا۔ اس پر چسپاں تصویر بالکل مرنے والی عورت جیسی تھی لیکن نام کے خانے میں مارلین الیگزینڈر لکھا ہوا تھا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’یہ تمہیں کہاں سے ملا؟‘‘

’’کمال ہے۔‘‘ کوپر نے کہا۔ ’’تم نے ہی مجھے یہ آئیڈیا دیا تھا۔ مارلین جب یہاں آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پرس تھا لیکن وہ لاش کے قریب نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ وہ پرس کہاں ہے؟ اور انتظار کرنے لگا کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی اشارہ ملے۔‘‘

’’اسی لیے تم کچھ دیر پہلے بار سے چلے گئے تھے؟‘‘

’’میں یہی سوچ رہا تھا کہ قاتل نے وہ پرس یہیں قریب میں چھپایا ہوگا۔ میری توقع کے مطابق پرس سے نکلنے والی لہریں بہت طاقتور تھیں۔ میں ان کی مدد سے وہاں پہنچ گیا جہاں قاتل نے اسے چھپایا تھا۔‘‘

’’کہاں؟‘‘

’’کوٹ چیک آفس۔ یہ ایک مناسب جگہ تھی، اگر وہ پرس کوڑے دان میں پھینکا جاتا تو اس کے جلد ملنے کا امکان تھا لیکن کوٹ چیک روم میں وہ رات بھر بھی لٹکا رہے تو کسی کی اس پر نظر نہ جاتی۔ میں کوٹ روم میں گیا اور فوراً ہی اسے تلاش کرلیا۔‘‘

’’تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مرنے والی عورت کا پرس ہے؟‘‘

’’کیونکہ یہ اس تصویر سے ملتا جلتا تھا جو تم نے مجھے دکھائی تھی۔‘‘

’’پھر تم نے اس کی تلاشی لی؟‘‘

’’ہاں، یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ یہ مقتولہ کا پرس ہے۔‘‘

’’خدا تمہیں سمجھے کوپر۔ تم نے ثبوت ضائع کردیا کیونکہ اس پرس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات آگئے۔‘‘

’’میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں اس پرس پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اس نے سفید دستانے پہن رکھے تھے۔ ’’کیا میں تمہیں کوٹ چیک روم لے چلوں تاکہ تم پرس میں رکھی ہوئی بقیہ چیزیں دیکھ سکو۔‘‘

اسکاٹی، کوپر اور میں بار میں بیٹھے مارلین کے پرس میں موجود اشیا کا معائنہ کررہے تھے۔ اسکاٹی نے evidence bage کا انتظام کرلیا تھا اور ہم وہ چیزیں فہرست بنا کر ان میں رکھ رہے تھے۔

’’کیا یہ کام کرائم سین انویسٹی گیشن والوں کو نہیں کرنا چاہیے؟‘‘ اسکاٹی نے پوچھا۔

’’وہ ابھی تک اسٹیجنگ والٹ میں مصروف ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور باہر شامیانے میں لوگوں کا ہجوم ہے لہٰذا ہمارے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے۔ ہم مارلین کے بارے میں جو جاننا چاہتے ہیں، وہ شاید اس پرس سے معلوم ہوجائے۔‘‘

کوپر نے کہا۔ ’’قابل غور بات یہ ہے کہ مارلین یہاں سہ پہر تین بجے کے قریب پہنچی اور اس نے اپنے آپ کو ڈورس سوئٹرز ظاہر کیا، کیوں؟ کس مقصد کے تحت اس نے جعلی شناخت اختیار کرکے ملازمت کے لیے درخواست دی؟‘‘

’’وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس کے یہاں آنے کے بارے میں معلوم ہو۔‘‘ میں نے خیال ظاہر کیا۔

’’اپنی شناخت چھپانے کی یہ ایک وجہ ہوسکتی ہے لیکن کس سے؟ اپنے مالک یا پارٹی میں شریک ہونے والے کسی مہمان سے؟‘‘

’’کوئی ایسا شخص جو اسے نام سے پہچان لے۔‘‘ میں نے کہا۔

کوپر نے کہا۔ ’’اب اگلا سوال۔ تم نے بتایا کہ یہ پہلا موقع تھا جب مارلین کیٹرنگ کے لیے کام کرنے آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے اپنے آپ کو نہیں چھپا رہی تھی جس کا تعلق کیٹرنگ کمپنی سے ہو۔‘‘

’’تمہارا اشارہ کوس گریو یا اس کے کسی مہمان کی جانب ہے؟‘‘

’’ہاں اگر اس نے خاص طور پر اس موقع کے لیے کیٹرنگ سروس میں ملازمت اختیار کی تھی اور ایک فرضی نام سے یہاں آئی تو پھر......‘‘

’’تو اس کا کوئی مقصد تھا۔ اس نے ایک ایسی تقریب کا انتخاب کیا جہاں اس شخص کی موجودگی یقینی تھی جس سے وہ ملنا چاہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ یہاں کی کیٹرنگ کون کررہا ہے۔‘‘

’’صرف یہی نہیں۔‘‘ کوپر بولا۔ ’’وہ کسی بڑے مقصد کے تحت یہاں آئی تھی لیکن بدقسمتی سے قتل ہوگئی۔‘‘

’’ہمیں اس کے بارے میں مزید جاننے کی ضرورت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

یہ سن کر اسکاٹی کمپیوٹر کی تلاش میں چلا گیا۔ کوپر چلتا ہوا

کھڑکی تک گیا اور عقبی صحن میں موجود لوگوں کو دیکھنے لگا جبکہ میں نے ثبوت کے تھیلوں پر لیبل لگانے کا کام مکمل کر لیا۔

''میں ٹائمنگ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' کوپر نے کہا۔ ''کیٹرنگ منیجر کے کہنے کے مطابق مارلین پارٹی میں کام کرنے کے لیے آئی تھی لیکن اس نے رپورٹ نہیں کی جبکہ تم نے جو تصویر مجھے دکھائی۔ اس پر سوا تین بجے کا وقت درج ہے۔ اس کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''وہ تصویر سوا تین بجے لی گئی تھی لیکن اس نے کام کی جگہ رپورٹ نہیں کی۔ وہ تقریباً چار بجے یا اپنے آنے کے پینتالیس منٹ بعد مر گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد اس کی کسی سے ملاقات ہوئی اور اس نے اسے قتل کر دیا پھر کسی طرح اس کی لاش کو پونے پانچ بجے سے پہلے امیجنگ والٹ میں پہنچا دیا۔''

''اسے ڈکیتی کی واردات ظاہر کرنے کے لیے وہ واپس مرکزی عمارت میں آیا اور اس کا پرس کوٹ چیک روم میں رکھ دیا۔''

''چھ بجے مہمان آنا شروع ہوئے۔'' میں نے کہا۔ ''تقریباً اسی وقت فرک اپنے معزز مہمان ڈاکٹر ہیر الڈ کو شراب کی فیکٹری دکھانے لے گیا۔''

''ایسی صورت میں پارٹی میں شریک ہونے والے مہمانوں کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔'' کوپر نے کہا۔

''پوری طرح نہیں۔ پہلے میں پارٹی سروس اسٹاف کی فہرست دیکھنا چاہوں گا لیکن شرلے کہاں ہے؟ وہ اپنی وین سے فہرست لینے گئی تھی۔ اسے گئے ہوئے بھی آدھا گھنٹا ہو گیا۔''

میں نے کوپر اور اس نے مجھے دیکھا۔ یوں لگا جیسے ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے ہوں۔

''پارکنگ لاٹ۔'' میں نے کہا اور دروازے کی طرف لپکا۔ کوپر بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم چند سیکنڈ میں وہاں پہنچ گئے لیکن کیٹرنگ وین کا کوئی پتا نہیں تھا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود اہلکار اپنی پوری توجہ مرکزی عمارت کے سامنے والی لاٹ پر مرکوز کیے ہوئے تھے اور عقبی لاٹ کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے سیل فون نکال کر اسکالی سے بات کی۔

''میرا کام ختم ہونے والا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی خاص بات؟''

''شرلے سلوراسٹین ہمیں دھوکا دے کر چلی گئی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اپنی وین سے سروس اسٹاف کی فہرست لینے گئی تھی لیکن اب اس کی وین پارکنگ لاٹ میں نہیں ہے۔ تم کیٹرنگ کمپنی فون کر کے اس کے بارے میں معلومات، وین کا لائسنس پلیٹ نمبر اور فون نمبر وغیرہ معلوم کرو۔''

''اس کا اس طرح بھاگ جانا اسے مشکوک بنا رہا ہے۔''

''یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ مقتولہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

''زیادہ تر چھوٹے موٹے جرائم ہیں۔ امن و امان میں خلل ڈالنا۔ چھوٹی موٹی چوریاں وغیرہ۔''

''جب فائل مکمل ہو جائے تو میرے فون پر بھیج دینا۔ اب تم شرلے کے پیچھے لگ جاؤ۔''

میسن کوس گریو، فرک کے ساتھ بار میں آیا اور کہنے لگا۔ ''اس المناک حادثے کے بعد میں نے آج کا نیلام ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان حالات میں یہ مناسب نہیں لگتا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔''

''کیا تم میرے مہمانوں کو زیادہ دیر تک روکنا چاہو گے۔ ان میں سے زیادہ تر بے چین ہو رہے ہیں اور انہیں کیٹرنگ سروس سے بھی شکایات ہیں۔''

میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ان سے کہہ دو کہ وہ جا سکتے ہیں۔ ہم نے کچھ ثبوت اکٹھے کر لیے ہیں۔ ویسے بھی میرا دو سو آدمیوں کے انٹرویو کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی نے یہ قتل کیا ہے۔ اس عورت کا قتل پارٹی شروع ہونے سے دو گھنٹے پہلے یعنی چار بجے ہوا۔ اس وقت کوئی مہمان یہاں موجود نہیں تھا۔''

''نہیں۔'' کوس گریو نے کہا۔

''اس کے علاوہ مجھے مشتبہ شخص مل گیا ہے اور وہ تمہاری کیٹرنگ منیجر ہے۔ میں نے اس سے کچھ سوالات کیے۔ وہ اسٹاف کی فہرست لینے کے بہانے اپنی وین تک گئی اور گاڑی سمیت غائب ہو گئی۔''

''اسی لیے کیٹرنگ سروس میں مسئلہ ہو رہا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

وہ اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے چلا گیا۔ ابھی مجھے مارلین کا پرس اور اس میں رکھی چیزیں کرائم انویسٹی گیشن والوں کے حوالے کرنا اور دو رپورٹیں لکھنا تھیں لیکن اس سے پہلے شرلے سلوراسٹین کا پتا لگانا ضروری تھا۔ اس طرح مجھے وقت مل گیا کہ میں تمام حقائق پر دوبارہ غور کر سکوں۔

''کیا خیال ہے تھوڑی چہل قدمی کی جائے۔'' کوپر نے کہا۔ ''تمہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک کپ کافی مل جائے تو کیا بات ہے۔ لگتا ہے کہ ہمیں رات دیر تک رکنا ہو

گا۔‘‘

ہم فرانسیسی دروازوں سے گزر کر عقبی لان میں آئے۔ شامیانہ اُتر چکا تھا اور زیادہ تر لوگ جا چکے تھے۔ البتہ چند افراد ٹولیاں بنائے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے عقبی پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ڈاکٹر ہیرالڈ جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ رک گیا۔

’’میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم نے آج شام ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔‘‘

’’مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی۔ البتہ اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس عورت کی جان بچانے وقت پر نہ پہنچ سکا۔‘‘

’’اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی اپنے آپ کو الزام نہ دیتا۔ وہ تمہارے پارٹی میں آنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔‘‘

’’ویسے تم کس چیز کے ڈاکٹر ہو؟‘‘ کوپر نے پوچھا۔

’’میں پلاسٹک سرجن ہوں۔‘‘ چلتے چلتے وہ ایک ...... کار کے پاس رک گیا۔

’’عمدہ کار ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’شکریہ۔‘‘

کوپر نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف لے گیا۔

’’اسے جانے مت دینا۔‘‘ اس نے کہا۔

’’کیا؟‘‘

’’اس سے کہو کہ ہمیں اس کے مزید تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم اسے اس جگہ لے جانا چاہتے ہیں جہاں لاش ملی تھی۔‘‘

’’یہ سب کیا ہے؟‘‘

’’میں یہاں نہیں بتا سکتا لیکن اگر تم نے اسے جانے دیا تو بہت پچھتاؤ گے۔‘‘

میں وہاں سے جانے لگا پھر مجھے یاد آیا کہ ماضی میں بھی اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے ہیں۔

’’ڈاکٹر ہیرالڈ......!‘‘ میں نے آواز لگائی۔ وہ کار میں بیٹھ چکا تھا۔ میری آواز سن کر باہر آ گیا۔

’’ہاں، بولو کیا بات ہے؟‘‘

’’میرے ساتھی سراغ رساں اسکائی نے فون پر بتایا ہے کہ اسے مارلین کے بارے میں کچھ نئی معلومات ملی ہیں۔‘‘

’’کیسی معلومات؟‘‘

’’کرائم سین انویسٹی گیشن والوں کو کچھ چیزیں ملی ہیں اور مجھے امید ہے کہ تم ان پر کچھ روشنی ڈال سکو گے۔‘‘ میں نے ہیرالڈ سے کہا۔ ’’میں جانتا ہوں کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور میں تمہیں ضرورت سے زیادہ نہیں روکنا چاہتا لیکن اگر تم چند منٹ دے سکو تو تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ مسٹر کوس گریو اور مسٹر فرک کو بھی اس میں دلچسپی ہو گی۔‘‘ کوپر نے کہا۔ ’’تم اسکائی سے کہو کہ وہ انہیں لے کر ہمارے پاس آ جائے۔‘‘

میں نے اپنا سیل فون نکال کر اسکائی کا نمبر ملایا۔

’’میں نے ابھی تمہیں تفصیل بھیجی ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’گو کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کیوں بھاگی۔ اس نے مارلین کو قتل کیا ہے یا نہیں لیکن وہ غیر قانونی پارکنگ کی عادی ہے۔ اس کا کم از کم پچاس مرتبہ چالان ہو چکا ہے جس کا اس نے جرمانہ ادا نہیں کیا جو پندرہ ہزار سے زیادہ ہو چکا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک وہ پکڑی کیوں نہیں گئی۔‘‘

’’ٹھیک ہے شکریہ، کیا تم کوس گریو اور فرک کو تلاش کر کے اسمجنگ والٹ پر لا سکتے ہو؟‘‘

’’بالکل لیکن کس لیے؟ کرائم سین والوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور کورونر کی وین بھی چلی گئی ہے۔‘‘

’’تم ان سے صرف یہ کہو کہ وہ ہمارے پاس آ جائیں۔‘‘ میں نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ کوپر کا گیم ہے۔‘‘

’’سمجھ گیا، میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔‘‘

☆☆☆

ہم سب ایک بار پھر جائے وقوعہ پر جمع ہوئے۔ ’’یہ سب کیا ہے؟‘‘ فرک نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہیرالڈ نے کہا۔ ’’سراغ رساں بوٹ رائٹ کا کہنا ہے کہ یہاں کچھ نئے ثبوت ملے ہیں۔‘‘

’’دراصل کوپر نے میری توجہ اس طرف دلائی تھی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میری تجویز ہے کہ وہی ہمیں تفصیل بتائے۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ کوپر نے اپنی ٹائی درست کی اور بولا۔ ’’ہم نے شام میں جو معلومات اکٹھی کیں، ان پر غور کرنے کے بعد میرے ذہن میں ان واقعات کی واضح تصویر بن گئی جس کے نتیجے میں اس عورت کی موت واقع ہوئی لیکن ابھی کچھ سوالات کا جواب باقی ہے۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا اگر تم اس تصویر کو مکمل کرنے میں میری مدد کرو۔‘‘

وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور اس جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جہاں کچھ دیر پہلے اس عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''مرنے والی اب خود بولنے کے قابل نہیں ہے لیکن پھر بھی میں اس کی موجودگی محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کا جذبہ بہت مضبوط تھا لیکن اس میں ایک کمزوری بھی تھی۔''

''وہ کیا؟''

''خودنمائی۔ وہ جوان تھی لیکن اسے عمر بڑھنے کا احساس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس کے ماتھے اور کانوں کے پیچھے کاسمیٹک سرجری کے نشانات نظر آئے۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زخم کا نشان بھی دیکھا۔ میرے خیال میں اسے اس عمر میں سرجری کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس نے ایسا کیا۔ مجھے حیرت ہے ڈاکٹر کہ تمہیں یہ نشانات نظر نہیں آئے۔''

''معاف کرنا، میں سمجھا نہیں۔'' ہیر اللہ نے کہا۔

''تم ایک ماہر پلاسٹک سرجن ہو۔'' کوپر نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم ان نشانات کو نظر انداز کر سکتے ہو جنہیں میں نے آسانی سے دیکھ لیا۔''

''جیسا کہ میں نے بتایا لاش دیکھ کر مجھے صدمہ پہنچا۔'' ہیر اللہ نے کہا۔ ''میری زیادہ دلچسپی اس میں تھی کہ اس میں زندگی کی علامات کا معائنہ کروں۔''

''اس کے باوجود کہ تم پہلی نظر میں جان گئے تھے کہ اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

''یقیناً وہ ایک رسمی کارروائی تھی۔'' ہیر اللہ نے کہا۔ ''میں نے اس کی نبض و سانس اور پتلیاں چیک کیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں لیکن مجھے طریقۂ کار پر عمل کرنا تھا۔''

''اور اس معائنے کے دوران تم نے اس کے زخم پر کوئی توجہ نہیں دی؟''

''وہ قابلِ ترجیح نہیں تھی۔''

''بے شک اس کی اہمیت نہیں۔'' کوپر نے کہا۔ ''لیکن تجسس تو ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے تم نے نیلاہٹ کی علامات نوٹ کرلیں اور ان سے تم یہ اندازہ لگانے کے قابل ہو گئے کہ اس کی لاش دو گھنٹے سے وہاں پڑی ہوئی تھی۔''

''یہ درست ہے۔''

''تم نے وہ لاش پونے سات بجے کے قریب دیکھی۔''

''ہاں۔''

''اور تم یہاں چھ بجے آ گئے تھے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس میں پانچ منٹ آگے پیچھے ہو سکتے ہیں۔''

''تم سیدھے مسٹر فرک کے دفتر گئے؟''

''معاف کرنا، میں سمجھا نہیں۔''

''جب تم یہاں آئے تو تم نے مسٹر فرک سے کہا کہ کبھی فیکٹری کا دورہ نہیں کیا۔ اس پر اس نے تمہیں فیکٹری دکھانے کی پیشکش کر دی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ہیر اللہ نے کہا۔ ''لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''صرف وقت کا تعین کرنے کے لیے۔ اس میں تمہارے لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں مارلین کا قتل سہ پہر چار بجے کے قریب ہوا۔ اس لیے ڈاکٹر تمہاری پوزیشن صاف ہے کیونکہ تم تقریباً چھ بجے یہاں آئے تھے۔''

''یہ میرے لیے باعثِ اطمینان ہے۔'' ہیر اللہ نے کہا۔ ''تم نے تو مجھے پریشان کر دیا تھا۔''

''معافی چاہتا ہوں۔'' کوپر نے کہا۔ ''اس میں میری نیت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مسٹر فرک، اب میرا سوال تم سے ہے۔ تم ڈاکٹر ہیر اللہ کو فیکٹری دکھانے لے گئے تھے۔ میں خود بھی کئی مرتبہ فیکٹری کا دورہ کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ اسے پوری طرح دیکھنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار ہیں لیکن مسٹر فرک تم نے اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے آدھا گھنٹے میں یہ دورہ مکمل کر دیا، اگر ڈاکٹر کچھ پہلے میرا مطلب ہے کہ تین بجے کے قریب آ جاتا تو اس کے پاس فیکٹری کو دیکھنے کے لیے کافی وقت ہوتا۔''

''لیکن میں نہیں آیا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مسٹر کوس گریو، تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''تم روحانی علوم کے ماہر ہو اور وہ سب کچھ محسوس کر سکتے ہو جو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔''

کوپر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ مسٹر کوس گریو۔'' پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اچھی طرح سوچو، جو کچھ مسٹر کوس گریو نے کہا ہے۔ وہ یاد رکھنا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اگر جھوٹ بولو گے تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ چھ بجے سے بہت پہلے تم یہاں نہیں آئے؟ پھر تم آج سہ پہر تین بجے کہاں تھے؟''

''یہ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔'' ہیر اللہ چلایا۔ ''مسین، یہ چھچھورا شخص مجھ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگا رہا ہے۔''

کوپر اچانک آگے بڑھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈاکٹر کا سر پکڑ لیا پھر پوری قوت سے اس کا چہرہ اپنی

طرف کھینچا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا پھر اس نے فوراً ڈاکٹر کا سر چھوڑ دیا جیسے اس کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ کوپر پیچھے ہٹا اور اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا۔

''واؤ۔'' وہ چلایا۔ ''یہ لہریں بڑی متاثر کن ہیں۔ مجھے سب صاف نظر آرہا تھا۔ تم آج سہ پہر تین بجے فیکٹری آئے تھے تاکہ پوری طرح فیکٹری دیکھ سکو۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' ہیر اللہ بولا۔

''یہی کہ تم نے یہاں اپنی آمد کے بارے میں ہم سے جھوٹ بولا، یہ جانتے ہوئے کہ مارلین کا قتل اس وقت ہوا جب تم یہاں موجود تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیوں؟ اگر تم بے گناہ ہو تو تم نے یہاں اپنی موجودگی کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟''

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' ہیر اللہ نے کہا۔

''لیکن تمہیں میرے سوال کا جواب تو دینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم آج تین اور چھ بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''کیا تم مجھے مشتبہ سمجھ رہے ہو؟'' ہیر اللہ نے پوچھا۔

''تم بھی ہماری فہرست میں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں تھے؟''

فرک نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم انہیں سچ بتادو۔''

ڈاکٹر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''فضا میں گردش کرنے والی لہروں کی مدد سے۔'' کوپر نے جواب دیا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ جب مارلین سوا تین بجے فیکٹری آئی تو ڈاکٹر ہیر اللہ کی کار عقبی پارکنگ لاٹ میں موجود تھی جو اس تصویر میں صاف نظر آرہی ہے۔'' میں نے وہ تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

کوپر نے کہا۔ ''جب پارکنگ لاٹ میں سراغ رساں بوٹ رائٹ نے تم سے کہا کہ ہمیں مارلین کے بارے میں کچھ نئی معلومات ملی ہیں تو تم نے کہا۔ ''کیسی معلومات؟ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون تھی، اس سے پہلے بوٹ رائٹ نے مقتولہ کا نام نہیں بتایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آدھے گھنٹے پہلے ہی اس کا نام معلوم ہوا تھا یعنی تم اسے جانتے تھے۔ اس لیے تم نے اپنی آمد کے بارے میں جھوٹ بولا اور نہ ہی ہمیں یہ بتایا کہ تم مقتولہ کو جانتے تھے۔''

''وہ قتل نہیں تھا۔'' ہیر اللہ نے کہا۔

''میں اس کی تصدیق کرسکتا ہوں۔'' فرک نے کہا۔ ''کیا یہ ضروری ہے کہ ہم یہ گفتگو یہاں جاری رکھیں۔ کیوں نہ بار میں بیٹھا جائے؟''

چند لمحوں بعد ہم بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرک نے سب کے لیے وائن کے گلاس تیار کیے۔ میں اور اسکائی ڈیوٹی پر تھے۔ اس لیے ہم نے معذرت کرلی۔ ڈاکٹر کافی اداس نظر آرہا تھا۔

''مارلین ہمیشہ پریشان رہتی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''چھ ماہ قبل ہم لیک مورگن کی ایک بوٹ پارٹی میں ملے۔ مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ تم نے اس کے زخموں کا نوٹس لیا۔ وہ چاقو سے لگے تھے۔ گفتگو کے دوران جب اسے معلوم ہوا کہ میں پلاسٹک سرجن ہوں تو وہ بڑی تیزی سے میری طرف بڑھی اور ہم نے ایک پُرجوش ویک اینڈ ساتھ گزارا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ میں ایک امیر اور کامیاب شخص ہوں اور سنا ہے کہ خواتین بھی مجھے پسند کرتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ میرے لیے اتنی اہم نہیں تھی بس میں نے وقتی تسکین کے لیے اس کے ساتھ وقت گزارا۔''

''وہ ایک ہفتے بعد وقت لیے بغیر میرے کلینک آگئی۔ وہ اپنے زخموں کا علاج اور چہرے کی مرمت کروانا چاہ رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ میں اس کا علاج مفت کروں گا کیونکہ ہمارے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہو چکا ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ کبھی کام اور تعلق کو آپس میں نہیں ملایا۔ میں نے اسے کسی دوسرے سرجن کے پاس بھیجنے کی پیشکش کی جو تسلی بخش کام کرتا ہے۔''

''اور اس نے تمہیں دھمکی دی۔'' کوپر بولا۔ ''اس نے کہا کہ وہ سب کو تمہارے آزادانہ جنسی تعلقات اور منشیات کے استعمال کے بارے میں بتادے گی اور تمہیں تباہ کرنے کی دھمکی بھی دی۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' ہیر اللہ نے کہا۔ ''میں گزشتہ چھ ماہ سے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ رات دن اس کے درجنوں فون آتے تھے، وہ بہت جذباتی اور ضدی تھی۔''

کوپر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور آج سہ پہر میں جب تم مسٹر فرک کے ساتھ فیکٹری جانے کی تیاری کررہے تھے تو وہ آگئی اور اس نے یہاں آنے کے لیے فرضی نام اختیار کیا۔''

فرک نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میرا نام بھی اس کہانی میں آ گیا ہے۔ اس لیے اب میں اسے آگے بڑھاتا ہوں۔ ہاں وہ میرے دفتر میں اس وقت آئی جب میں اور ٹام فیکٹری میں جانے والے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی تو ٹام نے مجھے سیکیورٹی کو فون کرنے کے لیے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں ٹیلی فون تک پہنچتا وہ عورت غصے میں آ گئی اور بولی کہ اب اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ اسے اس طرح نظرانداز کیا جائے۔ یہ کہہ کر اس نے میری میز پر سے لفافہ کھولنے کا چاقو اٹھایا اور ڈاکٹر ہیرالڈ پر حملہ کر دیا۔“

”میں نے اضطراری طور پر اپنا ردِعمل ظاہر کیا۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”ایک طرف جھک کر اس کا وار خالی جانے دیا اور دھکا دے کر دور کر دیا۔ وہ پیچھے کی جانب گری اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرایا اور کھوپڑی پر کاری ضرب آ گئی۔ وہ فوراً ہی مر گئی۔“

”پھر تم نے وہاں سے لاش کیوں ہٹائی؟“ اسکائی نے پوچھا۔ ”پولیس کو فون کر کے کیوں نہیں بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟“

”اس کا جواب میں دیتا ہوں۔“ کوس گریو نے کہا۔ ”میری جسمانی حالت سب کے سامنے ہے، میں چند ہفتوں یا مہینوں کا مہمان ہوں۔ میری بیوی کئی برس پہلے مر چکی ہے اور میں بے اولاد ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کوس گریو فارمز کی ملکیت فرک کو منتقل کر دوں اور وہ بھی میرے منصوبوں سے واقف ہے۔ اس کے علاوہ صرف میں اور فرک ہی اس فیکٹری کے مالی حالات کے بارے میں جانتے ہیں۔ اگر کمپنی کو چلانا ہے تو اس کے لیے ہمیں سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔“

”میں سمجھ گیا۔“ کوپر نے کہا۔ ”آج سہ پہر ہونے والا فیکٹری کا دورہ کوئی عام نوعیت کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہیرالڈ ممکنہ طور پر اس فیکٹری میں سرمایہ کاری کرنے والا تھا۔“

”مارلین کی لاش کو ہٹانے کا آئیڈیا میرا تھا۔“ فرک نے کہا۔ ”اگر پولیس کو اطلاع کرتے تو آج ہونے والا نیلام متاثر ہو سکتا تھا۔ اس طرح ہمیں سوچنے کے لیے وقت مل جاتا۔ امیجنگ والٹ تک جانے کے لیے ایک عقبی راستہ بھی ہے۔ وہاں کیمرے نہیں لگے ہوئے۔ ڈاکٹر ہیرالڈ اور میں نے اس کی لاش کو وہاں سے ہٹایا اور میں نے اس کا پرس کوٹ چیک روم میں چھپا دیا پھر ہم دفتر واپس آ گئے۔ اس وقت پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اس کی لاش کو اس طرح وہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

”تم نے یہ ظاہر کیا کہ والٹ میں ایک لاش ملی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہمارا خیال تھا کہ پولیس اسے ڈکیتی کی واردات سمجھے گی۔“ ہیرالڈ نے کہا۔

”جب ہم نے مارلین کا فون ریکارڈ چیک کیا تو اس کے ساتھ تمہارے تعلق کا علم ہو گیا تھا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ یہ ہمارا منصوبہ تھا۔ ہم اتنے ہوشیار نہیں ہیں۔“ ہیرالڈ نے کہا۔ ”میں قاتل نہیں ہوں اور فرک یا میں جرائم پیشہ نہیں۔ یہاں کوئی سازش نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی منصوبہ بنا۔ ہم کچھ وقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ سب جاننے کے بعد اب تم کیا کہتے ہو؟“

”سراغ رساں اسکائی تم دونوں کا بیان قلم بند کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن لے جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم ڈسٹرکٹ اٹارنی کو اپنی رپورٹ پیش کر دیں گے۔ اس کی روشنی میں دیکھا جائے گا کہ تم دونوں پر کوئی الزام عائد کرنے کی ضرورت ہے۔ تب تک تم خاموش رہو گے۔“

ان لوگوں کے جانے کے بعد کوپر نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے خیال میں ان پر کوئی الزام لگ سکتا ہے؟“

”میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے لاش کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے علاوہ کوئی غلطی کی ہے۔ میری نظر میں یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ بہرحال آخری فیصلہ تو ڈسٹرکٹ اٹارنی ہی کرے گا۔ ہماری محنت رائگاں نہیں گئی اور ہم مارلین کی موت کی وجہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”اس کے لیے تمہیں میرا شکرگزار ہونا چاہیے۔“ کوپر بولا۔ ”اس گتھی کو سلجھانے میں میری روحانی قوت کا بھی بڑا دخل ہے۔“

”میں تمہارا دل توڑنا نہیں چاہتا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تم ایک عام مخبر ہو اور محض اپنی یادداشت کے بل بوتے پر سنی ہوئی باتوں کو ذہن میں محفوظ کر لیتے ہو۔“

”تم نے میری صلاحیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں کوئی عام نہیں بلکہ غیرمعمولی مخبر ہوں اور جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہوں اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔“

میں نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بھی مارلین کی طرح خودنمائی کا شکار تھا جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر ہیرالڈ کے پیچھے لگ گئی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ ایک کامیاب سرجن ہے اور محض وقتی تسکین کی خاطر اپنا مالی نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔

❖❖❖

دسمبر بہت سرد تھا۔ میں ایک درمیانے درجے کے ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ دل آج پھر کچھ اداس تھا۔ ثروت کو بچھڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ چند روزہ بخار اور اس کے بعد برین ہیمرج...... وہ داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ میں خود کو کافی سنبھال چکا تھا مگر پھر بھی کبھی کبھی یا سیت اُمڈ کر آ جاتی تھی۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے لمبی آہ بھری۔ پندرہ سال گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ہماری ازدواجی

اس پنچھی کی پرواز جو اپنے ہی دام میں آ گیا تھا......

کہانیوں کے کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے... وہ ذہنوں میں دلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں... ایسے ہی چند کرداروں کی مکرر رونمائی... جو آپ کو ایک بار پھر یادوں کے ایسے طلسم کدہ میں لے جائیں گے جس کے آپ اسیر تھے... آپ کے پسندیدہ... جانے مانے کرداروں کی واپسی...

ہنگامی شادی

طاہر جاوید مغل
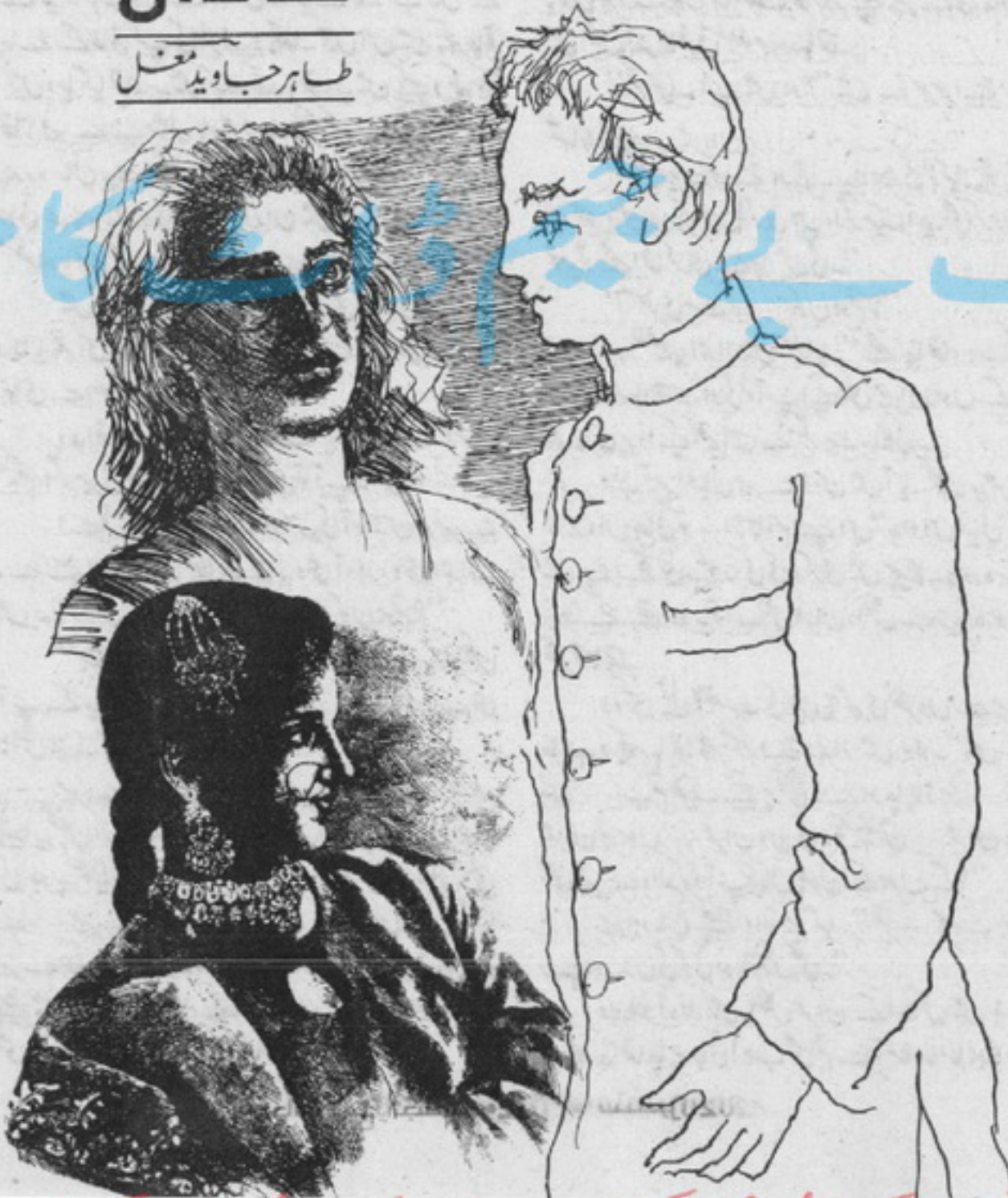
زندگی ہر طرح سے خوشگوار رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ ہم اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ ایک بچہ پیدائش کے وقت فوت ہوگیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔ اب میرا ایک ہی بچہ تھا۔ یہ پہلی بیوی سلطانہ کے بطن سے تھا۔ بلال عرف بالو آج کل انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا۔

...... چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ چند کش لے کر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک منظر دیکھ کر بُری طرح ٹھٹک گیا۔ دو میزیں چھوڑ کر ایک بندہ میری دائیں جانب بیٹھا تھا اور مسکراتی نظروں سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے سر پر ہزار پاؤنڈ کا وزنی بم پھٹ جاتا تو شاید مجھے اتنا دھچکا محسوس نہ ہوتا جتنا اسے دیکھ کر ہوا۔ میں نے اپنی پلکیں زور سے جھپکائیں، دل میں یہی خیال آیا کہ شاید میری نگاہ دھوکا دے رہی ہے اور یوں پلکیں جھپکانے سے یہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ تب میں نے چائے کے خالی کپ کی طرف دیکھا۔ کہیں اس میں کچھ ملا تو نہیں دیا گیا تھا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا تھا، یہ میں کیسے دیکھ سکتا تھا؟ میرے بے مثال یار عمران دانش کو دنیا سے گئے چودہ پندرہ سال بیت گئے تھے اور آج ...... دسمبر کی اس ٹھٹھری ہوئی سہ پہر میں وہ اس ریستوران میں میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا، مجھ سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر۔

میں کوئی توہم پرست ہوتا تو اسے عمران کی روح قرار دیتا یا پھر کسی جادو ٹونے کا شاخسانہ۔ سینے میں دل بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

وہ اٹھا اور تیزی سے میرے پاس آگیا۔ ”اسلام علیکم، اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تو آپ تابش ہو......“

اسے قریب سے دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوئے۔ وہی آواز، وہی انداز۔ میں نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ”کک...... کون ہو تم؟“

”جناب نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن آپ کے یہ بوکھلی والے تاثرات بتا رہے ہیں کہ آپ ہی تابش ہیں۔“

میرے ذہن میں دوسرا اور زیادہ منطقی خیال اُبھرا۔ یقیناً یہ شخص اپنے اصل روپ میں نہیں تھا۔ پلاسٹک سرجری کی جدید تکنیک، چہرے کو کسی بھی صورت میں ڈھال سکتی ہے...... میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجیں۔ کیا میرے حوالے سے کچھ غلط ہونے والا تھا۔ چودہ پندرہ برس پہلے میں نے اور عمران نے جو دشمنیاں پالی تھیں، ان کو اب بھی یکسر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ کئی افراد ہماری طرف متوجہ تھے۔ میں لرزتی ٹانگوں کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مم...... میرا خیال ہے...... ہمیں باہر جا کر بات کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”چلیں جی، باہر چلیں...... بلکہ اگر آپ پاکستان سے باہر جانا چاہیں تو بھی میں تیار ہوں۔“

میں جیسے ہوا میں ڈگمگاتا ہوا ریستوران سے باہر آگیا۔ کچھ فاصلے پر میری سوزوکی کلٹس کھڑی تھی۔ ہم دونوں اس میں آن بیٹھے۔ وہ بڑی بے تکلفی اور دبے دبے جوش سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر وہی چمک تھی جو عمران دانش کے چہرے پر ہوا کرتی تھی۔ وہی ٹھوڑی کا گڑھا، وہی خوب صورت رخساروں کی قدرے ابھری ہوئی ہڈیاں...... دانتوں کی نہایت ہموار اور چمکیلی قطار۔ ہاں بالوں کا رنگ تھوڑا سا مختلف تھا اور نچلے جبڑے کی بناوٹ میں انیس بیس کا فرق معلوم ہو رہا تھا۔

”تم میک اپ میں ہو؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”کیسی بات کرتے ہو جی۔ یہ لاہور کی لڑکیاں تو پہلے ہی مجھ پر مکھیوں کی طرح گرتی ہیں، اگر میک اپ بھی کروں گا تو یہ تو مجھے اٹھا کر ہی لے جائیں گی۔“

”مسخری مت کرو...... کون ہو تم؟“

وہ دلنشیں انداز میں مسکرایا۔ ”مجھے پتا تھا، جب بھی آپ سے ملاقات ہوگی، آپ ایسے ہی حیران ہوں گے۔“ پھر میری پروا کیے بغیر اس نے سگریٹ سلگالی۔

اب تیسرا خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں یہ عمران کا جڑواں بھائی تو......؟ تاہم اپنے اس ”بدحواس خیال“ کو میں نے اگلے ہی لمحے ردی کی ٹوکری میں پھینکا۔ پندرہ سال بیت گئے تھے اور یہ تو اب بھی عمران دانش سے زیادہ جوان نظر آتا تھا۔

وہ کسی ٹیلی پیتھسٹ کی طرح گہری نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا پھر مسکراتے انداز میں بولا۔ ”لیس...... لیس...... اب تم ٹھیک نتیجے پر پہنچ رہے ہو چاچو ڈیئر...... میں عمران ٹو ہوں...... عمران ون کی ایکسٹینشن...... عمران ون یعنی میرے والد کو تو آپ کہاں بھول سکے ہوں گے؟“

میرا دماغ پھٹنے والا ہوگیا۔ ”تم...... جھوٹ بول رہے ہو۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔“

وہ بلند آواز میں بالکل عمران کے اسٹائل میں ہنسا۔ ”مجھے پتا تھا چاچو جانی! جب بھی تم سے آمنا سامنا ہوگا، یہ

ڈائیلاگ اور اس طرح کے دوسرے ڈائیلاگز ضرور سننے کو ملیں گے۔ میرے پاس سب سوالوں کے جواب ہیں لیکن افسوس ہے کہ تم ملے ایسے وقت ہو جب میں تسلی سے ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔ چاچو جانی! تمہیں تھوڑا سا بریک پر پاؤں رکھنا پڑے گا۔ دیکھو، میں نے بھی تو اتنا انتظار کیا ہی ہے۔ میں کوئی آٹھ ماہ سے یہاں لاہور میں ہوں اور تمہارے لیے لور لور بھی پھرتا رہا ہوں بلکہ......''

وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ ہماری گاڑی کے پاس سے گزرنے والی ایک موٹر بائیک ذرا آگے جا کر رک گئی۔ دو لڑکے سوار تھے۔ وہ مڑ کر کار کی کھڑکی کے پاس آئے۔

''ہیلو، ہیرو بھائی! کیا ہورہا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے بولے۔

''دیکھ نہیں رہے، ڈیٹ پر ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

وہ ہنسنے لگے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے ایک شاپر میں سے مکئی کے دو بھنے ہوئے بھٹے نکالے اور ہم دونوں کی طرف بڑھا کر آگے بڑھ گئے۔

''ہیرو بھائی۔'' کے الفاظ میرے کانوں میں اودھم مچانے لگے۔ یہ تو وہی انداز تھا، یہ تو وہی مناظر تھے...... کیا یہ واقعی...... عمران دانش کا بیٹا میرے سامنے بیٹھا تھا؟

وہ بھٹے پر دانت آزماتے ہوئے بولا۔ ''چاچو جانی! بتا نہیں سکتا، تمہیں دیکھ کر میری حالت کیا ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ میرے دونوں گردوں کو ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔''

اسی دوران میں اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی اور وہ ٹھٹک گیا۔ پینتالیس پچاس سال کا ایک فربہ اندام شخص بڑے پژمردہ انداز میں ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا اور عینک لگا رکھی تھی۔

وہ جو خود کو ''عمران ٹو'' کہہ رہا تھا، بولا۔ ''چاچو جانی! آؤ میرے ساتھ۔ آپ کو ایک تماشا دکھاؤں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

وہ مجھے کھینچتا ہوا...... دوبارہ ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ اندر داخل ہونے والا قدرے فربہ اندام شخص ایک میز پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دے چکا تھا۔ وہ سیدھا اس کی طرف گیا اور ادب سے سلام کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر فربہ اندام شخص کے چہرے پر جھنجلاہٹ ابھر آئی تھی۔

میں وہیں دوسری میز پر بیٹھ گیا۔ وہ جو خود کو عمران ٹو کہہ رہا تھا اور فربہ اندام شخص کے ساتھ سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کر رہا تھا۔ کچھ کچھ الفاظ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

اندازہ ہوا کہ ثمائلہ نام کی کسی لڑکی کی شادی کا ہنگامی معاملہ ہے۔ فربہ اندام شخص کا نام ماسٹر شفیق تھا۔ ثمائلہ اس کی بیٹی تھی۔ وہ غالباً کسی اور لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اس لڑکے کا نام معاذ معلوم ہوا۔ وہ جو خود کو عمران ٹو بتا رہا تھا، معاذ کی وکالت کرنے میں لگا ہوا تھا اور ماسٹر جی سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اللہ رسول کے حکم کے مطابق اپنی بچی کی مرضی کے خلاف نہ جائیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ فربہ اندام ماسٹر شفیق کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور طیش کے تاثرات نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ توجہ مبذول کروانے والا تھا مگر میری توجہ تو ایک طوفان میں گھری ہوئی تھی۔ اس گفتگو سے کہیں زیادہ میں عمران کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب میرے دل نے یہ گواہی دینا شروع کر دی تھی کہ شاید یہ واقعی عمران کا بیٹا ہی ہے مگر...... اس ''مگر'' کے آگے ان گنت سوالات تھے۔

اس سے پہلے کہ ماسٹر شفیق کا غصہ حد سے تجاوز کر جاتا، وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوکے...... اوکے ماسٹر صاحب! ہم پھر بات کریں گے۔''

''کوئی ضرورت نہیں پھر بات کرنے کی۔'' ماسٹر صاحب خود پر بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور وہ عمران ٹو ریسٹورنٹ سے باہر تھے۔ ہم پھر گاڑی میں آن بیٹھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم عمران دانش کے بیٹے ہو؟''

وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔ ''چاچو ڈیئر! یہ سب باتیں ہوں گی اور تفصیل سے ہوں گی لیکن یہ معاملہ زیادہ ایمرجنسی کا ہے، جس شادی کا تم نے ابھی سنا ہے، یہ پرسوں بروز ہفتہ انجام پا جانی ہے۔ ہمیں کسی بھی صورت اسے رکوانا ہے۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔ شتابی سے کہنے لگا۔ ''چاچو! صرف ایک بات بتاؤ، یہ ماسٹر شفیق، تمہیں لالچی بندہ لگا ہے یا نہیں؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''لالچی تو نہیں لگا...... لیکن تم مجھے باتوں میں اڑانے کی کوشش کر رہے ہو، جب تم......''

''بس...... بس...... بس...... تمہیں لالچی نہیں لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ گڑبڑ گوٹالا دوسری طرف ہے۔ وہ بندہ ٹیلر ماسٹر شفیق پر دباؤ ڈال کر اس کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے۔ کوئی اور وجہ ہو ہی نہیں سکتی کہ ماسٹر شفیق اپنی سترہ اٹھارہ

سالہ لڑکی 38 سال کے رنڈوے سے بیاہ دے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کون ہے وہ؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

وہ تیزی سے بولا۔ "چاچو جانی! تم کو ملواتا ہوں اس سے۔ کچھ بھی ہے تمہاری ان پیاری پیاری آنکھوں میں مجھے تجربے اور ذہانت کا دریا بہتا نظر آرہا ہے۔"

میں نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ یہ تو اب ناممکن ہو چکا تھا کہ اب اس زور آور کے "بھتیجے" کو یہاں چھوڑ کر چلا جاتا۔ قریباً بیس منٹ بعد ہم شہر کے گنجان علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ میرا دماغ چٹخنے لگا۔ یہ لاہور کا وہی علاقہ تھا جہاں کبھی عمران کی رہائش تھی اور یہی وہ گلیاں تھیں جن میں وہ اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر دندنایا کرتا تھا۔ ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر اس نے مجھے گاڑی روکنے کو کہا۔ سامنے ہی حجازی کلاتھ ہاؤس کے نام سے ایک بڑی دکان نظر آرہی تھی۔ شیشے کے عقب میں کاؤنٹر پر موٹے نقوش، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور شلوار قمیص والا ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ اسے جواں سال تو ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ عمران نے بے تکلفی سے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہی ہے وہ بندہ جس سے پرسوں شمائلہ کی شادی خانہ آبادی ہو رہی ہے۔"

مجھے واقعی تعجب ہوا۔ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے یہ شخص واقعی بالکل غیر موزوں لگتا تھا۔ عمران نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق اسے شیخ ظہیر کہتے ہیں۔ اس کی پہلی بیوی ایک بیٹی چھوڑ کر دو ڈھائی سال پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ کافی پیسے والا بندہ ہے۔ اب ذرا چلتے ہیں اس کے پاس اور اس کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

میرا دماغ چوپٹ ہو رہا تھا۔ میں اپنی رفتار سے چلتے چلتے اچانک جیسے کسی پہاڑی نالے کے تیز بہاؤ میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے لے کر دکان میں داخل ہو گیا۔ علیک سلیک کے بعد ہم شیخ ظہیر کے سامنے جا بیٹھے۔ شیخ ظہیر اپنی گفتگو سے دھیما اور معاملہ فہم شخص لگا۔ تاہم آنکھوں میں دنیاداری اور ہوسِ زر کی چمک بھی لشکارے مارتی تھی۔ دکان میں کپڑے کے تھانوں کے قریب سرخ کپڑے کا ایک کافی بڑا تھیلا بھی نظر آرہا تھا۔ اس میں نکاح کے لیے بدھی، یعنی چھوہارے، بادام، کشمش وغیرہ۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پرسوں کے لیے پوری تیاری ہے۔

غیر متوقع طور پر عمران نے شیخ ظہیر کے ساتھ شادی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف کپڑے کا بھاؤ تاؤ پوچھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اٹھ گیا۔ ہم واپس گاڑی میں آگئے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھ رہے تھے، ایک ریڑھی والا پھل فروش بڑی عقیدت سے عمران کو سلام کرتے ہوئے گزرا۔

وہ بے تکلفی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "چاچو جانی! اب بتاؤ اس بندے شیخ ظہیر کے بارے میں تمہارا کیا تجزیہ ہے؟ میرا مطلب ہے، کیا وہ بندہ بلیک میلر وغیرہ ہو سکتا ہے؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"خالص کاروباری ہے، پیسا بھی ہے اس کے پاس۔ لیکن دین دار ہے اور دھیمے مزاج کا لگتا ہے۔ میرے خیال میں یہ امکان رد کر دینا چاہیے کہ اس نے ماسٹر شفیق پر رشتے کے لیے کسی طرح کا ناجائز دباؤ ڈالا ہو گا یا دھمکایا ہو گا۔ ویسے وہ لڑکی شمائلہ اس کی دکان پر خریداری کے لیے آتی جاتی رہی ہے۔"

پتا نہیں کیوں، اب مجھے بھی اس معاملے میں تھوڑی سی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "دباؤ روپے پیسے کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ماسٹر صاحب نے اس سے کوئی بڑا قرض لے رکھا ہو اور اب یہ قرض اتارنا ممکن نہ ہو۔"

"چاچو یار! مشہور فلسفی گریگری پیک نے اپنی کتاب "سونے کی تلاش" میں ایک جگہ پنجابی کا ایک شعر لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بندے کو دو ہی چیزیں قرض میں جکڑا کرتی ہیں۔ ایک بیماری اور دوسرے مقدمے بازی۔ جہاں تک میں نے چھان بین فرمائی ہے، ماسٹر شفیق اور اس کی فیملی کو ایسی کوئی مصیبت لاحق نہیں، بالکل بھی نہیں۔"

میں ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ دماغ کی چولیں ہلنا شروع ہو گئی تھیں۔ قریباً وہی شکل و صورت، وہی لب و لہجہ، وہی بے پر کی اڑانے کا انداز...... یوں لگا جیسے عمران دانش نیا جنم لے کر میرے سامنے آن موجود ہوا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ سرعت سے بولا۔ "گاڑی اسٹارٹ کرو چاچو جانی! اب میں تمہیں ملواتا ہوں اس کہانی کے اہم ترین کردار معاذ سے...... اس بالی سی عمر میں بے چارہ بے موت مارا جا رہا ہے...... وہ دل و جان سے فدا ہے ماسٹر شفیق صاحب کی دختر پر...... یہاں سے تھوڑی

ہی دور گھر ہے اس کا۔''

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، جو تم کہتے ہو میں کرتا ہوں لیکن پہلے تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت۔''

اس نے میرے تاثرات دیکھے اور پھر ایک دم جھک کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ''چاچو! قسم کھاتا ہوں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا لیکن اس وقت پھڈا کھوتا نہ کرو۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ کل مہندی ہو جانی ہے اور پرسوں نکاح۔ دیر ہوگئی تو یہ شیخ اس ''کومل'' سی بالڑی کے سارے حقوقِ زوجیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہی کچھ ہوگا جو ''دولت بمقابلہ محبت'' میں ہوتا ہے پلیز پلیز، گاڑی اسٹارٹ کرو۔''

تقریباً دس منٹ بعد ہم اندرونِ شہر کے ایک دو منزلہ گھر کی نچلی منزل پر ایک کمرے میں موجود تھے۔ ہمارے سامنے جو انیس بیس سالہ خستہ حال لڑکا بیٹھا تھا، اس کا نام معاذ تھا اور یہی تھا جس پر شائلہ کے نکاح کی صورت میں ایک بڑی افتاد آن پڑی تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں مسلسل آنسو تیر رہے تھے۔ کمرے کی حالت بھی ابتر تھی۔ چاروں طرف کتابیں اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے بھی تھے۔ جو کچھ عمران سے مجھے معلوم ہوا تھا اس کے مطابق معاذ جہلم کا رہنے والا تھا۔ یہاں لاہور میں وہ بی سی ایس کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک کالج میں پڑھا بھی رہا تھا۔ وہ اور شائلہ ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے، ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے تک سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کو اپنی منزل پانے میں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا۔ معاذ بہت محنتی اور بااخلاق لڑکا تھا۔ شائلہ کے گھر والے بشمول ماسٹر شفیق اسے بہت پسند کرتے تھے۔ خاص طور سے شائلہ کا بھائی آصف، معاذ کا ہم عمر تھا اور دونوں میں گہری دوستی تھی۔

مجھے بھی یہ معاذ نامی لڑکا ہر طرح سے اچھا لگا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا سر! سب جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، چند دن پہلے تک سب ٹھیک جا رہا تھا لیکن پھر ایک دم شائلہ کے نکاح کی بات چل پڑی اور نکاح بھی دیکھیں، کس بندے کے ساتھ، جو عمر میں اس سے دگنا بڑا ہے۔''

''شائلہ اب کیا کہتی ہے؟'' میں نے معاذ سے پوچھا۔

''اس سے بس دو دفعہ فون پر بات ہو سکی ہے۔ آخری بار اس نے کہا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے جو فیصلہ کیا ہے، وہ اس پر خوش ہے۔ اب ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانا چاہیے۔''

عمران نے پوچھا۔ ''وہ اس بارے میں کیا کہتی ہے کہ اس کی شادی ایک پختہ عمر کے بندے سے ہو رہی ہے۔ کیا مجبوری ہے اس کے پیچھے؟''

معاذ، عمران کو بڑے احترام سے بھائی جان کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ ''بھائی جان! کھل کر تو وہ کچھ بھی نہیں بتا رہی۔ صرف اتنا کہا ہے کہ شیخ ظہیر کا والد ماسٹر جی کا پیر بھائی ہے...... اور یہ نکاح پیر صاحب کی ہدایت پر ہی ہو رہا ہے۔ لیکن......'' معاذ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

معاذ نے الٹے ہاتھ سے، آنکھوں میں اُمڈنے والے آنسو صاف کیے اور بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ بات بھی بس ایک بہانہ ہی ہے۔ اصل وجہ کچھ اور ہوگی۔''

میں نے دیکھا اس بے ترتیب، نیم تاریک کمرے میں ایک جانب میز پر دو فریم شدہ تصویریں رکھی تھیں۔ ایک تصویر میں شائلہ اپنے چہرے پر ایک خوب صورت بھولپن لیے نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ خود معاذ خوش گوار موڈ میں کھڑا تھا۔ دوسری تصویر میں شائلہ اپنے بھائی آصف اور معاذ کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ پھول دار دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجا۔ دبلا پتلا معاذ بُری طرح چونک گیا۔ اس نے آواز دے کر پوچھا کہ کون ہے۔ دوسری طرف سے جو آواز آئی، اس نے معاذ کا رنگ ہلدی کر دیا۔ اس نے میز پر موجود دونوں تصویریں جلدی سے اوندھی کر دیں۔ میں نے بھی پہچان لیا، یہ شائلہ کے والد ماسٹر شفیق کی آواز تھی وہ گرجے۔ ''دروازہ کھولو۔''

معاذ نے ڈری ہوئی نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے اسے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر مجھے ساتھ لے کر ایک عقبی کمرے میں چلا آیا۔ یہاں ساتھ ہی چھوٹا سا کچن تھا اور مختصر سا صحن بھی۔ ہم کمرے میں خاموش کھڑے ہو گئے۔ ماسٹر شفیق صاحب اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ سامنے والے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ معاذ پر گرج برس رہے تھے۔ ''تمہارا وہ یار کیوں

آیا تھا میرے پاس؟ وہ کیوں تمہاری وکالتیں کرتا پھر رہا ہے۔ کیا حق پہنچتا ہے اسے میری بیٹی کا نام اپنی زبان پر لانے کا؟ میں...... میں تم دونوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کردوں گا۔''

''ہم...... میں نے کچھ نہیں کیا انکل اور میری دوستی بھی نہیں ہے ان سے...... وہ بس محلے دار ہیں اور......''

''بکواس بند کرو۔'' ماسٹر شفیق نے معاذ کو دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر کسی چیز پر گرا۔ یوں لگا کہ معاملہ مزید بگڑنے والا ہے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے دروازہ کھولا اور اطمینان سے سامنے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ غیظ وغضب سے بھرے ہوئے ماسٹر صاحب نے ہمیں دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئے۔ لرزہ براندام معاذ بھی اپنے کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اسلام علیکم ماسٹر جی۔'' عمران نے بڑی نیازمندی سے کہا۔

''تم...... یہاں؟'' ماسٹر جی کی حیرت پھر طیش میں ڈھلنے لگی۔ لگتا تھا کہ اپنے حواس کھو کر وہ واقعی مارا ماری پر اتر آئیں گے۔ اس موقع پر عمران نے اپنی چرب زبانی کا باکمال مظاہرہ کیا اور دو تین منٹ میں ماسٹر جی کو کافی حد تک ٹھنڈا کر دیا۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے انہیں ایک چھوٹا سا ڈراوا بھی دیا...... اور وہ یہ کہ اس کی معلومات کے مطابق ابھی ان کی بیٹی کی عمر پورے اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی اور اس نکتے کی وجہ سے پرسوں ہونے والا نکاح کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ اسی دوران میں ماسٹر صاحب کے فون پر کال کے سگنل آئے مگر انہوں نے کال ریسیو نہیں کی۔ تاہم ان کے چہرے پر ایک واضح رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

ماسٹر شفیق کو غالباً خود بھی بیٹی کی ٹھیک تاریخِ پیدائش معلوم نہیں تھی لہٰذا وہ کچھ الجھے ہوئے نظر آئے۔ عمران نے انہیں کرسی پیش کی اور مجھے بھی۔ پھر وہ خود بھی بیٹھ گیا اور معاذ سے چائے لانے کو کہا۔ ماسٹر شفیق غصے سے بولے۔ ''میں یہاں چائے پینے نہیں آیا۔ پرسوں میری بچی کا نکاح ہے، اگر کسی نے اس میں کوئی رکاوٹ ڈالی تو فساد ہو گا۔''

''ہم رد الفساد کی کوشش ہی تو کر رہے ہیں انکل۔ آپ تسلی سے بات تو سن لیجیے۔'' اس نے مجھے بات آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے ماسٹر شفیق سے یہی جاننے کی کوشش کی کہ آناً فاناً ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ بیٹی کی شادی کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

ان کا جواب وہی تھا جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ ''وہ ہماری بچی ہے، ہم اسے اندھے کنویں میں پھینکیں، تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔''

اسی گرم سرد گفتگو کے دوران میں لرزتا کانپتا معاذ ایک ٹرے میں چائے کے کپ اور بسکٹ وغیرہ رکھ کر لے آیا۔ وہ ٹرے رکھنے لگا تو کپ پھسل کر الٹ گئے۔ کافی ساری چائے تپائی پر گری۔ عمران اور ماسٹر جی کے موبائل فون بھی شرابور ہوگئے۔

''سوری، ویری سوری۔'' معاذ بار بار یہی کہتا جا رہا تھا۔ کچھ چائے ماسٹر جی کی سفید شلوار پر بھی گری تھی، وہ بھنّائے ہوئے تھے۔

دونوں موبائل فون بُری طرح بھیگ گئے تھے۔

عمران نے جلدی جلدی انہیں کھولا، ان کی بیٹریاں علیحدہ کیں اور ٹشو پیپر سے انہیں خشک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ معاذ بے چارگی کے عالم میں ٹوٹے ہوئے کپس کے ٹکڑے اکٹھے کر رہا تھا۔ کچھ دیر موبائلز کو پھونکیں وغیرہ مارنے کے بعد عمران نے انہیں دوبارہ بند کر دیا۔ ماسٹر صاحب کا موبائل انہیں تھماتے ہوئے بولا۔ ''اب اسے جلدی آن نہ کیجیے گا۔ ٹھیک سے خشک ہو جائے تو بہتر ہے۔'' پھر وہ معاذ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دوسری چائے بنا لو۔''

ماسٹر صاحب نے اپنا موبائل، عمران سے جھپٹا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں لعنت بھیجتا ہوں چائے پر۔ اور یہ بھی بتا دیتا ہوں۔ میرے اور میری بچی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ اپنا غصہ دروازے پر اتارتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ہم تینوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر معاذ نے تاسف کے ساتھ انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔ ''عمران بھائی! مجھے نہیں لگتا کہ اب کچھ ہو سکے گا۔ جب شائلہ ہی کوئی مزاحمت نہیں کر رہی تو پھر ہماری کوششیں بیکار ہیں اور...... میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اس کے نام پر کوئی حرف آئے۔''

عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے کہا۔ ''معاذ! تم کہہ رہے ہو کہ شائلہ کا بھائی آصف تمہارا دوست اور ہمراز بھی تھا۔ اس نے اس معاملے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟''

''ماسٹر صاحب کے سامنے اس کی بھی کوئی پیش نہیں چلی ہوگی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ بدھ کو وہ کراچی چلا گیا تھا۔ اس کا فون بھی بند ہے۔''
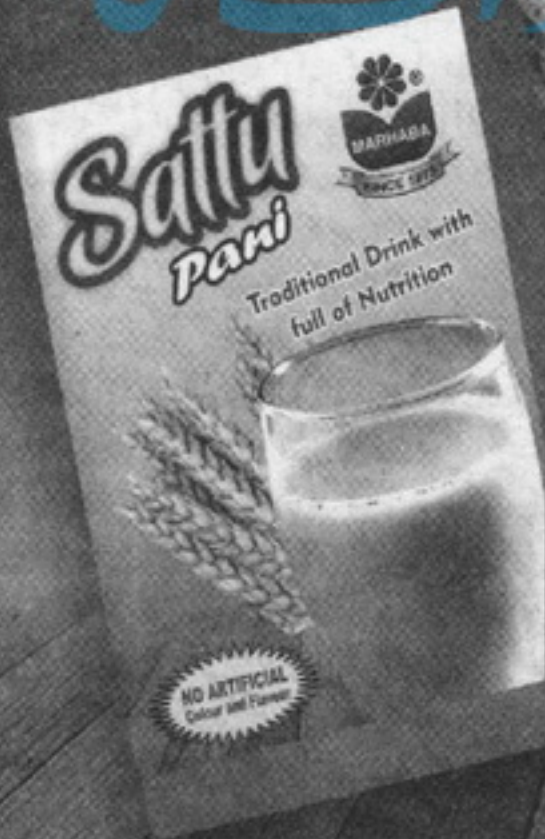
''تو کیا اس کی اکلوتی بہن کی شادی اس کی غیر موجودگی میں ہوجائے گی؟'' میں نے پوچھا۔
معاذ بولا۔ ''میرا تو یہی خیال ہے کہ وہ کراچی بھی گھر والوں سے ناراض ہوکر گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس بے جوڑ رشتے کی......'' معاذ نے اپنی سوچوں کو الفاظ کا روپ دیا۔

☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور عمران پھر گاڑی میں موجود تھے۔ اب شام کے سائے گہرے ہورہے تھے اور اس گنجان آبادی کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ میں جان چکا تھا کہ معاذ کے کمرے میں چائے اتفاقاً نہیں گری تھی جس وقت معاذ چائے رکھ رہا تھا، عمران نے اس کی کہنی کو ہلکا سا ٹھوکا دے دیا تھا۔
وہ معصومیت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ''اب کیا کیا جائے چاچو؟''
میں نے اطمینان سے کہا۔ ''کہاں ہے وہ سم، جو ماسٹر جی کے فون سے نکالی ہے؟''
وہ پہلے تو چپ رہا، پھر مسکرانے لگا۔ ''نظر تو تمہاری بھی عقابی ہے چاچو جانی! بلکہ اسے شاہینی نظر کہنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ فلم بانگ درا تم نے بہت دفعہ دیکھی ہوئی ہے...... یہ بانگ درا فلم ہی تھی ناں؟''
میں نے اسے گھور کر دیکھا تو اس نے اپنا فون نکال لیا۔ اس میں ماسٹر جی والی سم تھی۔ عمران کی اپنی سم ان کے فون میں منتقل ہوگئی تھی۔ عمران نے فون آن کیا اور وہ خیریت سے ہوگیا...... پانچ دس منٹ کے اندر ہم پر ایک نہایت اہم انکشاف ہوا، شمائلہ کا بھائی آصف، ناراض ہوکر کراچی نہیں گیا تھا...... وہ اغوا ہو چکا تھا...... اس کے لیے ماسٹر صاحب کی فیملی سے تاوان مانگا جارہا تھا...... اور تاوان بھی معمولی نہیں ڈیڑھ کروڑ روپیا...... جو سودے بازی کے بعد کم ہوا تھا اور اب ستر لاکھ کے ہندسے پر آچکا تھا اغوا کاروں کی طرف سے یہ بدترین دھمکی بھی موجود تھی کہ آصف کے گھر والے پولیس کو ''اتوالو'' نہیں کریں گے۔ اغوا کاروں کا تعلق اسی علاقے سے تھا اور وہ بہت زیادہ تجربہ کار بھی نہیں لگتے ہاں اضافی طور پر خطرناک ضرور تھے۔ یہ ساری چشم کشا معلومات ہمیں ان ٹیکسٹ اور وائس میسجز سے حاصل ہوئیں جو ماسٹر جی کی سم پر موجود تھے۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، یہ سانحہ رونما ہو چکا تھا اور یہی وہ طوفان تھا جس نے مڈل کلاس ماسٹر شفیق کی زندگی کو ہی تہ و بالا نہیں کیا تھا بلکہ معاذ اور شمائلہ کو بھی جدائی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ان پیغامات کے ذریعے سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔ اپنے اکلوتے بچے کی جان بچانے کے لیے ماسٹر صاحب کی فیملی، شمائلہ کی قربانی دینے جارہی تھی اور وہ بھی سرِتسلیم خم کر چکی تھی۔ شیخ ظہیر، شمائلہ سے نکاح کے بدلے میں یقیناً ایک بھاری بھرکم رقم ادا کررہا تھا۔
عمران نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''دولت کے بدلے عزت کا کھیل کہاں نہیں کھیلا جاتا، وہاں انڈیا میں بھی تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔''
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تو تم...... انڈیا سے آئے ہو؟''
اس نے گڑبڑانے کی اداکاری کی۔ ''نہیں چاچو! میں تو ایک عام بات کررہا ہوں۔''
''تم بہت کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے۔'' میں نے کڑے لہجے میں کہا۔
''بہت کچھ تو نہیں...... لیکن کچھ ضرور چھپا رہا ہوں اور وہ بھی بتادوں گا ایک دو دن میں۔'' اس نے حلفیہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا۔

☆☆☆

رات تاریک تھی۔ ہم بند روڈ کی طرف ایک اجاڑ جگہ پر گاڑی کے اندر موجود تھے۔ یہاں زیادہ تر کارخانے اور ٹرکوں کے اڈے وغیرہ تھے۔ ٹرکوں کی باڈیز وغیرہ بنانے والا ایک کارخانہ ہم سے سو ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس کارخانے کی لوکیشن اس فون سم کے ذریعے ہی معلوم ہوئی تھی جس پر اغوا کنندگان ماسٹر جی کی فیملی سے رابطہ کرتے تھے۔ اس سم کے ذریعے ایک اور سم کا سراغ ملا...... اور پھر اس دوسری سم نے سارا پول کھول دیا تھا۔ یہ کام اپنے ''لنکس'' کے ذریعے میں نے قریباً ایک گھنٹے میں مکمل کرلیا تھا۔ میرے پاس ایک لائسنس یافتہ پستول موجود تھا اور مجھے پتا تھا کہ عمران بھی خالی ہاتھ نہیں ہے۔ ہم اس کارخانے میں گھسنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ آج ایک مدت کے بعد میں اپنے جسم میں وہی سنسنی محسوس کررہا تھا جو عمران دانش کے کندھے سے کندھا ملا کر خطرات میں کودتے وقت محسوس کرتا تھا۔ (ہمارا ماٹو تھا ہمیں موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنا ہے)
کارخانے کی بیرونی دیوار آٹھ فٹ سے زیادہ اونچی تھی۔ آہنی گیٹ بھی اتنا ہی بلند تھا۔ ہم گھوم کر عقبی سمت میں گئے۔ عمران بندر کی طرح دیوار پر چڑھ کر اندر کودا، پھر اس

نے یہاں موجود ایک چھوٹا سا زنگ آلود دروازہ کھول دیا۔
گہری تاریکی میں کاٹھ کباڑ کے درمیان احتیاط سے چلتے ہم آگے بڑھے۔ میں اپنا پستول ہاتھ میں لے چکا تھا۔ یکایک ایک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ ہمیں کتے کی نہایت غصیلی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، رکھوالی کا ایک نہایت جسیم کتا ہماری طرف لپک رہا تھا...... مگر تب...... ایک اور حیران کن منظر سامنے آیا اور اس منظر نے ماضی کی ایک اور تحیر خیز یاد ذہن میں تازہ کردی۔ کتا ہم پر جھپٹنے یا شور مچانے کے بجائے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ عمران گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور پچکارنے لگا۔

کتے کی جارحیت چند ہی سیکنڈ میں نرمی اور پھر فرمانبرداری میں ڈھل گئی۔ اس نے عمران کے سامنے ایک لوٹ لگائی اور پھر دُم کو ہولے ہولے حرکت دیتا ایک نامکمل ٹرک کے ڈھانچے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کون پلٹ کر آیا تھا؟ یہ کس نے گردشِ ایام کو الٹا چلایا تھا؟ یہ تو ہو بہو وہی تھا۔ جو تھوڑے بہت فرق تھے، وہ معمولی تھے۔

ہم دونوں وہیں ڈبک کر کچھ دیر تک آہٹیں لیتے رہے۔ پھر جھک کر چلتے ان دو کمروں کی طرف بڑھے جن میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ وسط میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس کے گرد تین افراد چٹائی پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے ان میں سے ایک کی گود میں اس کا ہتھیار بھی دکھائی دے رہا تھا اور وہ خطرناک سیون ایم ایم رائفل تھی۔ پختہ فرش پر مونگ پھلی کے چھلکوں کا ڈھیر تھا اور یقینی بات تھی کہ یہاں الکحل بھی چل رہی ہے۔ تینوں افراد شکلوں سے ہی خونخوار غنڈے نظر آتے تھے۔

ان تینوں کو دیکھنے کے بعد ہم دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ پہلے کمرے کی طرح یہاں بھی ایک ادھ جلی انگیٹھی موجود تھی۔ ایک درمیانی شکل و صورت کی لڑکی لحاف اوڑھے پلنگ پر سو رہی تھی۔ قریب ہی ٹو سیٹر صوفے پر ایک لڑکا اکڑوں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ یہ سارا منظر ہم نے دروازے کی جھری میں سے بمشکل دیکھا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”خوشخبری چاچو! ہم ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔ یہی شمائلہ کا بھائی ہے۔“

”یہ تو بڑے سکون سے بیٹھا ہے۔ اسے باندھا واندھا بھی نہیں گیا۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔

”حرام زادوں نے ڈرا ہی اتنا دیا ہوگا۔“

اچانک ایک آہٹ نے مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ میں پلٹا۔ ایک گرج سنائی دی۔ ”کون ہے اوئے۔“ اس کے ساتھ ہی ایک موچھیل شخص ہماری طرف لپکا...... لپکنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ہاتھ اپنی گرم چادر کے نیچے گھسا رہا تھا یقیناً کوئی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا۔ عمران اسے اتنی مہلت کہاں دیتا۔ وہ اس پر جھپٹا اور اسے رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اب دروازہ کھلا تھا اور وہاں صرف دو بندے نظر آرہے تھے۔ ایک وہی سیون ایم ایم رائفل والا۔ مجھے اسی کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا۔ ”ہینڈز اپ“ میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کرتے ہوئے مخصوص چھاپا مار گرج کے ساتھ کہا۔

اس نے حماقت کی اور نشانے پر ہونے کے باوجود آٹومیٹک رائفل میری طرف سیدھی کرنا چاہی۔ میری چلائی ہوئی گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرف پٹ سے اوندھے منہ انگیٹھی کے قریب گرا۔ اس دوران میں تیسرا شخص پہلو کی طرف سے مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے لوہے کے ایک بڑے راڈ کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی جو اچٹتی ہوئی میرے کندھے پر پڑی۔ ماہ و سال کی ریاضت نے میرے جسم کو ایسے درد سہنے کی غیر معمولی صلاحیت بخش دی تھی۔ چوٹ کھانے کے باوجود میں نے اس پر جوابی وار کیا اور پسٹل کا دستہ اس کے تھوبڑے پر رسید کیا، وہ کربناک آواز نکالتا ہوا کاٹھ کباڑ میں گرا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شخص نے سیاہ جیکٹ اور سیاہ پینٹ پہن رکھی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے لڑکی کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی مگر میں نے دبوچ لیا۔ اس اثنا میں عمران اپنے مدمقابل کو ناکارہ کر چکا تھا۔ تاہم اس دوران میں ایک غیر متوقع واقعہ ہو گیا تھا۔ مدمقابل کی چلائی ہوئی ایک گولی ایک چھوٹے ٹرک کے ٹینک میں لگی تھی۔ ٹینک میں ڈیزل تھا۔ اس نے تیزی سے آگ پکڑ لی تھی۔ اب یہ آگ بھک بھک کر خوفناک آوازوں سے پھیلتی چلی جارہی تھی۔ پانچ دس سیکنڈ کے اندر اس آگ نے ایک بڑے ٹرک کے ساتھ ساتھ دونوں رہائشی کمروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ کمرا بھی دھڑا دھڑ جلنے لگا جس میں مغوی لڑکا آصف صوفے پر بیٹھا تھا۔

یہ دیکھ کر ہمیں شدید حیرت ہوئی کہ آگ سے بچنے کے لیے وہ صوفے سے اٹھ نہیں رہا تھا بلکہ وہیں بیٹھا کربناک آواز میں چلا رہا تھا۔ میں نے اپنی گرفت میں آئی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہ کوئی بازاری لڑکی تھی جو

دل پشوری کے لیے اس اڈے پر لائی گئی تھی۔ اس نے سراسیمہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ”یہ صوفے سے نہیں اٹھے گا...... اس کے نیچے...... انہوں نے بارود لگایا ہوا ہے۔“

”بارود؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

تاہم اگلے ہی لمحے بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے جھک کر دیکھا، صوفے کے نیچے کوئی ڈیوائس قسم کی شے موجود تھی اور اس میں ایک سرخ بلب اسپارک رہا تھا۔ ”اوہ گاڈ۔“ عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ اور تیزی سے صوفے کی طرف گیا۔ میں بھی لڑکی کو چھوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ آتشزدگی کوئی چھپی رہنے والی چیز نہیں تھی۔ باہر سے بے پناہ شور وغل سنائی دے رہا تھا۔ یقیناً فائر بریگیڈ وغیرہ کو بھی فون کیے جا رہے ہوں گے......

لڑکے آصف کا رنگ دہشت سے سفید ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یا پھر اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس قسم کا بم کس طرح کام کرتا ہے۔ جونہی صوفے کے کشن پر سے اس کے جسم کا دباؤ ایک خاص حد سے کم ہوتا، یا ختم ہوتا یہ ڈیوائس بلاسٹ ہو جاتا اگلے دو تین منٹ بے حد لرزہ خیز تھے۔ آگ تیزی سے کمرے کو ڈھانپتی چلی جا رہی تھی۔ حدت بے پناہ ہو گئی تھی۔ عمران نیچے بیٹھ کر بم کے میکنزم کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس ناکامی میں، میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اگلے بیس تیس سیکنڈ میں اگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم مزید اس کمرے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ آصف رحم طلب نظروں سے ہماری جانب دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ گو بات معمولی تھی لیکن اس کا ”بروقت“ ذہن میں آجانا اہم تھا اور یہ بات شاید...... میرے اور عمران کے ذہن میں ایک ساتھ ہی آئی تھی۔ ٹو سیٹر صوفہ کافی وزنی تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ ہم دونوں اسے آصف سمیت اٹھا نہ سکتے۔ بالکل آخری لمحوں میں ہم آصف کو آگ اور دھوئیں کے مرغولوں میں سے نکال کر باہر سڑک پر لے آئے...... وہ سکتے کی سی کیفیت میں صوفے پر موجود تھا۔

سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ کارخانے کے اردگرد کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ایک شخص کے پاس بڑے سائز کی سرچ لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے لائٹ اس سے جھپٹی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ٹو سیٹر صوفے کے نیچے دیکھنے لگا۔ دو منٹ کے اندر اندر مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ جس بم کے ذریعے آصف کو صوفے سے ”اٹیچ“ کر دیا گیا ہے، وہ دراصل بم ہے ہی نہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کسی ٹرک کے انجن کا پرزہ تھا جس کے ساتھ بجلی کے تین چار تار جوڑ کر بلب لگا دیا گیا تھا۔ یہ سب ایک ڈراوا تھا جو آصف کو دیا گیا تھا اور وہ کئی دن سے اس سنگین ڈراوے کے نرغے میں تھا۔ میں نے نیلے رنگ کا ایک تار کھینچا اور اسپارک کرتی ہوئی سرخ لائٹ بھی بجھ گئی۔

”ڈراما تھا سارا؟“ عمران نے کہا۔

”سو فیصد۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس بلب اسپارک کرتا تھا۔ اس بٹن سے آن آف بھی ہو جاتا تھا۔“

میں نے عمران کے ساتھ مل کر آصف کو صوفے سے اٹھایا اور وہ لرزتا کانپتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

عمران نے زور سے میرا کندھا دبایا اور اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ ہم ہجوم میں سے راستہ بناتے اپنی گاڑی تک آ گئے۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چاچو یار! ایک بندہ جان سے چلا گیا ہے، دوسرا زخمی ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہ کافی تگڑا پولیس کیس بن چکا ہے۔ فی الحال ہم یہاں سے نکلیں۔ بعد میں دیکھیں گے، کیا کرنا ہے۔“

”لیکن پولیس تو آ چکی ہے۔“

”کہاں؟“ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

”تمہارے سامنے تو کھڑی ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ (اس مرتبہ حیران کرنے کی باری میری تھی)

”کیا مطلب؟“

میں نے جیکٹ کی جیب سے اپنا کارڈ نکالا۔ ”عمران! میں پولیس ڈپارٹمنٹ سے بطور فزیکل ٹرینر منسلک ہوں۔ اب میرا عہدہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا ہے...... اور...... میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔“

”ہائیں۔“ اس نے دیدے گھما کر کھوپڑی سہلائی اور میری۔ آئی ڈی کو غور سے دیکھنے لگا۔

میرے سینے میں جوش، سنسنی اور محبت کی ایک عجیب لہر سی پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پچھلے پندرہ برس یکا یک میری زندگی میں سے ”مائنس“ ہو گئے ہیں۔ میں نے عمران کی طرف بازو وا کیے ایک دوست کی طرح اسے گلے سے لگا لیا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔“ وہ میرے کندھے سے لگے لگے بولا۔

”میں بھی بہت کچھ سمجھ نہیں پایا۔“ میں نے ترت جواب دیا۔ ”چلو کہیں بیٹھتے ہیں، آرام سے بات کرتے ہیں۔“

❖❖❖

کچھ دل نیکی کے لیے بنے ہوتے ہیں۔۔۔ وہ نیکی کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔۔۔ وہ بھی ان لمحوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ مختلف لوگوں کے چہروں کو کھوجتا رہتا تھا کہ کہیں ان کو کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔۔۔ بالآخر اسے کوئی نہ کوئی ایسا شخص ٹکرا ہی جاتا۔۔۔ مگر اس دفعہ کی نیکی اس کے گلے پڑ گئی تھی۔۔۔

خوف، دہشت اور ڈرامائی صورتِ حال کے گرد گھومتی پُراسرار کہانی......

بے گھر

مظہر سلیم ہاشمی

میں نے ڈیش بورڈ پر نگاہ دوڑائی تو شام کے سات بج رہے تھے۔ میں اس وقت گاڑی چلاتے ہوئے کیری، نیو میکسیکو کی ریاست میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے ہائی وے پر ہی موجود ایک ٹرک اسٹاپ پر گاڑی روکی تبھی وہ مجھے ایک بینچ پر بیٹھا دکھائی دیا۔

وہ جولائی کی ایک گرم سہ پہر تھی اور میں پچھلے نو گھنٹے سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں اس دوران میں آٹھ سو کلو میٹر سے زائد کا فاصلہ طے کر چکا تھا لیکن ارادہ تھا کہ جلدی ڈنر

کرنے کے بعد کوئی دو، تین سو کلومیٹر مزید سفر کروں گا اور پھر رات بھر کے لیے کسی موٹیل میں آرام کروں گا۔

اتنا تردد کرنے کی ایک وجہ تو میری اپنی برن سائڈ کیمیکلز کی جاب تھی لیکن دوسری اہم وجہ کیرن تھی...... وہ لاس اینجلس میں شدت سے میری آمد کی منتظر تھی۔ ہم پچھلے دو ہفتوں سے نہیں ملے تھے اور میں اسے بہت زیادہ مس کررہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ کیرن کے بھی میرے بارے میں کچھ ایسے ہی جذبات ہوں گے۔ فون پر البتہ وہ بڑے محتاط انداز میں بات کرتی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی...... بس کچھ لوگ جیسے ہر بات کا اظہار کرنے میں شرمیلے ہوتے ہیں وہ اسی طرح محبت کے برملا اظہار کرنے میں شرما جاتی تھی۔ مجھے اس کا محبت اور شرم کے مارے سرخ ہو جانے والا چہرہ بہت پسند تھا۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اس وقت بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی اوڈی کار کی ٹینکی فیول سے بھری اور وہیں پر واقع ایک کیفے نما ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں ٹھہرا دی۔ وہاں سے پیدل چلتا ہوا جب میں داخلی دروازے کی جانب جارہا تھا تبھی میری نظر اس شخص پر پڑی جو بینچ پر ڈھیر ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ کسی باسکٹ بال کے کھلاڑی کی طرح لمبا تھا۔ سچ کہوں تو میں نے باسکٹ بال ایرینا سے باہر پہلی بار اتنا لمبا کوئی آدمی دیکھا تھا۔ سات فٹ کے لگ بھگ قد، دبلا بدن لیکن کمزور نہیں، معمول سے کہیں زیادہ چوڑے ہاتھ اور انگلیوں کٹی پھٹی تھیں جیسے وہ بہت زیادہ مزدوری کرتا رہا ہو۔

اس نے پسینے میں بھیگی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جینز کی خستہ حال پتلون کے ساتھ بوٹ بھی پرانے تھے۔ وہ آگے کی جانب اس طرح سے جھک کر بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان جھول رہے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سینے پر ٹکی ہوئی تھی جبکہ نگاہیں زمین پر اس کے قدموں میں دھرے ایک ڈفل بیگ پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

اس کے بڑے سے چہرے پر چھائی اداسی دیکھ کے بے اختیار ہی میں افسردہ ہونے لگا۔ وہ گرمی کی شدت سے بے چین دکھائی دیتا تھا۔ تھکن اس کے انگ انگ سے نمایاں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی نوعمر لڑکا ہو جسے رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہ ملا ہو...... اور نہ ہی کوئی اس کو مزید اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار ہو۔ حالانکہ وہ کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا۔ لگ بھگ چوبیس پچیس سال کا ہی ہوگا، یعنی کوئی مجھ سے چند سال چھوٹا۔

میں تیزی سے قدم اٹھاتا اس کے پاس سے گزر گیا...... پھر یکلخت ہی رکا اور مڑ کر واپس آ گیا۔ اس میں کچھ عجیب بات تھی۔ شاید چہرے پر چھائی افسردگی۔ کیرن کہتی تھی کہ میں کسی بے گھر کو دیکھ لوں تو خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ کوئی راستے سے بھٹک گیا ہو، کھو گیا ہو یا گھر سے نکال دیا گیا ہو...... میں ان سب کی مدد پر ہمیشہ ہی آمادہ رہتا تھا۔ یہ مدد صرف انسانوں تک محدود نہیں تھی...... بقول کیرن میں کسی گمشدہ بلی کو بھی بے گھر دیکھتا تو گھر لے آتا تھا اور اس کی یہ بات صرف حیوانوں تک محدود نہ رہی تھی۔ میں اس کی باتوں کا برا نہیں مناتا...... کیونکہ میں واقعی لوگوں کی مدد کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ انسان اگر اپنے جیسے انسانوں کی مدد نہیں کرے گا تو پھر کیا آسمان سے فرشتے اتریں گے ان کی امداد کے لیے؟

”مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہوں......“ میں نے بات کا آغاز کیا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور بھوری سی تھیں جن میں نامعلوم سی اداسی کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ ان چاکلیٹ براؤن آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ایک بلی یاد آ گئی جسے میں ایک بار گھر لے آیا تھا اور کیرن نے سخت ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

”گرمی ہے......“ اس نے مختصر ترین الفاظ میں اپنی پریشانی بیان کر دی۔ اس کی آواز نرم تھی لیکن اس میں تھکن کا عنصر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

”واقعی بہت زیادہ گرمی ہے......“ میں نے بات کو بڑھایا اور پھر سوال کیا۔ ”تم اندر کیوں نہیں چلے جاتے؟ اتنا بڑا بڑا لکھا ہے کہ اندر ائرکنڈیشن چل رہا ہے۔“ کیفے کے باہر اس کی جو خوبیاں لکھی تھیں، ان میں ائرکنڈیشنڈ ہال کا تذکرہ جلی حروف میں کیا گیا تھا۔

”نہیں جا سکتا...... میرے پاس وہاں خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔“

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے......“ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہاں کہیں آس پاس سے ہو؟“

”نہیں...... بس گزر رہا تھا اس علاقے سے۔“

”اور تمہاری گاڑی کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس پیٹرول کے پیسے تو ہیں نا؟“

”میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے......“ اس نے جواب دیا۔

"پھر تم یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کسی سے لفٹ لے کر آئے ہو؟"

"پیدل چل کر......"

"پیدل چل کر......" میں حیرت کی شدت سے چلاتے ہوئے بولا۔ "کہاں سے؟"

"قصبے سے ہی پیدل آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"یعنی تم ٹوکم کیری قصبے سے یہاں تک پیدل چل کر آئے ہو؟" میری حیرانی ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ "وہاں سے یہاں آنے تک تو کوئی سایہ دار علاقہ بھی نہیں ہے...... تم اس وقت سے شدید گرمی میں پیدل چل رہے ہو؟"

"کسی نے راستے میں لفٹ ہی نہیں دی۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ "آج کل کوئی لفٹ دیتا ہی نہیں ہے۔"

"تم تو تھکن سے بے حال ہو چکے ہو گے......" میں نے اندازہ لگایا۔ "تم نے آخری بار کھانا کب کھایا تھا؟"

"کل شام میں کسی وقت کھایا تھا......" اس نے جواب دیا۔

وہ نہ صرف تھکا ہوا تھا بلکہ کئی پہر سے بھوکا بھی تھا۔ مجھے بڑی شدت سے اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔

"یہاں پر بہت سے لوگ رکتے ہیں......" میں نے آہستگی سے کہا۔ "تم کسی سے بھی کہہ دیتے تو وہ تمہاری مدد کر دیتا۔ میرا مطلب ہے......"

"میں بھکاری نہیں ہوں......" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

اُس کے لہجے کی قطعیت سن کر میں ایک بار ہچکچا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو جی میں آیا کہ اسے اُس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں لیکن میرا مزاج ایسا نہیں کہ کسی کی بدحالی دیکھ کر بھی دل نہ پسیجے۔

"بھیک کے بجائے کوئی تمہارا ہمراہی...... کوئی راستے میں ملنے والا دوست مسافر تمہاری مدد کرنا چاہے تو؟" میں نے ہر ممکن مناسب الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہائیں؟" اس کے چہرے پر ہونقوں والے تاثرات ابھر آئے جیسے میری بات اس کی سمجھ نہ آئی ہو۔

"چلو اٹھو یہاں سے......" میں نے اب کی بار اسے واضح الفاظ میں دعوت دی۔ "میں تمہیں کولڈ ڈرنک بھی پلاؤں گا اور مزے دار سینڈوچ بھی کھلاؤں گا۔"

وہ حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا جیسے میں نے عقل سے بعید کوئی بات کی ہو۔

"تم یہ سب میرے لیے کرو گے؟" اس کے لہجے میں استعجاب نمایاں تھا۔ "لیکن کیوں؟"

"کیونکہ میں ایک دوست مسافر ہوں......" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے بھی کھانے کا وقت ہو گیا ہے...... تم بھی اس وقت بھوکے ہو اور میرے پیٹ میں بھی چوہے دوڑ لگا رہے ہیں۔"

میرے انداز پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نما چیز ابھری جو فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"آج تک کسی نے بھی میرے لیے ایسا کچھ نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں تشکر سے زیادہ اب بھی حیرت تھی۔

"زندگی میں ہر کام کبھی نہ کبھی پہلی بار ضرور ہوتا ہے......" میں نے کہا۔ "تو کیا خیال ہے، تمہارے ساتھ پہلی بار ایسا ہو جائے؟"

"ٹھیک ہے......" اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تہ کیا ہوا وجود سیدھا ہو گیا ہو۔ اُف خدایا...... وہ بہت طویل قامت تھا...... مجھ سے تقریباً دوگنا لمبا۔ میں نے اس کے قد کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ بالکل ہی غلط ثابت ہوا تھا۔ میرے سامنے وہ کسی کھمبے کے مانند ایستادہ ہو گیا...... ایسا لگتا تھا کہ وہ جیسے کوئی دیوزاد ہو۔ بس مہربان اور نرم دل قسم کا دیوزاد...... ورنہ وہ بہت خوفناک لگتا۔

ہم لوگ کیفے ٹیریا میں داخل ہو گئے۔ ڈنر کا وقت ہو چکا تھا اس لیے ہال تقریباً بھر چکا تھا۔ دور کونے میں ایک ٹیبل خالی تھی چنانچہ ہم اس جانب بڑھ گئے۔ لوگ گردنیں موڑ موڑ کر ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ غالباً ایک دیوزاد اور مجھے ایک ساتھ چلتے دیکھنا بھی عجیب تجربہ تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد بھی کچھ لوگ عجیب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ وہ اُن کی جانب سے بالکل ہی بے پروا نظر آ رہا تھا۔

ایک ویٹریس شیشے کے گلاسوں میں ہمارے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آئی...... مینیو کارڈ بھی اس کے پاس تھے جو اس نے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے۔ اس دیوزاد نے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ کرتے ہوئے پورا گلاس خالی کر دیا۔ ویٹریس حیرانی سے اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ کوئی انوکھی مخلوق ہو اور سرکس سے بھاگ کر یہاں کھانا کھانے آ گیا ہو۔

میں نے مینیو کھولنے کی زحمت نہ کی اور آلو کے چپس، ایک بڑے لیمن جوس کے گلاس کے ساتھ پنیر گوشت والے برگر کا

آرڈر کر دیا...... دیوزاد نے بھی میری تقلید کی۔
''میرا نام جیک ہے۔'' ویٹریس کے جانے کے بعد میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''جیک تو بن...... تمہارا کیا نام ہے؟''
''بریک بون۔''
''بریک بون......'' میں حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے ہڈی توڑ؟''
''ہاں وہی وہی...... مجھے سب اسی نام سے بلاتے ہیں...... بریک بون۔'' وہ بولا۔
''بڑا ہی انوکھا نام ہے۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''یہ میرا اصل نام نہیں ہے...... بس جیسے کسی کا نک نیم ہوتا ہے یہ ویسا ہی ہے۔'' اس نے وضاحت دینا شروع کی۔ ''میں بہت بڑا ہوں نا...... اور میرے ہاتھ دیکھو، بہت مضبوط ہیں...... میں ان سے کچھ بھی توڑ سکتا ہوں۔''
''ٹھیک ٹھیک...... مجھے یقین آ گیا۔'' میں نے اس کے کسی بڑے تھال جتنے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس مجھ پر ایک مہربانی کرنا کہ کبھی مصافحہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''
''اوکے......'' اس نے یک لفظی جواب دے کر میری درخواست قبول کی اور پھر میرے پانی کے گلاس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے یہ نہ پینا ہو تو میں لے لوں؟''
''کیوں نہیں؟'' میں نے خوش دلی سے کہا۔
اُس نے شکریہ ادا کرنے کا تکلف کیے بغیر میرا گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں ختم کر دیا۔
''تو تم کہاں جا رہے ہو...... بریک بون؟'' میں اس کا نام لیتے ہوئے قدرے ہچکچایا لیکن پھر بھی سوال کر دیا۔
''کہیں خاص نہیں...... میں گھومتا پھرتا رہتا ہوں...... بہت ساری مختلف جگہوں پر۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔
''کیا تم اپنے لیے کوئی کام تلاش کرتے پھر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں ڈھونڈ رہا ہوں......'' اس نے بتایا۔
''تم کس طرح کا کام تلاش کر رہے ہو؟'' میں نے بات آگے بڑھائی۔
''کسی بھی طرح کا...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ کندھوں کو اچکاتے ہوئے بولا۔
''برا نہ مناؤ تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ آخر تمہارا گھر کہاں ہے؟'' میں نے نیا سوال داغ دیا۔
''میرے پاس گھر نہیں ہے......'' یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب طرح کی یاسیت در آئی تھی۔ ''میں بے گھر ہوں۔''
''اوہو...... میرا مطلب ہے کہ تم ہو کس علاقے سے؟'' میں نے وضاحت کی۔ ''ملک کے کس کونے سے تعلق رکھتے ہو؟''
''مڈویسٹ سے ہوں......'' وہ اتنی مختصر سی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس موضوع پر کسی قسم کی گفتگو پسند نہیں کرے گا چنانچہ میں نے گفتگو کا موضوع تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
''میں کیلیفورنیا جا رہا ہوں......'' میں نے اسے بتایا۔ ''میرا پنسلوانیا سے وہاں تبادلہ ہو گیا ہے۔ مجھے وہاں پچھلی سے کئی گنا بہتر نئی نوکری مل گئی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی اچھی جاب کرنے جا رہا ہوں۔ ویسے میں ایک ریسرچ کیمسٹ ہوں۔'' میں نے اپنی کمپنی اور جاب کے بارے میں تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔
''آں...... ہاں۔'' اس نے ایک ہنکارا بھرا۔
میری گرل فرینڈ وہاں میری منتظر ہے......'' میں بولا۔ ''وہ دو ہفتے قبل ہی وہاں پہنچ گئی تھی تا کہ ہمارے اپارٹمنٹ کی تزئین و آرائش کر سکے۔ ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں۔ جیسے ہی میں اپنی نئی جاب پر سیٹل ہو جاؤں گا تب ہی ہم شادی کر لیں گے۔ شاید اسی سال کے آخر تک......''
''میری کبھی کوئی گرل فرینڈ نہیں رہی۔'' وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولا۔
''یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔'' میں بولا۔ ''خدا نے ہم انسانوں کو جوڑوں میں پیدا کیا ہے۔ ہر لڑکے کی گرل فرینڈ ضرور ہونی چاہیے۔ ہاں اگر وہ لڑکوں......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن وہ سمجھ گیا تھا۔
''مجھے لڑکوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم ایسا کوئی شوق رکھتے ہو۔'' میں نے فوراً ہی صفائی پیش کی حالانکہ وہ میری بات پر ناراض یا غصے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے...... ویسے پریشان مت ہو، ہو سکتا ہے کہ تمہیں وہ جلد ہی مل جائے۔''
''مشکل ہے......'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''وہ مجھے پسند نہیں کرتی ہیں...... میں بہت بڑا ہوں۔ کسی جن

جیسا......''

''تم بڑے ہو تو کیا ہوا...... بہت سی لڑکیاں بھی بڑی لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور انہیں تمہارے جیسے مردوں کا ساتھ ہی درکار ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا ساتھ کسی کو نہیں چاہیے ہوتا......'' اس نے کہا۔

میں نے اس موضوع پر مزید بات نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک بات چیت کرنا ایک مشکل کام تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس کا دماغ تھوڑا سست روی سے کام کرتا تھا اور وہ سیدھا بھی نہیں سوچتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دماغی طور پر کمزور ہو۔

ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا اس لیے خاموشی پہ ہی اکتفا کیا گیا۔ کھانا آیا تو میں نے سکون سے اپنا برگر کھایا لیکن وہ چند لقموں میں ہی سب ٹھونس گیا۔ میری پلیٹ ابھی آدھی سے بھی زیادہ بھری تھی اور وہ اپنا سب کچھ ختم کر چکا تھا۔

''بے چارہ......'' بے ساختہ ہی میرے ذہن میں سوچ ابھری۔ نجانے کب سے اسے مناسب خوراک نہیں ملی تھی۔ اگر چکنائی میں لتھڑے ہوئے برگر اور فرائز کو ڈھنگ کا کھانا سمجھا جا سکتا ہے تو بڑے عرصے بعد ہی اسے ڈھنگ کا کھانا ملا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے اس بھوکے کو کھانا کھلانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے کھانے کا بل چکایا اور ہم ریستوران سے باہر نکل آئے۔ گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا اور موسم اب اے سی کے بغیر بھی قابل برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ماتھے پر تیوریاں چڑھائے انٹر اسٹیٹ 40 کی جانب جانے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت گہری سوچ میں ہو۔

''اب تم کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں......'' وہ اپنے شانے اُچکاتے ہوئے بولا۔ ''آج کل کھیتوں پر مزدوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے مستقل بنیادوں پر کوئی کام نہیں ملتا۔ شاید شہر میں کوئی کام مل جائے۔''

''قریبی شہر بھی کافی فاصلے پر ہے۔'' میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''مسئلہ ہی کوئی نہیں......'' وہ بولا۔ ''مجھے لمبے فاصلے پیدل طے کرنے کی عادت ہے...... اور راستے میں کہیں بھی سو سکتا ہوں۔''

مجھے اُس کی باتیں سن کر دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ آج کے جدید دور میں بھی وہ شخص زمانہ قدیم کے انسانوں والی عادات اپنائے ہوئے تھا اور اس کی واحد وجہ فقط مالی عدم استحکام تھا۔

''سنو بریک یون...... اگر تم چاہو تو میں تمہیں سانتا روزا تک لفٹ دے سکتا ہوں۔'' میں نے اپنے راستے میں آنے والے قریبی شہر کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''وہاں میں کسی اچھے موٹل میں تمہارا رات گزارنے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ آج کل دوسرے شہر منتقل ہونے کی وجہ سے ذرا رقم کی کمی کا شکار ہوں لیکن ایک اور وقت کا اچھا کھانا کھانے کے پیسے بھی دے دوں گا...... لیکن اگر تمہارے لیے یہ پیشکش قابل قبول ہو تو ہی ایسا ہو سکتا ہے۔''

میں نے آخری جملہ اس لیے کہا تاکہ اُس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ وہ گہری اور پُرسوچ نگاہوں سے مجھے تکتا رہا۔

''یہ سب تم میرے لیے کرو گے؟'' وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حیرانی سے بولا۔ ''لیکن کیوں؟''

اسے شاید زندگی میں کبھی بھی اچھے رویّے کا سامنا نہیں ہوا تھا اس لیے اس کا استعجاب مبنی بر حقیقت تھا۔

''بس سمجھ لو دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ مجھے لوگوں کے کام آنا پسند ہے۔ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ کسی کی مدد کر کے خوشی ملتی ہے۔ اب بتاؤ کہ لفٹ قبول ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ہم دونوں میری اوڈی کار میں سوار ہو گئے۔ وہ اتنا زیادہ لمبا تھا کہ نشست پر تقریباً نیم دراز ہو کر بیٹھنا پڑا۔ اس کا ڈفل بیگ نیچے رکھا تھا لیکن پھر بھی اس کے گھٹنے ڈیش بورڈ کو چھو رہے تھے اور اس کا سر، کار کی چھت کو۔ سفر پر روانہ ہونے کے بعد وہ بالکل ہی خاموش ہو گیا...... وہ پہلے ہی بات چیت کم کرتا تھا اور میرے پاس بھی اس سے گفتگو کے موضوعات ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے مجھے اس بات کی خاص پروا نہ تھی۔ سارا دن ڈرائیونگ کرنے کے بعد میں بھی اس موڈ میں نہیں تھا کہ خوامخواہ گفتگو کرتا رہوں...... ویسے بھی ڈرائیونگ کے دوران بات چیت کی وجہ سے مجھے اُلجھن ہی ہوتی تھی۔

یہ صحرائی علاقہ تھا...... دور دور تک کسی ذی نفس کا نشان نظر نہیں آتا تھا۔ دور کہیں ٹیلے اور بے آب و گیاہ میدان نظر آ جاتے تھے۔ کہیں کہیں اصطبل اور کھیت بھی موجود تھے۔ گھوڑے تو پھر بھی ایسے ماحول میں گزارہ کر لیتے تھے لیکن گائے بھینسیں کیسے خشک چارے پر گزر بسر کرتی تھیں، یہ

میری سمجھ سے باہر تھا۔ بیشتر علاقہ بنجر تھا اور کہیں کہیں کیکٹس کے پودے یا دیگر خاردار جھاڑیاں نظر آجاتی تھیں۔

ٹریفک بھی خال خال ہی تھی۔ کوئی اکا دُکا گاڑی نظر آجاتی تھی۔ ہم سکون سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے تب کوئی بیس بائیس کلومیٹر کے بعد ایک انٹر چینج آیا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو مجھے ایک لڑکا نظر آیا جو کندھے پر بیگ لٹکائے گھاس پر ٹھہرا تھا۔ وہ کسی گاڑی سے لفٹ لینے کا منتظر دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور آوارہ گرد جو مفت سفر کا خواہاں تھا۔ اس ہائی وے پر کسی سے بھی لفٹ لینا خلاف قانون تھا لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جاتا تھا جو ان قواعد کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

بریک بون اپنی ونڈ وسیٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وقت باہر ہی دیکھ رہا تھا۔ جب ہم لڑکے کے پاس سے گزر کر آگے جانے لگے تو وہ ایک دم ہی چلا اٹھا۔

”روکو روکو...... گاڑی روکو۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں یکلخت ہی اس کی حرکت سے چونک اٹھا تھا۔ ”میں ایسے آوارہ گردوں کو نہیں بٹھاتا اپنی گاڑی میں......“

”گاڑی روکو......“ وہ غرایا۔

”گاڑی روک بھی دوں تو پیچھے میرا اتنا سامان رکھا ہے کہ کسی کو بٹھانے کی جگہ نہیں......“

میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنا بھاری بھرکم اور چوڑا ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ کر دبا دیا۔

”آہ......“ میرے حلق سے بے اختیار ہی ایک کراہ خارج ہوئی۔

”گاڑی روک دو......“ اس نے پھر سے کہا۔

مجھے اتنی تکلیف ہو رہی تھی جیسے میرا گھٹنا کسی آہنی شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہو۔ مجھے ہڈی کے کڑکڑانے کی آواز آرہی تھی اور درد کی شدید لہریں میری پوری ٹانگ میں دوڑنے لگی تھیں۔ میں نے بنا سوچے سمجھے بریک پیڈل پر اتنی تیزی سے پاؤں کا دباؤ ڈالا کہ گاڑی ایک بار میری گرفت سے نکل گئی۔ گاڑی قابو سے باہر ہو کر ایک بار لہرائی، اس کا پچھلا حصہ ٹیڑھا ہوا اور گاڑی سڑک کے بیچ میں ٹیڑھی ہو کر رک گئی۔

پہیوں کی چرچراہٹ کافی زیادہ تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ کوئی پچاس فٹ تک سڑک پر ان کی رگڑ کے نشان ثبت ہوگئے ہوں گے۔ میں نے گاڑی کو سیدھا کیا اور ایک جانب کر کے روک دی۔ صد شکر کہ اس وقت آس پاس کوئی اور گاڑی نہیں تھی ورنہ حادثہ ایسا ہوتا کہ میرا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

میں یہ سب سوچ کر ہی جھرجھری لے کر رہ گیا۔

”لعنت ہو......“ بے ساختہ ہی میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تم کیا سوچ رہے تھے؟ کوئی حادثہ بھی ہوسکتا تھا، ایسے اچانک بریک لگانے سے گاڑی الٹ بھی سکتی تھی۔ تم نے دیکھا کیسے میرے قابو سے باہر ہوگئی تھی؟“

اس نے میری بات اَن سنی کر دی۔ وہ اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر پیچھے کی جانب دیکھتے ہوئے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا تو وہ راہ گیر دوڑتا ہوا ہماری جانب ہی آرہا تھا...... اس نے اپنا بیگ سینے سے لگایا ہوا تھا۔

وہ اٹھارہ انیس برس کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ سنہری بال اور گرمی کی شدت سے جھلسی ہوئی رنگ کا مالک...... کپڑے اس کے مناسب سے ہی تھے۔

بریک بون اس کے قریب پہنچنے پر اٹھ کر باہر نکلا اور گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

لڑکا اس کا قدوقامت دیکھ کر ایک مرتبہ ٹھٹک کے رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”واؤ......“ بے ساختہ وہ بولا۔

”جلدی سے اندر بیٹھو......“ بریک بون نے کہا۔ ”سیٹ پر کافی جگہ موجود ہے۔“

”شکریہ...... شکریہ۔“ لڑکے نے ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے بیٹھے دیکھ کر بریک بون سے کہا اور سیٹ پر سامان کے ساتھ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے اس نے اپنا بیگ گود میں ہی رکھ لیا تھا۔

”باہر بہت گرمی تھی...... اُف یہ ائرکنڈیشن کی ہوا کتنی اچھی لگ رہی۔“ لڑکا بولا اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ آج کوئی لفٹ ملے گی...... ایسا لگتا تھا کہ آج رات مجھے کھلے آسمان کے نیچے ہی گزارنا پڑے گی۔“

”میں بھی تقریباً نہیں رکا تھا۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”ہاں میں نے دیکھا...... آپ نے بڑی عجلت میں بالکل ہی آخری لمحے میں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ لڑکے نے کہا۔

”میرا فیصلہ نہیں تھا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

بریک بون ایک بار پھر سے میرے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

"چلو اب چلیں۔" وہ بولا۔

میں احتجاجاً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے گھٹنے سے ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ویسے بھی وہ لڑکا اب لفٹ لے کر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا تو یہ بات کرنا چڑیوں کے کھیت چگنے کے بعد رونے والی کیفیت کے مترادف ہی بن جاتا تھا۔ جو ہوا سو ہوا...... اب مجھے آگے کا سوچنا تھا۔ میں نے گاڑی کو گیئر لگایا اور اسے آہستگی سے ہائی وے پر لے آیا۔

تقریباً دو تین کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے خاموشی میں طے کیا اور اس کے بعد ہی نو وارد لڑکا بول اٹھا۔

"یہاں بہت سارا سامان پڑا ہے...... آپ لوگ کہیں منتقل ہو رہے ہیں؟"

"صرف میں جا رہا ہوں......" میں نے قدرے درشت لہجے میں مختصر جواب دیا کیونکہ ابھی تک میرے مزاج میں بریک بون کی حرکت کے باعث پیدا ہونے والی برہمی کا اثر باقی تھا۔ "کیلیفورنیا۔"

"میں فینکس جا رہا ہوں......" لڑکا تیزی سے بولا۔ "ایریزونا اسٹیٹ یونیورسٹی۔ میں وہاں کا طالب علم ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ آپ اتنی دور تک مجھے لفٹ دیں گے...... لیکن اگر آپ اسی ہائی وے پر سفر کرتے رہیں تو مجھے فلیگ اسٹاف تک چھوڑ سکتے ہیں۔"

"دراصل میں......" میں نے کوئی بہانہ بنانے کا سوچا ہی تھا کہ لڑکے نے میری بات کاٹ دی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں اگر آپ یہ راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتے......" لڑکا ابھی بھی تیز تیز بات کر رہا تھا۔ "آپ نے مجھے لفٹ دے دی...... آپ کا یہی احسان بہت زیادہ ہے۔ آپ جہاں مناسب سمجھیں وہاں اتار دیجیے گا۔ ویسے میرا نام روبن ہے...... یار دوست مجھے روب کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"جیک......" میں نے مکمل تعارف کے بجائے صرف اپنے نام کا پہلا حصہ بتانے پر اکتفا کیا۔

بریک بون نے اپنا انوکھا لقب بتانے کی زحمت نہ کی اور خاموش بیٹھا رہا۔

ایک بار پھر سے گاڑی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ مجھ پر بے چینی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ بریک بون نے جب سے میرا گھٹنا دبایا تھا تب سے ہی میں کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت میرا موڈ غارت کر گئی تھی اور میں اب اسے مزید اپنی کار میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سانتا روزا پہنچنے کے بعد میرا پورا ارادہ تھا کہ میں وہاں رک کر اسے اپنی گاڑی سے اترنے کا کہہ دوں گا۔ وہ لڑکا روب پھر بھی مناسب تھا...... میں اسے فینکس تک لے جا سکتا تھا اور وہاں سے انٹراسٹیٹ 10 پکڑ کر کیلیفورنیا بہ آسانی پہنچ سکتا تھا...... لیکن اب میں اسے بھی اپنے ساتھ رکھنے کا حامی نہیں تھا۔ سانتا روزا کے بعد میں کسی ایرے غیرے آوارہ گرد یا بے گھر کی صحبت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر بریک بون نے مجھے زبردستی روکنے کی بیہودہ حرکت کیوں کی تھی؟ یہ ٹھیک تھا کہ میں نے ہمدردی میں اسے لفٹ دے دی تھی لیکن اس کا مطلب اب یہ تو نہیں تھا کہ وہ بھی ہمدردی کے نام پر مجھ پر تشدد کر کے کسی کو بھی لفٹ دینے کے لیے مجبور کر دے۔

اتنی زیادہ دیر کی خاموشی اب میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کار ریڈیو چلا دیا۔ موسیقی، خبریں، موسم کا حال یا فرمائشی گیتوں کا پروگرام کچھ بھی چل رہا ہوتا مجھے پروا نہیں تھی کیونکہ میں اپنے ذہن پر چھائے بوجھ کو کم کرنا چاہتا تھا۔ جو ریڈیو اسٹیشن چلا اُس پر ولی نیلسن کا ایک شاندار گیت چل رہا تھا۔

ابھی گانے کا آغاز ہی ہوا تھا کہ بریک بون نے اپنا بازو بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا۔

"یہ کس لیے بند کیا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے ریڈیو پسند نہیں ہے......" وہ بولا۔

"مجھے تو پسند ہے......" میں نے قدرے غصے سے کہا۔

"مجھے بھی بہت پسند ہے......" پیچھے بیٹھے روب نے کہا۔ "اور جاز میوزک کی تو کیا ہی بات ہے...... میری پسندیدہ ترین موسیقی......"

"بحث مت کرو جیک......" بریک بون نے قطعیت سے کہا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں واقعی بحث نہ کر پایا اور خاموش ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے سمجھاؤں کہ اس گاڑی کا مالک میں ہوں۔ میری کار...... میری مرضی...... میں جیسا چاہے میوزک چلاؤں لیکن میں کچھ بھی نہ بول پایا۔ وہ میرے ساتھ والی نشست پر جیسے بیٹھا تھا ایسے لگتا تھا کہ مصر کے ابوالہول کا مجسمہ زندہ ہو کر براجمان ہو گیا ہو۔ اُس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھ گود میں رکھے تھے اور اُس کی یہ خاموشی میرے وجود میں عجیب سا اضطراب پیدا کر

رہی تھی۔

سورج ڈوب چکا تھا اور شام کا اندھیرا تیزی سے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن کردیں۔ تیس پینتیس کلومیٹر کا فاصلہ خاموشی سے ہی طے ہوگیا۔ ابھی کیرن سے ملنے کے لیے کئی میل کا سفر باقی تھا۔ میں رات گہری ہونے سے قبل ابھی کم از کم مزید ڈیڑھ دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلینا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ رات کسی اچھے سے موٹیل میں گزاروں گا اور صبح تازہ دم ہوکر روانہ ہونے کے بعد کل رات تک اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔

نجانے کیوں مجھے کیرن کی یاد ایک دم ہی بڑی شدت سے آنے لگی تھی۔ جسمانی قرب سے زیادہ اس کی رفاقت کا احساس مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، اس کی مسکان، اس کی شیریں آواز، اس کا کھلکھلا کر ہنسنا...... سب کچھ بڑی شدت سے مجھے اپنی جانب پکار رہا تھا۔ میری پہلے بھی گرل فرینڈز رہی تھیں لیکن جیسی محبت مجھے کیرن کے ساتھ محسوس ہوتی تھی...... ایسا احساس پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

رات کی تاریکی نے صحرا کے سایوں کو نگل لیا تھا۔ ہم بڑی تیزی سے سفر کررہے تھے۔ رات بھی اسی رفتار سے اتری تھی۔ سنسان سڑک پر ہمارے سوا دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔

اسپیڈومیٹر نے مزید دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کا اشارہ دیا ہی تھا جب بریک بون نے خاموشی توڑنے کا فیصلہ کیا۔

یہاں ہائی وے پر ابھی ایک ایگزٹ آئے گا جیک......'' وہ بولا۔ ''گاڑی اُدھر موڑ لینا۔''

میں نے آگے بڑھ کر ایگزٹ کے سائن بورڈ کو دیکھا۔ اس کے مطابق یہ ذیلی راستہ دور دراز کے قصبات کی جانب جاتا تھا جن کا میں نے کبھی زندگی میں نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہاں کوئی قیام وطعام یا سروس اسٹیشن بھی نہیں تھا جس کے لیے بریک بون مجھے رکنے کا کہتا۔ صرف ایک خالی سائن بورڈ تھا جو دور تک پھیلے صحرا میں ایک انجانی سڑک کی جانب اشارہ کررہا تھا۔

''کس لیے؟'' میں کچھ نہ سمجھنے پر بے اختیار سوال کر بیٹھا۔

''اِدھر موڑ لو۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات دہرائی۔

''میری بات سنو......''

میری بات حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی...... بریک بون نے اپنا بھاری پنجہ میرے گھٹنے پر رکھا تو میری بولتی ہی بند ہوگئی۔ اُس نے ابھی تک اپنے ہاتھ سے کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

''گاڑی موڑ لو......'' وہ بولا۔

میں نے رفتار آہستہ کی اور گاڑی کو ذیلی سڑک کی جانب موڑ لیا۔ میں ایک بار پھر اپنے وجود کو اذیت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' عقبی نشست سے روب نے پوچھا۔ اس کی آواز میں نیند کا شائبہ تھا۔ وہ غالباً پیچھے بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا۔

''بائیں جانب موڑ لو......'' بریک بون نے کہا۔

''نہیں...... نہیں۔ ایسا مت کرنا۔'' میری چھٹی حس بار بار چلا کر کہہ رہی تھی لیکن میں نے بغیر ہچکچائے بریک بون کے حکم کی تعمیل کی۔ حالانکہ اس طرف جاتے ہوئے میں نے ''اسٹاپ'' کا اشارہ واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ اب ہم مشرق کی سمت ایک سیدھی سڑک پر رواں تھے۔

''آخر تم جانا کہاں چاہتے ہو؟'' کچھ دیر کے سفر کے بعد میں مزید برداشت نہ کر پایا تو پوچھ بیٹھا۔

''تم بس گاڑی چلاتے رہو......'' بریک بون نے اپنے کسی بھی عمل کی وضاحت دینے کے بجائے نیا حکم جاری کیا۔

تین چار کلومیٹر کا فاصلہ ایسے ہی گزر گیا۔ سڑک کے اس حصے پر لگتا تھا جیسے معمول سے کہیں زیادہ تاریکی چھائی ہو۔ چاند نے بھی آج فلک پر اپنی جھلک نہیں دکھائی تھی جبکہ ستاروں کی زرد ٹمٹماتی روشنی اس اندھیرے سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ یہ علاقہ پہلے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ایک اور ذیلی سڑک نظر آئی جو دائیں جانب مڑ رہی تھی۔ یہ راستہ کچا پکا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی بریک بون بولا۔

''اب اس راستے پر گاڑی موڑ لو۔''

میں ابھی تک اس کو انکار کرنے کی ہمت مجتمع نہیں کر پایا تھا۔ ہم ایک متروک باڑے کے پاس سے گزرے۔ یہ تنگ راستہ کوئی باقاعدہ سڑک نہ تھی۔ پکا نہ ہونے کے سبب خوب دھول اُڑ رہی تھی...... یہ شاید کسی پرانے قصبے کا غیر مستعمل راستہ تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے راستے پر گاڑی جھٹکے کھاتی ہوئی کوئی بیس پچیس فٹ کا فاصلہ طے کرچکی تھی جب ایک جانب گھنے درختوں کا جھنڈ نمودار ہوگیا۔ میں نے گاڑی کی رفتار مزید آہستہ کردی۔

"ہیلو......" روب نے کہا۔ "ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

وہ کافی زیادہ سہما ہوا لگ رہا تھا...... یا کم از کم اتنا خوف زدہ ضرور تھا جتنا میں خود تھا۔

"اگر تم لوگوں نے مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے تو میں پہلے سے بتا دوں کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میرے پاس اگر کچھ پیسے ہوتے تو میں لفٹ لینے کے بجائے بس سے ہی چلا جاتا۔ دیکھو میرے پاس سے صرف چند ڈالر ہی......"

"بکواس بند کرو......" بریک بون اس کی بات کاٹتے ہوئے غرایا۔

بیچارے روب نے واقعی بولنا بند کر دیا اور خوف کے مارے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

درختوں کے جھنڈ میں بنے راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم کچھ آگے نکل آئے تو بریک بون بولا۔ "میرے خیال میں ہم اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ چکے ہیں جیک...... اب تم گاڑی روک لو۔"

میں نے گاڑی روک لی۔

"انجن بھی بند ہی کر دو۔" وہ بولا۔

جیسے ہی میں نے اس کے کہے پر عمل کیا اس نے آگے بڑھ کر اگنیشن چیمبر سے چابی اچک کر نکال لی۔

"اب ہیڈ لائٹس بھی بجھا دو۔" اس نے کہا۔

میرے پاس اُس کے کہے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہیڈ لائٹس بجھنے پر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ درختوں کی وجہ سے ٹمٹماتے ستاروں کی روشنی بھی کوئی واضح منظر پیش نہیں کر پا رہی تھی۔ مجھے یکلخت ہی گھٹن کا احساس ہونے لگا...... جیسے مجھے کسی نے تابوت میں بند کر دیا ہو۔

میں عقبی نشست پہ بیٹھے روب کی خوف بھری سسکیاں سن سکتا تھا۔ غالباً وہ کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کر رہا تھا...... شاید وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اچانک ہی گاڑی کی چھت کا بلب روشن ہو گیا...... لیکن یہ روب کے دروازہ کھولنے میں کامیابی کا نشان نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ براجمان بریک بون نے اپنا دروازہ کھول کر باہر قدم رکھ دیے تھے۔

اس نے ایک ہی ہلّے میں گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور روب کو اپنے بڑے ہاتھ کی گرفت میں لے کر باہر نکال لیا۔ روب بُری طرح مچل رہا تھا اور چیخنے چلّانے کے ساتھ ساتھ لڑنے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن بریک بون کے شکنجے سے نہیں نکل پا رہا تھا۔

"چھوڑو مجھے...... چھوڑ دو۔" ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے روب منہ بھی چلا رہا تھا لیکن اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی معصوم غزال ایک ببر شیر کی گرفت سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

بریک بون نے روب کو اپنی بغل میں اس طرح دبوچا کہ جیسے اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بیک پیک اٹھا لیا۔

"تم یہیں پر رہنا جیک......" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں کھلے دروازوں کو لات مار کر بند کیا اور ایک جانب اندھیرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ میں ایک بار پھر سے جیسے آہنی تابوت میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

میں جیسے سکتے کی کیفیت میں چلا گیا تھا۔ میرا ذہن اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں آج تک ایسے حالات سے نہیں گزرا تھا اور اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جیسے ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ آخر بریک بون کی ان سب حرکات کا مقصد کیا تھا؟ میرا ذہن اس سوال کا کوئی بھی معقول جواب تلاش کرنے سے قاصر تھا۔

اس سوال کا جو جواب ملا، وہ میرے تصور سے کہیں زیادہ بھیانک تھا...... اور پھر ساری حدیں عبور ہو گئیں۔

یکلخت ہی روب کی کریہہ چیخیں اس سناٹے میں گونجنے لگی تھیں۔

ایسی بھیانک اور دردناک چیخیں جو میں نے کبھی اپنی زندگی میں نہیں سنی تھیں۔ درد اور وحشت بھری وہ چیخ و پکار اتنی بلند تھی کہ میں اپنے آہنی تابوت میں بیٹھا سب سن سکتا تھا۔ ایک کے بعد ایک چیخ، پچھلے سے زیادہ تکلیف کی شدت سے بھرپور...... ایسے جیسے کوئی اُس کے وجود تار تار کر رہا ہو۔ میں نے بے بسی سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے لیکن پھر بھی اس کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ کوئی جیسے خنجر کی نوک سے میرے پردۂ سماعت میں چھید کر دینا چاہتا تھا۔

یہ شور تھوڑی ہی دیر میں میرے لیے اتنا ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ میرا سانس لینا محال ہو گیا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی...... میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ان دردناک چیخوں سے کہیں دور، بہت دور...... جہاں یہ دلدوز پکار میری سماعت سے ٹکرانا بند کر دے۔ وائے

قسمت، میں درختوں میں اندازہ ہی نہ لگا پایا اور دور جانے کے بجائے اس تکلیف دہ تماشے کے ماخذ کے مزید قریب پہنچ گیا۔

اب میں وہ آوازیں بھی سن سکتا تھا جو ہر کریہہ چیخ سے پہلے آتی تھیں اور شاید وہی اس کی وجہ بھی تھیں۔ ایسی آوازیں جیسے گوشت کو کچلا جا رہا ہو...... کڑک، تڑک...... ایسی آوازیں جیسے ہڈیوں کو بھینچ بھینچ کر توڑا جا رہا ہو۔

میں تیزی سے گھوما اور سرپٹ دوڑتا ہوا واپس اپنی کار تک پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے دوڑ جانا چاہیے...... اس خوفناک عفریت سے چھپ جانا چاہیے لیکن میری ٹانگوں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ایسی شدید کپکپاہٹ مجھ پر طاری ہوئی کہ کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ میں بس اتنا ہی کر پایا کہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا لی اور پوری قوت سے اپنے کانوں کو بند کرنے کی سعی کرنے لگا۔

اس خوفناک اور لرزہ خیز چیخ و پکار کو ختم ہونے میں بہت وقت لگا تھا۔ میرے اعصاب بالکل ہی جواب دے چکے تھے جب میں نے اس کے قدموں کی آواز سنی...... وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھردرے راستے پر چلتا ہوا آ رہا تھا...... اکیلا، بالکل اکیلا۔ وہ کوئی دیو قامت ہیولا ہی لگ رہا تھا۔ جب اس نے قریب آ کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو اندر کا بلب روشن ہو گیا اور وہ اپنی تمام تر سفاکیت کے ساتھ عیاں ہو گیا۔

میں اس کے وجود پر پھیلا خون بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ لہو رنگ ہو رہے تھے اور پتلون پر بھی خون کے نشان تھے جہاں جہاں اس نے اپنے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ بازو اور سینے پر خون بُری طرح سے پھیلا ہوا تھا۔ اس خوفناک نظارے کے باوجود اس کے چہرے پر چھائی طمانیت بھری مسکراہٹ نے میرا خوف سے بُرا حال کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے موت اپنی تمام تر ہیبت کے ساتھ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو۔ کسی خوفناک ڈھانچے کی مسکراہٹ......

میں مزید اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور ایک جانب دُہرا ہو کر الٹی کر دی۔ اپنا لذیذ ڈنر باہر نکالنے کے بعد متلی اور چکروں کی شدت میں ذرا کمی آئی تو میں نے ہمت جمع کی اور پھر سے بونٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹھہر گیا۔ وہ اب میری جانب بغور دیکھ رہا تھا...... خوفناک مسکان اب اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔

''تم...... تم نے اُسے مار ڈالا؟'' مجھے اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

''ہاں......'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''ایک ایک ہڈی توڑ ڈالی اُس کی......''

''کک...... کیوں؟'' میرے حلق سے بمشکل نکلا۔

''ٹین ایجر لڑکا تھا وہ...... شش...... شاید ابھی یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھا۔''

''مجھے اچھا لگتا ہے...... مزہ آتا ہے۔'' وہ باقاعدہ زبان چٹخاتے ہوئے بولا۔

''اُف خدایا...... مزہ آتا ہے۔ اچھا لگتا ہے...... کس بھیانک جانور سے پالا پڑ گیا ہے؟'' میں خوف کے باعث کچھ بول نہ سکا اس لیے صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔

''تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں......'' میری بُری حالت اور کوئی جواب نہ دینے پر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میں نے تم سے پہلے جھوٹ بولا تھا...... میرا 'نک نیم' کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ پہلی بار ایسے ہڈیاں توڑنے کے بعد میں نے خود ہی اپنا نام 'بریک بون' رکھا تھا۔''

میں مزید اس کی جانب نہیں دیکھ پایا۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھ کر میری طبیعت بُری طرح سے خراب ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر زخموں کے نشان اور چوٹیں کوئی محنت مزدوری کرتے ہوئے نہیں آئی تھیں۔ میں گاڑی سے آتی مدھم روشنی میں دیکھ سکتا تھا کہ لہو میں لتھڑے ہوئے ان ہاتھوں سے ابھی بھی بیچارے روب کا خون ٹپک رہا تھا۔

''اب...... اب کیا تم مجھے بھی مار ڈالو گے؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اندھیرے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اپنی موت کے بارے میں پوچھنا ایک خوفناک تجربہ تھا اور مجھے اپنے اندر کی تمام تر ہمت مجتمع کرنے کے بعد یہ سوال کرنے کا حوصلہ ہوا تھا۔ میرے اس سوال پر وہ کچھ دیر تک ہونقوں کی طرح مجھے تکتا رہا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں نے آخر پوچھا کیا ہے۔

''مار ڈالوں گا...... تمہیں؟'' وہ ٹکڑوں میں بات کر رہا تھا۔ ''نہ...... نہ، ایسا تو میں بالکل بھی نہیں کروں گا۔ تم تو اچھے انسان ہو...... تم نے تو میری...... مدد کی تھی۔ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو جیک...... ہم اب دوست ہیں...... میرا پہلے کبھی کوئی دوست نہیں بنا...... لیکن تم جیسا اچھا اور مددگار انسان تو میرا دوست بنے گا نا؟''

''دوست؟'' میں اس کے بھیانک وجود کی سوالیہ کیفیت پر کوئی جواب دیے بغیر صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ یہ

تصور ہی جھنجھنا دینے والا تھا کہ میں اس سے دوستی کرتا۔ آج رات کے واقعے کے بعد تو ایسا سوچنا بھی ناممکن تھا بلکہ مجھے تو آج کی رات ہی اپنی زندگی کی آخری رات محسوس ہورہی تھی۔ نجانے اس دیوزاد کو کب کون سی میری بات بُری لگ جاتی اور وہ اپنے دیو قامت ہاتھوں کے بیچ میرا وجود مسل کر رکھ دیتا۔

''گاڑی میں کوئی کمبل وغیرہ بھی ہے؟'' اس نے پوچھا تو میں اپنے خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔

''کیا؟''

''کوئی کمبل وغیرہ ہے گاڑی میں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ایسے خون آلود کپڑوں کے ساتھ بیٹھ گیا تو سیٹ خراب ہوجائے گی۔''

''ڈکی میں دیکھ لو......'' میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ایک انسانی جان کی پروانہ کرنے والے کو میری گاڑی کی نشست خراب ہونے کی کیسے پروا ہوسکتی تھی...... میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا۔

وہ ڈکی کھول کر ٹھہر گیا اور اس میں موجود سامان کو ٹٹولنے لگا...... تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک کمبل نکال کر لے آیا...... کیرن نے یہ ہمارے پکنک پر جاکر استعمال کے لیے خریدا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے......'' وہ کمبل کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''چلو اب چلتے ہیں......''

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ساتھ والی پسنجر سیٹ پر ایک بار پھر سٹ کر بیٹھ گیا۔ کمبل کو اس نے اپنے وجود کے گرد اس طرح سے لپیٹ لیا تھا کہ خون سیٹ پر نہ لگے۔ گاڑی کی چابیاں اُس نے میرے حوالے کردیں لیکن میری کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں گاڑی چلا پاتا۔

کافی دیر تک میں اپنے خطا ہوجانے والے اوسان بحال کرتا رہا لیکن اپنے بکھرے اعصاب کو سمیٹنے میں کافی دشواری ہوئی۔ میرا ذہن ابھی بھی بُری طرح سے منتشر تھا۔ تھوڑی دیر قبل جو کچھ ہوا تھا، میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... اور میں مزید سوچنا چاہتا بھی نہیں تھا لیکن بے چارے روب کی چیخ و پکار ابھی بھی میری سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

بالآخر میں نے حوصلہ کیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ایک چکر کاٹ کر اسے واپسی کے لیے موڑا اور واپس اس راستے پر روانہ ہوگیا جس پر سفر کرکے ہم درختوں کے اس گھنے جھنڈ میں پہنچے تھے۔ ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں تو ایسا محسوس ہوا کہ کسی تاریکی کے پہاڑ میں روشنی کی سرنگ بنانے کی کوشش کی جارہی ہو۔

ہمارا سفر خاموشی میں ہی کٹا تھا۔ بریک بون زیادہ بولنے کا قائل نہیں تھا جبکہ میں موجود حالات کے تناظر میں کچھ بھی بولنے کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے وجود میں کوئی بار بار چیخ کر کہہ رہا تھا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے...... جان چھڑا لو اس جانور سے...... لیکن میں خود گنگ ہوکر رہ گیا تھا۔

جب ذیلی سڑک سے ہم...... ہائی وے پر پہنچے تو میں بے اختیار ہی سوال کر بیٹھا۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

''کسی ایسی جگہ چلو جہاں میں یہ خون آلود لباس تبدیل کر سکوں...... اور خود بھی صاف ستھرا ہوجاؤں۔'' وہ ایسے اطمینان سے جواب دے رہا تھا جیسے فٹ بال کھیلتے ہوئے وہ کیچڑ میں گر گیا ہو اور اب صاف ستھرا لباس پہننے کا خواہش مند ہو۔

''اور اس کے بعد؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ پایا۔

''اس کے بعد ہم آگے روانہ ہوجائیں گے......'' وہ مجھے دیکھ کر ایسے بولا جیسے کسی ناسمجھ بچے سے مخاطب ہو۔ ''ساری رات کی ڈرائیونگ ہمیں کسی بہتر مقام پر پہنچا دے گی۔ اتنا بڑا ملک ہے یہ...... ہم مستقل بھی گھومتے رہیں تو شاید اس کی ساری سڑکیں نہیں ناپ پائیں گے۔ اور ان راستوں پر گھومتے پھرتے نجانے کون، کہاں، کوئی انجانا راہ گیر ہم سے لفٹ لینے کا منتظر ہو۔''

اس کی بات کی گہرائی تک پہنچنے میں مجھے چند لمحے لگے لیکن جب مجھے سمجھ آئی تو میں روح تک لرز کر رہ گیا۔

''نن...... نہیں......'' میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔ ''میری گرل فرینڈ ہے...... میری نوکری ہے......''

''اب تم سمجھو کہ کچھ بھی نہیں ہے......'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''بس تم ہو اور میں ہوں...... کوئی ہماری دوستی کے بیچ میں نہیں آسکتا جیک۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بریک بون نے کمبل سے اپنا خون آلود ہاتھ نکالا اور اپنی انگلیوں کا شکنجہ میرے گھٹنے کے گرد کس لیا۔ خوف کے مارے میری گھگی بندھ گئی۔ میں یکلخت خود میں ہی سمٹ کر رہ گیا تھا۔

''ہم مل کر خوب مزے کریں گے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''آہا...... آہا۔ مزے۔''

میری سماعت میں جیسے زہر گھل گیا تھا۔ ایک معمولی سی نیکی میرے گلے پڑ گئی تھی۔ مجھے اجنبی اور بے یار و مددگار لوگوں کے کام آنا پسند تھا۔ ایک شکریہ ادا کرکے وہ اپنے راستے نکل جاتے تھے جبکہ میں اپنی راہ لیتا تھا۔ میری توقعات کے برعکس بریک بون ایک نفسیاتی پاگل ثابت ہوا

تھا جو میری جان کا روگ بننے جا رہا تھا۔
اُس کی جان لیوا حرکات نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف کر ڈالی تھی۔ میں اس کی بات مان لیتا تو مستقل اس کی قید میں ہی چلا جاتا۔
''نہیں......'' میں نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔
''کیا نہیں؟'' وہ حیرت سے بولا جیسے میرا انکار اس کی سمجھ سے باہر ہو۔
''مم...... میں یہ قتل و غارت نہیں کر سکتا۔'' میں نے بمشکل کہا۔
بریک بون کی گرفت میرے گھٹنے پر یکلخت ہی سخت ہوگئی۔ میرے پاؤں کا بھی ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھ گیا۔
''تمہیں ایسا کرنے کا کس نے کہا؟ تم بس میرے کھانے پینے کا خیال رکھنا اور گاڑی چلانا......'' وہ بولا۔
''یہ جرم ہے...... آہ۔'' میں بات کرتے ہوئے کراہ اٹھا کیونکہ میرے گھٹنے میں تکلیف ایک دم ہی بڑھی تھی۔ ''کسی قاتل کی مدد کرنا بھی جرم ہوتا ہے۔'' میں نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔
''تو تم میرے دوست نہیں بننا چاہتے؟'' اس نے خونی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ گھٹنے سے اٹھنے والی ٹیسیں میری پوری ٹانگ میں دوڑ رہی تھیں۔ گاڑی اب حدِ رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔
''نہیں نہیں...... میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' میں نے خوف و درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا دوست تو بننا چاہتا ہوں لیکن میں اس طرح کسی کی جان لینے میں مدد نہیں کر سکتا۔''
اس کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑی...... ''پھر؟'' اس نے یک لفظی سوال کیا۔
میں نے سوچنے میں کچھ وقت لیا۔ سانتا روزا کی آبادی اب قریب دکھائی دینے لگی تھی۔
''میں چاہتا ہوں کہ ہم دوست رہیں...... ایک دوسرے سے بات چیت بھی کریں لیکن میں اپنی جاب اور گرل فرینڈ نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں جیسے جیسے بولتا جا رہا تھا ویسے ویسے بریک بون کی گرفت میں سختی آرہی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں کوئی کھلونا ہوں اور اس کا ریموٹ میرے گھٹنے کی صورت میں اُس کے ہاتھ آ گیا ہو۔
''نہیں...... بھول جاؤ انہیں......'' وہ غصے سے بولا۔
''آہ...... مجھے چھوڑو۔'' میں چلّایا لیکن بریک بون کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر اپنے شکنجے کا دباؤ بڑھاتا ہی چلا جا رہا تھا۔
''نہیں...... تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا......'' وہ غرایا۔
درد میرے رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اچانک ہی تکلیف کے مارے اندھیرا چھا گیا۔
گاڑی میرے قابو سے باہر ہوگئی اور پتا نہیں کس چیز سے جا ٹکرائی۔ اس کے بعد اتنے شدید جھٹکے لگے جیسے گاڑی ہوا میں اُچھلی ہو اور کئی قلابازیاں کھانے کے بعد ایک خوفناک دھماکے کے بعد رک گئی۔
میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ بس یہی احساس باقی تھا کہ میرے گھٹنے کو اتنی شدت سے دبایا گیا تھا کہ ایسا درد ہوا جیسے ٹانگ ٹوٹ گئی ہو...... بریک بون کا خوفناک چہرہ میری جانب ہی جھکا ہوا تھا۔

☆☆☆

''ارے...... رک بھی جاؤ۔'' وہ قدرے بے تابی سے بولی تو میں نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کے شاداب چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی مجھے زندگی واپس ملنے کے دن لگی تھی۔
دو سال قبل ہونے والے کار حادثے کے بعد مجھے اسپتال میں ہی ہوش آیا تھا۔ میری ٹانگ میں اٹھنے والا درد ناقابلِ برداشت تھا جو مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لے آیا تھا۔ چند لمحے تک تو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں؟ پھر تھوڑے حواس ٹھکانے آئے تو میں ایک سفید دیواروں والے روشن کمرے میں موجود تھا۔
نرم دہ بستر پر محو استراحت میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میری ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہوئی تھی اور میں غالباً کسی اسپتال میں موجود تھا۔ اٹینڈنٹ کی کرسی پر ایک حسین چہرہ اداسی سے بھرپور تاثرات کے ساتھ میری جانب ہی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔
''تمہیں ہوش آ گیا؟'' وہ بے ساختہ اٹھی اور دوڑتے ہوئے آ کر میرا چہرہ چوم لیا۔
یہ کیرن تھی...... میری منگیتر اور گرل فرینڈ۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا...... ایسے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے ہاتھ بڑھا کر چھو لیا تاکہ یقین کر سکوں کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام تر شادابی اور خوبصورتی کے ساتھ حقیقتاً میرے سامنے ہی موجود تھی۔
آخری خیال جو میرے ذہن میں تھا وہ بریک بون کی

خوفناک گرفت اور بھیانک چہرہ تھا۔ میں بار بار کیرن کے چہرے کو چھو رہا تھا تاکہ اطمینان کرسکوں کہ میں موت کے منہ سے واقعی واپس آگیا تھا۔ بریک بون کے ساتھ گزرا وہ وقت کسی ڈراؤنے سپنے سے کم نہیں تھا۔

"ہاں مجھے ہوش آگیا......" میں نے اسے بے ساختہ بانہوں میں جکڑ لیا اور رونے لگا۔

کئی گھنٹے بعد سانتا روزا پولیس ڈپارٹمنٹ کا نمائندہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"ہم نے کافی تلاش کیا ہے اور اردگرد کا علاقہ بھی چھان مارا ہے لیکن آپ کے بتائے گئے حلیے کا کوئی شخص نہیں ملا۔" وہ میری بریک بون کے بارے میں بتائی ہوئی معلومات کے حوالے سے بات کررہا تھا۔

حادثے کے بعد میں چار روز بے ہوشی کی حالت میں رہا تھا۔ اتنا وقت کافی تھا بریک بون کے فرار ہونے کے لیے ......اور میرے لیے یہ تصور ہی لرزہ خیز تھا کہ وہ پھر سے آزاد پھر رہا ہے۔

"آفیسر......میں بالکل سچ بول رہا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "آپ ٹوکم کیری کے سروس اسٹیشن کے ریسٹورنٹ میں موجود سی ٹی کیمروں سے بے شک مدد لے لیں۔"

"ہمیں آپ کی بات کا پورا یقین ہے مسٹر جیک......" وہ نرمی سے بولا۔ "اسی لیے ہم نے الرٹ جاری کرکے اس شخص کی تلاش جاری کردی ہے......لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی تلاش بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوگی۔"

"لیکن......" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آفیسر نے نرمی سے میری بات کاٹ دی۔

"آپ ریسٹ کریں مسٹر جیک......ہم جہاں تک ہوسکا پوری کوشش کریں گے اس ہڈی توڑ قاتل کو ڈھونڈنے کی۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور خاموشی اختیار کرلی۔ ویسے بھی میرے گھٹنے کی ہڈی جڑنے کے لیے مجھے آرام کی بہت سخت ضرورت تھی۔

آج دو سال ہوگئے تھے اس حادثے کو اور میں ابھی بھی حیران ہوتا تھا کہ آخر بریک بون نے مجھے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ کیا وہ کار حادثے میں شدید زخمی ہوگیا تھا کہ خود پر پڑنے والی افتاد کے باعث مجھے چھوڑ کر فرار ہوگیا یا پھر اس نے واقعی مجھے اپنا دوست سمجھ کر بخش دیا تھا؟ بہرحال جو بھی تھا، اس نے میری روح پر ایسا گھاؤ ڈالا تھا کہ سنبھلنے میں بہت وقت لگ گیا تھا۔

کیرن نہ ہوتی تو شاید میں خود کو کبھی بھی نہ سنبھال پاتا۔ اس سے میری شادی ہوگئی تھی۔ ابھی... ہم میری نئی کار میں اس کے والدین سے ملنے دوسرے شہر جارہے تھے تاکہ انہیں نانا نانی بننے کی خوشخبری سنا سکیں۔

اس کی آواز میں جھرنوں جیسی ترنگ تھی۔ کیرن خوشی سے ایک گانا گا رہی تھی اور میں گاڑی چلاتے ہوئے اس کی آواز کی نغمگی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ ہائی کے انٹرچینج پر کھڑا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر لفٹ مانگ رہا تھا۔ میرے وجود میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔

وہ اتنا بے خوف تھا کہ گاڑی کی تیز رفتاری سے قطع نظر بار بار سڑک کے کنارے سے اتر کر ہائی وے پر قدم رکھ کر رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔ میں خوفزدہ سا ہوگیا، کیرن کی آواز بھی اب مجھے بھلی نہیں لگ رہی تھی۔

میں نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کی اور ایکسی لریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ میں نے کیرن کی پروا کیے بغیر رفتار تیز کردی۔ جیسے ہی میں اس لفٹ مانگنے والے کے قریب پہنچا......میں نے تیزی سے گاڑی ایک سائڈ پر کی اور اسے دوڑاتا ہوا اس کے پاس سے گزر گیا۔

"ارے......رک بھی جاؤ۔" کیرن نے کہا۔ "دیکھو تو سہی وہ بے چارہ اسٹوڈنٹ کتنی بے تابی سے لفٹ مانگ رہا ہے۔"

میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھا اور پھر سے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"زندگی میں اب میں کوئی بھی نیکی کا کام کرلوں گا......لیکن کبھی کسی بے گھر اور آوارہ کو اپنی کار میں بٹھانے کی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔"

بریک بون والے حادثے کے بعد سے میں نے اپنی زندگی سے یہ نیکی کا کام خارج کردیا تھا۔ اس دیوزاد بریک بون کی وجہ سے میں اب کسی بھی اجنبی کو اپنی گاڑی میں بٹھانے سے کتراتا تھا۔ نجانے کب کہاں کون سا بے گھر انسان میری گاڑی کو ہی اپنا گھر بنانے کے لیے تیار ہوجائے؟

کیرن نے کندھے اُچکائے اور بے نیازی سے پھر سے گانا شروع کردیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اب بھی کسی آوارہ گرد کو گھر لانے کی غلطی نہیں کروں گا لیکن وقتاً فوقتاً ایسی باتیں کرکے مجھے یاددہانی کراتی رہتی تھی کہ نیکی کرنے کے بہت سے دوسرے طریقے بھی ہیں......مجھے ہمیشہ انہی طریقوں پر عمل کرنا چاہیے اور میں کرتا تھا......

❖❖❖

قسط: 5

اناگیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو اناگیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

اس وقت پوجا مجھے ایک ایسے رنگین سانپ کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ جو دیکھنے میں تو بڑا خوبصورت اور پُرکشش ہوتا ہے لیکن اس کا زہر انتہائی تیزی سے اثر کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی ہو۔ پوجا انہیں سنہرے خواب دکھا کر یوں حصار میں لے چکی تھی کہ وہ کسی بھی طرح نکل نہ پائیں۔ وہ کسی بھی وقت اپنا پھن مار کر ڈس لے گی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ دونوں نے خود اپنی موت کو آواز دے لی تھی۔ مجھے لگا کلیان جی نے جو ایک ہفتے کا وقت دیا تھا، وہ بہت زیادہ تھا۔ دونوں ایک ہی دن میں ان کے جال میں آ گئی تھیں۔

''لیکن وہ ہم پر کیسے اعتماد کرلیں گے؟'' رتنا نے شک بھری مزاحمت کرتے ہوئے کہا تو پوجا نے مگ سے ایک بڑا سا سپ لیا پھر اسے نگل کر بولی۔

''کون کہتا ہے کہ وہ تم پر فوراً اعتماد کرلیں گے۔ اس دنیا میں کوئی بھی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ ہاں مگر اپنے کام سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔''

''لیکن پوجا، میں خون خرابے میں نہیں پڑنا چاہتی، میرا مقصد صرف پیسہ بنانا ہے اور بس۔'' رتنا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''پھر تو کوئی مشکل نہیں...... بلکہ یہ زیادہ اچھا ہے، ساری دنیا سے چھپ کر صرف میرے ساتھ کام کرو۔ جہاں مرضی رہو، مجھے بھی نہ بتاؤ کہ تم کہاں ہو، یہ اپنے کمپیوٹر وغیرہ ادھر رکھو اور شروع ہو جاؤ، اس میں اتنا تردد کیسا۔ کیا تم پہلے ایسے کام نہیں کر چکی ہو؟'' پوجا نے سکون سے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''میں آزاد پھر بھی نہیں رہ پاؤں گی، یہ جو دشمنی......'' رتنا نے تیزی سے کہا۔

''کچھ عرصہ غائب رہو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ، فکر نہ کرو۔'' پوجا نے بے پروائی سے کہا اور مگ سے باقی چائے بھی حلق میں انڈیل کر مگ ایک جانب رکھ دیا۔ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ ''اور تم ویر سنگھ، کچھ بھی مت کرنا، بس میری سہیلیوں کا دل بہلاتے رہنا، سمجھو تمہاری بھی زندگی عیش میں گزرنے والی ہے۔''

''بڑی مہربانی لیکن ان سے تو پوچھ لو، یہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں گی بھی یا نہیں؟'' میں نے یوں کہا جیسے میں ایسی ہی کوئی سوچ پہلے ہی سے سوچ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ اس پر رتنا نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی پھر بڑے مخمور لہجے میں بولی۔

''تیرے جیسے کو تو میں سنوار کر رکھوں گی۔''

''چل پھر ڈن ہو گیا۔ ہم آج ہی پونا کے لیے نکلتے ہیں، تیاری کرو۔'' پوجا نے کہا اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

''ڈن ہو گیا۔'' ششما نے کہا اور اٹھ گئی۔

میں بھی ان کے پاس سے اٹھ کر عقبی حصے میں آ گیا۔ میں وہاں اس طرح بیٹھا تھا کہ کسی طرف سے بھی کوئی آ جائے تو میں دور سے دیکھ لوں۔ چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا پھر میں نے فیصلہ کرتے ہوئے خوشگوار مردانہ آواز کو کال کر دی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کال ریسیو کرلی۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے اپنا شک ظاہر کیا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہو سکتی ہے؟''

''میرا گمان تو یہی کہہ رہا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں اپنی سوچ کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے اور نکلنے کے لیے جو میرے ذہن میں تھا، اس سے کہتا چلا گیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے میری ساری بات غور سے سنی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ میں مطمئن ہو کر اس معاملے پر مزید سوچنے لگا۔

اچانک میری نگاہ پوجا پر پڑی، وہ راہداری میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ وہ میرے پاس یوں آ کر کھڑی ہو گئی جیسے وہ آگے بڑھنا چاہ رہی ہو لیکن یونہی میرے پاس رک گئی ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں فون پکڑا ہوا تھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''یہاں الگ سے آ کر کیوں بیٹھ گئے؟''

''تنہائی میں بندہ کیوں بیٹھتا ہے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا تو اس نے خوشگوار حیرت سے میری جانب دیکھا پھر پوچھا۔

''اوہو، بات کیا ہے؟''

''بات تو نہیں ایک خواہش ہے لیکن پتا نہیں تم سے کہنی بھی چاہیے یا نہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہہ دو یار، ہم سے کیا پردہ۔'' اس نے اپنے لب مخصوص انداز میں دباتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''لیکن اگر تم برا نہ مانو تو......؟'' میں نے تجسس پیدا

کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بُرا نہیں مانوں گی جو دل میں ہے کہہ دو۔'' اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو میں نے چند لمحے رک کر کہا۔

''خواہش یہ ہے کہ میں کچھ وقت بھرپور انداز میں تمہارے ساتھ تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ، ایسا کیوں......؟'' اس بار اس نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا پہلی نگاہ میں محبت ہوتی ہے یا نہیں، لیکن کل جب میں نے تمہیں دیکھا تو سمجھو تمہارے سامنے دل ہار گیا ہوں۔ رات سوئمنگ پول پر کسی چکنی مچھلی کے مانند تمہارا بدن میری نگاہوں ہی سے نہیں ہٹ سکا۔ میں تمہارا دیوانہ ہو رہا ہوں۔'' میں نے یوں کہا جیسے میں اپنے آپ ہی میں نہ رہا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا تم سمجھ رہے ہو کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، میں نے اپنی خواہش بتائی ہے، پوری کرنے یا نہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں، میں کوئی بہت بڑا آدمی نہیں، راکیش ورما نہیں، عام سا بندہ ہوں... پر خواہش تو کر سکتا ہوں۔'' میں نے تشنہ لب لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر میرے پیچھے آکر اپنا ایک ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ پھر میرا سینہ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی شدت سے میری خواہش ہے؟''

''ہاں، اتنی شدت کہ اس کا اندازہ تم نہ کر پاؤ۔'' میں نے خمار بھرے لہجے میں کہا۔

''عورت جو ہوتی ہے نا مرد کی آنکھ میں شدت بھی پڑھ لیتی ہے۔ میں تمہیں تنہائی میں وقت دے دوں تو یہ دونوں بُرا مان جائیں گی۔'' اس نے ایک نئی طرح سے مجھے پرکھنا چاہا اور میرے سینے پر سے ہاتھ ہٹا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ تب میں نے کھڑا ہوتے ہوئے اکتاہٹ سے کہا۔

''میں ان سے اکتا گیا ہوں، دونوں سے کھیلنا بہت مشکل ہے۔''

وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا تھا۔ یہ فطرتی بات ہے کہ جیسے عادی شراب پینے والے کے سامنے جام آجائے تو اس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے، ایسا ہی حال پوجا کا بھی تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ بالشت بھر کا تھا۔ دونوں کے درمیان اعصابی تناؤ ٹھہرا ہوا تھا۔ تبھی اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو میری چاہت کی ہے، میں اس کی قدر کرتی ہوں، کیا ایک بار چاہنے سے تمہاری تشنگی ختم ہو جائے گی؟''

''میں نہیں جانتا، کب اور کس وقت حالات بدل جائیں۔ بس جو وقت ہاتھ میں ہے، وہی اپنا ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو یہ تعلق طویل بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے مبہم سی بات کر دی۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ میرے گال پر لاکر ہلکے ہلکے میری گردن تک لے آئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کافی حد تک پگھل گئی ہے۔ میں نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈال دیا تو میرے ساتھ لگ گئی۔ اس کا گداز بدن اور گرم سانسیں میری گردن ہی کو نہیں مجھے بھی گرما رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ہم بے خودی میں چلے جاتے، اس نے دھیرے سے خود کو الگ ہوتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ دیر ٹھہرو، میرے خیال میں رتنا اور ششما برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

''وہ تو نہیں...... لیکن پھر......'' میں نے مضطرب انداز میں یوں کہا جیسے مجھے شدید غصہ آ گیا ہو۔ لیکن میں جو جاننا چاہ رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ آ گئی تھی۔

''یہ اب تمہارا کام ہے کہ تم انہیں کس طرح مطمئن کرتے ہو۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا اور بے دم سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اوکے، اب اُن سے اجازت لینا ہوگی۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں مایوس ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں پوجا کے دل میں اس وقت کیا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات نہیں تھے۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

''میں کرتی ہوں کچھ، مگر تھوڑا صبر کرو۔''

''کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ تو کروں گی نا لیکن......'' اس نے مسکراتے ہوئے ادھورا فقرہ کہا اور میرے لیے تجسس چھوڑ دیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''لیکن کیا......؟''

''میں جو کہوں گی وہی کرنا ہوگا، اگر منظور ہے تو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ایک دو لمحے سوچا اور اس کا سفید ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میرا ہاتھ دبایا، لبوں پر مسکراہٹ لاکر میری جانب دیکھا، پھر میرا ہاتھ چھوڑا اور پھیل کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز مجھے لبھانے والا تھا۔ وہ مجھے مزید دیوانہ بنا دینا چاہ رہی تھی اور میں دیوانہ بن جانا

چاہ رہا تھا۔ میرا انداز ہی ایسا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی، میرا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب چل دی۔ ہم لاؤنج میں آ گئے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ اپنے فون میں کھو گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد سر اٹھاتے ہوئے رتنا سے بولی۔

''تیاری کر لی ہے تم دونوں نے؟''

''سمجھو ہو گئی۔'' اس نے کہا۔

''سمجھو ہو گئی مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''سب سامان تو اکٹھا کر لیا ہے میں نے لیکن یہاں سے جانا کیسے ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ میرے جاننے والے کا فون بند جا رہا ہے؟'' رتنا نے پریشانی میں کہا تو پوجا بے پروائی کے انداز میں بولی۔

''چلو کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بعد کھل جائے گا، پھر چل دیں گے۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ ایک ہائی ایس وین پورچ میں آ رکی۔ میرے سمیت رتنا اور ششما نے چونک کر وین کو دیکھا۔ تبھی ششما کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''یہ کون ہے؟ کس کی وین......''

ہمیں حیران ہونے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا، چند افراد تیزی سے اترے، انہوں نے ہاتھوں میں پسٹل پکڑے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ لاؤنج میں آ گئے۔ میں صوفے سے اٹھ کر اندر بھی نہیں جا سکا تھا۔ پہلے کے بعد دیگرے دو بندے اندر داخل ہوئے پھر جیسے ہی ان کے پیچھے دو مزید آئے تو چاروں نے ہم پر پسٹل تان لیے۔ تبھی ان میں سے ایک بولا۔

''چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو، جس نے بھی انکار کیا وہ زندہ نہیں رہے گا۔''

''کون ہو تم لوگ......؟'' میں نے سخت انداز میں کہا۔

''پھول بیچنے والے تو نہیں ہیں ہم۔'' اسی نے طنزیہ انداز میں کہہ کر وہی کوڈ دہرا دیا، جو میرے اور خوشگوار مردانہ آواز کے درمیان طے ہوا تھا۔

''باتیں مت کرو چلو، نہیں تو......'' اس کے پیچھے کھڑے ایک لڑکے نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے رتنا کو پکڑ کر دھکا دے دیا۔ دوسرا ششما کی جانب بڑھا، اس نے اس کی کنپٹی پر پسٹل رکھا اور اسے باہر لے جانے لگا۔ ایک لڑکا میری جانب آیا تو میں نے اسے روکتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''میم آپ چلیں۔'' ایک لڑکے نے بڑے احترام سے کہا۔

''مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا، الگ سے گاڑی لائے ہو۔'' پوجا نے نخوت سے کہا تو رتنا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ یہی حال ششما کا تھا۔ تبھی اس لڑکے نے کہا۔

''وہ رستے میں ہمیں مل جائے گی، فکر نہ کریں، آپ چلیں۔''

''چلو پھر۔'' پوجا نے ہم سب پر نفرت بھری نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے ہمیں وین میں بٹھایا اور پسٹل لے کر ہم پر مسلط ہو گئے۔ پوجا بڑے سکون سے ان کے درمیان بیٹھ چکی تھی۔ تبھی وین چل دی۔

''پوجا، یہ تم نے اچھا نہیں کیا؟'' رتنا نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''تمہیں کس نے کہا تھا مجھے بلاؤ۔ میں کسی کے ساتھ دشمنی نہیں لے سکتی، ہاں اب تم دونوں کو دے کر کچھ پیسہ کما لوں گی۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں اس سے بھی زیادہ دے دیتی۔'' رتنا نے نفرت سے کہا۔

''مگر میں دشمنی افورڈ نہیں کر سکتی...... سوری۔'' اس نے کہا اور سامنے دیکھنے لگی۔ وین تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ روشن دن میں، باہر کی دنیا کو بالکل بھی پتا نہیں تھا کہ کوئی اغوا ہو کر جا رہے ہیں۔ کچھ دیر تک تیزی سے چلتے رہنے کے بعد پوجا نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''ابھی تک گاڑی نہیں آئی؟''

''میم کورٹ روڈ پر چڑھتے ہی جو پہلا فلنگ اسٹیشن آئے گا، وہاں موجود ہے گاڑی، بس پانچ منٹ۔'' اسی لڑکے نے کہا اور پھر اس نے میری جانب دیکھا، میں سمجھ گیا تھا مزید پانچ منٹ ہیں۔ پوجا کا چہرہ سامنے کی طرف تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے سے پسٹل لیا جو اس نے مجھے آرام سے دے دیا، میں نے اسے نال سے پکڑا اور دستہ پوجا کے سر پر دے مارا۔ شاید اسے حیران ہونے کا بھی موقع نہیں ملا ہوگا اس لیے اس نے آواز بھی نہیں نکالی اور ایک جانب لڑھک گئی۔

رتنا اور ششما میری جانب حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں زیادہ حیران نہیں ہونے دیا اور تلخی سے کہا۔

''یہ ہے تمہاری دوست پوجا......'' وہ دونوں حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ ان کی زبان پر ایک بھی لفظ نہیں آیا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے کہا۔ ''کیا تم دونوں اس وقت جسوندر سنگھ یا کسی بھی محفوظ جگہ جا سکتی ہو؟''

"جا تو سکتے ہیں لیکن......" رتنا نے تشویش زدہ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تو میں نے تیزی سے کہا۔

"تو جاؤ، میں کچھ دیر بعد فون پر رابطہ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

فلنگ اسٹیشن پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے پوجا کا فون ایک لڑکے کو دے دیا تو وہ لڑکا وہاں اتر گیا۔ وہ دونوں بھی وہیں اتر گئیں۔ کچھ دیر بعد ہم آگے بڑھ گئے۔ مجھے لگا کہ میں ایک حصار سے نکل آیا ہوں۔

☆☆☆

وہ شہر کے مغربی علاقے میں ایک کالونی تھی۔ دن ہونے کے باوجود کوئی چہل پہل نہیں تھی، ممکن ہے وہاں کے لوگ جلدی کام پر نکل جاتے ہوں کیونکہ کالونی سونے پن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کالونی کے اندر ایک کارنر والا دومنزلہ بڑا سا گھر تھا۔ وین اس کے پورچ میں جار کی۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پوجا ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے اسے ہوش میں لانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے لڑکوں کو اشارہ کیا کہ اسے اٹھائیں اور اسی طرح اندر لے چلیں۔ وین سے داخلی دروازے تک چند سیکنڈ میں اسے لے جایا گیا اور پھر لاؤنج میں جاتے ہی ایک لڑکے نے کہا۔

"پیچھے ایک الگ تھلگ کمرا ہے، اگر اسے......"

"ہاں اُدھر ہی لے چلو۔" میں نے کہا اور سبھی اسی لاؤنج میں موجود راستے سے اس کمرے تک آگئے۔ وہاں قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا فریج بھی رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کمرا شاید اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ پوجا کو چھوڑ کے وہ لڑکے وہیں باہر رہ گئے۔ میں نے فریج کھول کر دیکھا اس میں پانی رکھا تھا۔ میں نے پانی کے چھینٹے پوجا کے چہرے پر مارے تو وہ کسمسا کر اٹھ گئی۔ اس نے حیرت سے اردگرد دیکھا پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سب سمجھ گئی۔ تبھی اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے دل کے پاس۔ ہمیں تنہائی چاہیے تھی نا تو میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔" میں نے صدقے واری ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ...... مطلب یہ لوگ تم نے بلائے تھے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تم کیا سمجھتی ہو؟ تمہاری چاہت مجھے ایسا بھی نہ کرنے دیتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ سمجھ گئی تبھی اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ دونوں......؟"

"وہ تو اُڑن چھو ہو گئیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مم...... میں...... سمجھی نہیں......؟" اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"یار وہ بھاگ گئی ہیں۔ اس وقت تو وہ شہر سے بھی نکل گئی ہوں گی۔" میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں اسے بتایا تو وہ یوں پیچھے ہٹی جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے آگے جھکا ہی تھا کہ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور دونوں بانہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ میں نے لاشعوری طور پر اسے خود سے الگ کر کے دیوار کی جانب پھینکا مگر وہ مجھ سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے آکٹوپس جکڑ لیتا ہے۔ وہ میری گردن پر دباؤ ڈال کر مجھے بے بس کرنا چاہ رہی تھی، میرا سانس بند ہونے لگا۔ میرے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اس کی پسلیوں میں اپنی کہنیاں ماریں مگر اس نے دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی، اس لیے پوری جان لڑا رہی تھی۔ میں قالین پر گر گیا تھا۔ وہ اپنا سارا وزن مجھ پر ڈال کر میری سانس بند کرنے کی کوشش میں تھی۔ وہ مجھے پوری طرح دبا کر ایک ہاتھ سے میرا بدن ٹٹولنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پسٹل تلاش کر رہی ہے۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ میری دائیں جانب نیفے میں اُڑسے ہوئے پسٹل پر لگا، وہ پسٹل نکالنے کی کوشش میں لگ گئی۔ اب میں اسے زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اپنے بدن کو لہرایا تو اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ میں نے جھٹکا دیا تو وہ الگ ہو گئی۔ شاید اسے اپنی شکست کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پھر سے مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے ناخن میری گردن میں گاڑنا چاہے تو میں نے پوری قوت سے اس کے سر میں ٹکر ماری۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بدحواس ہو گئی، مجھے اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ گرتے ہی اسپرنگ کے مانند اچھلی اور پھر سے مجھے جکڑنے کی کوشش...... کرنے لگی۔ مگر اب میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ لڑنے کا فن نہیں جانتی۔ وہ بس اپنی بقا کے لیے یوں لڑ رہی تھی جیسے خطرے کے وقت بلی گلے پڑ جاتی ہے۔ وہ جیسے ہی مجھ پر حاوی ہونے کے لیے میری جانب آئی، میں نے ذرا سی جھکائی دی اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑا اور پھر پوری قوت سے دیوار پر دے

مارا۔ اس کا کاندھا، کان اور سر دیوار سے ٹکرایا تو وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کی کمر پر گھٹنا دے مارا۔ وہ بے بس ہو کر قالین پر گر گئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی یوں ہانپ رہی تھی جیسے اسے سانس لینا مشکل ہو رہا ہو۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کی گردن مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ تماشا اپنی جان بچانے کے لیے کر رہی ہو؟''

''ہاں...... میں یہ...... بھی جانتی ہوں...... تم مجھے زندہ...... نہیں چھوڑو...... گے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں زندہ چھوڑ سکتا ہوں، کیونکہ تم تو شطرنج کا مہرہ ہی نہیں ہو، اگر پیادہ بھی ہوتی نا تو شاید میں تم پر تھوڑا وقت ضائع کرتا۔ اس وقت تمہاری حیثیت ایک ٹشو پیپر کے برابر بھی نہیں ہے۔'' میں نے اسے آخر حد تک ذہنی اذیت دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''سچ بتاؤ، کون ہو تم؟'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں پوچھا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ سکون سے بتا دو گی تو بہت اچھا ہوگا، نہیں تو مجھے تم سے بہت زیادہ پیار کرنا پڑے گا۔''

میرے یوں کہنے پر وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر حسرت سے میری جانب دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پھنس گئی ہے۔ میں نے پانی کی بوتل ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اسے سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر بولی۔

''میں یہ مانتی ہوں کہ رتنا اور ششما سے میرا تعلق پرانا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کام بھی آتی رہی ہیں۔ اسی ناتے انہوں نے مجھے مدد کے لیے بلایا تھا۔ میں دل سے ان کی مدد کے لیے نکلی تھی لیکن 'کلیان جی' نے مجھے اس وقت فون کیا جب میں ان کی مدد کے لیے نکل چکی تھی۔ میں یہ کام نہ کرتی تو کوئی اور کر دیتا۔ فارم ہاؤس پہنچنے تک میں نے انہیں اطمینان دلا دیا تھا کہ میں بڑی آسانی سے انہیں ٹریپ کر لوں گی۔ ایسا ہو بھی جانا تھا۔ میں ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، ان کا مجھ پر اعتماد بھی ہے۔ ششما نے مجھے آج صبح تمہارے بارے میں بتایا تو میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں نشے میں نجانے کیا اول فول بکتی رہی۔ صبح ہی مجھے احساس ہو گیا کہ راکیش ورما کی کہانی جو میں سنا چکی ہوں اور کلیان جی کے بارے میں جو میرے منہ سے نکل گیا ہے، تم اسے ضرور پکڑ لو گے اور ایسا ہی ہوا۔''

''تم کیا کرنا چاہ رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے فون کی لوکیشن پر وہ یہاں آ کر ہمیں لے جاتے۔ مگر تم نے میری سوچ سے بھی آگے سوچا۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''اور اب وہ فون کی لوکیشن پر ہی جائیں گے۔'' میں نے دھیمے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے میں انہیں بتا ہی نہیں سکی کہ......'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں پھر تیزی سے بولی۔ ''میرا فون...... اوہ، وہ آنے والے ٹریپ میں آ جائیں گے؟''

''ہاں، کلیان جی یہی سمجھیں گے کہ تم نے انہیں دھوکا دیا، رتنا اور ششما کو بچانے کے لیے۔'' میں نے سکون سے کہا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔

''اگر ان کا ایک بندہ بھی...... کسی کو کچھ ہو گیا تو میں نہیں بچ سکتی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف جم گیا تھا۔ تبھی میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ ''تمہارے پاس صرف دو راستے ہیں؟''

''وہ کیا......'' اس نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

''میرے ساتھ تعاون کرو گی تو میں تمہیں فرار کا راستہ دے سکتا ہوں۔ یہاں تک کہ کسی بھی ملک نکل جانا۔ دوسرا، میرے ساتھ دھوکا کرو گی تو اسی کمرے میں دبا دوں گا۔'' میں نے آخری الفاظ بہت سخت لہجے میں کہے۔

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''رتنا اور ششما کو کہاں لے کر جانا تھا؟''

''دیوگڑھ...... کلیان جی کے ایک اہم آدمی پرتاب راؤ کے پاس۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''تم جانتی ہو اس کے بارے میں؟''

''نہیں، اتنا زیادہ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ کلیان جی اصل میں ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی، مجھے تو بس راکیش ورما کا معلوم ہے۔ اسی نے اس نام سے متعارف کروایا ہے۔''

''تم اس کے لیے کتنا کام کر چکی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت زیادہ، مجبورا کیش ورما کے ساتھ اب بھی کام کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا تو میں خاموش رہا۔ پھر بڑے سکون سے پوچھا۔

''رتنا اور شنشا کو پکڑنے کے لیے تمہیں کس 'کلیان جی' نے کہا تھا؟''

''پرتاب راؤ نے وہ اس علاقے کا......'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بے تاج بادشاہ ہے، اسی کا حکم چلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

میرے یوں کہنے پر وہ خاموش رہی۔ میں بھی سوچنے لگا۔ میرے سامنے اب ایک ہی نام تھا، دیوگڑھ کا پرتاب راؤ۔ لیکن میں آنکھیں بند کر کے اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ جو کچھ پوجا کہہ رہی ہے وہ درست ہی ہوگا۔ وہ مجھے غلط معلومات بھی دے سکتی تھی اس لیے میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہاری دی ہوئی معلومات اگر غلط ہوئیں تو سمجھ سکتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، اگر درست ہوئیں تو مجھے بتا دو، تم کہاں جانا چاہوگی؟''

''مجھے بس آزاد کر دیا جائے، میں خود ہی پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے جانا ہوگا۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں اٹھتے ہوئے بولا۔

''تو پھر آرام کرو۔''

''بھگوان کے لیے، مجھے مارنا مت، میں......'' اس نے لجاجت سے کہا تو میں ایک لمحے کے لیے کنفیوژ ہو گیا۔ وہ واقعی خوف زدہ ہو گئی ہے یا محض ڈراما کر رہی ہے۔ جرم کی دنیا میں آنے والے لوگ اتنے بزدل نہیں ہوتے، جتنا وہ دکھاوا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا، دروازہ لاک کیا اور لاؤنج میں آ گیا۔ وہ لڑکے گھر کے اس حصے میں اس کی نگرانی کے لیے آ گئے۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ میں شہر کے گنجان آباد علاقے کی سڑک پر پیدل جا رہا تھا۔ اس سڑک پر کافی رش تھا۔ بالکل سامنے ایک ٹاور دکھائی دے رہا تھا۔ اس مارکیٹ کا ایک قدیم گیٹ تھا جو میں پار کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہاں راجستھانی روایتی لباس میں بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ممکن ہے یہ وہی ہوں جو ارد گرد کے دیہات سے وہاں آئے ہوں۔ گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چوک تھا۔ مجھے دائیں جانب مڑنا تھا۔ تقریباً دو سو میٹر آگے جانے کے بعد مجھے ایک دکان کا بورڈ دکھائی دیا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ وہ ویسی ہی ہول سیل کی روایتی دکان تھی۔ سامنے ہی گدی پر نوجوان لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے سامنے گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''مجھے مشرا جی سے ملنا ہے؟''

''وہ پیچھے بیٹھے ہیں......'' اس نے بے پروائی سے کہا تو میں نے سامنے دیکھا۔ دکان کے ایک کونے میں ایک موٹا سا ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے سفید کرتہ پاجامہ پر سیاہ صدری پہن رکھی تھی۔ اس نے گول شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی بے ترتیب مونچھیں اور سر پر سیاہ ٹوپی تھی۔ اس کے سامنے حقہ دھرا تھا جس کی نے اس کے منہ میں تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں جیسے ہی اس کے پاس گیا، اس نے اٹھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''خوش آمدید رانا وریر سنگھ جی۔'' یہ وہی خوشگوار آواز تھی جو میں فون پر سنتا رہا تھا۔ مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھے پہچان کیسے گیا ہے۔ میں نے اسے دیکھا پھر ماحول کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا پھر اسی خوشگوار آواز میں بولا۔ ''آپ سے مل کر اچھا لگا۔ راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

''جی بالکل نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ بالکل صحیح وقت پر پہنچے ہیں، میں ابھی گھر کے لیے نکلنے والا تھا۔ میرا خیال ہے گھر ہی چلیں وہیں باتیں ہوں گی۔'' اس نے اپنے سلیپر پہنتے ہوئے کہا۔

ہم پیدل ہی چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تھوڑے فاصلے پر دائیں جانب ایک پتلی سی گلی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔ پھر اس میں ایک ویسی ہی گلی تھی۔ جو آگے سے بند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پرانے سے مکان میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی ہم صحن میں آ گئے۔ وہی پرانی طرز کا گھر تھا۔ گھر میں کچھ افراد تھے لیکن شاید مجھے دیکھ کر وہ ہماری جانب نہیں بڑھے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑی ایک ادھیڑ عمر خاتون سے کہا۔

''کھانا اوپر لگوا دیں۔''

''جی۔'' خاتون نے اتنا ہی کہا اور ہم اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ سامنے دو کمرے تھے اور دائیں بائیں ایک ایک کمرا تھا۔ اس کے سامنے بڑا صحن۔ ہم نے سامنے والے ایک کمرے کے باہر جوتے اتارے اور اندر چلے گئے۔ کمرے میں اے سی چل رہا تھا۔ قالین پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

''میاں، اب بتاؤ کیا صورت حال ہے؟ پھر آگے کی

کوئی بات ممکن ہوسکتی ہے۔'' اس نے پھیل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتایا تب وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میرے خیال میں پوجا سچ کہہ رہی ہے۔ پرتاب راؤ اپنے علاقے میں انتہائی اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ اس کا حکومت میں بھی تعلق ہے، جرم کی دنیا میں وہ انتہائی خطرناک آدمی مانا جاتا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے کہ سیدھے اس پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔''

''میں اُس پر ابھی ہاتھ ڈالنا بھی نہیں چاہتا، کوئی اندر کا بندہ مل جائے تو شاید میرا اور اس کا سامنا ہو ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم اصل میں چاہتے کیا ہو، لیکن تم نے جو اَب تک کیا، اسے دیکھتے ہوئے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ میرا بھی پرتاب راؤ کی طرف کچھ ادھار باقی ہے، وہ بھی چکتا ہو جائے گا۔'' اس نے یوں کہا جیسے کوئی اپنی خواہش کا اظہار کر رہا ہو پھر سانس لے کر بولا۔ ''مشکل تو ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔''

''بس یہی چاہیے، باقی میں دیکھ لوں گا۔'' میں اعتماد سے بولا۔

''ہو جائے گا، فکر نہ کرو۔'' اس نے کہا۔

''یہ کلیان جی والا کیا معاملہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم اس دنیا سے واقف ہو تو کیا تمہیں نہیں پتا، ایک نام گھڑ لیا جاتا ہے اور پھر اس کے اوپر جرائم سے لے کر دہشت گردی تک کر کے خوف طاری کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کون کرتے ہیں، یہ بھی تم جانتے ہو گے۔ یہ کلیان جی بھی ایک ایسا ہی گھڑا ہوا نام ہے۔ جب چاہے، جس جگہ ضرورت ہو اپنا مہرہ بڑھا کر اسی نام سے کام نکال لیا جاتا ہے۔ جتنا بھی اسے صاف کر لیا جائے، یہ ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کے چلانے والے اپنی جگہ موجود رہتے ہیں راکیش ورما ہو یا پرتاب راؤ یا ایسا ہی کوئی بندہ، یہ سب مہرے ہوتے ہیں، کوئی فیل ہوتا ہے، کوئی گھوڑا، کوئی بادشاہ، کوئی ملکہ......''

اس نے بے پروائی سے کہا تو باہر آہٹ ہوئی۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ وہی ادھیڑ عمر خاتون اندر آ گئی۔ اس نے ٹرے لا کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ باہر کوئی دوسرا بھی تھا۔ چند منٹ بعد اس نے بھی کچھ چیزیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ ہم کھانے کے دوران حالات پر بہت ساری باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ اس علاقے میں صورتِ حال کس طرح کی ہے اور اس سے کیسے نبرد آزما ہوا جاتا رہا ہے۔

مشراء جی سے مجھے بہت ساری معلومات مل گئی تھیں۔ میرے ذہن میں جس طرح کا ایک شخص تھا وہ اس سے بالکل ہٹ کر تھا۔ وہ بھی جرم کی دنیا کا ایک بندہ تھا لیکن وہ بہت محتاط ہو کر بڑے کام اس قدر خفیہ انداز میں کرتا تھا کہ کسی کو ہوا تک نہیں لگتی تھی۔ میری اس تک اس لیے رسائی ہو گئی تھی کہ وہ میرے نیٹ ورک کے لیے کئی کام کر چکا تھا اور اب پھر اس سے نئے کام کی ڈیل ہو گئی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا جب مشراء جی اور میرے درمیان چائے کا دور چلا۔ تبھی اس نے کہا۔

''آپ چائے پی کر تھوڑا آرام کرو۔ اب رات تک کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو لڑکی پوجا وہاں پر ہے، اسے وہ لڑکے ہی ٹھکانے لگا دیں گے۔ ابھی اسے چند دن رکھنا ہے۔ میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔''

یہ پہلی بات تھی جو اس نے انتہائی نرم انداز میں کہی تھی۔ یوں لگا جیسے ایک چائے کی پیالی اور کسی کو مار دینا ایک ہی بات ہو۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس قدر خوشگوار باتیں کرنے والا اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔

چائے پینے کے بعد مشراء جی باہر چلا گیا اور میں وہیں لیٹ گیا۔ مجھے اب رتنا اور رشما کی کوئی فکر نہیں تھی۔

☆☆☆

فور وہیل تیزی سے دیوگڑھ کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا، مضبوط جسم کا مالک تھا۔ ملگجی روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش تیکھے دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بال، کلین شیو تھا۔ اس نے ہاف سلیو سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میں ایک شاپنگ سینٹر تک گیا تو انہوں نے مجھ سے رابطہ کر لیا۔ پھر وہیں سے انہوں نے مجھے پک کر لیا تھا۔ تھوڑی سی جان پہچان کے بعد ہمارے درمیان خاموشی طاری تھی۔ میرے دماغ میں کوئی سوچ نہیں تھی اور نہ ہی میں سوچنا چاہتا تھا۔

میں راستے کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔ بس نوجوان نے مجھے اتنا بتایا تھا کہ وہ اہم شاہراہ سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں سے ہوتے ہوئے دیوگڑھ جائیں گے۔ یہ راستہ تقریباً چار گھنٹے کا تھا۔ فور وہیل کے اندر کا ماحول خنک تھا۔ مجھے مشراء جی پر اعتماد تھا۔ جودھ پور سے نکلتے ہی میں سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم سفر کیسے سمٹا۔ جب جاگا تو نوجوان نے کہا۔

''یہ آگے پتلا سا دریائے کھاری آئے گا، پھر تھوڑی دیر

بعد ہم دیوگڑھ پہنچ جائیں گے۔ کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ، یہاں کچھ ڈھابے ہیں۔''

''اگر آگے شہر میں جا کر کچھ نہیں ملے گا تو کھا لیتے ہیں۔'' میں نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''رات گہری ہوگئی ہے، یہاں بیٹھے تو بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر شاید......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''پھر کھانے کو چھوڑو، بس نکلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور وہ خاموش ہوگیا۔

ہم شہر میں داخل ہوئے تو وہی ماحول تھا جو گہری رات کے وقت ہوتا ہے۔ ہمیں ایک مخصوص فلنگ اسٹیشن تک جانا تھا، جہاں ہمارے انتظار میں تین آدمی موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں پہنچے تو وہ لوگ ہمیں فلنگ اسٹیشن کے بالکل سامنے سڑک کے پار کھڑے دکھائی دیے۔ وہ بے پروائی سے کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہم نے فور وہیل فلنگ کے لیے کھڑی کی تو ہمیں دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے فون کال ملائی، میرے ساتھی کا فون بج اٹھا۔ دونوں میں شناسائی ہوگئی۔ فلنگ کی ادائیگی جب تک ہوئی تب تک وہ تینوں سڑک کنارے آگئے۔ ہم چل پڑے اور اگلے چند منٹوں میں وہ ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک نے کہا۔

''یہاں سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ایسی سڑک ہے جہاں رات بھر رونق رہتی ہے۔ وہاں ایک کیسینو ہے۔ جس کی رونق اس وقت عروج پر ہوگی۔ وہ پرتاب راؤ کا ہے۔ تم اس شہر میں آنے کا احساس دلا دو۔''

''او کے......'' میں نے سکون سے کہا۔ میرے ساتھی ڈرائیور کو اس کیسینو کا پتا تھا۔ میرے پیچھے بیٹھے ایک نوجوان نے وہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ تبھی میں نے اس صورتِ حال کے تناظر میں ایک پلان انہیں بتا دیا کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا۔

وہ سڑک واقعی روشن تھی۔ یہ گمان ہی نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا پچھلا پہر ہے۔ ایسی کسی سچویشن میں آسانی یہی ہوتی ہے کہ ساتھیوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہی ساتھی سب سے زیادہ مشکل کا باعث بن جاتے ہیں۔ میں ان کے نام کیا، ان کے چہرے بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔ فور وہیل میں کافی طرح کا اسلحہ تھا۔ میں نے دو پسٹل لیے، ان کے میگزین دیکھ کر شرٹ کے نیچے اڑس لیے تھے۔ اس کے ساتھ میں نے ایک دستی بم بھی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے اور میرے کور پر جانے والے نے اپنا چہرہ پر سیاہ نقاب میں چھپا لیا تھا۔ ہم پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

ڈرائیور نے رنگ برنگے چمکتے ہوئے نیون سائن کی روشنوں کے نیچے بالکل اس کیسینو کے گیٹ کے سامنے فور وہیل روک دی۔ گیٹ پر تعینات دو گارڈ فور وہیل کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

میں انتہائی تیزی سے فور وہیل سے اُتر کر گیٹ کی جانب بڑھا تو داخلی دروازے پر کھڑے دونوں گارڈ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اندر کہیں مجھے سی سی ٹی وی کیمرے سے دیکھا جا رہا ہوگا۔ وہ ہمارے سیاہ نقاب دیکھ کر الرٹ ہو گئے ہوں گے۔ ہمارا مقصد وہاں سوائے دہشت پھیلانے کے اور کچھ نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ تاثر یہی دینا تھا کہ وہاں ڈکیتی کی گئی ہے۔ اس دوران مجھے کور دینے کے لیے نوجوان اتر کر میرے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے انہی گارڈز سے ابتدا کرنے کا سوچ لیا تھا۔

وہ دونوں گارڈ میرے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں اپنے دونوں پسٹل نکال چکا تھا۔ میں نے بیک وقت ان دونوں پر فائر کر دیے۔ بلاشبہ ان فائرز کی آواز اندر تک گئی تھی۔ اس سے پہلے کوئی کچھ سمجھتا، میں اندر چلا گیا۔

اندر واقعتاً ہلچل مچ چکی تھی۔ سامنے کاؤنٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بار تھا جہاں کافی مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر سے زیادہ میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پسٹل پر تھیں۔ میں تیزی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھا۔ کیسینو کے ایک کونے میں دو افراد انتہائی سرعت سے گن نکال چکے تھے۔ میں نے لمحے کا ایک حصہ بھی ضائع نہیں کیا اور ان پر فائر کرنے لگا۔ فائر کے ساتھ وہاں چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ لوگ میزوں کے نیچے چھپنے لگے۔ کوئی زمین پر لیٹ چکا تھا۔ میں فائر کرتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں بھی لوگ نیچے چھپ گئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر کی آڑ لی اور فائر کرنے لگا۔ مجھے کور دینے والا نوجوان میرے پیچھے آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ فائر کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے چھپے تین افراد پر فائر کر چکا تھا۔ وہاں سامنے کافی سارا کیش گڈیوں کی صورت میں پڑا تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نوجوان میرے قریب آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے وہ سارے نوٹ اس بیگ میں ڈالنے

شروع کر دیے۔ میں اندر ہونے والی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھی مجھے خطرہ محسوس ہوتا، میں فوراً فائر کر دیتا۔ نوجوان بیگ بھر چکا تھا۔ میں کاؤنٹر سے نکل کر بار تک پہنچ گیا۔ انہی لمحات میں سامنے سے فائرنگ ہونے لگی۔ نوجوان نے بیگ گلے میں ڈالا اور فائر کرنے لگا۔

لوگوں کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ بار کے کاؤنٹر پر شراب پھیل چکی تھی۔ لوگ وہاں سے اٹھ کر نیچے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بوتل اٹھائی اور اسے ریک میں لگی بوتلوں پر دے مارا۔ جس سے بہت ساری بوتلیں ٹوٹ گئیں اور ان سے شراب بہنے لگی۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا، میں نے فائرنگ کی سمت اور پھر داخلی دروازے کا اندازہ لگایا۔ نوجوان کو اشارہ کیا کہ اب نکلنا ہے۔ میں نے اسے کور دیا، وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ میں نے جیب سے دستی بم نکالا، اس کی پن نکالی اور وہیں بار میں لڑھکا دیا۔ اب میرے پاس بھی کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے دوسرا پسٹل نکالا اور اندھا دھند فائر کرتے ہوئے وہاں سے نکل کر دروازے کی سمت بھاگا۔ میں جانتا تھا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور ہوا تو فور وہیل میں بیٹھے نوجوان موجود ہیں، وہ ان پر حملہ کر دیں گے۔ باہر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے چند لمحوں کا فاصلہ بہت مشکل سے طے کیا۔ جیسے ہی میں داخلی دروازے کے پاس پہنچا، اندر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں پوری جان سے لرز گیا۔ میں گرتے گرتے سنبھلا تھا۔ میں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمائے اور فور وہیل تک جا پہنچا۔ میں جیسے ہی بیٹھا، ڈرائیور نے فور وہیل بڑھا دی۔ وہاں سے نکلتے ہوئے میں نے اندر آگ بھڑکتے ہوئے دیکھی۔ فور وہیل تیزی سے سڑک پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔

میرے پیچھے بیٹھا ایک اور نوجوان کسی کو وہاں ہونے والی صورتِ حال کے بارے بتا رہا تھا۔ میرے کانوں میں اب تک ہونے والے...... دھماکے اور لوگوں کی چیخ و پکار گونج رہی تھی۔ میں نے خاموشی سے پسٹل کا میگزین بدل کر کسی بھی نئی صورتِ حال کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

اس سڑک کے اختتام پر ایک بڑا کراس تھا۔ وہاں تک ابھی کیسنو پر حملے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ وہاں سب معمول کے مطابق تھا۔ ڈرائیور نے فور وہیل نہیں روکی بلکہ سیدھا چلتا چلا گیا۔ اگلے کراس سے پہلے ہی وہ ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک پر مڑ گیا۔ وہاں سے نکلا تو سامنے ایک بڑی سڑک تھی۔ وہ بالکل ویران تھی۔ یہاں تک کہ ایک جگہ دو کاریں کھڑی دکھائی دیں۔ ڈرائیور ان کے پاس جا کر رک گیا۔

جب تک فور وہیل رکی میرے پیچھے بیٹھے نوجوان نے مجھے بتایا کہ میں کس کار میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ باقی بھی اتر کر دوسری کار میں بیٹھنے لگے۔ میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔

مجھے سمجھ آ رہا تھا۔ فور وہیل کسی نہ کسی کیمرے میں آ چکی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ حملہ آور کون ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس فور وہیل سے جان چھڑا لی تھی۔ پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا، فور وہیل میں دھماکا ہوا، وہ پھٹ چکی تھی اور اس میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی بھی ثبوت وہیں ختم کر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگا لی۔

کاریں واپس شہر کی جانب رواں تھیں۔ ایک جگہ آکر دوسری کار ہم سے جدا ہو گئی۔ تب میں نے ڈرائیور کی جانب دیکھا تو چونک گیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ تھوڑا سا ڈھانپا ہوا تھا۔ مجھے شک ہوا جیسے وہ کوئی لڑکی ہو۔ میں نے زیادہ تجسس نہ کیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ تک تیز تر سفر کرنے کے بعد ہم ویران سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک پوش علاقے میں آ گئے۔ ایک آہنی گیٹ کے سامنے اس نے کار روکی تو روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بنگلا کافی بڑا ہے۔ ہم جیسے ہی رکے فوراً ہی چند سیکیورٹی گارڈ لپکے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے انتظار میں ہوں۔ سیکیورٹی والوں نے زیادہ وقت نہیں لیا اور کار کو اندر آنے دیا۔

سامنے بنگلے کا مین پورچ تھا۔ کار اُدھر نہیں گئی بلکہ فوارے سے گھوم کر دائیں جانب چلی گئی۔ سامنے عمارت یوں بنی ہوئی تھی جیسے بنگلے سے ہٹ کر کوئی آفس یا الگ قسم کا گھر ہو۔ ڈرائیور نے کار روک دی پھر اترتے ہوئے مجھے آنے کا اشارہ کیا تو میں نیچے آ گیا۔ وہ مجھے لیتی ہوئی داخلی دروازے سے اندر چلی گئی۔ سامنے ہی..... مضبوط جسم کا ایک گارڈ نما شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو لڑکی نے ہاتھ اوپر کر دیے۔ گارڈ نے اس کی تلاشی لی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا تو اس نے جانے کا اشارہ کر دیا۔

لمبی راہداری میں دائیں جانب مڑ کر وہ ایک کمرے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے دروازہ ہلکا سا بجایا اور پھر کھول کر پہلے خود اندر گئی پھر چند لمحے بعد مجھے اندر بلا لیا۔ پُرتعیش سامان سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک خوشگوار بھینی بھینی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کمرے میں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ سفید سیاہ اور طلائی رنگ وہاں

کی ہر شے میں نمایاں تھا۔ تبھی میری نگاہ سامنے کھڑی ایک عورت پر پڑی۔ اس کی پشت میرے سامنے تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی طلائی بت نصب ہے یا کوئی موی مجسمہ۔ اس نے میرون رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اسی رنگ کا مختصر سیلولیس بلاؤز تھا۔ اس کی کمر آدھی ساڑی کے پلو نے اور آدھی اس کے لمبے سیاہ بالوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔ پیلی روشنی سے اس کا سفید بدن طلائی رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے رکتے ہی وہ دھیرے دھیرے مڑی تو میں چونک کر رہ گیا۔ لمبا، سڈول بدن، لانبے گیسو، بھاری سینے اور لانبی گردن والی اس عورت کا آدھا چہرہ باقی آدھے چہرے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک طرف سے وہ بالکل حسین تھی۔ لیکن دوسری جانب یوں لگ رہا تھا جیسے چہرہ بگڑنے کے بعد پلاسٹک سرجری سے اسے ٹھیک کر دیا گیا ہو لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا ہو۔

''اچھا تو تم ہو رانا ویر سنگھ......'' اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ اس پر میں خاموش رہا تو وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی اور نہ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہاری پرتاب راؤ سے کوئی دشمنی ہے یا نہیں، لیکن میں اتنا ضرور پوچھنا چاہوں گی کہ کیا تم اس کے بارے میں جانتے ہو یا انجانے میں یہ آفر قبول کر لی ہے؟''

''نہیں جانتا تو جان جاؤں گا اور جان لے بھی لوں گا۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''تم چاہے جان لے لو یا دے دو مگر یہ جو ہمارے اور تمہارے درمیان ملاقات ہے، اسے اپنی زندگی سے کھرچ دینا، جو چاہو گے، ملے گا۔''

''مجھے بس اتنا ہی چاہیے۔'' میں نے اس بار قدرے بے پروائی سے کہا۔

''مجھے تمہارا انداز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ تم ہمارے خاص مہمان رہو گے۔'' اس نے کسی بھی جذبے سے عاری لہجے میں کہا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو، دشمن کو مار دینا، کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، وہ تو مر گیا، جان چھوٹی اس کی۔ اہم بات یہ ہے کہ دشمن کو بے بس کر کے، اسے اس کی اوقات دکھانا ہوتی ہے۔ وہ سامنے پڑا سسکے اور اس کی سسکاری دراصل تمہاری فتح ہے۔'' اس نے غرانے والے انداز میں کہا، پھر چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے میرے ساتھ کھڑی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری بہت اچھی میزبان ثابت ہوگی۔'' مجھے یقین

ہے کہ ہماری بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے مجھے جانے کے لیے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ اگرچہ میرے ذہن میں کئی سوال گردش کر گئے تھے لیکن میں کوئی بھی سوال کرنے کا ارداہ ترک کرتے ہوئے پلٹ گیا۔

وہ لڑکی میرے پیچھے تھی۔ میں کمرے سے باہر آگیا۔ اس عورت نے میرا دماغ سلگانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے واضح پیغام بھی دے دیا تھا کہ میں کوئی بھی کامیابی لیتا ہوں تو ٹھیک ورنہ ناکامی کی صورت میں وہ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ میں اس کی منشا سمجھ گیا تھا۔ مجھے اس کے کسی پیغام سے کوئی غرض نہیں تھی' مجھے اپنے مقصد سے غرض تھی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی جو مہم مجھے دے دی گئی تھی، اس سے بلاشبہ وہ عورت یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ اگر میں اس مہم میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو وہیں میرا فیصلہ ہونا تھا کہ آگے وہ میرے ساتھ کیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اس مہم کے فوراً بعد ہونے والی ملاقات سے مجھے یہی تاثر دیا گیا تھا کہ نہ صرف وہ مجھ سے خوش ہوئی بلکہ آئندہ کے لیے ان کے نزدیک میری حیثیت کیا ہوگی، وہ بھی بتا دیا۔

ہم ایک بنگلے نما گھر میں پہنچ گئے جو اس آہنی گیٹ والے بنگلے سے کافی دور تھا۔ دن نکلنے کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ نیلگوں روشنی ہر جانب پھیل گئی تھی۔ گاڑی پورچ میں رکنے کے بجائے سیدھی گیراج میں چلی گئی تھی۔ میں وہاں اترا تو لڑکی... بھی اتر آئی۔ اس نے مجھے سامنے والے دروازے میں سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر چلا گیا۔ سامنے راہداری تھی۔ جس کے بعد کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جانے کا اشارہ کر کے خود آگے بڑھ گئی۔ میں لحہ بھر رکا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ ایک پُرآسائش کمرا تھا۔

میں ابھی کمر بھی سیدھی نہیں کر پایا تھا کہ ہلکے سے کھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ تبھی کھڑکی سے دبیز پردہ ہٹا تو اُجالا کمرے میں درآیا۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں کچھ دیر سو یا تھا۔

پردہ ہٹانے والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ بوائے کٹ بالوں والی نے سیاہ ٹائٹس کے ساتھ ڈھیلی سی سفید سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گول چہرے پر نین نقش تیکھے نہیں تھے۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی تھی، ہونٹ سرخ لیکن موٹے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن پر چتون بنائی ہوئی تھی۔ سفید رنگ کے ساتھ پتلا سا جسم تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھ سے بے نیاز پردہ ہٹا کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ چند لمحے میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد خالص راجستانی لہجے میں بولی۔

"اگر تھکن اُتر گئی ہو تو جا کر فریش ہوجاؤ۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میں پہچان گیا تھا کہ یہی رات والی لڑکی ہے۔ میں جواب دینے کے بجائے اٹھا اور فریش ہونے چل دیا۔

واپس آیا تو میز پر کافی کچھ کھانے کے لیے سج چکا تھا۔ وہ ایک کرسی پر انتظار والی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار میں نے اس کا چہرہ بھرپور انداز میں دیکھا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ میک اپ بھی کرلے تو اتنی خوبصورت نہیں لگے گی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کرختگی تھی۔ اس نے کوئی بات کیے بنا کھانا شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھانے لگی۔

میں نے کھانا ختم کیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم مجھے ریتو کے نام سے پکار سکتے ہو۔"

"میرا نام تمہیں معلوم ہی ہوگا۔" میں نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی بھی مسکان نہیں ابھری بلکہ اسی سنجیدگی سے وہ بولی۔

"ہاں معلوم ہے، راناویر سنگھ۔"

"مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو رانی بھاگ وتی چاہے گی؟" اس نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"چلو، میں تمہیں تھوڑا بتا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے سوچا، پھر کہتی چلی گئی۔ "جس سے تم رات ملے تھے، وہ رانی بھاگ وتی تھی۔ اس کے ماتا پتا، کسی زمانے میں اس علاقے کے مالک تھے۔ وہ نہیں رہے۔ یہ اکلوتی ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ یہ بڑے آرام سے اپنی زندگی گزار رہی تھی کہ پرتاب راؤ اس کی زندگی میں آگیا۔ اس نے رانی بھاگ وتی کا سب کچھ چھننا شروع کردیا یہاں تک کہ اسے اپنے محل تک محدود کردیا۔"

"تو کیا وہ اب اس سے بدلہ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"پرتاب راؤ نے اس سے سب کچھ ہی نہیں چھینا، اس کی زندگی اجیرن کردی۔ وہ شادی نہیں کرسکتی، کیونکہ پرتاب راؤ نہیں چاہتا۔ اس کا حُسن ختم کردیا کہ وہ اسے داغدار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے جینے بھی نہیں دیتا۔"

"مجھے یہ بتاؤ تمہاری رانی بھاگ وتی چاہتی کیا ہے؟" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"پچھلے دو برس سے اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس پرتاب راؤ سے چھٹکارا پانا ہے۔ لیکن رانی کا کوئی بس نہیں چل رہا۔ ایک دو بار کوشش بھی کی لیکن رانی ہی کے بندے مارے گئے۔ اب رانی آخری کوشش کرنا چاہتی ہے۔ اسی مقصد کے لیے اس نے کچھ لوگ اکٹھے کیے ہیں۔ جن میں ایک تم بھی ہو۔" ریتو نے کہا تو مجھے لگا کہ یہ کہانی کافی ادھوری سی ہے۔ اصل کہانی کیا ہے؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھے اپنے مقصد سے مطلب تھا اس لیے میں نے کرید نہیں کی۔ وقت نے اگر میرا ساتھ دیا تو یہ کہانی خود بخود میرے سامنے آجائے گی۔ سو میں نے بات کرنے کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا رانی بھاگ وتی کے اس نیٹ ورک کو تم دیکھ رہی ہو؟"

"ابھی تک یہاں کوئی نیٹ ورک نہیں بنا ہے۔ بس لوگ ہی لوگ ہیں جنہیں رانی پال رہی ہے اور بس۔ ان سے کوئی کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ کوئی کام لینے والا ہی نہیں ہے۔ ہاں رات جو پہلا اٹیک ہوا، اس میں بھرپور کامیابی ملی ہے۔ پرتاب راؤ تڑپ رہا ہے۔"

"اصل میں کرنا کیا ہے، راؤ کو قتل کرنا ہے یا......"

"ختم کرنا ہے۔ اس کا گھمنڈ، اس کی طاقت! اس کا یہ سارا نیٹ ورک۔" ریتو نے نفرت سے کہا۔

"تم لوگ کیا سوچ رہے ہو، کس بنیاد پر یہ سب ختم کر سکو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو اس نے میرا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات ہیں، ان کے اندر تک ہمارے لوگ موجود ہیں، جن سے فائدہ لیا جا سکتا ہے، تم یہ تو جانتے ہو اور سمجھتے بھی ہو نا کہ معلومات خود ایک طاقت ہے۔"

"معلومات کون دیتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سارے لوگ ہیں، جو اس پورے علاقے میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔" اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جس طرح تم بتا رہی ہو، پرتاب راؤ ایک طاقت ور آدمی ہے تو اس کا نیٹ ورک بھی تو ہو گا، تو کیا وہ تم تک نہیں پہنچ سکتا؟" میں نے پوچھا۔

"پہنچ سکتا ہے، لیکن ہمیں ایسا کوئی ثبوت نہیں دینا کہ ہمارے پیچھے رانی بھاگ وتی ہے اسی لیے کچھ لوگ اکٹھے کیے ہیں۔" اس نے بتایا تو میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، جب میری ضرورت پڑے تو بتا دینا۔"

میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر کچھ کہے بنا برتن اٹھا کر چلی گئی۔ میں بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔

نجانے مجھے کیوں لگا تھا کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی تھی۔ اگر رانی بھاگ وتی نے بساط بچھا ہی لی تھی تو کرائے کے مہرے کب تک چلتے؟ اس کے اپنے لوگ کیا اتنے وفادار نہیں ہیں کہ وہ اپنی رانی کے لیے جان تک دے دیں؟ رانی اور پرتاب راؤ کا کوئی نہ کوئی ایسا تعلق ضرور ہو گا جس کی بنیاد پر یہ دشمنی ہے؟ میرا ذہن یہ قبول ہی نہیں کر رہا تھا کہ ایسا کچھ رہا ہو گا۔ اندر کی بات کیا تھی، یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا۔ مجھے ان کی دشمنی سے کوئی غرض نہیں تھی، مجھے اپنے مقصد سے مطلب تھا۔ اگر وہ مجھے دکھائی دے گیا تو پھر نہ مجھے رانی سے اور نہ پرتاب راؤ سے کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ریتو پھر آن وارد ہوئی، اس کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار تھا۔ اس بار اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ پتلون پر نیلی چیک دار شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے اخبار میری جانب بڑھا کر خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس واردات کو ڈکیتی کا ہی رنگ دیا گیا ہے؟"

میں نے اخبار پر سرسری سی نگاہ ڈالی، مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد لکھی ہوئی تھی۔ ڈکیتی کی رقم اور ڈکیتوں کے بارے درج تھا۔ سی سی ٹی وی کیمرے سے تصویریں بھی تھیں۔ میں نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پرتاب راؤ کا کیا خیال ہے، وہ بتاؤ؟"

"وہ ابھی کچھ نہیں بولا۔" اس نے کہا۔

"جب وہ بولے تو بتانا۔" میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر پوچھا۔

"کچھ معلومات ہیں، لیکن اس سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں ہم کوئی کارروائی کر سکتے ہیں یا ابھی چند دن رکنا ہو گا؟"

"تم نجانے میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو؟ یا شاید میرا امتحان لے رہی ہو؟" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب' میں تو......" اس نے کہنا چاہا تو میں تیزی

سے بولا۔

’’جب جنگ کا آغاز کر دیا جائے تو پھر دشمن کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دینی چاہیے۔ کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے یہ بھی نہیں دیکھا جاتا، ہار جیت کا فیصلہ تب ہوتا ہے جب دشمن صلح کے لیے ہاتھ بلند کر دے۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ......‘‘ اس نے کہنا چاہا تو میں نے تلخی سے کہا۔

’’میرا مطلب جو بھی ہے لیکن تم یوں بات کر رہی ہو جیسے ہم کوئی گیم کھیل رہے ہیں۔ ہاں یہ کھیل ہے مگر موت کا، ہم کسی کو مارنے جائیں تو یہ سوچ کر جائیں کہ ویسی ہی گولی ان کے پاس بھی ہے جو ہمارے بدن کے پار بھی ہو سکتی ہے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہتے ہو، ہمارے پاس معلومات تو بہت ہیں لیکن انہیں استعمال کیسے کرنا ہے، ظاہر ہے اس کے لیے پلاننگ تو کرنا ہوگی۔‘‘ ریتو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

’’کسی بھی کام کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے مطابق معلومات کو استعمال کر کے پلان کیا جاتا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’یہی تو سوچنا ہے، کہاں سے کیا کریں؟‘‘ اس نے تیزی سے کہا۔

’’دیکھو، اپنی رانی بھاگ وتی سے پوچھو وہ چاہتی کیا ہے، اس کا اصل ہدف کیا ہے، جب تک ہمارے پاس ہدف نہیں ہوگا، ہم کوئی پلان نہیں کر سکتے۔ پلان تبھی ہوگا، جب کوئی ہدف ہمارے پاس ہوگا۔ مثلاً صرف راؤ کو ختم کرنا ہے، اس کا نیٹ ورک تباہ کرنا یا اسے کمزور کر کے اس کی جگہ لینی ہے کیا کرنا ہے، یہ پوچھو۔‘‘ میں نے ٹھہرے انداز میں کہا۔

’’ٹھیک ہے، میں کر لوں گی بات۔ ابھی تمہیں ایک صاحب سے ملانا ہے، آؤ میرے ساتھ۔‘‘ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ باہر نکلتی چلی گئی۔ میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ ہم دونوں ایک راہداری میں چلتے ہوئے پچھلی جانب کاریڈور میں آگئے۔ وہاں سے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دوسری منزل پر جا کر ایک کمرے میں آئے تو وہاں ایک کمپیوٹر لیب بنی ہوئی تھی۔ جس میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ان سے ذرا فاصلے پر ایک نرم سے چہرے والا ادھیڑ عمر شخص کمپیوٹر اسکرین میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے ہماری جانب دیکھا، پھر اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کا چہرہ نرم اور پُرسکون، آنکھیں بھوری سی متورم اور خشخشی داڑھی تھی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر لبوں میں مسکرا دیا۔

’’یہ ملکیت سنگھ ہیں۔‘‘ ریتو نے ہولے سے تعارف کرایا پھر میرے بارے میں اسے بتایا۔ ’’یہ راناویر سنگھ ہیں۔‘‘

’’نام سے کیا فرق پڑتا ہے، کام ہونا چاہیے۔‘‘ اس نے نرم سے انداز میں کہا اور پھر مسکرا دیا۔

’’اسی لیے تو آئے ہیں کہ کام سمجھا دیں، کرنا کیا ہے۔‘‘ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جس میں طنز کی آمیزش تھی۔

’’ایک میان میں دو تلواریں تو سنا ہی ہوگا آپ نے۔‘‘ ملکیت سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا، پھر گہرے لہجے میں بولا۔ ’’لیکن معاملہ اس سے بھی ہٹ کر ہے۔ جسے جاننا ضروری تو نہیں؟‘‘

’’ضروری نہیں......مطلب؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔‘‘ اس نے مسلسل میرے چہرے پر نگاہیں جمائے کہا تو میں نے ایک طویل سانس لی اور پھر اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

’’اب تک آپ لوگ ایسی باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں، جن کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ سو مجھے بھی کوئی چنتا نہیں۔ میں نیچے جا کر سو رہا ہوں۔ جب کوئی کام ہو تو بتا......‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے بات پوری کرنا چاہی تو ملکیت سنگھ نے کہا۔

’’یہاں ہمارے پاس بیٹھا کرو۔ یہاں راؤ پرتاب سنگھ کے بارے میں بڑی معلومات ملیں گی۔ ابھی تو یہی کام ہے۔ پھر دیکھتے ہیں۔‘‘ ملکیت سنگھ نے اتنے نرم انداز میں کہا جتنا کسی نوآموز شاگرد کے لیے لہجہ اپنایا جا سکتا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اپنے کاندھے اچکا دیے، جس کا یہی مطلب تھا کہ جیسا تم لوگ چاہو۔ کچھ دیر بعد مجھے ایک لیپ ٹاپ تھما دیا گیا۔ جس میں پرتاپ راؤ کے بارے میں معلومات تھیں۔ لیپ ٹاپ لے کر میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

☆☆☆

ہر وہ ریاست جو توسیع پسندانہ عزائم رکھنے کے علاوہ اپنی دھاک بھی قائم رکھنا چاہتی ہو وہ ایسے ناجائز ہتھکنڈے

ضرور استعمال کرتی ہے۔ کسی بھی ریاست میں ایک ایسا اَن دیکھا ٹولا، گروہ یا مافیا موجود ہوتا ہے جو اپنی مرضی مسلط رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں اپنے ہم وطن مارنا پڑیں یا کسی دوسرے ملک میں کارروائیاں کرنا پڑیں، وہ دریغ نہیں کرتے۔ ریاست چلانے والے بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

پورا دن پرتاب راؤ کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے ہوئے گزر گیا۔ جس کے مطابق وہ اُن عناصر میں سے ایک تھا، جو ریاست کے ساتھ مل کر نہ صرف امور نمٹاتے تھے بلکہ اپنی جرم کی دنیا کو بھی پورا تحفظ دیتے تھے۔ ریاست بھی ان سے وہ ناجائز کام لیتی ہے جو وہ سیدھے سبھاؤ نہیں کرسکتی۔ پرتاب راؤ کی اصل طاقت ریاست کے ساتھ جُڑے ہونا ہی تھا، جس کی وجہ سے وہ بے دھڑک مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

میں اس کے بارے میں پڑھ پڑھ کر بور ہو چکا تھا۔ مختلف ایجنسیوں کی رپورٹس سے لے کر اخباری خبریں اور تجزیے تھے۔ اس کے ساتھ بہت زیادہ تعداد میں چھوٹے بڑے ویڈیو کلپس بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ڈنر کے بعد انہیں دیکھوں گا۔

ڈنر پر میں اور ریتو ہی تھے۔ وہ تھوڑی دیر مجھ سے باتیں کرکے اٹھ گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور ایک ایک کرکے ویڈیو دیکھتا رہا۔ وہ اس کی سیاسی اور گھریلو زندگی دکھا رہی تھیں۔ اسی دوران میں نے ایک فولڈر کھولا۔ اس میں چند ویڈیوز تھیں۔ میں نے جونہی پہلی ویڈیو کھولی تو چونک گیا۔

وہ کسی چھوٹے سے کیمرے سے بنائی گئی ویڈیو تھی۔ اس کا رزلٹ اتنا اچھا تو نہیں تھا لیکن اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ کچھ سمجھ نہ آسکے۔ وہ کسی ایسی جگہ کی چوری چھپے بنائی گئی ویڈیو تھی جہاں کچھ لوگ قید تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے پنجرے میں بند ننگے انسان، جو شاید بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کہیں درختوں کے ساتھ بندھے انسان تھے۔ وہ جس کسی نے بھی ویڈیو بنائی تھی، ویڈیو بنانے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ویڈیو خفیہ طور پر بنائی گئی ہے۔ کسی جگہ فوکس نہیں ہو پا رہا تھا۔ اچانک اندھیرا ہوا اور کلپ ختم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اگلا ویڈیو کلپ چلایا۔ وہ ایک غار نما جگہ تھی۔ جس کے اندر کہیں کہیں مدقوق سے بلب جل رہے تھے۔ وہاں مجھے عورتیں بندھی ہوئی دکھائی دیں۔ یہ مختلف عمر کی تھیں۔ منظر تیزی سے بدلتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک جگہ مجھے ایک ادھیڑ عمر جوڑا بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے کلپ وہیں روک دیا۔ وہ منظر دھندلا گیا۔ میں نے پھر سے دیکھا، پھر بار بار دیکھا، جس طرح میں دیکھتا جا رہا تھا، میرے اندر آگ بھڑکتی چلی جا رہی تھی۔ میرا روم، روم شعلے اُگلنے لگا تھا۔ جس طرح وہ مجبور اور بے کسی کی حالت میں پڑے تھے، میرے اندر کا درندہ اتنی ہی قوت سے جاگ گیا تھا۔ یہاں تک کہ میرے سامنے کا منظر دھندلا گیا۔

نجانے کتنی بار میں نے وہ منظر دیکھا اور پھر خود پر قابو پانے میں کتنا وقت لگا تھا، مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میرے لیے وقت کا احساس مٹ گیا۔ میں نے اگلے ویڈیو کلپ دیکھے۔ وہ وہیں کے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر جوڑا پھر سے دکھائی دیا تھا۔ بس ایک لمحہ انہیں دیکھا تھا۔ باقی کلپ اسی جگہ کے مزید مناظر تھے۔ باہر قیدی کام کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ان پر مسلط تھے۔ جس وقت میں نے باقی فولڈر میں موجود ویڈیو دیکھے، تب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں بے چین ہو چکا تھا۔ وہی ادھیڑ عمر جوڑا میرا ہدف تھا۔ جس کے لیے میں اتنا سفر کرکے یہاں تک پہنچا تھا۔ میں ایک منزل سر کر چکا تھا۔ اب اگلی منزل کے لیے مجھے تیار ہونا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس گھر کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ میں راہداری پار کرکے کاریڈور میں آ گیا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش میں تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ تبھی مجھے اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، میرے پیچھے ریتو کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے یوں خاموشی سے آکر کھڑے ہونے کی وجہ پوچھتا، اس نے ہولے سے پوچھا۔

”کیا بات ہے ویر سنگھ......؟“

”یہ تیرا پرتاب سنگھ تو بہت ہی ظالم بندہ ہے۔“ میں نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

”شاید تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔“

”ریتو، مجھے ایک فون چاہیے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”اوہ، ابھی چاہیے تو یہ لو۔“ اس نے نہ سمجھتے ہوئے اپنا فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک نگاہ فون کی طرف دیکھا پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بالکل نیا، جس کا سم کارڈ......“ میری بات پوری

بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ سمجھ گئی۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اسی لمحے واپس پلٹ گئی۔ میں وہیں کاریڈور میں ٹہلنے لگا۔ پھر وہاں سے لان میں موجود ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ ایک تصور اب ایک حقیقت میں بدل گیا تھا۔ اس حقیقت کو قابو کرنے کے لیے میرے دماغ میں جو طوفان اٹھا ہوا تھا، وہ میرے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

”یہ لو......“ ریتو کی آواز پر میں چونکا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کب میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ انتہائی خطرناک معاملہ تھا۔ میرے جذبات کوئی دوسرا سمجھ جائے، یہ میری غفلت ہی نہیں انتہائی درجے کی بداحتیاطی تھی۔ جس راہ کا میں مسافر تھا، اس میں غفلت ہی سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔ میں نے خود کو سرزنش کی اور فون پکڑتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ریتو۔“

”کوئی بات نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”میرے خیال میں تم واپس کمرے میں جاؤ، فریش ہوکر پُرسکون ہونے کی کوشش کرو۔ اگر تم چاہو تو میں وہاں آجاتی ہوں۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی......“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ، ٹھیک ہے۔“ اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ میں نے کچھ دیر تک فون کو جانچا۔ وہ میرے لیے ’بے ضرر‘ تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے چاچا عبدالمجید کے نمبر ملائے اور رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں بعد رابطہ ہوگیا۔ چاچا عبدالمجید کی شناسا آواز میرے کانوں میں گونجی تو میرا لہجہ حد درجہ جذباتی ہوگیا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں ہوں چاچا......“

”خیر تو ہے نا پتر......“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں پہنچ گیا ہوں۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ یوں جیسے میری بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

”کیسے ہیں وہ......؟“ چاچا عبدالمجید نے یوں پوچھا جیسے وہ میرا جواب جانتے ہوں اور سننا بھی نہ چاہتے ہوں۔

”میں بتا نہیں سکتا۔“ میرا لہجہ رو دینے والا تھا۔

”میں سمجھ گیا ہوں پتر۔“ انہوں نے کڑک دار آواز میں کہا پھر لمحہ بھر بعد بولے۔ ”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہمت......“

”نہیں چاچا ایسی بات نہیں، بس یہ وقتی کیفیت ہے۔“ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ سکون سے بولے۔

”بالکل، یہ فطری سی بات ہے۔ بہرحال گھبرانے کی ضرورت نہیں، مجھے ساری معلومات دو، میں کرتا ہوں کچھ۔“

”میرے پاس چند ویڈیوز کے علاوہ مزید کچھ بھی نہیں ہے، پتا نہیں یہ کب کی ہیں، اس وقت وہ کس حال میں ہیں، ہیں بھی یا......“ یہ کہتے ہوئے میں رک گیا پھر انتہائی اختصار سے انہیں بتا دیا۔ سب کچھ سن کر وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

”کوئی بات نہیں، تم وہ ویڈیوز مجھے بھیجو۔ جگہ کا بھی اندازہ ہوجائے گا اور جو تم سے پہلے اس مشن پر جاچکے ہیں، ان کا رابطہ بھی تمہارے ساتھ ہوجائے گا۔ تم کو بس خود پر قابو رکھنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی بھیجتا ہوں۔“ میں نے کہا اور الوداعی باتوں کے بعد فون بند کردیا۔

میں واپس کمرے میں گیا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے ویڈیوز چاچا کو بھیج دیں۔ کچھ دیر بعد ان کا جواب آگیا کہ پہنچ گئی ہیں۔ ساتھ میں یہ تنبیہ بھی کردی کہ خود پر ہر طرح سے قابو رکھنا ہے، یہ بہت نازک وقت ہے۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ ریتو ہاتھ میں چائے کے مگ پکڑے کمرے میں آگئی۔ اس نے ایک مگ مجھے تھمایا اور دوسرا خود لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ میں بھی چائے پینے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

”رانا، بولو کس بات نے اتنا دکھی کردیا تمہیں؟“

اس کے یوں کہنے پر میں چند لمحے چپ رہا جیسے سوچ رہا ہوں، پھر مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”ریتو، جب کوئی بے بس انسان پر ظلم ڈھاتا ہے نا، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ سامنے طاقتور دشمن ہے یا کمزور، جیسا بھی ہے اگر وہ ہتھیار اٹھائے ہوئے ہے تو اس سے مقابلہ بنتا ہے۔ لیکن...... وہ جو کمزور ہے، بے بس ہے، جسے قیدی بنالیا جاتا ہے، اور پھر اس سے غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے، وہ برداشت نہیں ہوتا۔“

”پرتاب سنگھ، ایسا کرسکتا ہے، یہ میں مانتی ہوں مگر......

تمہیں یہ احساس کہاں سے ملا؟'' وہ سرسراتے ہوئے تجسس بھرے لہجے میں بولی۔

''یہی جو ملکیت سنگھ نے پڑھنے اور دیکھنے کو دیا، اسی میں کچھ ویڈیو کلپ ہیں، انہیں دیکھ کر لگا مجھے۔'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''دکھاؤ مجھے۔'' اس نے تجسس بھرے انداز میں کہتے ہوئے لیپ ٹاپ کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے وہ خاص ویڈیوز نکال کر لیپ ٹاپ اسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی، پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''یہ تو اس کا ایسا خاص کام ہے، جس پر ریاست بھی اس پر اعتماد کرتی ہے۔''

''اچھا، مطلب......'' میں نے کہنا چاہا لیکن وہ بولی۔

''اسی کے بل بوتے پر وہ من مانی کرتا ہے۔''

''یہ جگہ کہاں ہے؟'' میں نے اپنے لہجے پر پوری طرح قابو رکھ کر یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔ وہ کچھ لمحے سوچتی رہی پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بے پروائی سے بولی۔

''مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں، لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اسی علاقے میں ہو سکتا ہے۔''

''یہ ویڈیو کس نے بنائی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو ایک راز ہے۔ اس قدر حساس......'' اس نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''ملکیت سنگھ کو تو پتا ہوگا؟''

''ممکن ہے۔'' اس نے سکون سے کہا پھر چونک کر بولی۔ ''تمہیں اس ویڈیو سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی ہے؟''

یہی وہ سوال تھا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔ اگر میں انہیں اپنی دلچسپی کے بارے میں بتا دیتا تو میرا مقصد نجانے کہاں گم ہو جاتا اور وہ مجھے اسی دلچسپی کی وجہ سے نجانے کب تک بلیک میل کر کے اپنا مطلب نکالتے رہتے۔ میں انہیں تو کیا کسی کو بھی اس کی بھنک نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ سو بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔

''یہ جو قیدی ہیں، کس قدر بھیانک حالات میں ہیں۔ سب سے زیادہ مجبور، بے بس اور لاچار زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ انسانیت کی تذلیل اور ظلم کی انتہا ہے۔''

''بے شک ایسا ہی ہے۔ لیکن نہ اس مقام کے بارے میں پتا ہے اور نہ اس کی جگہ کی سیکیورٹی کے بارے علم ہے۔'' ریتو نے سوچتے ہوئے کہا۔

''پتا کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہی وہ مقام ہے جہاں ضرب لگائی جائے تو پرتاب سنگھ کی قوت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا تو ریتو خاموش رہی۔ پتا نہیں اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم میں خاموشی آن ٹھہری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''تم آرام کرو، صبح کوئی پلاننگ کرتے ہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور بیڈ پر پھیل گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ مجھے سوچوں نے گھیر لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نیند میری آنکھوں میں نہیں اُتری تھی۔ یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ میری حالت اس وقت یوں تھی کہ جیسے کوئی دیوار کے ایک طرف کھڑا ہو اور اسے یقین ہو کہ دیوار کے دوسری جانب اس کا ہدف اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ اَن دیکھی دیوار مجھے حد درجہ بے چین کر رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر خود اپنے طور پر کوشش کروں یا ان کے ساتھ رہ کر اپنے ہدف تک پہنچنے کی کوشش کروں؟ یہی سوال اس وقت میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میری سوچ کو کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ ایسے میں سیل فون بج اٹھا۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری جانب ایک بھرپور مردانہ آواز ابھری۔ اس نے صاف انگریزی لہجے میں پوچھا۔

''رانا ویر سنگھ بول رہے ہو......؟''

''ہاں، میں بات کر رہا ہوں، آپ کون؟'' میں نے پوچھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے چاچا عبدالمجید کی آواز ابھری۔

''تمہاری بھیجی ہوئی ویڈیو میں نے دیکھ لی ہیں۔''

''اوہ، تو آپ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ تیمور ہے لیکن یہاں پر ایک ہندو نام سے رہ رہا ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح اسی ہدف کے لیے یہاں ہے۔'' چاچا عبدالمجید نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''رانا جی، میں تھوڑی دیر پہلے یہاں دیوگڑھ پہنچا ہوں۔ ہوتی ہے ہماری ملاقات، میں کرتا ہوں فون۔'' تیمور نے کہا تو الوداعی باتوں کے بعد کال ختم ہوگئی۔ میرے ذہن میں چند لمحے پہلے جو اُلجھن تھی، وہ بھی ختم ہوگئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک نے اس وقت شادی کی تھی جب وہ امریکا سے ڈگری لے کر واپس وطن آئے تھے۔ اگرچہ ان کے درمیان محبت کی کونپل تبھی پھوٹ پڑی تھی، جب دیارِ غیر میں پڑھتے ہوئے ایک برس بھی نہیں ہوا تھا۔ تقریباً تین برس تک انہوں نے اکٹھے پڑھتے، ایک

دوسرے کو سمجھتے ہوئے اور بہترین دوستی میں گزار دیے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ واپس وطن جائیں گے۔ وہیں اپنے والدین سے بات کریں گے اور ان کی مرضی سے شادی کریں گے۔ والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو دونوں خاندانوں نے ہنسی خوشی ان کی شادی کردی اور وہ بھرپور زندگی گزارنے لگے۔

ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ نے وطن واپس آکر حکومت کے خصوصی ادارے میں ایٹمی توانائی کی چند جدید شاخوں پر اپنی پوری قوت صرف کردی۔ جس طرح ان کے درمیان محبت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی، اسی طرح وہ اپنی تحقیق میں جتے رہے۔ ان کے ہاں ایک بیٹا اور دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ جن کی پرورش ددھیال میں ہونے لگی۔ وہاں انہیں زندگی کی تمام تر سہولیات میسر تھیں اور یہ دونوں میاں بیوی بے فکری سے اپنی تحقیق میں مگن رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے عالمی سطح پر خود کو منوالیا۔ وہ جس طرح اپنی تحقیق میں کامیابیاں سمیٹتے جارہے تھے، اس قدر ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا جارہا تھا۔

تقریباً چھ برس تک میں اُن کی حفاظت پر مامور رہا تھا۔ اس دوران ان کا میرے ساتھ ہی نہیں اپنی حفاظت پر مامور ہر شخص کے ساتھ ایسا سلوک تھا جیسے والدین اپنے بچوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ میرا وہاں پر جتنا بھی وقت گزرا تھا، میں اسے اپنی زندگی کا شاندار دور سمجھتا ہوں۔ دو برس قبل وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے تو ہمیں بھی وہاں سے جانا پڑا۔ کچھ نئے لوگ وہاں آگئے۔ یہ ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ کی زندگی کا ایک نیا فیز تھا۔ اس میں وہ عالمی سطح پر مختلف فورم پر اپنے مقالات پڑھتے، اپنے نکات کو منواتے اور اپنے شعبے کے عالمی لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔

دو ماہ قبل وہ تھائی لینڈ میں ایک عالمی فورم کے لیے گئے تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر وہ اپنی سیکیورٹی کے حصار میں ہوٹل واپس جارہے تھے کہ رستے میں انہیں اغوا کرلیا گیا۔ وہ نہ صرف خود اغوا ہوئے بلکہ ان کے دونوں گارڈ بھی غائب تھے۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود ان کا سراغ نہیں ملا تھا کہ وہ کہاں پر ہیں؟ ان کی بازیابی کے لیے جہاں اور بہت سارے لوگ کام کررہے تھے، وہاں مجھے بھی حکم ملا کہ میں انہیں تلاش کرنے نکل پڑوں۔ یہ تلاش صرف ایک اُڑتی ہوئی اطلاع پر تھی کہ ممکن ہے انہیں راجھستان کے کسی علاقے میں رکھا گیا ہو۔

دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی خفیہ ایجنسیاں کام کررہی ہیں، وہاں ان پر نگاہ رکھنے کا بھی پورا پورا انتظام موجود ہے۔ یہ ایک دوسرے کی سوچ سے بھی آگے جاکر کام کررہی ہیں۔ جس نے پہلے سوچا اور اس پر عمل کرگیا اسے کامیابی ملتی ہے۔ دہشت گردی کی طرز پر منفی وارداتیں وہی ایجنسیاں کررہی ہیں جو ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کرچکی ہیں۔ یا پھر ایک ایجنسی اپنا مقصد لے کر چل رہی ہے تو دوسری اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ کئی اَن دیکھے محاذ ہیں جہاں یہ سب ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ میرا انفرادی طور پر ان کی تلاش میں جانا بھی ایک ایسی ہی خفیہ پلاننگ کا حصہ تھا۔ کسی کی سمجھ ہی میں نہ آسکے کہ میں کون ہوں، مجھے کہاں جانا ہے؟ میرا ہدف کیا ہے؟ اس وقت تک میں کسی پر کھل ہی نہ سکوں کہ میں کس مقصد کے لیے نکلا ہوں جب تک میں ہدف کو پوری طرح نہ پالوں۔ میرے لاشعور میں تھا کہ میری طرح اور لوگ بھی ہوں گے جو اس راہ کے مسافر بن گئے ہوں۔ کون کس طرح، کہاں پر کام کررہا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں اتفاقاً اپنے ہدف تک پہنچ گیا تھا...... اصل میں اب میرا امتحان شروع ہوا تھا۔ روہی میں وارد ہونے سے لے کر یہاں پہنچ جانا اسی تلاش کا ایک ایسا حصہ تھا۔ اگر کوئی میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا، یا میں کہیں پکڑا جاتا تو اصل ہدف کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔ اگر اس تاریک راہ میں مارا بھی جاتا تو یہ راز میرے ساتھ ہی دفن ہوجاتا۔

میں اپنے ہدف تک پہنچ گیا تھا۔ شاید یہ اتنا بڑا کام نہیں تھا، اصل کامیابی یہ تھی کہ میں ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ کو پوری حفاظت سے نکال کر واپس وطن پہنچا دیتا۔ ایسا ممکن تھا یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

وہ دیوگڑھ کا مہنگا ترین ہوٹل تھا۔ محراب دار ستونوں پر بنی چھت کے نیچے ٹیبل سجے ہوئے تھے۔ وہاں سے پُرسکون جھیل کا نظارہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ لمبے قد والا تیمور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ میں نے اگر اسے پہلے نہ دیکھا ہوتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ ہی میں ہندو دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کلین شیو اور سر پر ہلکے ہلکے بال تھے۔ وہ دھیمی سی مسکان کے ساتھ میرے قریب آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔ اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں پچھلے ایک ماہ سے پنجاب کے مختلف علاقوں میں بھٹک رہا ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی یہاں تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''لوکیشن کا کوئی پتا چلا؟''

''ابھی تک تو نہیں، تم سناؤ، تمہارا کیا پلان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں نزدیک ہی محبوب علی پیا کی درگاہ ہے۔ اس کے عقب میں ایک گھر ہے، آج شام تک وہاں کچھ دوست پہنچ رہے ہیں۔ ان میں ایک بندہ مقامی ہے۔ دیکھیں، کیا ہوتا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہو......؟''

''یہاں ایک عورت ہے رانی بھاگ وتی، اس کی پرتاب سنگھ کے ساتھ کیا دشمنی ہے، یا کیا معاملہ ہے ابھی تک مجھ پر نہیں کھلا، لیکن وہ چاہتی ہے کہ پرتاب سنگھ ختم ہو جائے۔ وہ جو پرتاب سنگھ نے اپنا قدآور بُت بنا لیا ہے، اسے زمین بوس کرنا ہے، یہی ٹاسک دیا ہے اُس نے مجھے۔ اب اگر تم لوگ......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں بالکل نہیں، تم اس کے ساتھ رہو اور اس کی قوت پوری طرح استعمال کرو۔ یہ اچھا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں رات تک تمہیں ساری صورتِ حال بتا دوں گا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''تم جانتے ہو رانی بھاگ وتی کو؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''پوری طرح تو نہیں لیکن یہاں کے کچھ لوگوں کے بارے میں ضرور معلومات حاصل کی ہیں۔ رانی بھاگ وتی کوئی معمولی شے نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کافی معلومات لی ہیں۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور بھی بڑے مگرمچھ ہیں لیکن وہ زیادہ پرتاب سنگھ کی طرف ہیں۔''

''مگر ہمیں کیا، بہرحال تمہیں سب سے پہلے محفوظ پناہ گاہ لینا ہوگی۔'' میں نے اپنے اطمینان کے لیے اسے مشورہ دیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ابھی تک اس ہوٹل سے بڑھ کر محفوظ پناہ گاہ کوئی نہیں ہے۔ یہاں سے رابطہ کرنے میں بڑی آسانی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں اپنی جیب میں سے ایک سیل فون نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرے اور تمہارے درمیان رابطے کا کام دے گا، یہ خاص ہے اور انتہائی محفوظ ہے۔ یہی دینے کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

میں نے اِک نگاہ سیل فون پر ڈالی اور اسے جیب میں رکھنے کے بجائے اپنے سامنے رکھ لیا۔ اسی وقت ایک ویٹر ہمارے لیے لنچ لے کر آ گیا۔ تیمور نے پہلے ہی آرڈر دیا ہوا تھا۔ لنچ کے دوران ہم نے بہت ساری باتیں کیں۔ ہم نے ماضی کو نہیں دیکھا بلکہ ساری گفتگو اسی حوالے سے رہی کہ آنے والے دنوں میں کیا کرنا ہوگا۔ لنچ کے بعد میں وہاں سے اٹھنے لگا تو اس کا دیا ہوا سیل فون میں نے جیب میں رکھ لیا۔ تبھی وہ بولا۔

''شام تک جو بھی ہوا، میں فون پر بتا دوں گا۔ تم جو چاہو سو کرو، میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔''

''اوکے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نمسکار کے لیے ہاتھ جوڑے اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

میں انتہائی محتاط تھا۔ میں کوئی بھی ایسا پہلو نظرانداز نہیں کر رہا تھا جس سے کوئی بھی میری طرف متوجہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ یہاں آتے ہوئے میں نے ریتو کو بھی نہیں بتایا تھا۔ واپسی پر میں کافی حد تک راستے سے واقف ہو گیا تھا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ریتو کی کال آ گئی۔

''کہاں ہو تم......؟'' اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی تشویش تھی۔

''یہیں تمہارے شہر کی سیر کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو وہ تیزی سے بولی۔

''تم جہاں بھی ہو، فوراً واپس پہنچو۔''

''خیریت ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''یہاں آجاؤ تو بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جب اس نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں نے بھی اسے اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو ریتو لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''رانی جی نے ایک صلاح دی ہے، اگر تمہیں اچھی لگے تو......؟''

''کیسی صلاح؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کی ایک فیکٹری دو چار برس سے بند پڑی ہے۔

صلاح یہ ہے کہ تم اسے دوبارہ اسٹارٹ کرو۔ وہ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو فیکٹری وغیرہ کا کوئی تجربہ ہی نہیں، میں کیسے اسٹارٹ کرسکتا ہوں۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا، دوسرے بہت سے لوگ ہیں کرنے والے، بس تمہارا یہاں رہنے کا جواز پیدا کرنا ہے۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یوں پڑے رہنے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔'' میں نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''رانی چاہتی ہیں کہ پرتاب سنگھ کے بارے جو کرنا ہے وہیں سے کریں۔'' اس نے اصل بات بتائی تو میں سمجھ گیا۔ مجھے لگا کہ رانی بھاگ وتی ذہنی طور پر پرتاب سنگھ کی نہ صرف برتری قبول کر چکی تھی بلکہ اس سے خوف زدہ بھی تھی۔ وہ طاقت جمع کر کے اس کے خلاف استعمال بھی کرنا چاہتی تھی لیکن کسی بھی ردِعمل سے ڈرتی بھی تھی۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور کیا کرنے والی ہے۔ مجھے چند دن یہاں رکنا تھا۔ جیسے ہی میں اپنے ہدف تک پہنچ جاتا، اس کے بعد میرا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''آؤ پھر چلیں، فیکٹری دیکھ کر آتے ہیں۔''

میں اٹھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ پورچ میں کار کھڑی تھی، ریتو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے پہلو میں پسٹل کو چیک کیا اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شاہراہ پر آ کر ریتو نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پرتاب راؤ کل شام ہی سے شہر میں نہیں ہے۔ وہ کسی اجلاس کے لیے دِلّی گیا ہے۔ اگلے دو دن تک اس کے آنے کا امکان نہیں۔''

''کیا یہ کوئی حیرت انگیز خبر ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، حیرت انگیز نہیں۔'' اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''تو پھر اصل بات کہو، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں حیران تھی کہ ابھی تک پرتاب راؤ کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا، ایک خاموشی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے پوچھا۔

''خاموشی تھی مطلب، اب کیا ہوا، جو تم اتنی پریشان ہو؟''

''تھوڑی دیر پہلے پتا چلا ہے اس نے گجندر کو یہ ٹاسک دیا ہوا تھا کہ کیسینو کے حملہ آوروں کو تلاش کرے، اس نے اب تک کئی لوگوں کو اٹھا لیا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہمارے آدمی بھی اٹھائے گا۔'' ریتو نے اصل تشویش کا اظہار کیا تو میں نے بڑے سکون سے کہا۔

''تم اپنے لوگوں کو ایسے ہی الرٹ کردو......''

''وہ تو میں نے کر دیا ہے، اب دو ہی باتیں ہوں گی۔ وہ ہمارے لوگوں کی طرف رخ کرے گا تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ یا پھر وہ نہیں آئے گا۔ اسی سے اندازہ ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔'' ریتو نے کہا تو مجھے اس کی باتیں بڑی بچکانا سی لگیں۔ وہ پتا نہیں کس طرح سوچ رہی تھی یا پھر یہ ساری کی ساری سوچیں رانی بھاگ وتی کی تھیں۔ وہ نجانے کتنا لمبا پلان کر کے بیٹھی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

دیو گڑھ کے جنوبی علاقے میں جہاں شہر کی آبادی کم تھی، وہ فیکٹری وہاں پر تھی۔ وہ آبادی نئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جب فیکٹری بنائی گئی تھی، تب یہاں آبادی نہیں تھی۔ گیٹ پر چوکیدار تھا۔ وہ ریتو کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ ہم کار سمیت اندر چلے گئے۔ وہاں چھ چوکیدار تھے۔ جو ہمارے وہاں پہنچتے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ایک طرف رہائش گاہیں تھیں، جہاں کوئی بھی نہیں رہتا تھا۔ کچھ کوارٹرز تھے جن میں یہ چوکیدار موجود تھے۔ دفاتر کی حالت بھی کافی خستہ ہو چکی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے دوبارہ اپنی درست حالت میں لانے کے لیے کئی ماہ درکار تھے۔ اسی وقت میرے دماغ میں آ گیا کہ یہاں پر توجہ دینا وقت کا ضیاع ہوگا۔

سورج ڈھلنے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ مجھے تیمور کی طرف سے فون کال کا انتظار تھا۔ میرا ذہن اسی طرف لگا ہوا تھا۔ ریتو کار بھگائے چلی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے وہی باتیں بتا رہی تھی جو میں پرتاب سنگھ کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ شہر میں موجود مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سن رہا تھا۔ مجھے راستوں کا اندازہ نہیں تھا۔ بس ایسے ہی لاشعوری انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اندھیرا ہو جانے اور پھر روشنیاں جگمگانے کے باعث کچھ ایسا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ریتو نے ایک ریستوران کے سامنے کار دھیمی کی اور پھر اس

کی پارکنگ میں روک دی۔

شہر سے دور وہ ایک پُرسکون جگہ تھی۔ ریستوران کے پیچھے شہر اور سامنے کی جانب پہاڑی سلسلہ تھا۔ دور بائیں جانب کافی بڑی سڑک تھی۔ ہم اوپن ایئر میں آ بیٹھے۔ سرسبز لان میں دھیمی روشنی اور ہلکا ہلکا میوزک ماحول کو خوشگوار بنا رہا تھا۔ ہمارے درمیان میز پر ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی جس میں الیکٹرک بلب یوں جگمگا رہا تھا جیسے شعلہ بھڑک رہا ہو۔ ہمیں آئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ ریتو اسے سمجھانے لگی تو اس دوران تیمور کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے محض ہیلو کہا تو تیمور مجھے وہاں ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ کل آٹھ افراد ہیں جن میں دو مقامی بھی ہیں اور وہ ہمہ وقت تیار ہیں۔ آج رات وہ پوری کوشش کریں گے کہ وہ جگہ تلاش کر لی جائے۔ میں نے ساری بات سمجھ کر فون بند کر دیا۔

ریتو آرڈر دے کر میری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ فون کے بارے تجسس کرے گی لیکن اس نے پوچھا نہیں۔ ممکن تھا کہ وہ پوچھتی...... مگر اچانک اس کے چہرے پر حیرت آمیز تشویش پھیل گئی، یوں جیسے اس نے کسی کو غیر متوقع طور پر دیکھ لیا ہو۔ میں نے اس کی نگاہوں کے رخ پر مڑ کر دیکھا تو سامنے سے چار افراد تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔

''کیا بات ہے ریتو؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''گجندر......'' اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس نے اندازہ لگایا تھا، وہ سچ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند لوگ تھے اور آتے ہی ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ان کے درمیان لمبے سے قد والا جوان کرسی کھینچ کر میرے دائیں جانب آ بیٹھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اجاڑ قسم کی داڑھی اور مونچھیں، آنکھیں سرخ، گلے میں شیو کا لاکٹ، کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے وہ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر مجھ پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر بولا۔

''ریتو ڈارلنگ، بتاؤ گی یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

تبھی ریتو نے کسی جھجک کے بغیر فوراً اعتماد سے کہا۔

''میرا منگیتر ہے، شری رانا ویر سنگھ۔''

''کب آیا ہے یہ تمہارے پاس؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو میں نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ اس سے کہا۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ارے، ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری کوئی خدمت کی جائے۔ ریتو کو چاہے بُرا لگے مگر تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہو گا، اٹھو......'' آخری لفظ اس نے درشت انداز میں تحکمانہ لہجے میں کہے تو میں نے پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ریتو کو بُرا لگے یا نہیں لیکن مجھے تمہارا یہ گھٹیا پن بہت بُرا لگ رہا ہے اس لیے فوراً اپنی شکل گم کر جاؤ۔''

''اوہ...... واہ......'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ''چلو کوئی تو میرے سامنے بولا، کسی نے تو بات کی، ریتو اسے سمجھا، اسے نہیں پتا میرے بارے میں۔''

''تمہاری اس گھٹیا فلمی انٹری سے میں سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی تھرڈ کلاس قسم کے غنڈے ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو اردگرد کھڑے لڑکوں نے اپنے ہتھیاروں کی نمائش کر دی۔ ایک آدھ نے تو پسٹل کا بلٹ بھی مار دیا۔

''سیانے سچ کہتے ہیں، لاعلمی بڑی شے ہے۔ تمہیں میرے بارے میں نہیں پتا، اس سے پہلے کہ میں تمہیں توڑ پھوڑ کر یہاں سے لے جاؤں، اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''کیا عورتوں کی طرح ہتھیاروں کے بل بوتے پر دھمکیاں لگائے چلے جا رہے ہو۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے مجھے توڑ پھوڑ کے لے جاؤ تو مجھے تمہارے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ہی تھا کہ اس نے میری گردن پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے وہیں روک دیا۔ وہ پوری قوت لگا کر اپنا ہاتھ بڑھانے کی کوشش میں تھا کہ میری گردن پکڑ سکے مگر میں نے اسے وہیں ساکت کر دیا۔

وہ پورا زور آگے کی جانب لگا رہا تھا۔ تبھی میں نے اسی کے زور کو استعمال کرتے ہوئے اچانک آگے کی جانب دھکیل دیا۔ وہ کھنچا چلا آیا۔ وہ میز اور کرسی کے درمیان گرا تو میں نے اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ اسی دوران میں نے اپنا پسٹل نکال کر اس کی گدی پر رکھ دیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے انتہائی تیزی دکھائی ہے لیکن اس وقت میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی جب ریتو کسی گیند کی طرح اچھلی، سامنے والے لڑکے کا ذرا سا سہارا لیا اور اس کے اوپر سے ہوتی ہوئی اپنے پاؤں پر جا کھڑی ہوئی۔ اس

کے بدن کی لچک اور پھرتی ناقابلِ یقین تھی۔ اسی دوران مجھے کسی ہتھیار کے بولٹ مارنے کی آواز آئی تو میں نے غرا کر کہا۔

''مر جائے گا یہ......''

وہ سب ساکت ہو گئے۔ گجندر میرے پاؤں کے نیچے پوری قوت سے مچل رہا تھا۔ شاید اسے احساس نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں پسٹل ہے۔

''پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' ریتو کی غراتی ہوئی آواز آئی تو ہمارے اردگرد کھڑے لڑکوں نے دیکھا۔ شاید انہیں فیصلہ کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سے کھڑے ہمیں دیکھتے رہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے اردگرد ہلچل مچ چکی تھی۔ ریستوران کے لان میں کئی دوسرے افراد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان ہونے والی دھینگا مشتی ایسی نہیں تھی جس سے لوگ متوجہ نہ ہوں۔

''اپنے لوگوں کو ہٹ جانے کا کہتے ہو یا پھر کروں سوراخ تمہارے دماغ میں۔'' میں نے گجندر سے کہتے ہوئے نال اس کی گردن میں چبھو دی۔ اسی لمحے وہ سہم گیا۔ موت کا خوف بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

''پیچھے ہٹو۔'' ریتو کی آواز آئی تو وہ لڑکے پیچھے ہٹنے لگے۔

''ریتو، ان سب سے ہتھیار لے کر تلاشی لو۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا تو ریتو انتہائی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ ریتو نے ان سے ہتھیار لے کر میز پر ڈال دیے پھر ان کی تلاشی لے کر بولی۔

''ہو گیا۔''

تبھی میں نے گجندر کی گردن سے پاؤں ہٹا لیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا پسٹل ریتو کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے پکڑ لیا تو میں نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اونچا کر دیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ آؤ اب میرے مقابلے پر۔ وہ انتہائی غصے میں میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنی ہزیمت پر شرمندگی تھی اس لیے وہ بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری جانب بڑھا۔ یہ اس کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا اظہار تھا۔ جس کا میں پوری طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اسے ذرا سی جھکائی دی تو وہ اپنی جھوک میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے تیزی سے اسے کمر سے پکڑا، اسے اوپر اٹھایا اور لان کی سبز گھاس پر پٹخ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھرپور ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اسی لمحے ایک لڑکا مجھ پر حملہ آور ہوا تو ریتو نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گیا۔ گجندر اٹھنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ایک مزید ٹھوکر اس کے سر پر ماری، وہ پھر زمین بوس ہو گیا۔ ایسے میں ایک طرف سے کافی سارے لوگ بھاگتے ہوئے آ گئے۔ وہ ریستوران کا منیجر تھا۔

''سر سر کیا ہو گیا۔''

''اس سے پوچھ، جو ہمیں اغوا کرنے آیا تھا۔'' مجھ سے پہلے ہی ریتو نے انتہائی غصے میں کہا۔

''سر چھوڑیں، میں دیکھتا ہوں، میں نے پولیس بلوالی ہے، وہ بس آتی ہی ہو گی۔...'' منیجر نے لجاجت سے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو تینوں کھڑے ہیں، انہیں پولیس کے حوالے کریں، اسے میں خود اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔''

''آپ سر کہاں...... میں دیکھتا ہوں نا۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا لیکن میں جو سوچ چکا تھا، اس پر عمل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے گجندر کو کالر سے پکڑا اور پارکنگ کی جانب چل پڑا۔ ریتو سمجھ گئی کہ میں کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ وہ تیزی سے میز کی جانب بڑھی، وہاں پڑے ہتھیار اٹھائے اور تیزی سے پارکنگ کی جانب چل دی۔

میں گجندر کو پکڑے وہاں تک گیا تو وہ کار اسٹارٹ کیے کھڑی تھی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور گجندر کو اس میں پھینک کر خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''ہتھیار کہاں ہیں؟''

''وہ جھاڑیوں میں......'' اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، کسی ویرانے میں۔'' میں نے کہا تو اس نے کار بڑھا دی۔

گجندر سیٹوں کے درمیان پڑا مچل رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کر دے۔ میں اسے دبا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ریتو انتہائی رفتار سے کار بھگائے جا رہی تھی۔ پھر ایک دم کار کی رفتار کم ہو گئی اور اس نے کسی کچی سڑک پر کار موڑ لی۔ کار کو ہچکولے لگ رہے تھے جس سے بلاشبہ گجندر کو تکلیف ہو رہی تھی۔ تبھی وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔

''کیا تم مجھے مارنے کے لیے لے جا رہے ہو؟''

''تمہیں مارنا ہوتا تو میں یہاں تک لانے کا کشٹ کبھی نہ کرتا، ہاں اگر تم خود مرنا چاہو تو میں تمہیں مار سکتا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''خود مرنا، مطلب......؟'' اس نے دھیمی آواز پوچھا تو میں نے کہا۔

''جو پوچھوں گا اگر بتا دو گے تو کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر تم ٹھیک طرح نہیں بتاؤ گے تو خود مرنے والی بات ہے نا۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا تبھی ریتو نے کار روک دی۔

باہر اندھیرا تھا۔ ریتو نے ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ اگر جلائے رکھتی تو نجانے کتنی دور سے ہم کسی کی بھی نگاہوں میں آسکتے تھے۔ اس نے اپنے سیل فون کی روشنی کر لی۔ میں نے بجندر کو باہر نکالا تو ریتو اس پر پسٹل تان کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل چکا تھا۔

''تمہیں کس نے ہم تک بھیجا ہے؟''

''میں خود آیا ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ کیسینو پر حملہ کروانے والی بھاگ وتی کے سوا کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ میں دو دن سے ریتو کی ریکی کروا رہا تھا۔ آج یہ تمہارے ساتھ باہر آئی ہے تو مجھے پتا چل گیا۔''

''کس نے بتایا تمہیں؟'' میں نے اپنا شک دور کرنا چاہا۔

''وہاں فیکٹری میں ایک بندہ ہے ہمارا، اس نے مجھے اطلاع دی تو میں بس پہنچ گیا کہ تم لوگ وہاں سے نکل پڑے ہو۔ میں تمہارے پیچھے آیا ہوں۔'' وہ کسی ریکارڈر کی طرح بولنے لگا۔

''رانی جی پر ہی کیوں شک ہوا تمہیں؟'' ریتو نے پوچھا۔

''اس شہر میں اس کے سوا کسی کی جرأت نہیں کہ ہم پر ایسا حملہ کر سکے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں یہ تو مانتی ہوں کہ میرا تعلق رانی جی سے ہے، تم میرے منگیتر کے بارے میں یہ کیسے......'' وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ بجندر تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔

''ہمیں یہ اڑتی ہوئی اطلاع مل چکی ہے کہ کوئی بندہ باہر سے آیا ہے، وہ ویر سنگھ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''چل چھوڑ، کیسینو والے چکر کو، یہ بتا، یہ تیرے پرتاب سنگھ نے اپنی جیل کہاں بنا رکھی ہے؟'' میں جلدی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔ اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی انہونی بات کر رہا ہوں۔ تبھی اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔''

''تو پھر کون جانتا ہے؟'' میں نے غصے میں پوچھا۔

''میں صرف ڈرگز کے معاملات دیکھتا ہوں، اس کے علاوہ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا تو میں نے ریتو کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پسٹل میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے پسٹل اس پر تانتے ہوئے کہا۔

''مطلب تم اب مرنا چاہتے ہو؟''

''بھگوان کی قسم، میں نہیں جانتا۔ اس طرح کے کام گوپال داس دیکھتا ہے، وہی سب کرتا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے کہا اور اس کی دائیں ران میں فائر جھونک دیا۔ اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے مت مارو......''

''بولو قیدی کہاں رکھے ہیں؟'' میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''بھگوان قسم نہیں معلوم......'' اس نے پھر کہا تو میں نے پھر اس کی بائیں ران میں فائر کر دیا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر گیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے یونہی چھوڑ دیا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تبھی ریتو میرے قریب ہوئی، اس نے سرسراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''ہو سکتا ہے یہ سچ بول رہا ہو؟''

''فون لگاؤ اپنی رانی کو، اس سے پوچھو۔ اسے تو بہر حال مرنا ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا اور بجندر کے سر پر جا پہنچا۔ وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں نے پسٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب بھی سچ بول دو۔ بچ جاؤ گے۔''

''میں...... سچ...... کہہ...... رہا ہووو......'' اس کے منہ سے اٹک اٹک کر لفظ نکلنے لگے۔

''تمہارا مطلب ہے گوپال داس...... لے چلو گے مجھے اس کے پاس......'' میں نے اس سے......''

''مم...... مجھے...... گولی مار دو......'' اس نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔

''کیوں، میں تو تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''اسے جب...... پتا چلا...... میں نے...... اس کا نام...... بتایا...... ہے...... وہ...... مجھے...... پہلے مارے...... گا۔'' اس نے پھر اٹکتے ہوئے کہا تو اتنے میں ریتو نے میرے قریب آ کر کہا۔

''یہ سچ کہہ رہا ہے۔''

"چل چھوڑ دیا تمہیں۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"مم مجھے...... اسپتال...... لے......" اس نے کہا مگر میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں چلتا ہوا پسنجر سیٹ پر آن بیٹھا۔ ریتو تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور پھر اگلے چند لمحوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔

جیسے ہی بڑی سڑک پر آئے۔ ریتو نے فون نکالا اور نجانے کس کے نمبر ملا کر اب تک ہونے والی تمام صورت حال بتانے لگی۔ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ وہ ملکیت سنگھ کو سب بتا رہی تھی۔ شاید اسے کوئی مزید ہدایت ملی تھی یا نہیں۔ اس نے کال ختم کر کے فون جیب میں رکھا تو میں نے پوچھا۔

"تم جانتی ہو گوپال داس کو۔"

"اسے شہر میں کون نہیں جانتا، وہ ایک بڑا بزنس مین ہے۔ اس کا ایک سیاسی بیک گراؤنڈ ہے۔ لگتا نہیں کہ وہ اس قدر خفیہ معاملات چلا رہا ہوگا۔" ریتو نے کہا۔

"کیا خیال ہے، اس تک پہنچا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، وہ کون سا جن بھوت ہے۔" ریتو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو مجھے لگا جیسے اس کا مجھ پر اعتماد بحال ہو گیا ہو۔

"چلو پھر، ایک بار اس طرف چلو، جہاں وہ رہتا ہے۔"

"دیکھ لو، کہیں......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے اس کا جواب نہیں دیا تو وہ پوری توجہ سے کار چلاتی چلی گئی۔

وہ ایک بڑا سا سارا بنگلا تھا۔ آہنی گیٹ سے اندر کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ وہی بڑے بڑے لان، درمیان میں سفید رہائشی عمارت، پورچ تک جاتی ہوئی سڑک، بجلی روشنی کے بڑے بڑے بلب جگمگا رہے تھے۔

"پتا نہیں اس وقت وہ گھر پر ہوگا بھی یا نہیں۔" ریتو نے ہولے سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، مل جائے گا وہ بھی۔" میں بھی ہولے ہی سے بولا اور تیمور والے فون سے وہاں کی لوکیشن اسے بھیج دی۔ پھر ایک ویڈیو بنائی، وہ بھی بھیج دی۔ اس کے ساتھ میں نے یہ لکھ کر بھیج دیا کہ یہ ہے گوپال داس کا گھر جس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہی قید خانے کے معاملات دیکھتا ہے۔

اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ سیدھے سبھاؤ جاؤں اور گوپال داس کو گردن سے پکڑ کر کھینچ لاؤں مگر یہ محض سوچ ہو سکتی تھی۔ اس کی عملی صورت بہت مشکل تھی۔ اگر وہ اس طرح آسانی سے مل جاتے تو نجانے کب کے، کتنے لوگوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے ہوتے۔ اس طرح سوچے سمجھے بغیر کسی پر چڑھ دوڑنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں خود پر قابو پاتا ہوا سامنے سڑک پر دیکھتا رہا۔ ریتو اس بنگلے کے آگے سے گزر کر اگلا کراس بھی پار کر چکی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ریتو نے کہا تو میں اپنے خیالوں سے باہر آ گیا، پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہی کہ اس گوپال داس کو کیسے اٹھایا جائے۔"

"اسے اٹھانا تھوڑا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"کیسے......؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس کی سیکیورٹی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ زیادہ تر عوام میں رہتا ہے۔ جس طرح یہ عام سیاست داں ڈرامے کرتے ہیں، یہ بھی آئے دن ایسے ڈرامے کرتا رہتا ہے۔ خود کو بڑا مذہبی بنا کر لوگوں کو دکھاتا ہے، پوجا پاٹ کا......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رک گئی، پھر یوں چونکی جیسے بہت اہم بات یاد آ گئی ہو۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کا معمول ہے کہ وہ ہر صبح مہادیو مندر میں پوجا کے لیے جاتا ہے۔"

"واہ، یہ پکی بات ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"بالکل پکی بات۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

میں اس سے مزید بات کرنا چاہ رہا تھا کہ انہی لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے اور پھر فون ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری جانب سے ایک غصے میں بھری ہوئی مردانہ آواز ابھری۔

"اے ریتو، کہاں ہے بجندر......؟"

"مجھے کیا پتا۔" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"بکواس کرتی ہے تو بے غیرت، اگر اسے کچھ ہو گیا تو تجھے اور تیری رانی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

"اب چل، ابھی تو میرے سامنے تو آ کر دکھا، رانی جی کی بات بعد میں کر لینا، سالا بھونکتا ہے۔" اس نے ہر لفظ چبا کر کہا۔

"دیکھ، بجندر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ چھوڑ دے اُسے۔" اس نے غراتے ہوئے کہا تو ریتو بولی۔

"وہ میرے پاس نہیں ہے، میں اسے ویرانے میں پھینک آئی ہوں۔ جا، جا کر اسے تلاش کر۔"

"کہیں تو نے اُسے......" اس نے کہتے ہوئے اپنی

بات ادھوری چھوڑ دی تو ریتو نے گول مول سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اس نے حملہ کرنے کی غلطی کی، اسے سزا تو دینی تھی نا۔''

''بہت بُرا کیا تو نے...... اب تو نہیں بچ سکتی ہو۔'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''میرے سامنے تو بھی آ۔ تو بھی نہیں بچ سکتا۔'' ریتو نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں ریتو، وہ شخص جو تیرے ساتھ تھا، اسی نے کیسینو پر حملہ کیا، تیرا اور تیری رانی کا جرم اب معاف نہیں ہوگا، تھوڑا سا صبر کر۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کار میں خاموشی چھا گئی۔

''کون تھا یہ......؟ میں نے پوچھا۔

''یہی گجندر گینگ کا ایک غنڈا...... پرتاب سنگھ کے پالتو۔'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ ہے ریتو، ہم دشمنوں کے سامنے کھل گئے ہیں؟'' میں نے سکون سے کہا۔

''ان کا اندازہ تو درست ہے۔'' ریتو نے کہا۔

''ریتو...... اب ہمارا واپس اپنے ٹھکانے پر جانا شاید خطرناک ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح تم لوگوں کے مخبر ان کے ہاں ہیں، اسی طرح ان کے مخبر تمہارے لوگوں میں موجود ہیں۔ ایک چوکیدار کی مخبری سے بات یہاں تک آن پہنچی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ وہ رانی پر تو حملہ نہیں کر سکتے لیکن جہاں میں ہوں گی وہاں ضرور چڑھ دوڑیں گے۔'' اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو پھر......'' میں نے پوچھا۔

''تو کوئی بات نہیں، ہمارے پاس کون سے ٹھکانے کم ہیں، کسی اور جگہ چلے جاتے ہیں۔'' اس نے کہا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

''نہیں، تم ایسے کرو، واپس اسی فیکٹری میں چلو۔'' میں نے کہا تو ریتو نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ کچھ لمحے سوچ کر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اگلے کراس سے وہ دائیں جانب مڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ فیکٹری ہی جائے گی۔

میں سوچنے لگا۔ دیوگڑھ کوئی اتنا بڑا شہر نہیں تھا کہ جہاں انسانوں کے سمندر میں کوئی گم ہو جائے اور کوئی اسے تلاش نہیں کر پائے۔ جو لوگ اس شہر پر راج کر رہے تھے، وہ کوئی معمولی لوگ تو نہیں تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کا بندہ ہم مار دیں اور وہ ہمیں تلاش نہ کر پائیں۔ کیسینو پر حملے کے بعد تھوڑا بہت ابہام تھا کہ پتا نہیں یہ حملہ کس نے کیا ہوگا۔ اب جبکہ ان کی یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ سب رانی بھاگ وتی کے لوگ کر رہے ہیں تو ان کا ہمیں تلاش کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ رانی بھاگ وتی کو براہ راست تھریٹ کر سکتے تھے۔ اس کا ردعمل کیا ہوگا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں ابھی یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ رانی بھاگ وتی کس حد تک ان کا سامنا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میں رانی بھاگ وتی پر پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

فیکٹری سے تھوڑی دور ہی ریتو نے کار روک دی۔ اس نے کار اس طرح لگائی کہ فوری طور پر کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں نے اپنا پسٹل سنبھالا، ڈیش بورڈ سے میگزین لیے اور نیچے اتر گیا۔ دوسری جانب سے ریتو بھی اتر آئی۔ وہاں پر اندھیرا گہرا تھا۔ ہم بڑے محتاط قدموں سے فیکٹری کی سمت چل دیے۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ ہم نے کچھ دیر وہاں ٹھہر کر یہ یقین کر لیا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہاں کون آتا جاتا تھا جو کوئی چوکیدار وہاں بیٹھا رہے۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ دور اندر کہیں بلب روشن تھے۔ وہاں گیٹ پر بالکل اندھیرا تھا۔

''ہمیں اندر سے کسی کو بلانا نہیں، یہ گیٹ ہم کو پار کرنا ہے، کہیں سے دیوار پار کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو ریتو ہنس دی، پھر بولی۔

''تم چاہو تو کوئی دیوار تلاش کر لو، میرے لیے یہ گیٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''مطلب، کس طرح اہمیت نہیں رکھتا؟'' میں نے پوچھا۔ ابھی لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ وہ ذرا سا پیچھے کو ہٹی، پھر آگے بڑھ کر کسی چھپکلی کے مانند گیٹ پر چڑھتی چلی گئی۔ چشم زدن میں وہ گیٹ کے اوپر تک پہنچ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ نیچے اترنے لگی۔ میں اس کے بدن کی لچک کچھ دیر پہلے ریستوران میں دیکھ چکا تھا، جہاں وہ اپنے پاؤں پر سے اٹھی تھی اور ایک ہی لمحے میں لڑکے کے اوپر سے دوسری جانب چلی گئی تھی۔ میں ان چند لمحوں میں جو دیکھ سکا تھا، اس کے پیچھے نجانے کتنی مدت کی ریاضت جھلک رہی تھی۔ وہ وقت نہیں تھا کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا۔ وہ گیٹ کھول چکی تھی۔ میں گیٹ کے اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ بند کر دیا۔

ہم پورچ کی طرف جانے والی سڑک کے بجائے لان

میں ہو گئے۔ اگرچہ وہاں پر کافی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ ہم نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہاں پر موجود چوکیداروں کے سر پر اچانک پہنچنا ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو لازمی طور پر ان میں موجود مخبر کسی کو بھی اطلاع دے سکتا تھا۔ ہم کوئی آواز پیدا کیے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا رخ ان کوارٹرز کی طرف تھا جہاں وہ رہتے تھے۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ وہ اس وقت اپنے اپنے کوارٹرز میں ہوں گے۔ وہ کوارٹرز فیکٹری کے دفاتر سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ تھے۔ وہاں چند بلب روشن تھے، جن کی ملگجی روشنی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ وہیں دوسرے عملے کی رہائش گاہیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جو اس وقت بے آباد تھیں۔ ہم ملگجی روشنی سے بچتے ہوئے کوارٹرز کے پاس پہنچ گئے۔

چند قدم بعد ہم رک گئے۔ ایک کوارٹر کے اندر سے باتیں کرنے اور قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں احساس ہو رہا تھا جیسے کافی سارے لوگ وہاں جمع ہوں۔ ایسے میں ریتو میرے ساتھ لگ کر میرے کان میں ہولے سے بولی۔

”لگتا ہے سارے ہی یہاں اکٹھے ہو کر موج میلہ کر رہے ہیں۔“

”تو پھر کیا خیال ہے؟“ میں نے دھیمے سے پوچھا۔

”تم یہیں رکو، میں اوپر جا کر دیکھتی ہوں، وہیں سے فون پر صورت حال بتاتی ہوں۔ یہاں دروازے سے اندر گئے تو حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے ہولے سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ وہ مجھ سے الگ ہوئی اور تیزی سے کوارٹرز کے آخری سرے پر چلی گئی۔ وہاں اس نے ہلکی سے جست لگائی اور دیوار پر جا چڑھی، وہیں سے اس نے اوپر منڈیر کی درزوں میں ہاتھ پھنسایا اور اپنا پورا بدن اوپر اٹھا کر چھت پر جا پہنچی۔ یہ سب ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک چھت سے دوسری چھت تک جانے والی تھی۔ میں نے ریتو کا دیا ہوا سیل فون نکال لیا۔ اس نے جونہی کال کی، میں نے کال ریسیو کر لی۔

”یہ تو چھ کے چھ یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”کہیں یہ سارے ہی تو آپس میں ملے ہوئے نہیں ہیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ ان کے سامنے شراب پڑی ہوئی ہے اور یہ پی رہے ہیں، کھانے پینے کا سامان بھی پڑا ہے۔“

”یوں کہو نا سب ہم نوالہ ہم پیالہ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم اندر جاؤ، میں اوپر سے تمہیں کور کروں گی۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا پھر پسٹل نکال کر کھلے ہوئے دروازے کے اندر چلا گیا۔

مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب حیرت سے میری جانب دیکھنے لگے۔ ہر اس بندے کی حیرت مزید بڑھ جاتی، جس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل پر پڑتی۔

”سب دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”صاحب، کیا ہو گیا؟“ ایک بندے نے کہا تو میں نے بلا جھجک اس کے پیروں میں فائر کر دیا۔ وہ فائر اسے لگا تو نہیں اور نہ ہی میں مارنا چاہتا تھا لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ تیزی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

”تم لوگوں کو پتا ہے کہ فیکٹری میں نے خرید لی ہے۔“ میں نے ان سب سے کہا تو سبھی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ تبھی ان میں سے ایک بولا۔

”نہیں پتا صاحب۔“

”لیکن یہ تو پتا ہو گا کہ ہمارے یہاں آنے کی اطلاع گجندر کو کس نے دی تھی۔“ یہ کہہ کر میں نے سب کی طرف دیکھا۔ سبھی کے چہروں پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ وہ میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی عجوبہ بات کہہ دی ہو۔ وہ سبھی خاموش تھے۔ تبھی میں نے کہا۔ ”ایک بندہ ہے، وہ بتا دے ورنہ باقی پانچ یونہی خواہ مخواہ میں مارے جائیں گے۔“

میرے یوں کہنے پر بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے لگے۔

”نہیں صاحب، ہم تو کسی گجندر کو نہیں جانتے۔“ اسی بندے نے جواب دیا تو میں نے سکون سے کہا۔

”اپنی اپنی جیب سے فون نکال کر یہاں چارپائی پر پھینک دو۔ اسی سے پتا چل جائے گا، کون ہے وہ؟“ میں نے یونہی اندھیرے میں تیر پھینکا تو دو نے فوراً اپنے فون چارپائی پر پھینک دیے۔ ایک نے انکار کر دیا کہ اس کے پاس فون نہیں، پھر باقیوں نے بھی اپنے فون پھینک دیے۔

”صاحب ہم غریب آدمی ہیں، ہم سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔“ اسی شخص نے بڑی بے چارگی سے کہا تو میں

بولا۔

''میں یہاں پر اکیلا نہیں آیا، تم لوگ ہر طرف سے گھر چکے ہو، وہ بندہ اپنے بارے میں خود بتا دے، ورنہ سب مارے جاؤ گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''فائر......''

تبھی اوپر سے یکے بعد دیگرے دو فائر ہو گئے تو ان سب کی گھگی بندھ گئی۔ وہ بدحواس ہو گئے، انہی میں سے ایک بندے نے بالکل آخر میں کھڑے ایک ناٹے قد والے کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''یہ رہا ہے گھندر کے ساتھ، اسی نے اسے کال کی ہو گی۔''

''آگے آؤ۔'' میں نے اسے اشارہ کیا تو وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''غلطی ہو گئی صاحب...... میں کوئی......'' لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کر دیے۔ وہ چلاتے ہوئے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔

''کب سے کام کر رہے ہو اس کے لیے؟''

''بہت عرصے سے...... میں اس کے ساتھ تھا، یہاں وہ اپنا مال رکھتا ہے۔ اس کے پیسے دیتا ہے۔ ہم سب کرتے ہیں کام۔'' اس نے تیزی سے بتایا تو میں نے سب کی طرف دیکھا۔

''جی صاحب، خالی فیکٹری ہے، ہمیں پیسہ مل جاتا ہے۔'' ایک بندے نے کہا تو سارا راز کھل گیا۔ وہ اس خالی فیکٹری کو اپنا مال رکھنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

''کیسا مال رکھتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تھوڑا اسلحہ ہے، کچھ شراب اور......''

''سب شامل ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، ہم سب ہی۔'' اس نے ندامت سے کہا۔

''تم ادھر آ جاؤ، تم نے سچ بولا۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً الگ ہو گیا۔

''آؤ دکھاؤ، کہاں ہے اُن کا مال۔''

''اس کے پاس چابیاں ہیں۔'' اس نے اسی شخص کی طرف اشارہ کیا، جس نے پہلے مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے چابیاں نکال دیں تو وہ میرے ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔ باقیوں کو نجانے کیا ہوا وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے۔ میں نے ان کی ذرا بھی پروا نہیں کی، اس اکیلے شخص کو لے کر باہر آ گیا۔ جیسے ہی میں دروازے سے نکلا، اوپر سے ریتو نے فائر کرنا شروع کر دیے۔ اندر سے چیخیں بلند ہوئیں تو میرے ساتھ کھڑا شخص کانپنے لگا۔ کچھ دیر بعد ریتو دروازے میں سے باہر آ گئی۔

وہ ہمیں دفاتر کی جانب لے گیا۔ اس نے کمرے کھول دیے۔ ایک کمرے میں کافی کچھ پڑا ہوا تھا۔

''اس کے علاوہ کچھ......'' ریتو نے پوچھا۔

''اور کچھ نہیں ہے۔'' اس نے بتایا تو ریتو نے سیل فون نکالا اور ملکیت سنگھ کو ساری صورتِ حال بتانے لگی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے فون بند کیا اور پلٹ کر اس سے بولی۔

''تم صبح تک یہیں رہو گے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔

''آؤ چلیں۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل کر سڑک پر چلنے لگا۔ تھوڑا چل کر اس نے بتایا۔

''میری ملکیت سنگھ سے بات ہوئی ہے۔ یہاں مال رکھ کر وہ دہرا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عام حالات میں مال کا اسٹور تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو سیدھا رانی جی پر پڑتا۔ اب وہ راتوں رات یہاں سے لاشیں اور مال غائب کروا دے گا۔''

''اور ہم واپس......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

''رانی جی نے بلایا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے، اس کے پاس آ جاؤ۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

☆☆☆

رانی بھاگ وتی کے بنگلے کا وہ حصہ جو شاید ملازمین وغیرہ کے لیے مختص کیا ہوا تھا، ہم وہاں پر آ گئے تھے۔ رات گہری ہو گئی تھی۔...... ہم فریش ہو کر، کھا پی چکے تھے۔ ریتو شاید کچن میں تھی اور میں اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے تیمور کو اب تک کی صورتِ حال کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ بھی یہی سوچنے لگا کہ گوپال داس کو اٹھا لیا جائے۔ اس سے بہت کچھ مل سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر گوپال داس کو اٹھا لیا تو پھر اس کے بعد قید خانے تک رسائی انتہائی مشکل ہو جائے گی۔ پرتاب سنگھ کے ساتھ ساتھ ریاستی قوت بھی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

تیمور کی بات بالکل درست تھی۔ دیوگڑھ ایک چھوٹا سا شہر تھا، گوپال داس کو اٹھا لینے کے بعد ہم چاہتے ہوئے بھی باہر نہ نکل پائیں گے۔ سب سے زیادہ توجہ مجھ پر ہو جائے

گی اور مجھے رانی بھاگ وتی سے مانگا جائے گا۔ اس کے بعد ہم مٹھی بھر لوگ کوئی بھی خفیہ کارروائی نہیں کر پائیں گے۔ میرے سامنے ایک طرح سے بند گلی آگئی تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے، ایسا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ سامنے سے مجھے ریتو آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں دو مگ تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک مگ میری جانب بڑھایا اور بولی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں، بس ایسے ہی تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ، میرے بارے میں سوچ رہے تھے؟'' اس نے خوشگوار حیرت سے کہا، پھر دائیں آنکھ دباتے ہوئے بولی۔ ''کب سے میرے بارے میں سوچنے لگے ہو؟''

''آج ہی سے......'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے تجسس سے پوچھا، پھر خود ہی بولی۔ ''آؤ کچھ دیر بیٹھ کر گپ شپ کریں۔''

''چاہے ساری رات بیٹھو، منع کس نے کیا ہے۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ ہنس دی۔ اس نے مجھے اپنا مگ پکڑایا اور کرسیاں لینے چل دی۔

میں اور ریتو کمرے سے نکل کر اوپری منزل پر ایسی جگہ آکر بیٹھ گئے تھے جہاں ہم کھلے آسمان کے نیچے تھے۔ یہ دوسری منزل پر بڑھا ہوا شیڈ تھا۔ وہاں گہرا اندھیرا نہیں تھا۔ ہلکی سی روشنی تھی جو باہر سے چھن کر آرہی تھی۔ ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''بتایا نہیں پھر تم نے......'' اس نے کہا۔

''تمہارے بدن کی لچک دیکھی ہے میں نے، یہ تو بڑی ریاضت کے بعد آتی ہے۔ تم اس جرم کی دنیا میں کیسے......؟'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بڑے عجیب سے لہجے میں بولی۔

''جرم کی یہ دنیا میرے لیے نئی نہیں ہے اور میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں بس اس دنیا میں ہوں تو ہوں۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے پوچھا، میں واقعی اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''رانا جی، میں نے جھونپڑیوں میں آنکھ کھولی تھی، وہیں ہوش سنبھالا۔ میرا باپ ایک خانہ بدوش تھا، قلابازی لگاتا، تنے ہوئے رسے پر کرتب دکھاتا، اس کا پیشہ تھا۔ اسی سے ہم کھاتے کماتے تھے۔ دوسرے بچوں کی طرح میں نے بھی یہ سب سیکھنا شروع کر دیا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ بھی سیکھنے لگا۔ میں بہت چھوٹی عمر میں یہ کرتب سیکھ گئی تھی۔''

''اب بھی آتے ہیں تمہیں یہ کرتب......'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''سنو نا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کہتی چلی گئی۔ ''پتا نہیں کب میرے باپ کے دل میں آئی کہ وہ مجھے پڑھائے لکھائے۔ اس نے ہمیں ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ خود ایک ٹولی کے ساتھ مل کر کماتا۔ ہمارا قبیلہ نجانے کہاں سے کہاں چلا گیا مگر ہم دیوگڑھ ہی میں رہے۔''

''مطلب پھر تم بھول گئیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میری ماں خود ایک نٹ کی بیٹی تھی۔ اس نے میرے بدن پر خاص توجہ دی۔ مجھے لچک دار بنا دیا۔ جب میں نے اسکول کی تعلیم ختم کی تو مجھے اپنے باپ والے سرکس میں کام مل گیا۔ میرا سارا دن پڑھنے اور نئے نئے کرتب سیکھنے میں لگ جاتا۔ شام ڈھلتے ہی سرکس کا کام شروع ہو جاتا۔ سرکس کی وجہ سے مختلف شہروں میں پھرتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن میرا باپ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ شاید ہم سنبھل جاتے لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی میری ماں نے شادی کرلی۔ یہ شادی کوئی محبت کی شادی نہیں تھی، میری ماں کو پناہ چاہیے تھی اور میرے سوتیلے باپ کو ہماری صورت میں کمائی کا بڑا ذریعہ مل گیا تھا۔ بس یہیں سے ہماری زندگی بکھر گئی۔''

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں پڑھنا چاہتی تھی اور میرے باپ نے مجھے کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ میں سمجھی کہ وہ مجھ پر رحم کر رہا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسے مافیا کے ہاتھوں میں دے دیا جو منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔ کیا عجیب بات تھی، ایک طرف میں منشیات سپلائی کرتی تھی تو دوسری جانب کالج کی بہترین ایتھلیٹ بن گئی تھی۔ میں نے بہت سارے مقابلے جیتے۔ میں باہر جانا چاہتی تھی لیکن میرا انسٹرکٹر ٹرانسفر ہو گیا۔ میں باہر نہ جا سکی، انہی دنوں ہمارے لوگ کمزور پڑ گئے تو نئے لوگوں نے دھندا سنبھال لیا۔ پھر وہی مار کٹائی، روز کے دنگے، ایک دن ایک لڑکا میرے ہاتھوں

مر گیا۔ بس تب سے اس دنیا میں ہوں۔"

"نہ تم بہترین ایتھلیٹ بن سکیں اور نہ......" میں نے کہنا چاہا تو جذباتی انداز میں میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"کچھ بھی نہیں بن سکی۔ ماں نہ رہی، بھائی اپنی دنیا میں کھو گیا اور میں چند برس سے یونہی اس دنیا میں ہوں۔ یہ تو رانی بھاگ وتی نے مجھ پر رحم کیا اور مجھے پناہ دی۔ میں بھی اس کی خدمت میں لگ گئی۔"

"کوئی مقصد نہیں، کبھی سوچا بھی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا سوچنا، کیسا مقصد، کوئی گولی آئے گی اور یہ زندگی چاٹ جائے گی۔ اگلے پل کی خبر نہیں۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ جتنی سانسیں ہیں، اپنی مرضی سے جی لوں اور کچھ نہیں چاہیے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بہت مایوس ہو زندگی سے؟" میں نے تبصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تھیں اب نہیں ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ کیوں......؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا انداز اور حوصلہ دیکھ کر لگا کہ جینا اسی طرح چاہیے، جب تک زندگی ہے تو بس ہے، اسی طرح جیو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب تک میں نے اس سے جو باتیں کی تھیں، وہ سب اسے قریب کرنے کے لیے تھیں، وہ جھوٹ بول رہی تھی یا سچ مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں نے جس مقصد کے لیے اس سے باتیں کی...... تھیں، وہ سوال میرے لب پر آ گیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن نجانے کیوں رُک گیا۔ میں نے اسے کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھا۔ میں بھاگ وتی اور پرتاب سنگھ کے تعلق یا پھر دشمنی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، پھر میں نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا۔

ہم وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ریتو کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا تو سرسراتے ہوئے بولی۔

"رانی جی کا فون......" میں خاموش رہا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی، پھر کال بند کر کے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "رانی جی نے ابھی بلایا ہے۔"

"تو جاؤ پھر۔" میں نے کہا۔

"تمہیں بھی ساتھ ہی بلایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تب میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات......؟"

"یہ تو وہیں جا کر پتا چلے گا۔" اس نے کہا اور قدم بڑھا دیے۔

رانی بھاگ وتی اسی کمرے میں تھی جہاں پہلی بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ساڑی پہننے کا انداز وہی تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑی اور سلیولیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ اس نے ہمیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی ہماری طرف دیکھتی رہی پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"ویر سنگھ جی، ہم نے اپنی طاقت ان چھوٹے غنڈے موالیوں پر صرف نہیں کرنی، یہ طاقت ایسی جگہ استعمال ہونی چاہیے جہاں پرتاب سنگھ پر کاری ضرب لگے۔"

"یہی بات تو یہی ہے رانی جی کہ آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہے، جو کہا اور جتنا سامنے آیا، وہ کر دیا۔ اب بتا دیں۔" میں نے بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، اب تک جو ہوا اس سے پرتاب سنگھ کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ ایسی ہلچل تو ان غنڈے موالیوں میں ہوتی رہتی ہے۔" رانی نے بے پروائی سے کہا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" میں نے اسی سکون سے کہا تو اس نے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا، تب میں بولا۔ "نجانے مجھے یہ کیوں لگتا ہے کہ آپ ذہنی طور پر پرتاب سنگھ سے شکست قبول کر کے اس سے خوف زدہ ہیں۔ آپ اس کے خلاف بہت کچھ کرنا بھی چاہتی ہیں لیکن ڈرتی ہیں۔ آپ کا یہ خوف اور ڈر آپ کو کوئی بھی بڑا فیصلہ کرنے سے روکتا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"یہی کہ آپ بچھی شطرنج پر مہرے تو رکھ لیتی ہیں لیکن کوئی بھی چال چلنے سے گھبرا جاتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کو مہرے رکھنا بھی نہیں آتے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ صوفے پر سیدھی ہو گئی۔

"میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھی۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"آپ پرتاب سنگھ کو ختم کرنا چاہتی ہیں، اسے اپنے سامنے سسکتا دیکھنا چاہتی ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتی ہیں کہ وہ

اپنے پیچھے ریاست کی قوت لیے کھڑا ہے۔ آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گی، جب تک اس کے پیچھے سے ریاست نہیں ہٹے گی۔ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا، جس سے ریاست آپ کے پیچھے آکر کھڑی ہو جائے۔'' میں نے کافی حد تک جذباتی انداز میں کہا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟''

''ٹارگٹ صرف اور صرف پرتاب سنگھ ہونا چاہیے۔ وہ ختم ہو گیا تو پھر باقی کیا بچے گا، کچھ بھی نہیں۔'' میں نے کہا تو وہ صوفے سے ٹیک لگا کر نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے باقی سے غرض نہیں ہے۔ میں اسے صرف اپنے سامنے گڑگڑاتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ میرے پاؤں پڑے اور میں اسے ٹھوکر مار دوں۔''

''معاف کرنا رانی جی، میں نے ایسے حالات بنا دیئے ہیں لیکن آپ سے پھر بھی کچھ نہیں ہونا۔'' اس بار میں دبے دبے غصے میں بولا۔

''کیوں نہیں ہونا رانا جی، آپ ایسے حالات تو بنا دو۔'' اس بار رانی بھاگ وتی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''حالات تو بن جائیں گے اور میں بنا بھی دوں گا لیکن آپ اس موقع پر پرتاب سنگھ کے سامنے جھک گئیں، یا کوئی مصالحت کرلی تو پھر میں آپ کا سب سے بڑا دشمن ہوں گا، یہ یاد رکھیے گا۔'' میں نے کرخت انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی، پھر خوشگوار انداز میں بولی۔

''مجھے تمہاری دشمنی قبول ہو گی۔''

میرے خیال میں رانی سے بات ختم ہو چکی تھی۔ اب تک ریتو نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا، ریتو نے کہا۔

''رانی جی، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''کچھ نہیں، بس وہی بات جو میں نے رانا جی سے کہہ دی، میرا خیال ہے سمجھ گئے ہو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تو میں اٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے اجازت......''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ ریتو بھی میرے پیچھے آ گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جا رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت ریتو کیا سوچ رہی تھی لیکن میرا دماغ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ میری تمام تر سوچوں کا مرکز رانی بھاگ وتی سے ہونے والی باتیں تھیں۔ ان باتوں سے ایک خیال میرے دماغ میں رینگ گیا تھا۔ میں اسی پر سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جس رہائش گاہ میں ہم ٹھہرے تھے، اس کی سیڑھیاں چڑھ کر جیسے ہی ہم چھوٹے سے لاؤنج میں آئے، ریتو نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''بہت خاموش ہو گئے ہو، کہیں رانی کی باتوں کا بُرا تو نہیں منا لیا؟''

''نہیں، بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پرتاب سنگھ پر ایک ایسی ضرب لگاؤں جس سے وہ تڑپ اٹھے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''میں نے جب پرتاب سنگھ کے بارے میں پڑھا اور اس کی ویڈیوز دیکھی تھیں، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ پرتاب سنگھ نے اپنی.... حویلی میں ایک چھوٹا سا مندر بنا رکھا ہے۔'' میں نے کہا تو تیزی سے بولی۔

''ہاں، ہے ایک کالی کا مندر۔ وہ اس کی حویلی کے پچھلی جانب ہے۔''

''اور اس مندر میں روزانہ پرتاب سنگھ کی ماں پوجا کرنے جاتی ہے۔'' میں نے کہا تو ریتو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہونقوں کی طرح میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ تبھی وہ دبے دبے سے لہجے میں بولی۔

''رانا، یہ تم کیا سوچ رہے ہو، اس کے لیے تو ایک فوج......''

اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، فوج نہیں، صرف ہم دو۔ اگر حوصلہ کر سکتی ہو تو۔''

''یہ کیسے ہو گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تمہیں سب بتا دیتا ہوں۔ تم دل کڑا کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے آگے بڑھی اور میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں میرے سینے پر رکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پُرسکون ہو گئی پھر پیچھے ہٹ کر بولی۔

''شاید وہ وقت آ گیا ہے جب میں خود کو رانی پر وار دوں۔ تم جو کہو، میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔''

میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا اور صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں کیا کرنا

ہوگا۔‘‘
وہ بیٹھ گئی اور میں اُسے سمجھانے لگا۔
☆☆☆
ہر طرف نیلگوں روشنی کا احساس تھا۔ رات لمحہ بہ لمحہ دن میں بدلتی جارہی تھی۔ ریتو نے فوراً ہیل ایک جگہ پارک کی اور نیچے اتر آئی۔
’’یہاں سے پانچ منٹ کا راستہ ہے۔‘‘ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں مجھے بتایا۔ میں نے ضروری سامان کا بیگ اپنے کندھے پر رکھا اور چل دیا۔ وہ میرے آگے آگے تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ چلتے رہنے کے بعد ہم پرتاب سنگھ کی حویلی کی پچھلی جانب آگئے جہاں ایک بڑا سا۔۔۔ جوہڑ تھا۔ جس کے اردگرد بہت سارے درخت اُگے ہوئے تھے۔ حویلی کی دیوار کافی اونچی تھی۔ جس کے سرے پر کانچ لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے رسا نکالا۔ اس کے آگے ہک لگا ہوا تھا۔ میں نے ہک کو زور سے گھماتے ہوئے رسا پھینکا تو وہ دیوار کے دوسری جانب اٹک گیا۔ میں نے رسے کو کھینچا اور پھر مضبوط پا کر ریتو کی طرف دیکھا۔ اس نے خود رسّے کو آزمایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لٹک گئی، اس نے اپنے پاؤں رسّے کے گرد جوڑے اور پھر لمحوں میں اوپر چڑھتی چلی گئی۔
وہ دیوار پر پہنچ گئی تھی۔ کانچ اس کے پاؤں زخمی کرسکتے تھے۔ اس نے دیوار پر چڑھنے سے پہلے لوہے کی ایک چھوٹی سی سلاخ سے کانچ کو توڑا اور پھر پاؤں رکھنے کی جگہ بنالی۔ اس دوران وہ لاشعوری طور پر اندر کا جائزہ لیتی رہی۔ اندر بالکل پُرسکون ماحول پاکر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیگ لیا اور رسّے کی مدد سے اوپر اٹھ گیا۔ جیسے ہی میں دیوار کے اوپر پہنچا۔ وہ میرے لیے کانچ توڑ کر جگہ بنا چکی تھی۔ میں نے اندر کا جائزہ لیا۔۔۔ ہر جانب سکون تھا۔ کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ریتو نے رسّا اندر کی جانب لٹکایا اور پھر اترتی چلی گئی۔ جیسے ہی وہ زمین پر اتری میں بھی اس کے پیچھے نیچے اتر گیا۔
ہمارے دائیں جانب ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ ایک بڑے سے سرسبز قطعہ کے عین درمیان سفید چبوترا بنا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف سیڑھیاں تھیں۔ بالکل درمیان میں چار ستونوں پر ایک سفید محراب بنی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل نیچے کالی کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک بلب روشن تھا جس میں کالی کی مورتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کالے پتھر سے تراشی ہوئی مورتی کی باہر نکلی ہوئی زبان سرخ تھی۔ اس بدہیئت مورتی کو پوری طرح خوفناک بنایا گیا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تبھی ریتو نے ہولے سے کہا۔
’’بڑی بی اس طرف سے آتی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑے سے ملازم بھی ہوتے ہیں۔‘‘
’’جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔‘‘ میں نے کہا اور اپنے اردگرد دیکھا۔ ہمارے اردگرد بڑے بڑے درخت تھے۔ میں نے ایک درخت کا انتخاب کیا اور اس پر چڑھتا چلا گیا۔ ریتو بھی میرے پیچھے ہی آگئی۔ ہم تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موٹی شاخوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اب ہمیں صرف بڑی بی کا انتظار تھا کہ وہ کب وارد ہوتی ہے۔ میں نے ایک پسٹل پر سائیلنسر لگایا اور جیب سے تیمور کا دیا ہوا فون نکال کر اسے میسج کردیا۔
تیمور اور اس کے ساتھی گوپال داس کو اغوا کرنے کا پلان کر چکے تھے۔ اس وقت وہ سب مہادیو والی مندر کے پاس پہنچ چکے تھے۔۔۔ رات کے پچھلے پہر ہی انہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ گوپال داس کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو رانی بھاگ وتی کی پرانی فیکٹری میں اسے لے جائیں۔ وہ رات وہاں ہونے والی کارروائی سے پوری طرح باخبر ہوگئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے وہاں کا ایک چکر لگا کر جاچکے تھے۔ وہ جگہ انہیں کافی بہتر لگی تھی۔ تیمور کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ وہ دیوگڑھ میں ابھی تک کوئی سیف ہاؤس نہیں بنا پایا تھا۔ اس کمی کو میں نے پورا کردیا تھا۔ اس نے اگر گوپال داس کو وہاں رکھنا تھا تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک، پھر اس کے بعد انہوں نے وہاں سے نکل جانا تھا۔ میں تیمور سے چیٹ میں مصروف تھا کہ ریتو کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔
’’وہ دیکھو۔‘‘
میں نے سامنے دیکھا۔ دو ملازمائیں وہاں پر آچکی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں جھاڑو تھیں۔ ایک نے جلدی سے پائپ کو سیدھا کرنا شروع کردیا اور دوسری جھاڑو پھیرنے لگی۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں سارے مندر کو دھو ڈالا تھا۔ اس میں اگر بتیاں لگا دی تھیں۔ ایک بڑے سے شاپر بیگ سے پیلے پھولوں کی مالا کالی کے مجسمے کی گردن میں ڈال دی تھی۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھیں یا ان کا یہ معمول تھا۔ وہ اپنا کام ختم کرکے جاچکی تھیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ بڑی بی یہاں ضرور آئے گی۔

سورج کی کرنیں پھوٹنے کو تھیں۔ نیلگوں ماحول ختم ہو گیا تھا۔ ایسے میں ایک سفید ماروتی نمودار ہوئی۔ وہ بالکل مندر کی سیڑھیوں کے پاس آرکی۔ اس میں سے پہلے ایک لڑکی نکلی جس نے سیاہ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اگلی جانب سے ایک نوجوان ساڈرائیور نکلا۔ اس کے بعد پچھلی نشست سے بھی ایک لڑکی نکلی، اس نے بھی سیاہ رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پوجا کی تھالی تھی۔ اس کے بعد بڑی بی نکلی۔

''یہی ہے پرتاب سنگھ کی ماں......'' ریتو نے سرگوشی کی۔

اس نے نارنجی رنگ کی پیلے بارڈ والی بیش قیمت ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس نے کچھ زیور بھی پہنا ہوا تھا۔ بڑی بی نے مندر کی سیڑھیوں پر ماتھا ٹیکا، پھر سیدھی کھڑی ہو کر پوجا کی تھالی لی۔ لڑکی نے پوجا کی تھالی میں رکھا ہوا دیا، ماچس کی تیلی سے روشن کر دیا تو بڑی بی دھیمے قدموں سے کالی کی مورتی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ تھالی کو گھماتے ہوئے جو بھی بھجن کہہ رہی تھی، وہ ہم تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

میں نے غور سے ماحول کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور ایک جانب کھڑا تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے یوں لگا جیسے وہ فقط ڈرائیور نہیں بلکہ کوئی تربیت یافتہ شخص تھا۔ میری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔

''ریتو تم تیار ہو؟''

''ہاں، میں تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''چلو'' میں نے کہا اور ہم پوری احتیاط سے نیچے اترنے لگے۔ میں پہلے اتر آیا تھا۔ ریتو کے پاؤں میرے کندھوں پر تھے۔ اگلے لمحے وہ پھسل کر میری پشت سے لگ گئی تھی۔ ہم دونوں درخت کی اوٹ میں تھے۔ میں نے سامنے کھڑے ہوئے ڈرائیور کو دیکھا اور پھر نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ اگرچہ مجھے اپنے نشانے پر پورا یقین تھا لیکن میں نے مزید دو فائر کر دیے۔ وہ ڈرائیور اپنا سینہ پکڑ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے اونچی کراہ نکلی تھی۔ جسے سن کر بڑی بی سمیت ان دونوں لڑکیوں نے گھوم کر دیکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ان کی آنکھوں میں حیرت جم کر رہ گئی۔ میں نے ان لڑکیوں پر فائر کر دیا۔ ایک کے سر پر فائر لگا تھا، وہ گھومتی ہوئی کالی کے چرنوں میں جا گری۔ دوسری سینہ تھام کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک دم سے تین لاشیں دیکھ کر بڑی بی نے حیرت سے اردگرد دیکھا۔ اسی لمحے ریتو کسی اسپرنگ کے مانند اچھلتی ہوئی بڑی بی کے پاس جا پہنچی۔ میں تیزی سے کار کی جانب لپکا۔ میں دیکھ رہا تھا بڑی بی صورت حال دیکھ کر چکرا گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے تھالی چھوٹ کر گر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ ریتو نے وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے بڑی بی کو اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی ماروتی کی پچھلی نشست پر آن بیٹھی۔ جیسے ہی وہ بیٹھیں، میں نے گیئر لگا دیا۔

ہم حویلی کے دائیں جانب سے نکلے تھے۔ تقریباً تین میٹر چلنے کے بعد ایک جانب پورچ تھا لیکن سامنے ایک بڑا سا فوارہ بنا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس گول چکر کی جانب چل دیا۔ وہاں سے سیدھی سڑک گیٹ تک جا رہی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا گیٹ پر دو سیکیورٹی والے کھڑے تھے۔ وہ ماروتی کی... طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ بڑی بی کی گاڑی پہچان رہے تھے یا جو بھی تھا۔ میں نے چند میٹر کے فاصلے پر زور سے بریک لگائے تو ریتو نے سر باہر نکال کر کہا۔

''جلدی کھولو گیٹ...... اسپتال جانا ہے۔''

ایک سیکیورٹی والا ہماری جانب بڑھا، اس نے اندر نگاہ ڈالی تو بڑی بی کو پچھلی نشست پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس نے اشارے سے گیٹ کھولنے کا کہا اور خود بھاگ کر گیٹ پر گیا۔ گیٹ کھل چکا تھا، میں نے تیزی سے ماروتی کو حویلی سے باہر نکال لیا اور پھر پوری رفتار سے چل پڑا۔

صبح کے وقت سڑکیں خالی تھیں۔ ریتو مجھے بتانے لگی کہ ہماری فوروہیل کہاں کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں گھوم کر حویلی کی پچھلی جانب آنا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد ہم فوروہیل تک جا پہنچے۔ ریتو نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، وہ سیدھی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی، اس دوران میں نے بڑی بی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی۔ ایک بار مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں پرواز ہی نہ کر گئی ہو۔ ریتو نے جس حد تک ہو سکا رفتار بڑھا دی تھی۔ بڑی بی کا ہچکولے کھاتا ہوا سر میری ران پر تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے ریتو سے کہا۔

''رانی کو پتا نہیں ہے کہ ہم کیا کر کے آرہے ہیں۔''

''ہاں... اچانک پتا چلے گا تو وہ......'' اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اسے فون کر کے بتاؤ، تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار

رہے۔‘‘

’’تو تم بتا دو۔ نمبر پر رانی لکھا ہے۔‘‘ اس نے جیب سے فون نکال کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر پش کیا تو چند لمحوں میں کال ریسیو کر لی گئی۔

’’بولو......‘‘ رانی کی خمار آلود آواز ابھری۔

’’میں بات کر رہا ہوں، رانا ویر سنگھ۔‘‘ میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولی۔

’’ریتو کہاں ہے؟‘‘

’’پریشان نہ ہوں، وہ میرے ساتھ ہے۔ میری بات سنیں۔‘‘ میں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا۔

’’ہاں بولو۔‘‘ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

’’پتا ہے، میں اس وقت کسے اغوا کر کے لا رہا ہوں۔‘‘ میں نے سکون سے کہا تو وہ انتہائی تجسس سے بولی۔

’’کسے لا رہے ہو؟‘‘

’’پرتاب سنگھ کی ماں کو۔‘‘ میں نے اسی سکون سے کہا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

’’اوہ، یہ کیا غضب کر دیا۔‘‘

’’میں نے کہا تھا کہ تم سنبھال نہیں پاؤ گی، بولو، لاؤں بنگلے پر یا واپس لے جاؤں، جلدی بولو۔‘‘ میں نے کہا اور بے ساختہ میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی یا شاید اسے احساس نہیں ہوا، وہ تیزی سے بولی۔

’’نہیں، نہیں لے آؤ لیکن انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔‘‘

’’نہیں ہو گی۔‘‘ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فور وہیل رانی بھاگ وتی کے بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے آ رکی تھی۔ سیکیورٹی والے اس فور وہیل کو پہچانتے تھے۔ گیٹ کھل گیا اور ریتو فور وہیل لیے اندر جا پہنچی۔ سامنے پورچ تھا۔ فور وہیل وہاں جا رکی۔ میں نے دیکھا، رانی بھاگ وتی پہلے ہی سے ہماری منتظر تھی۔

’’ریتو، یہ پانی کی بوتل دینا۔‘‘ میں نے کہا تو ریتو نے جلدی سے پانی کی بوتل اٹھائی، اسے کھولا اور پانی کے چھینٹے بڑی بی کے منہ پر مارے۔ وہ ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ ریتو پر پڑی۔ تب ریتو نے پچکارتے ہوئے کہا۔

’’آئیں نیچے اتریں، ڈریں مت، اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔‘‘

’’تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟‘‘ بڑی بی نے پوچھا۔

’’آپ آئیں تو سہی۔‘‘ اس نے بڑی بی کا ہاتھ پکڑا۔

میں نے بھی اسے اٹھایا اور وہ اٹھ گئی۔ ریتو جلدی سے نیچے اتری، اس نے گیٹ کھولا تو بڑی بی باہر آ گئی۔ میں اسے سہارا دے کر اندر کی جانب بڑھا۔ وہ چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر گئی تو اس کے سامنے رانی بھاگ وتی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بڑی بی کے منہ سے حیرت بھرے انداز میں بے ساختہ نکلا۔

’’بہو تم......‘‘

’’ہاں، ماتا جی میں۔ آئیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے رانی نے بڑی بی کو خود پکڑ لیا تو مجھے بہت ساری کہانی کی سمجھ آ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تشویش بھرا خوف میرے اندر در آیا کہ جو میں نے سوچا ہے، کہیں رانی کی وجہ سے وہ درہم برہم نہ ہو جائے۔

ریتو اور رانی...... بڑی بی کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئیں۔ بڑی بی کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی بیڈ پر بیٹھی، اس نے اسی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

’’بہو، مجھے یوں کیوں لایا گیا ہے؟‘‘

رانی بھاگ وتی نے ایک بار میری طرف دیکھا، شاید اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے تیزی سے کہا۔

’’اس لیے کہ تمہاری بہو، کچھ دن تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہے۔‘‘

’’میں جانتی ہوں اس خدمت کو، میرے پرتاب کو پتا چل گیا نا تو سب ختم ہو جائے گا، میں تم سب کا قصور معاف کر سکتی ہوں اگر تم مجھے ویسے ہی واپس چھوڑ کر آ جاؤ۔‘‘

’’بڑی بی ابھی آپ آرام کرو، میں تمہارا بیٹا بھی یہیں لا رہا ہوں۔ پھر دیکھنا کون کسے ختم کرتا ہے۔‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا تو بڑی بی کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے رانی بھاگ وتی کی طرف دیکھا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ بھی میرے پیچھے نکلی۔ وہ بالکل میرے سامنے تن کر کھڑی تھی۔ تب میں نے کہا۔

’’یہ تمہارا امتحان ہے رانی جی، چاہے کچھ ہو جائے، اسے چھپا کر رکھنا، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔‘‘

’’تم نے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ویر سنگھ۔‘‘ اس نے اعتماد سے کہا۔

’’میں جا رہا ہوں، میری اگلی چال کا انتظار کرنا۔‘‘ یہ کہہ کر میں نیچے کی طرف چل دیا۔ میں نے ابھی سیڑھیاں

طے کی تھیں کہ ریتو بھی بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آگئی۔ اس نے پھولے ہوئے سانس میں پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''یہ مت پوچھو، میں کہاں جا رہا ہوں، لیکن تم ایک بات یاد رکھنا۔''

''وہ کیا......؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ رانی بھاگ وتی کسی بھی وقت تمہاری قربانی کر سکتی ہے۔ کیونکہ معاملہ اب بہو ساس کا... آگیا ہے، کاش تم مجھے پہلے بتا دیتیں۔''

''میں جانتی ہوں، ایسا ہو سکتا ہے لیکن...... میں سنبھال لوں گی۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں دکھ کی کیفیت پھیل گئی تھی۔ پھر میں مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

پورچ میں کھڑی فوروہیل کو اسٹارٹ کیا اور نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

شہر میں دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیمور نے گوپال داس کو اغوا کر لیا تھا۔ اس وقت وہ تیزی سے پرانی فیکٹری کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے اس نے تفصیل نہیں بتائی تھی، محض ایک چھوٹا سا میسج کیا تھا۔ مجھے راستوں کی پوری طرح شناسائی نہیں تھی، پھر بھی میں فوروہیل بھگائے ہوئے جا رہا تھا۔ میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

شاید گوپال داس کا اغوا اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا، جتنا بڑی بی کا اغوا کرنا پرتاب سنگھ کے لیے اہم تھا۔ میں جانتا تھا کہ بڑی بی کو اغوا کرنے کے بعد میں نے پرتاب سنگھ کے دل پر ہی نہیں عقل پر بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں شاید ایسا نہ کرتا لیکن اس نے میری ماں جیسی ڈاکٹر فائزہ کو جس طرح رکھا ہوا تھا، وہ منظر میری نگاہوں سے ہٹتا نہیں تھا۔ میرے بھی دل پر اسی طرح ہاتھ پڑا تھا۔ میں بھی عقل کھو بیٹھا تھا۔ میں چاہتا تو پورے شہر میں آگ لگا دیتا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ کو بازیاب کروانا تھا۔ اگر گوپال داس سے معلومات مل گئیں تو ٹھیک ورنہ دوسری صورت میں مجھے بڑی بی کا کارڈ استعمال کرنا تھا۔ اب یہ رانی بھاگ وتی پر تھا کہ وہ کس قدر مضبوط رہتی ہے۔

میں پرانی فیکٹری کے پاس پہنچ چکا تھا۔ زنگ آلود گیٹ بند تھا۔ میں نے تیمور کو کال کی۔

''کہاں پر ہو؟''

''میں شاید راستہ بھول گیا ہوں، ابھی تک فیکٹری نہیں پہنچ پایا۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا تو خوف کی لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔ یہ تو بہت غلط ہو گیا تھا۔ مجھے بھی پوری طرح شہر کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے دماغ کو قابو میں رکھا اور سکون سے کہا۔

''تمہارے پاس اس فیکٹری کی لوکیشن تو ہے نا؟''

''ہاں ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''دیکھو، میں وہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ میں تمہیں دوبارہ لوکیشن بھیج رہا ہوں، تم اسے فالو کرتے ہوئے آجاؤ۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''فوراً بھیجو۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے تیزی سے لوکیشن اسے بھیج دی۔ اب میرے پاس سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں فوروہیل سے نیچے اترا۔ گیٹ تک گیا اور اسے کھول دیا۔ میں واپس فوروہیل میں بیٹھا اور اندر پورچ تک چلا گیا۔ میں نے فوروہیل ایک سائڈ پر کھڑی کی اور دفاتر والی عمارت کی طرف چلا گیا۔ وہاں دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ جس کمرے میں سامان پڑا تھا اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تک کھڑا اپنی سانسیں بحال کرتا رہا، پھر تیمور کو فون کرنے کے لیے اپنا سیل فون نکالا، اس سے پہلے کہ میں کال کرتا، ریتو کے دیے ہوئے سیل فون پر کال آنے لگی۔ میں نے اسے جیب سے نکالا تو ایک اجنبی نمبر اسکرین پر جگمگانے لگا۔ وہ نمبر پہلی بار فون پر آئے تھے۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز ابھری۔

''پرتاب سنگھ بات کر رہا ہوں۔''

''کون پرتاب سنگھ......'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہوگا کہ تم میرا تعارف نہ ہی لو، مگر میں تم تک پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

''پہنچ ہی گئے ہو تو آؤ مل لیتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ذرا سا صبر کرو۔'' یہ کہتے ہی فون بند کر دیا گیا۔ میں نے فون اسکرین پر دیکھا اور جیب میں ڈال لیا۔ نجانے مجھے یہ کیوں لگا کہ میں پرتاب سنگھ کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ کسی بھی وقت میرا اور اس کا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔

حالات کی تندو تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

ریڈ کارڈ

محمد سلیم کرد

ناگہانی طور پر بعض دفعہ ہم ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ اسے معمولی سمجھ کے نظرانداز کر دیتے ہیں... مگر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اس کا غیر معمولی پن عیاں ہوتا چلا جاتا ہے... ایک ایسے ہی نوجوان سے سرزد ہو جانے والی معمولی غلطی... جس کا کفارہ اسے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑا...

ایک ہی انداز میں قتل ہونے والے دو دوستوں کی سنگین واردات......

مجھے پوری طرح یقین تھا کہ پولیس ضرور میری خدمات حاصل کرے گی کیونکہ دونوں وارداتیں اے ایس پی وجاہت علی کے علاقے میں رونما ہوئی تھیں۔ سیل فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی اور اسکرین پر اے ایس پی وجاہت علی کا نام نمبر سمیت جگمگا رہا تھا۔

''آپ کے علم میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ میرے ایریا... میں قتل کی دو وارداتیں رونما ہوئی ہیں۔ چار دن کے بعد پرسوں دوسرا قتل ہوا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ

دونوں قتل میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ آلۂ قتل میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے اور مقتولین مقامی سطح کے فٹ بالر اور اسٹوڈنٹ تھے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد اے ایس پی وجاہت علی اصل گفتگو پر آتے ہوئے بولا۔

''ناممکن ہے کہ مجھے علم نہ ہو...... میں نے دونوں قتل کے متعلق اخبارات میں بڑی تفصیل سے خبریں پڑھی ہیں۔ آپ کے خیال میں دونوں واردات کے پیچھے ہاتھ ایک ہے اور وہ کوئی نفسیاتی مریض جیسا سیریل کلر ہوگا اور اس کی لسٹ میں مزید بھی ٹارگٹ ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں، ناصر بھائی! سر دست تو ایسا نظر آرہا ہے، اس لیے آپ کو زحمت دینے کی نوبت آئی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''خادم ہمہ وقت حاضر ہے۔'' میں نے قدرے مروت سے کہا۔ چند لمحے مزید گفتگو کے بعد ہمارا رابطہ منقطع ہوگیا۔

☆☆☆

میں ایک فری لانسر سراغ رساں ہوں۔ مجھے پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے کئی بار ملازمت کی آفر ہوئی تھی لیکن میں نے ہر بار آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ میرا یقین تھا کہ میں پولیس ڈپارٹمنٹ میں رہ کر وہ کارکردگی ہرگز دکھا نہیں سکوں گا جو میں آزاد رہ کر بڑی کامیابی کے ساتھ دکھاتا آرہا ہوں جب سے وجاہت علی سے دوستی کا رشتہ استوار ہوا تھا، آفر کا سلسلہ تیزی کے ساتھ چل نکلا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں تقریباً آٹھ نو سال چھوٹا تھا اور تجربے کے لحاظ سے بھی مجھ سے کم تھا۔ میرے پاس بارہ سالہ سراغ رسانی کا تجربہ تھا اور وجاہت علی کے پاس سات سالہ پولیس ملازمت کا تجربہ تھا۔ ہمارے ملک میں پرائیویٹ سراغ رساں کا تصور تک نہیں ہے۔ صرف پیروں کے نشانات سے مجرم کا سراغ لگانے والے کھوجی...... اور وہ بھی دور دراز کے اِکا دُکا دیہات اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔

سراغ رسانی نہ صرف میرا پیشہ ہے بلکہ میرا شوق اور جنون بھی ہے۔ اب تک میں نے کئی پیچیدہ اور الجھے ہوئے کیس حل کیے ہیں۔ پولیس کی نظروں میں میری بڑی ساکھ ہے۔ آخر کسی پرائیویٹ فرد سے پولیس ڈپارٹمنٹ دہرے قتل کے کیس کے متعلق کیوں مدد طلب کرتا۔ ایک طرح سے میں پولیس کے لیے غیر متعلقہ فرد نہیں تھا۔

دوپہر کے ڈیڑھ بجنے والے تھے، میں پولیس اسٹیشن میں اے ایس پی وجاہت علی کے آفس میں داخل ہوا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ اوپر خاصا دباؤ ہے...... ورنہ دونوں قتل کی فائلز دستور کے مطابق بند ہوتیں اور مجھے بلانے کی نوبت پیش نہ آتی۔'' میں نے وجاہت علی سے مصافحہ کرنے کے بعد میز کے پاس ایک خالی کرسی سنبھالتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس وقت وہ آفس میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

''جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ یقیناً آپ کے علم میں بھی ہو گا کہ مقتولین کا تعلق خاصے بڑے گھرانوں سے ہے۔ پولیس پہ...... دراصل مجھ پر تو بہت دباؤ ہے۔'' اسے میرے مزاج کا صحیح اندازہ تھا اس لیے وہ میرے طنزیہ جملے پر بھی اثبات میں جواب دیتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

''میرے پاس اس کیس کے متعلق پوری میڈیا رپورٹ موجود ہے۔ میں بغور اس پر اسٹڈی کر چکا ہوں۔ کیونکہ مجھے پوری امید تھی کہ پولیس قاتل یا قاتلوں کے پیچھے مجھے دوڑائے گی۔'' میں نے کہا۔

''چلیں لیب تاکہ میں آپ کو پوری طرح بریف کروں۔'' وہ میز کے پیچھے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پولیس اسٹیشن کے ایک لیبارٹری نما کمرے میں موجود تھے جو میرا دیکھا بھالا تھا پھر اس نے دیوار پر لگی اسکرین آن کی جس پر خون میں لت پت پڑی ہوئی ایک نوجوان لڑکے کی تصویر ظاہر ہوئی۔

''یہ امجد ظہیر ہے، شہر کے ایک بڑے بزنس مین ظہیر احمد کا فرزند جسے چھ دن قبل رات کے گیارہ سے بارہ بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔ اس کی لاش پبلک پارک سے ملی تھی جسے صبح کے وقت پارک کے مالی نے پارک کے ایک گوشے میں پڑے دیکھا تھا۔ پارک پولیس اسٹیشن کی حدود میں ہے جو مقتول امجد کے گھر سے تقریباً پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ لاش کے قریب عجیب و غریب قسم کا آلۂ قتل اور ایک سرخ رنگ کا کارڈ پڑا ہوا ملا...... ریڈ کارڈ۔ کھیل کے دوران کسی کھلاڑی کی بڑی یا آخری غلطی پر میچ ریفری اسے ریڈ کارڈ دکھا کر میدان سے آؤٹ کرتا ہے۔ ایک عام ریڈ کارڈ جس پر ہم نے خاص توجہ دینا ضروری نہ سمجھا۔ امجد فٹ بال کا ایک کھلاڑی تھا۔ اس کی لاش کے پاس سے ریڈ کارڈ کا پایا جانا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ شاید نامعلوم قاتل یا قاتلوں سے گتھم گتھا ہوتے وقت مقتول کی جیب میں موجود ریڈ کارڈ نکل گیا ہوگا مگر دوسری لاش کے پاس ریڈ کارڈ ملنے سے ہم چونک اٹھے۔ دونوں ریڈ کارڈ سمیت دونوں آلۂ قتل پر فنگر پرنٹ نہیں پائے گئے۔''

وجاہت علی کہتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

ہمارے درمیان ایک لمبی چوڑی میز موجود تھی۔ میں میز کے عین سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وجاہت میز کے پیچھے دیوار کے سامنے کھڑا ہوا تھا پھر وہ قدرے جھکا اور میز کی درازیں کھولنے میں مصروف ہوگیا۔

''دونوں لاشوں کے پاس ریڈ کارڈ کا پایا جانا، کسی ایک بڑی غلطی یا بار، بار کی غلطی کی سزا کو ظاہر کرتا ہے جس طرح کھیل کے دوران میچ ریفری کسی کھلاڑی کی پہلی بڑی یا آخری غلطی پر اسے ریڈ کارڈ دکھا کر میدان سے آؤٹ کر دیتا ہے...... نامعلوم قاتل یا قاتلوں نے دونوں کو کسی پہلی بڑی غلطی پر یا آخری غلطی کی پاداش میں زندگی کے میدان سے آؤٹ کر دیا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں آپ کی رائے سے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

وجاہت نے میز پر ایک سفید رنگ کا کینوس کا تھیلا رکھ دیا جہاں کیس کی فائل بھی موجود تھی پھر وہ ایک طرف رکھے ہوئے دستانے پہننے لگا۔

''میں نے تھوڑی دیر قبل کہا تھا کہ عجیب وغریب قسم کے آلۂ قتل، آپ نے میڈیا پر ان کی تصویریں دیکھ لی ہوں گی۔ دونوں لاشوں کے پاس سے یہ عصا نما نیزے ملے ہیں۔'' اس نے کینوس کے تھیلے سے دو پلاسٹک کے پارسل نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا جن میں عصا نما نیزے واضح نظر آرہے تھے۔ میں نے دستانے پہننے کے بعد ان کا معائنہ شروع کیا۔ واقعی دونوں عجیب وغریب قسم کے انوکھے ہتھیار تھے۔ میں نے ایسے ہتھیار جو قدیم طرز کے نظر آرہے تھے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ دونوں کی بناوٹ میں بھی ذرہ برابر کمی بیشی نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کے دستانے کسی بڑے سائز کے نیزے کے دستانوں کے برابر تھے مگر نیزوں کے پھل کی لمبائی تقریباً آٹھ انچ کے قریب تھی۔ میں نے ایک کو اپنی مٹھی میں پکڑا تو نوکدار پھل پوروں کے درمیان خطرناک انداز میں نکلتا ہوا نظر آیا۔ پھل کا وہ حصہ جو انگلیوں کے پاس تھا، وہاں ایک سپورٹ لگی ہوئی تھی تاکہ نیزے پر ہاتھ کی جکڑ مضبوط رہے۔ کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایسے خطرناک ہتھیار کا ایک آدھ وار بھی کافی ثابت ہوتا۔

''کسی لوہار کے ہاتھوں کی کاریگری نظر آرہی ہے۔'' میں بولا۔

''جی ہاں، یہ خاصے ابھرے ابھرے سے ہیں۔ مشین کے بنے ہوتے تو ہموار اور صاف ہوتے۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ قاتل ریفری بھی ہے اور پیشہ ور لوہار بھی ہے۔'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''سردست تو ایسا کچھ نظر نہیں آرہا ہے...... یہ زمانۂ قدیم کے ہتھیار دکھائی دے رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''صرف نظر آرہے ہیں مگر ہیں نہیں۔'' میں برجستہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد اسکرین پر دوسرے مقتول کی خون میں لت پت لاش کی تصویر تھی۔ اس دوران میں دونوں ریڈ کارڈ کا بھی اچھی طرح معائنہ کر چکا تھا جو عام نوعیت کے ریڈ کارڈ تھے۔

''مقتول راشد...... شہر کے ایک معروف ٹرانسپورٹر راشد کا فرزند۔ یہ بھی لوکل سطح کا ایک فٹ بالر تھا۔ اس کی لاش پرسوں رات نو بجے کے قریب یہاں سے دس بارہ منٹ کی ڈرائیونگ پر واقع ایک غیر استعمال عمارت کے آس پاس کھڑی ہوئی اس کی اپنی کار میں ملی تھی جسے پولیس کی گشتی ٹیم نے اتفاق سے دریافت کیا تھا۔ علاقہ سنسان اور غیر آباد ہے۔ شام ڈھلتے ہی وہاں تاریکی کا راج ہوتا ہے۔ نامعلوم قاتل یا قاتلوں نے موقع پا کر اسے اس کی کار میں موت کی نیند سلا دیا۔ زیادہ امکان ہے کہ مقتول کو کسی طرح قاتل نے اسے ویران علاقے میں آنے پر مجبور کیا ہوگا۔ کار کے اندر فرنٹ سیٹ پر آلۂ قتل اور ریڈ کارڈ دونوں پائے گئے۔''

وجاہت علی نے روشن اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر ایک نوجوان شخص کی خون میں لت پت لاش کی تصویر تھی جس کا سر کار کے اسٹیئرنگ وھیل سے ٹکا ہوا تھا اور وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑا تھا۔ کار کا اندرونی منظر بے حد ہولناک تھا۔

''جس آلے سے مقتول کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ یہ ہے۔'' اس نے میز پر موجود دو نیزوں میں سے ایک اٹھاتے ہوئے کہا جس کے دستانے پر شناخت کے لیے انگریزی کا حرف M سفید رنگ میں درج تھا جو مقتول کے نام کا پہلا حرف تھا اور اسی طرح دوسرے آلۂ قتل کے دستانے پر شناخت کے لیے A درج تھا جو ظاہر ہے، امجد کے نام کا پہلا حرف تھا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق پیٹ اور پہلو پر نیزے کے پے در پے وار کی وجہ سے مقتول کی موت ساڑھے سات سے ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ جب اتفاق سے پولیس کی گشتی ٹیم کو لاوارث کار ویران علاقے میں نظر آئی تھی رات کے نو بج کر

بیس منٹ کا وقت ہو رہا تھا یعنی پچاس منٹ قبل مقبول ختم ہو چکا تھا۔''

مقبول اپنے گھر سے کس وقت نکلا تھا اور اس دن کس کس سے ملا تھا؟ میں خاص نکات کو نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

''شام چھ بجے کے وقت وہ گھر سے نکلا تھا۔ وہ کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہا اور اس کی ملاقات کس کس سے ہوئی نہ پوری طرح اس کے گھر والوں کے علم میں ہے اور نہ اس کے دوستوں کو خبر ہے جن سے وہ ہفتے کے چھ دن ملا کرتا تھا۔ مقبول کے ساتھیوں کا یہ کہنا ہے کہ اتوار کو ہم ریسٹ کرتے ہیں اور گراؤنڈ میں پریکٹس نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اتوار کے دن ہم اکثر ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے۔'' اے ایس پی نے بتایا۔

''کس کی کال آئی تھی اور مقبول نے کس کو کال کی تھی؟'' میں نے سوالات کا سلسلہ برقرار رکھا۔ مجھے میڈیا کی خبروں سے علم تھا کہ دونوں مقتولین کے سیل فون بند حالت میں ان کی جیبوں سے ملے تھے۔

''میں نے دونوں کے سیل فونز کے ریکارڈ چیک کیے ہیں۔ اس دن مقبول نے کسی کو کال کی تھی نہ کسی اور کی کال اس کے فون پر آئی تھی۔ ہاں...... امجد کو دوپہر کے وقت اس کے کلب کے کوچ نے کال کی تھی مگر اس دن اس نے بھی خود کسی کو کال نہیں کی تھی۔ دونوں مقتولین کے فون سے قاتلوں کو اگر کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا تو یوں ہی لاشوں کی جیب میں فون ہرگز چھوڑ کر نہ جاتے...... بہرحال انہوں نے فون آف کرنا ضروری سمجھا مگر آلۂ قتل اور ریڈ کارڈ کی طرح ان پر بھی قاتلوں کے فنگرز پرنٹ نہیں پائے گئے۔''

''مقتولین ایک کلب کی طرف سے کھیلا کرتے تھے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''نہیں...... دونوں دو مختلف کلب سے وابستہ تھے۔'' پھر اس نے دونوں کلب کے متعلق مجھے ایک لسٹ فراہم کی جس میں دونوں کلب کے عہدے داران سمیت کوچ و کیپٹن اور ہر ایک کھلاڑی کے نام مع فون نمبرز اور دیگر ضروری معلومات درج تھیں۔ دونوں دو مختلف فٹ بال کلب کی طرف سے کھیلا کرتے تھے مگر ان کا ہوم گراؤنڈ ایک تھا جہاں دونوں کلب کے آفس بھی واقع تھے۔

''امجد اتوار والے دن قتل نہیں ہوا تھا، وہ گھر سے کس وقت نکلا تھا اور کس کس سے اس کی ملاقات ہوئی تھی؟''

''صبح وہ کالج چلا گیا تھا۔ حسب معمول ایک بجے کے وقت اس کی واپسی ہوئی تھی۔ لنچ کرنے کے بعد دو بجے وہ کسی کام کے سلسلے میں اپنے والد سے ملنے آفس چلا گیا تھا۔ وہاں سے پونے تین بجے وہ گھر کے لیے نکلا تھا لیکن گھر لوٹنے کے بجائے وہ فٹ بال گراؤنڈ کی طرف نکل گیا۔ راستے میں اس کے کلب کے کوچ نے ایک ہنگامی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے اسے کال کی تھی۔ میٹنگ کے اختتام کے بعد معمول کی مشق کا وقت شروع ہوا۔ امجد نے معمول کے مطابق مشق میں حصہ لیا۔ مشق کے بعد شام چھ بجے وہ گراؤنڈ سے نکلا مگر دوسرے روز صبح کے وقت وہ مردہ حالت میں پارک میں پایا گیا۔ مقتول کے والد نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ رات کے ایک بجے درج کرائی تھی۔ پہلے اس کے اہلِ خانہ سمجھے تھے کہ کسی دوست یا عزیز کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے امجد کو گھر لوٹنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ جب کافی وقت گزرا تو رابطہ کرنے پر اس کا نمبر مسلسل بند جاتا رہا تب انہیں تشویش لاحق ہوئی پھر رابطہ اور تلاش کا سلسلہ شروع ہوا۔ عزیز، دوست، رشتے دار سب کی طرف سے نفی میں جواب ملا تو فوری طور پر پولیس اسٹیشن میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی مگر دوسرے دن وہ ایک لاش کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ امجد کے دو بھائی ہیں جو اس سے کافی چھوٹے ہیں...... اسی طرح مقبول کا ایک بھائی ہے جس کی عمر صرف چھ سال ہے۔'' وجاہت علی نے بتایا۔

''فیملی کی کیا رائے ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کوئی خاص نہیں، بس عام سی رائے ہے جو ایسے حالات میں ہر متاثرہ فیملی کی ہوتی ہے۔ صرف معمولی شک کی بنیاد پر عام مخالف بھی قاتل نظر آتا ہے اور صحیح معنوں میں یہ فیصلہ کر نہیں پاتے کہ ان میں اصل قاتل کون ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا یہ پختہ خیال ہے کہ دونوں کے قاتل ان کے کسی بھی ظاہری اور قریبی مخالفین میں سے نہیں ہیں اور اس بات پر کوئی شبہ نہیں ہے کہ دونوں کسی ایک قاتل کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔'' آخر میں وجاہت علی وثوق سے بولا۔

''دونوں گھرانوں کا آپس میں کسی قسم کا راہ و رسم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی بھی قسم کا نہیں ہے۔ دونوں مقتولین کا تعلق صرف فٹ بال کے کھیل کی حد تک تھا، دونوں دو مختلف کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔'' اس نے بتایا۔

''پولیس کی عینک سے قطع نظر قاتل کا سراغ لگانا آسان اور سہل ہے۔'' میرا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا، میں نے ایک خیال کے تحت معنی خیز انداز میں کہا۔

''اور ہاں، امجد کی بائیک کہاں سے ملی تھی؟'' میں

نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''دراصل ہم نے میڈیا سے اصل بات چھپائی ہے تاکہ اسے پولیس پر چیخنے کا موقع نہ ملے۔ بائیک پولیس کی ناک کے نیچے سے برآمد ہوئی تھی۔ پولیس اسٹیشن کے عین عقب میں نامعلوم قاتلوں نے بائیک لاکر چھوڑ دی تھی۔ دونوں طرف کی نمبر پلیٹ بھی غائب ہیں۔'' اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا مگر یہ سن کر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ چونکا۔
چائے بسکٹ اور مزید ضروری بات چیت سے فراغت کے بعد میں پولیس اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

شام سات بجے کے وقت میری کار فٹ بال گراؤنڈ جانے والے راستے پر دھیمے انداز میں محوِ سفر تھی۔ میں کسی تحقیقات کے سلسلے میں پیشگی اطلاع دینے کا قائل نہیں تھا، اس طرح کسی کو بھی مجھ سے ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا اور ملاقات کے بھی ہمیشہ خاطر خواہ نتائج کے نکلتے۔ امجد کی لاش کے قریب اور اسی طرح مقبول کی کار کے آس پاس جس میں اس کی ڈیڈ باڈی ملی تھی، پولیس کو چند غیر واضح نقش پا ملے تھے جو کسی بھی طرح تفتیش کے لیے ناکافی تھے۔ گمان ہوتا تھا کہ نقش پا مٹائے گئے ہوں۔ میں نے دونوں جائے وقوعہ کا بھی جائزہ لیا تھا مگر مجھے وہاں کوئی مختلف بات نظر نہیں آئی تھی۔ مقبول کی کار کا بھی میں نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا مگر مجھے اپنی طرف توجہ دلانے والی کوئی بات اس میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ دونوں مقتولین نوجوان تھے۔ امجد اور مقبول کی عمریں بالترتیب اٹھارہ اور انیس سال تھیں۔ قاتلوں نے خوف و دہشت کا عالم طاری کرنے کے لیے لاشوں پر خوفناک قسم کے آلۂ قتل بھی چھوڑے تھے اس بات میں کوئی دو رائے نہیں تھیں کہ اس کا مقصد دونوں مقتولین کے عزیز و اقارب کے دل میں خوف و دہشت پیدا کرنا تھا اور ریڈ کارڈ سے ناقابل معافی غلطی کی سزا کا واضح پیغام جاتا تھا جو انہیں موت کی صورت میں مل چکی تھی۔ قاتل ایک فرد ہے یا قاتلوں کا کوئی ٹولا ہے مگر انہوں نے دونوں قتل بڑے شاطرانہ انداز میں کیے تھے۔ میں ہر زاویے پر غور و فکر کرتا ہوا فٹ بال گراؤنڈ کے سامنے پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری کار گراؤنڈ کے احاطے میں داخل ہوگئی۔
یہ کوئی باقاعدہ اسٹیڈیم نہیں تھا بلکہ ایک عام سا

> خاتون بہت خوش جمال مگر بدخصال تھیں۔ تلخیوں سے بچنے کے لیے شوہر نامدار ہمیشہ اپنی زبان بند رکھتے، دل ہی دل میں جلتے بھنتے رہتے، اپنی تو بیاہتا بیوی کی دل آزاری کے خیال سے کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔
> ایک صبح ان کی بیوی نے بہت ناز و ادا کے ساتھ ان سے شکوہ کیا کہ رات کو وہ نیند کی حالت میں اسے بہت برا بھلا کہہ رہے تھے۔
> شوہر نے بے رخی سے بیوی کی شکایت سنی اور تلخی سے کہا۔ ''مجھے سب معلوم ہے، تمہیں جان لینا چاہیے کہ اس وقت میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔''
>
> کراچی سے ج۔ کاظمی کا تعاون

گراؤنڈ تھا۔ بعض جگہ تماشائیوں کے بیٹھنے کے لیے ترچھی انداز کی سیڑھی نما فرشی نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سبزہ زار بچھی ہوئی نظر آرہی تھی اور کہیں فقط خاکی مٹی کے گول مول دائرے برقی قمقموں کی تیز روشنی میں چمکتے دمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر مختلف کلبوں کے بڑے بڑے بینرز ہوا سے جھول رہے تھے۔ کان پڑی باتوں کی آوازوں نے میری توجہ گراؤنڈ کے ایک گوشے کی طرف مبذول کرائی۔ میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھنے لگے جہاں کمروں کی ایک مختصر قطار پر مختلف کلبز کے سائن بورڈ آویزاں نظر آرہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد میں اپنے مطلوبہ کلب کے آفس میں داخل ہوگیا۔ دیوار کے سامنے ایک کشادہ میز بچھی ہوئی تھی جس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص کرسی پر براجمان تھا اور میز کے دونوں طرف دیوار کے ساتھ نشستوں کی قطار تھی جن پر دس بارہ نوجوان لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ میز کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی ٹیبل پر مختلف سائز اور مختلف انداز کے میڈل، کپ، شیلڈ اور ٹرافی قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواریں عالمی شہرت یافتہ اور مقامی سطح کے کھلاڑیوں کی بڑی بڑی تصاویر سے سجی ہوئی تھیں۔ کمرے کا اندرونی ماحول مکمل طور پر فٹ بال کلب کے دفتر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس وقت ان کا موضوعِ گفتگو دونوں لڑکوں کے قتل کے بارے

میں تھا۔ ایک اجنبی کو آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔

"پرائیویٹ سراغ رساں ناصر خان، پولیس نے دونوں مرڈر کی تحقیقات کی ذمّے داری مجھے سونپی ہے۔" علیک سلیک کے بعد میں ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔

"عبدالحبیب کہتے ہیں۔" وہ پُرجوش انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے تقریباً اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولا اور مزید اپنا تعارف کلب کے صدر کی حیثیت سے بھی کرایا۔

"تشریف رکھیں ناصر خان صاحب۔" عبدالحبیب کے چہرے پر خوف و بے چینی کی ہلکی سی بھی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔ میری غیر متوقع آمد پر اس نے میرا پُرجوش انداز میں استقبال کیا تھا۔

"مقبول کتنے عرصے سے آپ کے کلب کے لیے کھیل رہا تھا؟" چند رسمی باتوں کے بعد میں اصل موضوع پر آیا۔

"وہ تقریباً دس گیارہ سال کا بچہ تھا جب ایک کلاس فیلو کے ساتھ فٹ بال گراؤنڈ میں کھیلنے کے لیے آیا پھر اسی روز سے وہ باقاعدہ آنے لگا۔ روزانہ کی مشقوں اور عام نوعیت کے دوستانہ میچوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے کلب کی بڑی ٹیم کا ایک اہم جزو بن گیا۔" عبدالحبیب نے چند لمحے سوچنے کے بعد بتایا۔

"آپ نے اسے کیسا پایا؟"

"نہ صرف ایک ہونہار اور باصلاحیت کھلاڑی بلکہ وہ ایک ملنسار، خوش اخلاق اور ہر ایک سے پیار کرنے والا نوجوان بھی تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مقبول جیسے شخص کا بھی کوئی جانی دشمن نکلے گا۔" آخر میں وہ حیرت اور تاسف کے ملے جلے تاثرات سے بولا۔

"فٹ بال ایک ایسا کھیل ہے جسے ہر کھلاڑی پورے جوش و جذبے کے ساتھ کھیلتا ہے اور گول روکنے کے لیے کھلاڑی رف کھیل کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں اور اس طرح کوئی کھلاڑی زخمی بھی ہو جاتا ہے۔ شدید زخمی بھی اور ہمیشہ کے لیے معذور بھی ہو جاتا ہے۔ بڑی یا آخری غلطی کی پاداش میں میچ ریفری وارننگ کے لیے یلو کارڈ نہیں لہراتا بلکہ ریڈ کارڈ کی سزا دیتا ہے۔ دونوں لاشوں کے پاس ریڈ کارڈ کی موجودگی کس پیغام یا بات کو ظاہر کر رہی ہے؟" میں نے اصل نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات کا مفہوم سمجھ گیا ہوں۔ جوانی میں، میں بھی فٹ بال کا کھلاڑی ہوا کرتا تھا۔ مجھے فٹ بال کھیل کے تمام قواعد وضوابط اور بنیادی طور طریقے کا علم ہے۔ بعض پوزیشنیں اہم ہوتی ہیں، کھلاڑی کے کندھوں پر حملہ اور دفاع کرنے کی ذمّے داری ہوتی ہے۔ ان سے ایسی حرکتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں جس سے مخالف ٹیم کا کھلاڑی شدید زخمی ہو جاتا ہے یا ہمیشہ کے لیے اس کے جسم میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ جوش کا کھیل ہے، قصداً یا غلطی سے بھی چوٹ لگ جاتی ہے لیکن بعض کھلاڑی بااصول ہوتے ہیں وہ ہمیشہ صاف ستھرے انداز میں کھیل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مقبول کا شمار بھی اس قسم کے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر قبل بھی اسی موضوع پر آپس میں گفتگو کر رہے تھے بلکہ فٹ بال کے حلقوں میں نشست و برخاست اسی موضوع پر ہو رہی ہے اور سراسیمگی سی پھیلی ہوئی ہے۔ کھیل کے دوران معمولی نوعیت کی چوٹیں آنا معمول کی بات ہے۔ مقبول کی وجہ سے کسی کو ایسی غیر معمولی چوٹ نہ آئی کہ وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتا۔" عبدالحبیب نے بتایا۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ وہ سرا جسے میں کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا، اُمید تھی کہ جلد ہاتھ آنے والا ہے۔

"امجد اور مقبول کے درمیان قریبی تعلقات تو نہیں تھے؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"بظاہر تو کسی قسم کے قریبی تعلقات نہیں تھے۔ دونوں کا تعلق فٹ بال کے کھیل سے تھا۔ دونوں کے کلب الگ تھے مگر ہوم گراؤنڈ ایک تھا۔ کھلاڑیوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہونا عام بات ہے مگر وہ نہ آپس میں رشتے دار تھے اور نہ قریبی دوست۔" عبدالحبیب نے جواباً کہا۔

"کوئی اور مقبول کا دوست تھا؟" میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے کھلاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہر ایک کے ساتھ مرحوم کا تعلق دوستانہ تھا۔ کوئی خاص دوست نہیں تھا اس کا۔" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"کسی کے ساتھ بھی اس کا لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے ایک اور سوال کھلاڑی لڑکوں کی طرف داغا۔

"ہر فیلڈ میں معمولی قسم کے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، آپ یقین کریں مقبول معمولی جھگڑوں سے بھی ہمیشہ دور رہتا تھا۔" ایک اور لڑکے نے جواب دیا، اس کے لہجے میں مجھے مقبول کے لیے عقیدت کا جذبہ محسوس ہوا۔

"امجد کس طبیعت کا مالک تھا؟" میں نے پہلے کلب کے صدر عبدالحبیب اور پھر لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بے ضرر قسم کا نوجوان تھا۔" عبدالحبیب مختصراً بولا۔

''پہلا قتل امجد کا ہوا تھا اور اس کے بعد مقبول کا...... دونوں کے قتل میں تعلق کا امکان سو فیصد نظر آتا ہے۔ آپ لوگوں نے حال ہی میں دونوں کو اکیلے دیکھا ہے کہ وہ آپس میں ملے بھی ہوں؟'' میں نے سب کی طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' سب نے بیک آواز ہو کر کہا۔

پولیس کی تفتیش روایتی انداز کی ہوتی ہے، کسی ٹھوس پلاننگ کے بغیر اندھا دھند اور بے قاعدگی سے شروع ہوتی ہے اس لیے تفتیش یا کھوج کی بعض کڑیاں رہ جاتی ہیں اور جو ہاتھ آجاتی ہیں' وہ بھی اکثر الجھی ہوئی اور بے ترتیب ہوتی ہیں اس لیے اکثر قاتل پکڑا نہیں جاتا۔ قاتل کا سراغ ہاتھ لگنے کا زیادہ امکان تب پیدا ہوتا ہے جب تفتیش کار مجرم کے منصوبے کے اختتام پر اپنی تفتیش شروع کرے۔ یہ میرا نظریہ ہے اور میں ہمیشہ اپنے نظریے پر کاربند رہتا ہوں۔ جب ہی تو میں نے امجد کے کلب سے اپنی تفتیش کرنے کے بجائے مقبول کے کلب کا انتخاب کیا تھا۔

''دونوں میں کبھی ان بن دیکھنے کو آئی تھی؟'' میں نے ایک سوال اور داغا۔

کلب کے صدر سمیت تمام کھلاڑیوں کا جواب نفی میں تھا۔

''کسی لڑکی سے مقبول کا معاشقہ چل رہا تھا؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''یہ ہمیں معلوم نہیں۔'' سب نے کہا۔

''اور امجد کا؟'' اس بار بھی سب کا جواب پہلے جیسا تھا۔

''امجد کو راستے میں کوچ کی کال آگئی تھی۔ دوسری صبح اس کی لاش پبلک پارک سے ملی تھی۔ وہ ہنگامی میٹنگ کس امور کی بنیاد پر بلائی گئی تھی؟'' میں نے یہ سوال بھی پوچھا اور اس کے جواب کا بھی مجھے اندازہ تھا۔

''سوری ناصر صاحب، ہم ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت بھی نہیں کرتے اور ایک دوسرے کی سن گن لینے کی کوشش نہیں کرتے تاوقتیکہ خود کوئی کلب اپنے معاملات میں کسی دوسرے کلب کو شامل ہونے کی دعوت نہ دے اور کسی معاملے میں خود مشورہ طلب نہ کرے۔'' عبدالحبیب نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''کان پڑی بات بھی کسی دوسرے کو یا مجھ جیسے غیر متعلقہ آدمی کو بھی نہیں بتا سکتے؟ دو انسان بے رحمی کے ساتھ قتل ہوئے ہیں جو ہونہار فٹ بالر بھی تھے۔'' میں نے لہجہ قدرے کاٹ دار رکھا۔

''ایک بین الصوبائی ٹورنامنٹ میں شرکت کے سلسلے میں کلب کے کوچ، استاد رفیق نے وہ ہنگامی میٹنگ اس دن بلائی تھی تاکہ ٹیم سلیکٹ کی جا سکے۔'' بالآخر عبدالحبیب نے میٹنگ کے حوالے سے بتایا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا اور نشست سے اٹھ گیا۔ چائے سے میری تواضع عبدالحبیب نے باتوں کے دوران کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں امجد کے کلب کے آفس میں موجود تھا۔ آفس میں صرف چار آدمی موجود تھے۔ کلب کے انفارمیشن سیکریٹری، دو کھلاڑی اور اچھی بات یہ تھی کہ استاد رفیق جو کوچ تھا وہ بھی موجود تھا۔ آفس کا اندرونی ماحول ویسا تھا جیسے فٹ بال کلب کے آفسز کا ہوتا ہے۔ مختلف ڈیزائن کی چمکتی دمکتی ٹرافی، شیلڈ اور انعامات سے سجی ہوئی میز و الماری اور دیواروں پر انٹرنیشنل و نیشنل سطح کے فٹ بالروں کے مختلف موومنٹ کی چھوٹی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔

''مقتول امجد کا کیریئر کتنے عرصے پر مشتمل تھا؟'' رسمی علیک سلیک، تعارف و شناخت اور اپنی وجۂ آمد کے بعد میں نے استاد رفیق سے سوال کا آغاز کیا۔

''پہلے میں کسی دوسرے کلب کے لیے کوچ کے فرائض انجام دے رہا تھا جب سے میں اس کلب کا کوچ مقرر ہوا، امجد ایک ذمے دار کھلاڑی کی حیثیت سے کھیل رہا تھا۔ مجھے تین سال کا عرصہ مکمل ہونے والا ہے اس کلب میں...... صحیح اندازہ نہیں کر پا رہا کہ وہ کتنے عرصے سے فٹ بال کھیل رہا تھا۔'' استاد رفیق نے کہا۔

استاد رفیق لگ بھگ سینتیس سال کی عمر کا ایک باریش آدمی تھا۔

''وہ شروع سے آپ کے کلب کے لیے کھیل رہا تھا یا اپنے سفر کا آغاز کسی اور کلب سے کر چکا تھا؟'' میں نے سوالات کا سلسلہ برقرار رکھا۔

''ہاں، یہ تو میرے علم میں ہے کہ امجد نے اپنے کیریئر کی ابتدا ہمارے کلب سے کی تھی اور تادم مرگ ہمارے کلب سے وابستہ رہا۔'' استاد رفیق نے جواباً کہا۔

استاد رفیق کے چہرے پر اور نہ لہجے سے کسی قسم کا خوف و پریشانی ظاہر ہو رہی تھی، وہ بڑے پُرسکون انداز میں میرے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

''دونوں مقتولین فٹ بالر تھے۔ دونوں کی لاش کے پاس آلۂ قتل سمیت ریڈ کارڈ ملے ہیں۔ میچ ریفری پہلی غلطی

پر کھلاڑی کو یلو کارڈ دکھاتا ہے جو ایک قسم کی وارننگ ہوتی ہے اور دوسری بار غلطی پر ریڈ کارڈ دکھا کر فیلڈ سے باہر کرتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہلی غلطی جو بڑی غلطی ثابت ہو، میچ ریفری پلیئر کو یلو کارڈ نہیں کرتا بلکہ براہ راست ریڈ کارڈ کرتا ہے۔ ریڈ کارڈ کا پایا جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ قاتل یا قاتلوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح فٹ بال کے کھیل سے ہے۔ امجد کے رف کھیل سے بھی کسی مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو تو مہلک چوٹ نہیں آئی...... یا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور تو نہیں ہو گیا یا چوٹوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ وہ موت کے منہ میں تو چلا نہیں گیا؟'' میں نے زور دے کر کہا۔

''میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ امجد کی ٹھوکر سے مخالف ٹیم کا کوئی کھلاڑی شدید زخمی ہوا ہے، البتہ گرنا پڑنا، معمولی اور غیر معمولی چوٹیں آنا فٹ بال جیسے کھیل کا حصہ تصور کی جاتی ہیں۔ بالفرض دونوں قتل کی وجہ وہ عوامل ہیں یا ہو سکتے ہیں جن کا خدشہ آپ ظاہر کر رہے ہو تو ایسی غیر منطقی باتوں کی بنیاد پر قتل کرنے والے قاتل کو میں احمق اور بے وقوف انسان سمجھوں گا۔'' استاد رفیق نے آخر میں دلائل سے کہا۔

''دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نارمل عقل سے ہٹ کر فاتر العقل کی طرف بھی نگاہ دوڑاتے ہیں، ہر رونما واردات کو فقط منطق کی نگاہ تک محدود رکھیں تو تفتیش جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔'' میں نے دلائل پیش کیے۔

''کوئی اور کچھ بتا سکتا ہے اس بارے میں؟'' میں نے انفارمیشن سیکریٹری اور کھلاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''امجد شروع سے لے کر آخر تک ہمارے کلب سے وابستہ رہا۔ تقریباً چھ سال سے وہ فٹ بال کے کھیل سے وابستہ رہا اور شروع سے آخر تک میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی وجہ سے کسی کھلاڑی کو ایسی کوئی مہلک گزند پہنچی ہو جس سے وہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہوا ہو۔'' انفارمیشن سیکریٹری جس کا نام راشد تھا بولا۔

''امجد طبعاً کیسا انسان تھا؟'' میں نے سوالات کا سلسلہ برقرار رکھا۔

''اچھا لڑکا تھا...... فٹ بال کے کھیل سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا، پھر نجانے......'' راشد کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں قدرے چونک اٹھا۔

''مرے ہوئے شخص کے بارے میں اب ایسا کچھ کہنا مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' راشد نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''قاتل تک پہنچنے کے لیے مقتول کے بارے میں تفتیش کار کا سچ جاننا لازمی ہے۔ اب اخلاق کا تقاضا بھی ہے کہ آپ باقی الفاظ بھی اپنے لب پر لے آئیں۔ ہم تفتیش کار معالجوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہمارا پورا سچ جان لینا لازمی ہے ورنہ کام میں رخنہ اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ مقتول امجد کے متعلق یہ بات صرف آپ تک محدود ہے تو آپ مجھے تنہائی میں بھی بتا سکتے ہو۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''پورے کلب کو معلوم ہے۔'' راشد گویا ہوا۔ ''وہ ایک بہترین اسپورٹس مین تھا۔ ڈسپلن کا سختی سے پابند اور ہر طرح سے اپنی فٹنس اور صحت کا خیال رکھنے والا کھلاڑی تھا، پھر نہ جانے اسے شراب اور پھر چرس کی لت کہاں سے پڑ گئی۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو سال کے عرصے تک نشے کی لت میں مبتلا رہا۔ اس کی صلاحیتیں اور داؤ پیچ اپنی جگہ برقرار تھے مگر اس کی جسمانی قوت اسے سپورٹ کرنے سے معذوری ظاہر کرنے لگی۔ اس کا کھیل کافی متاثر ہوا۔ امجد کا اسٹیمنا نشے نے کمزور کر دیا تھا۔ پہلے ہاف کے بعد ہم اسے فیلڈ سے باہر بٹھاتے تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کھلاڑی کو فیلڈ میں داخل کرتے تھے لیکن اپنی موت سے تقریباً ایک ماہ قبل امجد نے نشہ بالکل ترک کر دیا تھا اور جس انداز کا کھیل اس کی پہچان تھی، وہ دوبارہ آہستہ آہستہ اپنے فارم میں آنا شروع ہو گیا اور آخری چند دنوں میں وہ پوری طرح بھرپور کھیل پیش کرنے لگا۔''

''آپ لوگوں نے ٹوکا ہو گا اس لیے امجد نے نشہ ترک کیا ہو گا؟'' میں نے کہا۔

''ہم لوگوں نے اسے کافی سمجھایا بجھایا پھر بھی اس نے نشے سے جان نہ چھڑائی۔ اچانک ایک دن اس نے اعلان کیا کہ وہ اب کبھی نشہ نہیں کرے گا۔ واقعی وہ نشے کو ترک کر چکا تھا۔'' اس دفعہ استاد رفیق نے کہا۔

''شاید وہ روبینہ کی بات مان گیا تھا۔'' راشد بولا۔ اب وہ کھل کر باتیں کر رہے تھے۔

''روبینہ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''امجد کی کلاس فیلو...... یا یوں سمجھیں کہ گرل فرینڈ۔'' راشد بھویں اچکاتے ہوئے بولا۔

امجد ظہیر اور مقبول دو مختلف کالج میں زیر تعلیم تھے مگر دونوں کالج ایک دوسرے کے تقریباً قریب قریب تھے،

اس بارے میں اے ایس پی وجاہت نے بتایا تھا۔ میں نے روبینہ کے متعلق جاننا چاہا اور رہائش گاہ کا ایڈریس طلب کیا تو جواب نفی میں ملا۔ وہ بس اتنی آگاہی رکھتے تھے کہ روبینہ، امجد کی کلاس فیلو اور گرل فرینڈ تھی، کہاں رہتی ہے یہ علم نہیں تھا۔

''امجد کو آخری کال آپ نے کی تھی، تین بجے کے وقت؟'' میں نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹورنامنٹ میں حصہ لینے کے لیے ٹیم سلیکٹ کرنے کی غرض سے میں نے ہنگامی میٹنگ طلب کرلی تھی۔ کلب کے تمام کھلاڑیوں کو میں نے کال کی تھی۔ یہاں جتنے بھی کلب ہیں، ٹورنامنٹ کمیٹی والوں نے تاخیر سے سب کو دعوت نامہ بھیجا تھا، کسی اور کلب نے ٹورنامنٹ میں شرکت کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ سب تاخیر سے دعوت نامے بھیجنے کی وجہ سے خفا تھے۔ ہم نے ٹورنامنٹ میں شرکت کا فیصلہ کرلیا لیکن تیاری کے لیے وقت کم تھا۔ میں نے کلب کے صدر کی ہدایت پر ٹیم سلیکٹ کرنے کی غرض سے میٹنگ طلب کرلی۔ دونوں کھلاڑیوں کے قتل کے بعد سوگواری کی فضا چھا گئی۔ ٹورنامنٹ میں شرکت کرنے کا جواز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ نہ صرف سوگواری بلکہ کھلاڑی خوف کی کیفیت میں بھی مبتلا ہیں۔'' رفیق نے تفصیل بتائی۔

گو کہ قتل کی یہ دونوں وارداتیں ایک ہی وقت میں ایک جگہ پر رونما نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے یہ دو مختلف قسم کے کیس نہیں تھے بلکہ ایک کیس تھا اور اس کیس میں مجھے ایک نیا کردار روبینہ کا ہاتھ آگیا تھا۔ اس سے ملاقات کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ کالج میں مل سکتی تھی۔ صبح کی شفٹ کی اسٹوڈنٹ تھی۔

☆☆☆

روبینہ کا نام سامنے نہ آتا تب بھی میرا کالج کا چکر لگانے کا ارادہ تھا۔ کسی بھی مقتول کے متعلق اس کے والدین اور رشتے داروں سے اس قدر معلومات حاصل نہیں ہوتیں جتنی معلومات اس کے دوستوں اور ساتھیوں سے مل جاتی ہیں۔ میں ہمیشہ کسی بھی مقتول کے اہل خانہ کو آخر میں رکھتا ہوں۔ تاکہ وقت کا زیاں کم ہو اور تفتیش بھی سہل ہو۔ میں اس وقت کالج کے پرنسپل کے آفس میں موجود تھا۔

''پری میڈیکل سال دوم کی کلاس سے اسٹوڈنٹ روبینہ کو میرے آفس میں بھجوانا۔'' پرنسپل نے فون پر کہنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''میرے خیال میں امجد کو چرس اور شراب جیسے نشے کی لت کالج سے پڑی ہوگی؟'' میں نے پرنسپل کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ضروری نہیں کہ کالج سے لت پڑ گئی ہو۔'' پرنسپل میری بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ قدرے ناگواری سے بولا۔

''پڑھائی کے حوالے سے کیسا تھا؟'' میں نے بات ٹالنے کی نیت سے سوال کرڈالا کیونکہ مجھے مرڈر کی تفتیش کرنا تھی نہ کہ ڈرگ کے متعلق چھان بین کرنے آیا تھا۔ ویسے بھی میں ہمیشہ پیچیدہ قتل کے کیس میں کام کرتا تھا، ڈرگ جیسے کیس پر کام کرنے میں مجھے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ تجربہ تھا۔

''بہتر تھا۔'' پرنسپل مختصراً بولا۔

کالج میں زیادہ تر امیر گھرانوں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ تھوڑی دیر بعد آفس کا دروازہ کھلا اور خوب صورت نقوش اور چھریرے بدن والی ایک لڑکی اندر داخل ہوئی جس کا چہرہ اس وقت مرجھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے رات کو دونوں مقتولین کے سوشل میڈیا پیجز سرچ کیے تھے مگر چند ایک عام پوسٹ اور پک کے سوا باقی پروفائل کھل نہ سکا جو میرے مطلب کے نہ تھے۔ اس لیے روبینہ کا چہرہ میرے لیے نیا تھا۔

''جی سر؟'' وہ ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد پرنسپل کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔

''یہ ناصر خان صاحب ہیں...... ایک پرائیویٹ سراغ رساں۔ امجد اور مقبول کے قتل کی تفتیش کی ذمے داری پولیس نے انہیں سونپی ہے۔ اس وقت امجد کے بارے میں آپ سے معلومات کرنے تشریف لائے ہیں۔'' پرنسپل نے نرم لہجے میں میرا تعارف کرایا اور روبینہ کو میری وجہِ آمد کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر روبینہ کے چہرے پر خوف وشرم کے ملے جلے تاثرات جھلکنے لگے۔

''بیٹی...... ناصر صاحب سے تعاون کرنا۔ شاید آپ کی معلومات کی روشنی میں ناصر صاحب، امجد کے قاتل تک پہنچ سکیں۔ اگر ایک مقتول کا قاتل دھرلیا گیا تو سمجھو دونوں مقتولین کے قاتل ہاتھ آگئے۔'' پرنسپل نے جب روبینہ کے چہرے سے اندرونی کیفیت کا اندازہ لگایا تو بڑے شفیقانہ انداز میں مخاطب کیا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی ناصر صاحب۔'' روبینہ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''چلیں بیٹی...... کالج کے پارک میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ آپ سے مل کر مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپ مجھے انکل کہہ سکتی ہو۔

میں نے نشست سے اٹھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

یہ سن کر روبینہ کے چہرے پر خوف و شرم کی جگہ اطمینان اور اعتماد نے لے لی۔

☆☆☆

دور کلاسیں جاری تھیں۔ پارک میں خاموشی طاری تھی۔ کسی پیڑ پر کسی پنچھی کی چہچہاہٹ کبھی کبھار سکوت میں میٹھے ارتعاش کا رنگ بکھیرتی اور پھر معدوم ہو جاتی۔ ہم دونوں ایک پیڑ کے گھنے سائے تلے بچھی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

”آپ کب سے امجد کو جانتی ہو؟“ میں نے آغاز کیا۔

”ہم دونوں نے اکٹھے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا...... اس دن سے انکل۔“ روبینہ نے بتایا۔

”آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی بیٹی؟“ میں نے کہا۔

”جس دن لاش برآمد ہوئی تھی، اس سے ایک دن قبل، کالج میں ملاقات ہوئی تھی۔“ روبینہ بولی۔

”نشے کی لت اسے کیسے لاحق ہوگئی تھی اور اچانک ایک دن اس نے دونوں نشے کیسے ترک کیے؟“ میں نے سوال جاری رکھا۔

”پہلے تو مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ نشہ کر رہا ہے پھر ایک کلاس فیلو لڑکے نے یہ بات بتائی کہ امجد نہ صرف شراب پیتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ چرس کا استعمال بھی کر رہا ہے۔ میں نے جب امجد سے یہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر میں اس کی ٹوہ میں لگی رہی تو ایک دن وہ پکڑا گیا، رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ میں نے بارہا اسے شراب اور چرس چھوڑنے کے لیے کہا اور تعلقات توڑنے کی بھی دھمکی دی۔ کئی کئی دن تک امجد سے بات تک نہ کی۔ اس کی فون کال تک بھی کاٹتی رہی لیکن اس کے باوجود وہ نشے سے اپنی جان نہ چھڑا سکا۔ انکل! مجھے امجد سے بے پناہ محبت تھی اور محبت ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے، میں خود کو روک نہیں سکی اور ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اسے پختہ یقین تھا کہ میں کسی بھی حالت میں اس سے زیادہ دن قطع تعلق نہیں کر سکتی اور نہ اسے جیتے جی چھوڑ سکتی ہوں، اس لیے وہ میرے سامنے بھی نشے کا استعمال کرنے لگا۔“

”پھر اس نے اچانک نشہ کرنا کس طرح ترک کر دیا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”ایک حادثے کے بعد......“ روبینہ نے گردن اٹھا کر چند لمبے گھنے پیڑ کو پُر خیال نگاہوں سے دیکھا پھر نگاہیں زمین پر گاڑتے ہوئے ایک لمبی سانس خارج کی۔

”اکثر یہ دیکھا ہے کہ کسی حادثے کی وجہ سے لوگ نشے میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، یہ کیسا حادثہ تھا جو نشے کو ترک کرنے کا موجب ثابت ہوا؟“

”دراصل نشہ ہی حادثے کا موجب ثابت ہوا۔ امجد ایک حساس طبیعت کا مالک تھا مگر نشے کی حالت میں وہ بے حس بھی ہو جاتا تھا۔ بالخصوص شراب کے نشے کی حالت میں اس کی گویا فطرت بدل جاتی تھی، لیکن حادثے نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔“ روبینہ نے کہا۔

”کیسا حادثہ تھا؟ کب، کہاں اور کیسے رونما ہوا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”تقریباً موت سے ایک ماہ قبل۔“ روبینہ خاموش ہو گئی۔

”ہاں بیٹی بتاؤ، حادثہ کیسے پیش آیا؟“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”تفصیل سے بتاؤ۔“

”وہ منگل کا دن تھا۔“ روبینہ گویا ہوئی۔ ”ہم دونوں کسی نہ کسی طرح کالج سے جلدی نکل پڑے۔ ہمارا گھومنے پھرنے اور شاپنگ کا پروگرام تھا۔ امجد کے پاس موٹر سائیکل تھی ہم اس پر بیٹھ کر رینٹ اے کار سینٹر پہنچ گئے، رینٹ اے کار والے عملے سے امجد کی اچھی خاصی واقفیت تھی اور وہ اکثر وہاں سے کار رینٹ پر حاصل کیا کرتا تھا۔ موٹر سائیکل امجد نے حسبِ دستور رینٹ اے کار سینٹر چھوڑی اور رینٹ پر ایک بہتر کنڈیشن کی کار حاصل کی۔ مختلف شاپنگ مال پر شاپنگ کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے کرتے شام کے چار بج گئے۔ لنچ کے بعد ہم گھومنے پھرنے کلفٹن کی طرف نکل گئے۔ ساحلِ سمندر پر چہل قدمی اور گھونگھے اور سیپیاں چن کر جمع کرتے ہوئے وقت بیتنے کا احساس تک نہ ہوا۔ شام ڈھل رہی تھی، سورج مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ہم لوگ ساحل سے نکل پڑے۔ امجد کو حسبِ معمول اس وقت نشے کی طلب ہو رہی تھی، راستے میں اس نے کہیں سے ایک شراب کی بوتل خرید لی۔ ہم آبادی سے دور شہر کے ایک ایسے مضافاتی علاقے میں آگئے جہاں آس پاس غریب ترین افراد اور گداگروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ امجد نے کار اونچی اور ہموار جگہ پر روکی اور اپنی طرف والا دروازہ کھولنے کے بعد شراب پینے میں مصروف ہوگیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ابھی تاریکی نہیں تھی کہ کچھ نظر آنا ناممکن ہو۔ جہاں

کار کھڑی تھی وہاں دائیں طرف اترائی تھی اور نیچے بڑے بڑے پتھروں کی بھرمار تھی۔ بائیں طرف کچی پکی قسم کی برائے نام سڑک تھی جس پر چل کر ہم بلند جگہ پر آ کر رک گئے۔ میں فرنٹ سیٹ پر تھی اور امجد اسٹیئرنگ پر موجود پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ نشہ تیزی کے ساتھ اس کے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ ''یہ دنیا کتنی خوب خوب صورت ہے ناں۔'' وہ شراب کے سُرور میں بولا تھا۔ اس کا موڈ بن رہا تھا پھر اچانک عین اسی وقت ایک صدا لہرائی۔ ''صاحب خیرات دو۔'' وہ سات آٹھ سال کا ایک میلا کچیلا بچہ تھا جو کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑا امجد سے مخاطب تھا۔ امجد اچانک کی مداخلت چونک اٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ امجد کو بے جا...... مداخلت ناگوار گزر رہی تھی۔ اس نے عجلت میں اپنی جیب ٹٹول کر دس روپے کا نوٹ نکال کر لڑکے کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''میڈم! آپ بھی!'' لڑکے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب جاتے ہو کہ نہیں۔'' امجد نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کا موڈ آف ہو رہا تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی آنکھیں پہلے ہی سرخ تھیں اب طیش کی وجہ سے اس کی آنکھیں انگارے کی طرح دہکنے لگیں۔ میں نے پرس سے دس کا نوٹ نکال کر بچے کی طرف بڑھایا۔ شراب شیطان کی طرح امجد کے اعصاب پر حاوی ہو چکی تھی۔

''تم لوگ کسی بھی جگہ انسان کو آرام سے رہنے دیتے نہیں۔'' امجد طیش کے عالم میں بولا اور......''

''اور پھر کیا ہوا؟'' چند لمحوں تک کی خاموشی کے بعد میں نے روبینہ سے استفسار کیا۔

''جو نہیں ہونا چاہیے تھا...... وہی ہوا۔'' روبینہ نے اپنی آنکھیں موند کر ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''امجد نے ایک زور کا ہاتھ اس معصوم بچے کے سینے پر جڑ دیا۔ وہ بے چارہ بھوک کی وجہ سے پہلے ہی کمزور اور ناتواں تھا...... ہاتھ کی شدید ضرب کھانے کے بعد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب اترائی میں گرتا چلا گیا جہاں نیچے بڑے بڑے پتھر موجود تھے۔'' روبینہ نے روتے ہوئے ہچکیوں میں بتایا۔

''بہت افسوس کی بات ہے...... بہرحال آپ ضبط کا دامن تھامے رکھیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے امجد کو ڈانٹا کہ یہ تم نے کیا کیا۔'' روبینہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

''ارے ظالمو! تم نے میرے بچے کو مار ڈالا۔'' اچانک سناٹے میں بائیں طرف سے ایک آواز لہراتی ہوئی آئی۔ ہم نے دیکھا کہ کوئی آدمی جھونپڑیوں کی طرف سے دوڑتا ہوا کار کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا فاصلہ کار سے خاصا تھا، خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ تاخیر ہو گئی تو جھونپڑیوں کی پوری آبادی کا کار پر امڈ آنے کا امکان یقینی تھا۔ امجد نے بھی نشے کے عالم میں خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔

''اب نکل بھی چلو یہاں سے۔'' میں نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ امجد نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم وہاں سے بروقت نکل گئے۔''

''آپ لوگوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ لڑکا مر گیا ہے؟'' میں تفصیل ایک بک میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

''وہاں گرنے کے بعد کسی انسان کا زندہ بچ جانا محال تھا اور ہمیں میڈیا کے ذریعے علم ہوا کہ وہ بچہ مر چکا ہے۔'' روبینہ یاسیت زدہ لہجے میں بولی۔

دوہرے قتل کے کیس کا ایک انتہائی اہم پہلو میرے سامنے آ گیا تھا، جس پر غور کرنا باقی تھا۔

''اس سانحے کے بعد امجد ہمہ وقت رنجیدہ اور افسردہ رہنے لگا۔ وہ احساسِ جرم تلے بُری طرح دب چکا تھا۔ میں نے بارہا اسے سمجھانے کی کوشش کی اور سب کچھ فراموش کرنے پر زور دیا مگر اس کے اعصاب پر وہ سانحہ سوار ہو چکا تھا۔ اس کے دل کی دنیا گویا بدل چکی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ سارا قصور تمہارا نہیں تمہاری اس لت کا ہے جس نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود کی تھیں۔ اس واقعے کے بعد اسے نشے سے نفرت ہو گئی تھی، پھر ایک دن اس نے اپنی اس بری لت سے جان چھڑا لی۔'' روبینہ بولی۔

''نشہ ترک کرنے کے بعد وہ نارمل ہو گیا تھا؟'' میں بولا۔

''کسی حد تک وہ پُرسکون نظر آنے لگا تھا۔'' روبینہ جواباً بولی۔

''اس واقعے کا ذکر آپ لوگوں نے کسی اور کے ساتھ شیئر کیا؟''

''نہیں انکل...... صرف اپنے تک محدود رکھا تھا۔'' روبینہ نفی میں بولی۔

''شاید امجد نے کسی اور سے تذکرہ کیا ہو جو آپ کے علم میں نہ ہو۔''

''بہت مشکل ہے...... وہ رازداری کے معاملے میں مضبوط انسان تھا۔'' روبینہ نے کہا۔
''امجد اور مقبول کو کبھی اکٹھے دیکھا ہے؟ یعنی دونوں کسی موضوع یا معاملے پر گفتگو کررہے ہوں؟''
''دونوں فٹ بال کے کھیل سے وابستہ تھے۔ کھیل کے موضوع پر میں نے دونوں کو کئی بار گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' روبینہ نے بتایا۔
''یعنی آپ بھی وہاں آس پاس موجود ہوتی تھیں؟''
''کبھی آس پاس اور کبھی اتنے فاصلے پر کہ ان کی آوازیں کانوں تک پڑسکتی تھیں۔'' روبینہ بولی۔
''مقبول کو آپ دونوں کے تعلقات کا یقیناً علم ہوا ہوگا؟'' میں نے لہجے کو معنی خیز رکھا۔
''ظاہری بات ہے۔'' روبینہ اثبات میں آہستگی سے بولی۔
''امجد کے مقبول کے بارے میں کیا تاثرات تھے؟'' میرے لاشعور میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔
''بہت اچھے تاثرات نہیں تھے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ مقبول کو مجھ سے جلن ہے۔ شاندار کھیل کے ساتھ جلن کی ایک وجہ تم ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ دراصل مقبول کی آنکھوں میں، میں نے ہمیشہ اپنے لیے پسندیدگی دیکھی تھی۔ وہ قریب کے کالج میں پڑھتا تھا اور چھٹی کے بعد میری راہوں پر کبھی کبھار کھڑا رہتا تھا لیکن ایک آنکھ بھی مجھے نہیں بھاتا تھا۔''
''سانحے کے بعد بھی کبھی دونوں کو باتیں کرتا دیکھا؟''
''نہیں انکل۔'' وہ نفی میں بولی۔
''بہت بہت شکریہ بیٹی...... آپ کی ضرورت پیش آئی تو آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔'' چند مزید ضروری باتوں کے بعد میں نے روبینہ کا سیل نمبر اپنے فون میں محفوظ کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے کہا اور ساتھ میں روبینہ بھی اٹھ گئی۔

☆☆☆

اے ایس پی وجاہت مجھ سے برابر رابطے میں تھا جس نے اب تک کی تحقیقات کے حوالے سے مجھے فی الحال پوری طرح آگاہ نہیں کیا تھا، صرف سرسری انداز میں بتایا تھا کہ میں کامیاب جارہا ہوں آپ اطمینان رکھیں۔ روبینہ کی زبانی ایک نئی بات یہ بھی سامنے آئی تھی کہ ان کی ایک اور بھی پسند مشترک تھی جو خود روبینہ تھی۔ اب سوال میرے سامنے یہ کھڑا تھا کہ اپنی تحقیقات کو کس انداز میں اور کس سمت سے آگے بڑھاؤں؟ کیا مجھے جھونپڑ بستی سے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھانا چاہیے جہاں حادثہ پیش آیا تھا؟ بالفرض دونوں قتل کا تعلق بچے کے قتل سے تھا تو قاتل کس طرح امجد تک پہنچنے میں کامیاب ہوا اور پھر اس نے مقبول کو کیوں قتل کیا؟ لفظ ''کیوں؟'' میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح لگاتار برستا رہا پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ میں نے فوراً روبینہ کا نمبر ملایا۔
''مجھے رینٹ اے کار سینٹر کا ایڈریس نوٹ کرائیں!'' رابطہ قائم ہوتے ہی رسمی دعا سلام کے بعد میں نے کہا۔
تھوڑی دیر بعد ایڈریس میرے سامنے میز پر موجود پیڈ پر درج تھا۔ روبینہ سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے عاصم شکیل کا نمبر ملایا جو ایک کرائم رپورٹر تھا۔ اس کا شمار میرے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا اور اتفاق سے وہ علاقہ بھی اس کی رپورٹنگ اسٹیشن میں آتا تھا جہاں نشے کی حالت میں امجد کے ہاتھوں لڑکے کا قتل ہوا تھا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی علیک سلیک کے فوراً بعد میں نے تاریخ، علاقہ اور لڑکے کی موت کا حوالہ دیتے ہوئے اخباری تراشہ بھیجنے کو کہا اور عاصم شکیل نے ایک گھنٹے کی مہلت مجھ سے مانگی۔ اس کے علاوہ میں نے اس حوالے سے مزید کوئی ذکر نہیں کیا اور صرف اوکے کہنے کے بعد رابطہ منقطع کرلیا۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد اسمارٹ فون کی میسج ٹون بج اٹھی۔ واٹس ایپ نوٹیفکیشن تھی جسے کھول کر دیکھا تو اخباری خبر کے ساتھ ایک نو دس سالہ لڑکے کی خون میں لت پت لاش کی تصویر بھی تھی۔ اخباری تراشہ عاصم شکیل نے سینڈ کیا تھا۔ میں نے اخباری تراشہ انلارج کیا اور خبر پڑھنے لگا۔ عام نوعیت کی واردات کی خبر سے کچھ مختلف خبر تھی جس میں مقتول لڑکا جس کا نام پرویز تھا اس کے والد امیر حسین کا بیان تھا کہ ایک سفید رنگ کی کار والے شخص نے اس کے بیٹے کو دھکا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ نیچے بڑے بڑے پتھروں پر جاگرا تھا اور اس کی موقع پر موت واقع ہوگئی تھی۔ دھکا دینے کے فوراً بعد سفید رنگ کی کار وہاں سے چلی گئی تھی۔ کار میں ایک نوجوان لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ پانچ چھ لائن پر مشتمل مختصر خبر تھی اور اس میں خاص بات یہ تھی کہ مقتول کا والد عینی گواہ تھا مگر قاتل کی ایسی کوئی اہم نشانی کا ذکر نہیں تھا جسے ڈھونڈ نکالنا آسان ہوتا۔ میں نے ایک دفعہ پھر عاصم شکیل کا نمبر ڈائل کیا۔ ''یہ خبر آپ نے خود براہ راست رپورٹ کی ہے؟''
''نہیں...... میرے اسٹاف کے ایک رپورٹر نے کی

ہے۔" میرے سوال پر اس نے جواباً کہا۔

"مجھے پرویز کے والد امیر حسین کی ایک تصویر درکار ہے۔" میں نے کہا کیونکہ خبر کے ساتھ امیر حسین کی کوئی تصویر نہیں تھی۔

"میں رپورٹر سے معلوم کروں گا۔ شاید اس نے کوئی تصویر یا ویڈیو بنائی ہو اور کہیں اور سے بھی شاید مل جائے۔" عاصم شکیل کی آواز آئی۔

"قد کاٹھ اور حلیے کے بارے میں بھی معلومات کافی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"جی میں تھوڑی دیر بعد آپ کو کال کروں گا۔" وہ بولا۔

میرے تمام دوست واحباب میری اس عادت سے بخوبی واقف تھے کہ میں خاص طور پر کام کے دوران کسی بھی قسم کا سوال پسند نہیں کرتا تھا اور کام کو منطقی انجام تک پہنچانے کے بعد جو نتائج سامنے آتے تھے، وہ خود بخود ان کے تمام سوالات کا جواب ہوتے تھے۔ فطری تجسس کے باوجود بھی وہ مجھ سے سوال کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ یہی حال عاصم شکیل کا بھی تھا۔ اس کے لہجے میں بھی تجسس کا عنصر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ خاموشی کے ایک لمحے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہوا۔

تھوڑی دیر بعد عاصم شکیل کی کال آئی۔ "تصویر تو نہیں ملی۔ آپ حلیہ نوٹ کریں۔" پھر وہ مقتول پرویز کے والد امیر حسین کا حلیہ بیان کرنے لگا۔

☆☆☆

رینٹ اے کار سینٹر کا شمار شہر کے بڑے اور معروف سینٹرز میں ہوتا تھا۔ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ میں اس وقت ایک نوجوان آفس کلرک کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اپنا تعارف کرانے اور آمد کی وجہ بتانے کے بعد میں نے اسے آفس کا دروازہ لاک کرنے کا حکم دیا تاکہ اور کوئی ہمارے درمیان مخل نہ ہو۔

"امجد ظہیر اکثر آپ کے ہاں سے کار رینٹ پر حاصل کرتا تھا؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں سر...... اب وہ کافی دنوں سے نظر نہیں آرہا ہے۔" میں نے اسے اب تک یہ نہیں بتایا تھا کہ میں امجد کے قتل کے سلسلے میں آیا ہوں محض یہ بتایا تھا کہ ایک کیس کے متعلق چھان بین کرنے آیا ہوں۔

"دراصل میں امجد کے قتل کے سلسلے میں آپ سے چھان بین کرنے آیا ہوں۔" میں نے واضح کر دیا۔

...ہمہ آفتاب است

تین امریکی دوست برسوں کے بعد ایک ہوٹل میں یکجا ہوئے اور پُرجوش انداز میں ماضی کی خوشگوار یادیں تازہ کرنے لگے۔

اس دوران میں ایک اٹھ کر واش روم گیا تو باقی دونوں نے اپنے بچوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

ایک نے بتایا کہ اس کا بڑا بیٹا نیویارک کا مشہور آرکیٹکٹ ہے۔ بے حساب کماتا ہے... حد یہ ہے کہ ایک ہفتے قبل اس کے کسی عزیز دوست کی سالگرہ تھی تو اس نے تحفے میں اسے دو نشستوں والا سیاحتی جہاز دیا تھا۔

دوسرے کا بیٹا کامیاب ترین ڈاکٹر تھا۔ اس نے فخر سے بتایا کہ اس کے بیٹے نے بھی پچھلے ہفتے اپنے ایک قریبی دوست کو اس کی سالگرہ پر سب سے مہنگی مرسیڈیز کا تحفہ دیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ تیسرا بھی لوٹ آیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا کیا کر رہا ہے۔

"بس ٹھیک ہے..." اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا۔ "اس میں ایک بڑی خرابی ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں سے دور بھاگتا ہے... مردوں میں خوش رہتا ہے۔"

ان دونوں نے بیک وقت تحیر زدہ آوازوں میں اس سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو بڑی مفلسی کے دن گزار رہا ہوگا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی سالگرہ تھی تو اس کے ایک دوست نے اسے نئے ماڈل کی مرسیڈیز کار اور دوسرے نے دو نشستوں والا تفریحی جہاز تحفے میں دیا تھا... وہ اپنے باحیثیت دوستوں میں بہت مقبول ہے۔"

سحرش افضل، رتیڑہ

''او...... تو...... کب قتل ہوا اس کا؟'' وہ ایک جھٹکے کے ساتھ تاسف بھرے انداز میں بولا۔

''آخری مرتبہ مقتول نے کب کار حاصل کی تھی؟'' میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ اپنے سامنے ٹیبل پر موجود ایک موٹا رجسٹر کھول کر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

''یہ دیکھیں سر۔'' اس نے میری طرف رجسٹر گھماتے اور ایک خانے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا مگر یہ تو وہ تاریخ نہیں تھی جس دن امجد کے ہاتھوں واقعہ رونما ہوا تھا بلکہ چند دن بعد کی ایک تاریخ تھی۔

''اس تاریخ سے پہلے؟'' میں نے کہا پھر اس نے صفحہ پلٹ کے ایک خانے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ رہا سر۔'' یہ وہی تاریخ اور ٹائم تھا جو روبینہ نے مجھے نوٹ کرائی تھی۔

''اس تاریخ کو امجد نے جو کار حاصل کی تھی' وہ کس رنگ کی تھی؟'' میں نے صفحے پر درج تاریخ اور دن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں امجد کے نام کے سامنے اس کے ضروری کوائف کے ساتھ کار کی لائسنس پلیٹ نمبر اور روانگی کا وقت بھی درج تھا۔

''سفید رنگ کی۔'' آفس کلرک بولا۔

''اس کے ساتھ کون تھا اس دن؟''

''ایک کلاس فیلو لڑکی۔''

''اس دن کے بعد بھی کوئی شخص امجد یا سفید کلر کی کار کے متعلق پوچھنے کے لیے آپ کے یہاں آیا تھا؟'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''نہیں سر...... میرے پاس تو اس غرض سے کوئی آدمی نہیں آیا۔ البتہ مذکورہ کار کے متعلق کسی نے ضرور پوچھا تھا، جس کا علم مجھے کرائے پر کار حاصل کرنے والے ایک لڑکے کی زبانی ہوا۔'' آفس کلرک نے کہا اور یہ سن کر میں اپنی نشست پر گویا اچھل کے رہ گیا۔

''کیا معلوم کرنا چاہتا تھا وہ آدمی لڑکے سے؟'' میں فوراً بولا۔

''ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ لڑکا گھبرایا ہوا واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت پھنستے پھنستے رہ گیا تھا جب ایک آدمی پاگلوں کے مانند دوڑا چلا آیا اور دوسرے لمحے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا تھا، 'اس دن تم میرے بیٹے کو مارنے کے بعد نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر آج تم کہیں نہیں بھاگ سکتے۔ میں سفید رنگ کی اس کار کو اچھی طرح پہچان سکتا ہوں جس کی ڈکی پر ڈینٹ کا نشان میرے ذہن میں محفوظ ہے......' لڑکے کا کہنا تھا وہ بڑی مشکلوں کے بعد اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوا تھا کہ دراصل وہ کار کی شناخت کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے، جو کرائے پر حاصل کی ہوئی کار ہے، اس کی اپنی ذاتی نہیں ہے، آج میرے پاس ہے کل کسی اور کے پاس بھی یہ کار ہو سکتی ہے اور میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں، اس طرح وہ لڑکا گلوخلاصی میں کامیاب ہوا۔ بقول لڑکے کے جہاں اس نے کار پارک کی تھی وہاں چہل پہل نہیں تھی اور سکوت و خاموشی تھی۔'' آفس کلرک بولا۔

''آپ مجھ سے اب ظاہری بات چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں ناگواری سے بولا۔

''نہیں سر...... میرے علم میں جو ہے' وہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ سکون سے بولا۔

''اس آدمی نے لڑکے کو مفت میں تو نہیں چھوڑا ہوگا ناں...... کوئی ایسا ثبوت یقیناً پیش کیا ہوگا جس سے اس کی بات کی تصدیق ہوئی ہوگی کہ واقعی کار اس نے کرائے پر حاصل کی ہوئی ہے۔ تب جا کر وہ آدمی لڑکے کی صفائی پر مطمئن ہوا ہوگا اور لڑکے کی معلومات کی روشنی میں وہ ضرور یہاں تک بھی آیا ہوگا۔'' ایک دفعہ پھر میں ناگوار لہجے میں بولا۔

''دراصل میں دو دن کی چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آیا ہو۔'' آفس کلرک نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سوچتے ہوئے کہا۔

''اس آدمی نے لڑکے کو یہ بھی ضرور بتایا ہوگا کہ اس نامعلوم شخص نے کب اس کے بیٹے کو مارا تھا؟ جسے اس کی تلاش تھی؟'' میں نے کہا۔

''لیکن لڑکے نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔'' وہ میری بات کا اصل مفہوم سمجھ گیا تھا لیکن اس کی ڈھٹائی اپنی جگہ برقرار تھی۔ مجھے پوری طرح یقین تھا کہ وہ آدمی یہاں ضرور آیا ہوگا اور آفس کلرک سے اس کی ملاقات یقیناً ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ امجد تک کیسے پہنچا ہوگا۔

''لڑکے نے اس کے حلیے بشرے کے بارے میں آپ کو ضرور بتایا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''درمیانے قد کاٹھ کا تھا۔ نچلی کلاس کا فرد نظر آرہا تھا۔ لڑکے نے اس قدر مجھے بتایا تھا۔'' آفس کلرک بولا۔

''لڑکے کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ کہاں ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ جواباً آفس کلرک نے ایک ایسی جگہ کا نام

بتایا جو شہر کے اس مضافاتی علاقے کے آس پاس واقع تھی جہاں امجد کے ہاتھوں دلخراش حادثہ سرزد ہوا تھا۔

''لڑکے نے کار کرائے پر کب حاصل کی تھی؟''

میرے سوال پر آفس کلرک ایک دفعہ پھر وہ ضخیم ریکارڈ رجسٹر کھول کر اوراق پلٹنے میں مصروف ہو گیا جس میں کرائے پر کار حاصل کرنے والے افراد کے نام مع دن تاریخ وغیرہ کے درج تھے۔

''یہ دیکھ لیں سر۔'' آفس کلرک نے رجسٹر کا رخ میری طرف گھماتے ہوئے کہا۔

''اوہ......'' جب میری نگاہیں آفس کلرک کی انگلی کے اشارے پر پڑیں تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ پچیس دن قبل کی ایک تاریخ تھی لیکن نام کے خانے میں مقبول راشد درج تھا۔

☆☆☆

''مقبول جو فٹ بالر تھا؟'' میں نے تصدیق کے لیے جاننا چاہا کیونکہ اتنے بڑے شہر میں مقبول نام کے افراد کثرت سے ہوں گے۔

''جی سر...... مگر ''تھا'' سے مراد؟'' آفس کلرک آخر میں حیرت سے بولا۔

''اب یہ بھی امجد کی طرح دنیا میں نہیں رہا۔ اس کا بھی قتل ہوا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''سن کر افسوس ہوا۔ امجد کی طرح مقبول کا شمار بھی ہمارے مستقل صارفین میں ہوا کرتا تھا۔'' آفس کلرک تاسف بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

''دونوں فٹ بالر تھے۔ دونوں کا قتل ایک جیسے انداز میں ہوا۔ دونوں کا شمار آپ کے بہترین صارفین میں ہوا کرتا تھا اور دونوں کی پسند کی کار بھی ایک تھی۔ کافی مشابہت پائی جاتی ہے دونوں مقتولین کی پسند اور قسمت میں۔'' میں آخر میں معنی خیز انداز میں بولا۔

''ہم ہر ممکن طور پر صارفین کی پسند کا خیال رکھتے ہیں۔ دونوں کے مزاج میں خاصا امتزاج تھا اور ہم انہیں کوئی شکایت کا موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔'' وہ بولا۔

''اس شخص نے مقبول کو واضح انداز میں کہا تھا میرا بیٹا تمہارے ہاتھوں قتل ہوا ہے یا سرسری انداز میں کہا تھا کہ تو نے میرے بیٹے کو مارا ہے۔ اس وقت جب وہ مقبول کو کار کی شناخت کی وجہ سے امجد سمجھ رہا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اب یہ تیسرا قتل؟'' وہ قدرے گھبراہٹ کے عالم میں مختصراً بولا۔

''تیسرا نہیں بلکہ پہلا۔ جو باقی دونوں قتل کا موجب بن گیا۔ بظاہر دوسرے اور تیسرے قتل کا ذمے دار وہ شخص ہے جس کے بیٹے کی موت امجد کے ہاتھوں ہوئی تھی۔'' میں نے تصحیح کی۔

''مقبول نے میرے سامنے قتل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ اس نامعلوم شخص نے یہ کہا تھا کہ فلاں دن اور فلاں تاریخ کو شام کے وقت تو نے میرے بیٹے کو مارا ہے۔'' آفس کلرک نے بتایا۔

''مارنے سے مراد زخمی اور قتل دونوں ہو سکتے ہیں۔'' میں بولا۔ ''مقبول نے آپ سے ضرور یہ معلوم کیا ہوگا کہ اس وقت کار کس نے کرائے پر حاصل کی تھی جس کا ذکر وہ شخص مقبول سے کرتا رہا تھا اور آپ نے بتایا بھی ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں سر، مقبول نے جاننا چاہا اور میں نے بتایا اسے کار امجد نے حاصل کی تھی۔'' آفس کلرک تائیدی انداز میں بولا۔

نجانے اب کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آفس کلرک جس کا نام عابد تھا غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہے۔

''اور وہ شخص خود بھی یہاں آپ سے معلومات کرنے آیا تھا؟'' پھر بھی ایک دفعہ میں نے پوچھنا ضروری خیال کیا۔

''نو سر...... میں نے پہلے بھی کہا تھا وہ میری یہاں موجودگی میں تو نہیں آیا تھا، میں دو دن چھٹی پر گیا تھا اگر وہ اس دوران یہاں آجاتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔'' عابد پُراعتماد انداز میں بولا۔

میرے ذہن میں الجھن آمیز نکتے مٹ رہے تھے اور تحقیقات منطقی انجام کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ عاصم شکیل کے ذریعے پرویز کے والد امیر حسین کا جو حلیہ مجھے نوٹ ہوا تھا وہ ہو بہو ویسا تھا جیسا تھوڑی دیر قبل عابد نے مقبول کی معلومات کے مطابق میرے سامنے بیان کیا تھا۔

رینٹ اے کار سینٹر میں داخل ہوتے وقت میں نے سیل فون کا ریکارڈنگ سسٹم آن کر لیا تھا۔ اب تک میرے اور عابد کے درمیان ہونے والی ساری بات چیت محفوظ ہو چکی تھی۔ عابد کے مطابق وہ سفید کلر کی کار اس وقت سینٹر میں موجود تھی مگر میں نے ایک نگاہ بھی اس پر ڈالنا ضروری نہ سمجھا اور عابد کا شکریہ ادا کرنے کے بعد سینٹر سے نکل آیا۔

☆☆☆

میں نے اے ایس پی وجاہت کا نمبر ڈائل کیا۔

''پولیس ٹیم کے ساتھ میرے پاس پہنچو، قاتل کو گرفتار کرنے جانا ہے۔'' رابطہ قائم ہوتے ہی میں بول پڑا۔

’’ویری گڈ، ناصر خان۔‘‘ وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔

’’گڈ مڈ کو فی الحال اپنے پاس محفوظ رکھو۔ ابھی قاتل کو گرفتار کرنا باقی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ٹھیک ہے جناب، میں تھوڑی دیر بعد پہنچوں گا۔‘‘ دوسری جانب سے آواز آئی اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

امجد اور مقبول دونوں کا قاتل بالآخر گرفتار ہو گیا۔ امیر حسین کی گرفتاری کے لیے جھونپڑ بستی جانے سے قبل میں نے اپنی رہائش گاہ پر تحقیقات کی پوری تفصیل اے ایس پی وجاہت کے سامنے رکھی جس میں اس بات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں تھا کہ دونوں قتل کا ذمے دار امیر حسین ہے۔ چھوٹے قد کاٹھ کا چونتیس سالہ امیر حسین ہمیں جھونپڑ بستی میں مل گیا، وہ اس وقت اپنی جھونپڑی کے سامنے بس اڈے کی طرف کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا جو جھونپڑ بستی کے اریب قریب ایک کھلے میدان میں واقع تھا جہاں وہ اڈے پر پہنچنے والی دھول اور مٹی سے اٹی ہوئی بسوں کی صفائی دھلائی کا کام کرتا تھا۔ پہلے تو وہ کافی انکار کرتا رہا اور بار بار یہ کہتا رہا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ قتل تو اس کے بیٹے کا ہوا ہے لیکن جب اسے ہتھکڑی پہنا کر پولیس اسٹیشن لایا گیا تو پولیس اسٹیشن کا ماحول دیکھ کر اس کی اکڑ جلد نرم پڑ گئی اور اس نے جرم کا اقرار کر لیا۔

امیر حسین نے پولیس کے سامنے جو بیان دیا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ امجد کو اس نے اپنے بیٹے کے قتل کے بدلے موت کے گھاٹ اتارا تھا جبکہ مقبول جو امجد کے خلاف اپنے دل میں بغض چھپائے رکھتا تھا اسے قتل کرنے کی وجہ کسی مصیبت میں پھنسنے کا خدشہ تھا۔ یعنی امجد کے قتل کا گواہ مقبول تھا اسے مٹانا بھی ضروری تھا۔ اگر مقبول امجد کے لیے اپنے دل میں بغض و کینہ نہ رکھتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امیر حسین امجد تک پہنچ کر اسے قتل کرتا۔ امجد کی شناخت مقبول نے کرائی تھی کہ دراصل اس کے بیٹے پرویز کا قاتل کون ہے اور ساتھ ساتھ اس نے امیر حسین کے انتقام کو نہ صرف بھڑکایا بلکہ ایک سہولت کار اور منصوبہ ساز کی طرح اس کے کام آیا اور بعد میں امیر حسین نے اس اندیشے کے تحت اپنے ہاتھوں سے اپنے سہولت کار کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا لازمی سمجھا کہ کہیں یہ شاطر انسان کل کو اس کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کرے۔ اس طرح امیر حسین نے دوسرے قتل کے بعد خود کو محفوظ تصور کیا تھا۔

سفید کلر کی کار جس کی ڈکی پر ڈینٹ کا واضح نشان تھا، بیٹے کے قتل کے وقت امیر حسین کے ذہن میں کار کی تصویر نقش ہو گئی تھی اور اس کی نظریں ہمہ وقت مطلوبہ کار کی متلاشی تھیں اور اچانک اس دن اس کی نظروں میں مطلوبہ کار آ گئی اور وہ دوڑتا ہوا کار تک پہنچ گیا اور کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کو گریبان سے پکڑتے ہوئے چیخا۔ ’’اس دن میرے بیٹے کو مار کر تم نکل بھاگے تھے مگر آج تم بھاگ نہیں سکتے۔‘‘ وہ ہذیانی کیفیت میں کار والے نوجوان سے ایسا ہی کچھ بولتا رہا اور نوجوان جو مقبول تھا اچانک... اس افتاد سے بوکھلا کر رہ گیا اور پھر جب اسے اصل بات کا اندازہ ہوا تو وہ انکار کے ساتھ ساتھ اسے حقیقت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس ثبوت تھے۔ کار کی، کی چین کا مونوگرام جس پر رینٹ اے کار سینٹر کا نام، ایڈریس اور فون نمبر درج تھا۔ کار کے کاغذات بھی دکھائے مگر امیر حسین بالکل ان پڑھ نکلا پھر مقبول نے امیر حسین کو رینٹ اے کار سینٹر چلنے کی آفر کی تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ بڑی مشکل سے مقبول، امیر حسین کو اس بات پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ رینٹ اے کار والے سے اس بات کا پتا کرے گا کہ اس وقت یہ کار کس کے پاس تھی جس وقت کار سوار نے بقول اس کے بیٹے کو مارا تھا۔ اس دوران مقبول نے اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے رینٹ اے کار سینٹر سے رابطہ کرنے کی کافی کوشش کی مگر دوسری جانب اس کا فون کسی نے بھی اٹھانے کی زحمت نہ کی۔ پھر مقبول نے امیر حسین کو اصل مجرم ڈھونڈ نکالنے کے وعدے پر اپنا فون نمبر اور رینٹ اے کار سینٹر کا ایڈریس دے کر جان چھڑائی۔ آفس آ کر اسے علم ہوا کہ اس وقت مذکورہ کار کس نے حاصل کی تھی۔ مقبول نے قاتل کے متعلق بتایا اور امیر حسین کو تعاون فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ امیر حسین نے امجد کے خلاف قانونی سطح پر اقدام اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مقبول سے اس ضمن میں رہنمائی اور تعاون طلب کیا کیونکہ وہ خود ایک مفلس اور بالکل ان پڑھ انسان تھا، تھانے کورٹ کچہری سے اس کا سابقہ بھی پڑا نہیں تھا اور بنا کسی بڑی سپورٹ کے ایک غریب انسان کو انصاف کہاں ملتا جب مدعی امجد جیسا کوئی امیر زادہ ہو۔ مقبول نے امیر حسین کو امجد کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے سے متعلق بدظن کرنا شروع کیا۔ ’’اس سے تو بہتر ہے کہ سب کچھ بھول جاؤ اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ تم

نے کبھی سنا ہے کہ کسی مفلس غریب کو بھی انصاف ملا ہے؟''
مقبول بولا۔

''آپ جو ہیں ناں میرے ساتھ۔'' امیر حسین نے کہا۔

''میں اس طرح تمہاری مدد نہیں کرسکتا کیونکہ میرے گھر والے میری مخالفت کریں گے۔ بہتر ہے کہ چپ سادھ لو یا از خود کوئی قدم اٹھاؤ، اس میں، میں تمہاری مدد کروں گا۔ کسی کو بھی کانوں کان خبر تک نہ ہوگی۔'' مقبول نے بھڑکایا تو امیر حسین کو اس کی بات وزن دار محسوس ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کی موت پر بھلا خاموشی کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتا تھا اور قاتل کی نشاندہی بھی اب ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں تو قاتل کے خلاف انتقام کی آگ پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ اب بدلے کی آگ میں شدت آگئی اور بھڑکتی پر تیل چھڑکنے کا عمل مقبول نے انجام دیا۔ کبھی وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اور کبھی واضح لفظوں میں امیر حسین کو انتقام لینے پر اکساتا رہا۔ بات ڈالتا رہتا کہ امجد جیسے امیر زادے کو قانون کے ہاتھوں سزا دلوانا ایک مفلس انسان کے لیے ناممکن ہے اور اس زاویے پر سوچنا احمقانہ بات ہے۔ دراصل مقبول کو امجد کے خلاف امیر حسین کی صورت میں ایک ہتھیار ہاتھ لگا تھا۔ وہ اسے کارآمد بنا کر امجد کے خلاف استعمال کرنے کی دلی تمنا رکھتا تھا۔ مقبول نے اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کا پورا سامان کیا۔ امیر حسین انتقام لینے کے لیے بے چین تھا۔

''امیر حسین نے مقبول کے لب و لہجے سے واضح محسوس کیا تھا کہ وہ امجد سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔ امیر حسین کے دل میں یہ کھٹکا بھی جنم لے چکا تھا کہ امجد اس کا اصل مجرم نہ ہو اور مقبول اپنے کسی ذاتی عناد کی وجہ سے اسے اس کے ہاتھوں قتل کروانا چاہتا ہو۔

امیر حسین بس اڈے پر بسوں کی صفائی ستھرائی کا کام پچھلے چھ سالوں سے کرتا آرہا تھا۔ اس سے قبل وہ لوہار کے پیشے سے وابستہ تھا جو اس کے آباؤ اجداد کا پیشہ تھا۔ وہ ماہر لوہار تھا۔ وہ نوعمری میں اپنے خاندانی پیشے سے وابستہ ہو چکا تھا مگر بدلتے حالات کے ساتھ بالخصوص بڑے شہروں میں اس کا کام ٹھپ ہوتا گیا اور اس نے گھر کا خرچہ چلانے کے لیے بس اڈے پر کام شروع کیا۔ اس کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا۔ بیوی، دو بچے اور وہ خود۔ دس سالہ پرویز، جو امجد کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ایک اور بیٹا رحیم خان جو سات سال کا تھا، دونوں بچے جھونپڑ بستی کے آس پاس بھیک بھی مانگتے تھے۔ مقبول نے اسے بتایا کہ وہ اور امجد دونوں فٹ بال کے کھلاڑی ہیں۔ امجد کو قتل کرنے سے ایک دن قبل دونوں میں ملاقات ہوگئی۔ مقبول نے امیر حسین کو ایک سرخ کارڈ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' امیر حسین نے ریڈ کارڈ پکڑتے ہوئے کہا۔

''فٹ بال کی دنیا میں اسے ریڈ کارڈ کہتے ہیں یعنی سرخ کارڈ۔ میچ ریفری اسے اس وقت کسی کھلاڑی کے خلاف استعمال میں لاتا ہے جب وہ کوئی بڑی غلطی کر بیٹھتا ہے یا اس کے پاس کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جس کی وارننگ وہ کھلاڑی کو یلو کارڈ دکھا کر پہلے دے چکا ہوتا ہے۔ یہ میچ ریفری کے حکم کا واضح انداز میں اظہار ہوتا ہے کہ میدان سے نکل جاؤ۔ آؤٹ ہو جاؤ۔ کھیل انتظامیہ اور تماش بینوں کو علم ہوتا ہے کہ فلاں کھلاڑی ریڈ کارڈ ہوگیا۔ تم جب امجد کو قتل کرو گے تو اس کی لاش پر یہ ریڈ کارڈ ضرور چھوڑنا تاکہ یہ تاثر جائے کہ فٹ بال کا تیزی سے ابھرتا ہوا کھلاڑی ایک ناقابل جرم کی پاداش میں زندگی کے میدان سے ریڈ کارڈ ہو چکا ہے۔'' مقبول نے کہا اور مزید ایک عدد ریڈ کارڈ دیا کہ کہیں گم ہونے کی صورت میں یہ دوسرا کارڈ استعمال کرے۔

امیر حسین نے عصا نما خوفناک نیزے خصوصی طور پر خود تیار کیے تھے، نہ جانے اس کے لاشعور میں کیا تھا کہ اس نے ایک کے بجائے دو ہتھیار بنائے تھے۔ امیر حسین اپنے ساتھ ایک عصا نما نیزہ بھی لایا تھا تاکہ مقبول کو دکھا سکے۔ ہتھیار دیکھ کر وہ امیر حسین کے ہنر کو داد دیے بنا نہیں رہ سکا۔

''خاصی ہیبت ناک قسم کا ہتھیار ہے۔ دیکھ کر جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کام تمام کر کے ریڈ کارڈ کے ساتھ امجد کی لاش پر اسے بھی چھوڑنا تاکہ خوف و ہیبت کا ماحول پیدا ہو۔'' مقبول بولا۔

دونوں نے فون پر رابطہ کرنا چند دن پہلے ترک کر دیا تھا۔ مخصوص جگہ پر خاص ٹائم ملاقات کے لیے مقرر ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن چکے تھے۔ امیر حسین کو بیٹے کے قاتل تک پہنچنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت تھی اور مقبول کو ایک آلے کی ضرورت تھی جس سے وہ امجد کا صفایا کر سکے۔ ہر ملاقات میں مقبول اسے منصوبے کے حوالے سے گائیڈ کرتا رہا تھا جس میں احتیاط کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ضروری تھا۔

امجد کے شب و روز کے متعلق مقبول واقف تھا کہ کہاں، کب اٹھتا بیٹھتا ہے۔ منصوبے کے مطابق امیر حسین

رات کے پونے گیارہ بجے کے وقت پبلک پارک میں داخل ہوا اس وقت پارک میں ہُو کا عالم تھا پھر بھی امیر حسین احتیاط سے عقبی گیٹ سے پارک میں داخل ہوا تھا۔ چند لمحے بعد وہ طے کردہ گوشے میں پہنچا جہاں ایک چھوٹا سا کمرا تھا وہ اس کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ پارک میں اس وقت کوئی نگراں وغیرہ موجود نہ تھا، مالی صبح ڈیوٹی پر آتا تھا اور شام سات بجے کے وقت واپس چلا جاتا تھا۔ پارک کی بیشتر لائٹس آف تھیں اور وہ گوشہ پوری طرح تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جہاں امیر حسین اس وقت موجود تھا۔ گیارہ بجے امیر حسین کے کانوں میں گفتگو کی آواز آئی، تاریکی میں دو ہیولے آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے جہاں امیر حسین چھپا بیٹھا تھا۔ ایک کا لب و لہجہ امیر حسین کے لیے مانوس تھا جو مقبول تھا اور ظاہر دوسرا امجد ہی ہوگا۔ امیر حسین نے دستانے پہن رکھے تھے اور نیزہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ مقبول شکار کو دام کی سمت بڑی ہوشیاری کے ساتھ لا رہا تھا۔

''چلو بھئی، یہاں تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' مقبول کی آواز امیر حسین کے کانوں میں پڑی۔

''اندھیرے میں بیٹھنے سے یار، ہمیں مچھر کاٹیں گے۔'' امجد بولا۔ امیر حسین موقع کی تاک میں تھا۔

''ارے...... ہمارے علاوہ بھی یہاں کوئی اور موجود ہے۔'' ایک دفعہ پھر امجد کی آواز آئی۔ اس نے سامنے امیر حسین کے ہیولے کو دیکھ لیا تھا۔

امیر حسین چشم زدن میں امجد کے عین قریب پہنچا اور اس کا کالر اپنی گرفت میں لیتے ہوئے تند مگر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یاد کرو وہ دن جب تم نے میرے معصوم بچے کو دھکا دے کر نشیب میں گرایا تھا۔ پتھروں سے ٹکرا کر اس کی موت موقع پر ہی ہوگئی تھی۔ اس دن تم بھاگ لیے تھے مگر آج......'' حیرت اور خوف کے مارے امجد کی گھگی بندھ گئی۔

''ارے...... یہ...... یہ...... کیا ہے سب مقبول؟'' وہ بمشکل ہکلاتے ہوئے بولا اور پیچھے کی طرف گردن گھمائی لیکن مقبول کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ دراصل وہ پروگرام کے مطابق چپکے سے ایک طرف نکل گیا تھا۔

''وہ تمہیں بچانے والا نہیں ہے، بچے۔'' امیر حسین طنزیہ انداز میں بولا اور امجد خوف و حیرت کے عالم میں اسے تکتا رہ گیا۔

''میں نے جان بوجھ کر آپ کے...... بیٹے کو نہیں مارا۔ وقتی اشتعالی کیفیت کے سبب...... غلطی سرزد ہوئی۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

''بولتی دھیرے رکھو اپنی۔ ورنہ یہ نیزہ میں تیرے حلق میں گھونپ دوں گا۔'' امیر حسین نے نیزے کی نوک اس کے حلق میں چبھوتے ہوئے کہا۔

''سبب جو بھی ہو۔ میرے بچے کی لرزہ خیز موت کی وجہ تو تم ہو ناں...... اب تم بھی بھیانک موت مروگے۔'' امیر حسین نے سفاکانہ انداز میں کہا اور اس کا وہ ہاتھ مشینی انداز سے حرکت میں آیا جس میں عصا نما خطرناک نیزہ موجود تھا۔ امجد کا سینہ اور پیٹ نیزے کی نکیلی نوک سے بُری طرح زخمی ہوگیا۔ سینے پر نیزہ عین دل کے مقام پر لگا تھا۔ امجد کو چیخنے اور کراہنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوا اور وہ اپنے لہو میں نہاتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

امیر حسین نے بے حس و حرکت امجد کی جیب سے سیل فون نکالا اور اسے آف کرنے کے بعد دوبارہ اس کی جیب میں ڈالا اور پھر آلۂ قتل کے ساتھ ریڈ کارڈ اس کی لاش پر پھینکنے کے بعد درخت کی ایک پتے دار لمبی شاخ توڑ کر جھاڑو کی طرح نرم ریت پر پھیرنے لگا جہاں پر اسے یہ اندازہ تھا کہ اس کے پاؤں کے نشانات موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ جائے وقوعہ سے نکل آیا۔ دو گھنٹے بعد وہ طے کردہ جگہ پر مقبول کے سامنے موجود تھا۔

''میں نے اسے مار کر اپنا بدلہ لے لیا۔'' امیر حسین نے کہا۔

''ویری گڈ...... مجھے تم سے یہی توقع تھی۔'' مقبول نے مسرت سے کہا۔

''آپ کا شکریہ، آپ نے میری کافی مدد کی۔ آپ کے تعاون کے بغیر میں اپنے بیٹے کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے قابل کہاں تھا۔'' امیر حسین نے مزید تفصیلات بیان کرنے کے بعد متشکرانہ انداز میں کہا۔

''بہتر ہے کہ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسے بھول جائیں جیسے ہم ایک دوسرے سے کبھی ملے بھی نہ تھے۔ میں آپ کا نمبر ڈیلیٹ کر رہا ہوں اور آپ میرا نمبر ڈیلیٹ کریں۔'' امیر حسین نے جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے ایک دفعہ پھر کہا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بابے...... ہمیں آئندہ بھی ایک دوسرے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔'' مقبول بے ساختہ بولا۔

امیر حسین چند لمحے سوچتا رہا پھر موبائل فون جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بات بجا ہے۔''

امجد کی موٹر سائیکل مقبول کے پاس تھی جس پر بیٹھ کر وہ دونوں پبلک پارک آئے تھے بلکہ مقبول اسے باتوں میں مصروف رکھ کر پبلک پارک کی طرف لایا تھا ورنہ امجد تو معمول کے مطابق ساڑھے دس بجے گھر کی طرف نکلنے والا تھا۔

دوسرے دن صبح کے وقت امجد کی لاش جب پارک سے ملی تو اسی دن شام کے وقت مقبول نے امجد کی موٹر سائیکل کسی طرح لاکر پولیس اسٹیشن کے احاطے میں چھوڑی تاکہ پولیس چکرا کر رہ جائے۔

امیر حسین نے مقبول کے سامنے بظاہر آمادگی ظاہر کی تھی مگر وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے امیر حسین اچھی طرح جان چکا تھا کہ وہ شاطر کھلاڑی اسے آئندہ بھی اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کرے گا۔ ان کے درمیان جو تعاون ہوگا اس کی بنیاد احسان جتانے اور بلیک میلنگ کی بنیاد پر ہوگی۔

''امجد کو ختم کر ڈالا تو یہ لومڑی نما مقبول کیا چیز ہے۔'' امیر حسین کے ذہن میں خیال ابھرا۔ غور و فکر کرتے کرتے بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ کر ذہنی طور پر تیار ہوگیا کہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے اور تحفظ کے لیے ایک اور خون کی بات ناگزیر ہے۔

امجد کے قتل کے چار دن بعد مقبول توقع کے مطابق امیر حسین کو شام سات بجے کے وقت کولڈ اسپاٹ میں ملا جہاں اکثر وہ شام کے وقت کولڈ ڈرنک پینے آتا تھا۔ امیر حسین نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا اور خود آگے جا کر سڑک کے کنارے مقبول کا انتظار کرنے لگا۔ مقبول کولڈ اسپاٹ سے نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد امیر حسین، مقبول کے برابر کار میں بیٹھا ہوا تھا۔

''میری معاشی حالت کا آپ کو بہتر علم ہے۔ آئے روز روپے پیسوں کی سخت ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ تنگدستی نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ سوچا آپ کے کسی خاص کام آؤں تو معاشی بوجھ بھی ہلکا ہو جائے۔'' امیر حسین نے اپنی مجبوری کا ذکر خوش آمدانہ انداز میں کیا۔

''اب آگئی نا، بات تیری سمجھ میں...... میں تیرے لیے کس قدر اہم ہوں۔'' مقبول فخریہ انداز میں بولا۔ اب تک اس نے سوائے معمولی جیب خرچ کے امیر حسین کی کوئی خاص مالی مدد نہیں کی تھی اور اس معمولی مدد کے پیچھے بھی اس کے مذموم عزائم کارفرما تھے۔ امیر حسین کو مقبول کی خود غرضانہ طبیعت کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس جیسے مطلبی اور خود غرض انسان سے کوئی بعید نہیں کہ اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے۔ اس طرح اس دن وہ مقبول سے اس کی من چاہی باتیں کرتا ہوا اسے ویران علاقے میں لانے میں کامیاب ہوا۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ایک قتل کے بعد اسے دوسرا قتل مشکل نظر نہیں آرہا تھا۔ ہر سو خاموشی کا عالم تھا۔ کار تارکی میں رکی تھی۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ امیر حسین نے پہلو بدلا اور جیب میں موجود نیزے کو چپکے سے نکالا، مقبول نگاہ سامنے جمائے باتوں میں مگن تھا۔ دوسرے لمحے امیر حسین نے اپنے ہاتھ میں موجود نیزہ مقبول کے پہلو میں گھونپ دیا۔ اچانک حملے سے وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ خوف اور حیرت بھری نگاہوں سے امیر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ اب میں تمہارے ہاتھوں کا کھلونا بن کے رہوں...... اب میں تمہیں زندگی کے میدان سے ریڈ کارڈ کرتا ہوں۔'' امیر حسین سفاک انداز میں بولا اور کوئی معمولی مزاحمت کا موقع دیے بغیر مقبول کے پہلو اور پیٹ میں اس وقت تک نیزہ گھونپتا رہا جب تک اسے یہ تسلی نہ ہوگئی کہ مقبول کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔ امیر حسین کے پاس دستانے تھے مگر مقبول کی نظروں میں آئے بنا چپکے سے پہن لینا مشکل تھا۔ قتل کے بعد اس نے دستانے پہن لیے۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر پڑا خون میں لت پت بے حس و حرکت مقبول کی جیب سے اس کا سیل فون نکال کر آف کرنے کے بعد دوبارہ اس کی جیب میں رکھا، پھر آلۂ قتل پر فنگرز پرنٹ ضائع کرنے کے بعد دوسرا ریڈ کارڈ جیب سے نکال کر آلۂ قتل سمیت لاش پر پھینک دیا۔

''چلو، یہ فالتو ریڈ کارڈ تیری لاش پر پھینکنے کے کام تو آیا۔'' امیر حسین بڑبڑاتا ہوا کار سے نکلا پھر مزید ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد جائے وقوعہ سے نکل گیا۔

آفس کلرک عابد نے مجھ سے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ رینٹ اے کار سینٹر میں کوئی اجنبی شخص ڈینٹ والی کار کے متعلق پوچھ گچھ کرنے نہیں آیا تھا۔ امیر حسین کا قصوروار کوئی اور ہوتا تو یقیناً مقبول، امیر حسین کو سپورٹ نہ کرتا اور امجد کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ایک لرزہ خیز موت مرنے سے بچ جاتا۔ جو گڑھا اس نے امجد کے لیے کھودا تھا وہ خود بھی اسی میں جا گرا تھا۔ مقبول کے قریبی ساتھی جو اس کی شرافت کی گواہی دے رہے تھے یقیناً اس کا دوسرا روپ انہیں ششدر کر دے گا۔

❖❖❖

سارجنٹ مارکم نے جھک کر گہری نگاہوں سے لاش کا معائنہ کیا، یہ لاش ایک جواں سالہ لڑکی کی تھی جسے سر میں گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔ لڑکی کو اس کے گھر میں گھس کر مارا گیا تھا۔ سارجنٹ مارکم کا خیال تھا کہ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سے پچیس سال کے درمیان تھی اگرچہ وہ مر چکی تھی مگر اس حالت بھی میں خاصی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم اب اس کا یہ ملکوتی حُسن کسی کام کا نہ تھا۔ سارجنٹ مارکم جانتا تھا کہ جلد ہی اس کا یہ وجود تابوت میں

دو بھائیوں اور ایک بہن کے درمیان حائل قاتل وصیت کی رسا کشی......

کچھ لوگ اپنا کام قبل از وقت کرنے کے عادی ہوتے ہیں... جوکہ قابل تحسین عمل ہے... مگر بعض اوقات یہ عادت مشکل سے دوچار کر دیتی ہے... ایک ایسی ہی حسینہ ماہ جبیں کی کہانی... جو اپنی زندگی میں اپنی موت کا سامان کر چکی تھی...

قاتل وصیت

شاکر لطیف

بند کر کے قبر میں اتار دیا جائے گا جو چند دنوں میں ہی مٹی میں مل جائے گا۔ حسن اور بدصورتی کا فرق بس موت سے پہلے تک ہی ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد بس ایک ڈیڈ باڈی رہ جاتی ہے۔

اسے ایک گھنٹا قبل اس قتل کی اطلاع ملی تھی۔ اس کا خاص ماتحت راجر پولیس ٹیم کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ لڑکی کو اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں قتل کیا گیا تھا۔ فنگر پرنٹ اٹھانے والی ٹیم اور فرانزک رپورٹ تیار کرنے والی ٹیم بھی وہاں موجود تھی۔ سارجنٹ مارکم کے پہنچنے سے پہلے پہلے کافی حد تک کام مکمل کر لیا گیا تھا۔ سارجنٹ مارکم نے آتے ہی سب سے پہلے لاش کا معائنہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ کچھ دیر تک لڑکی کی لاش کو پُرسوچ نگاہوں سے تکتا رہا اور پھر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ گھر کے دروازے سے باہر نکل کر اس نے متلاشی نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں آتے ہی اس نے راجر سے بس ہیلو ہائے کی تھی اور پھر لاش کا معائنہ کرنے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ راجر اسے ایک طرف کھڑا دکھائی دے گیا۔ اس کے پاس کچھ لوگ موجود تھے۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا شاید وہ اہل علاقہ تھے اور راجر ان سے مقتولہ لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ سارجنٹ مارکم تیز قدم اٹھاتا اس کی جانب بڑھ گیا۔

اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر راجر بھی اپنے پاس موجود لوگوں سے اجازت لیتا ہوا اس کی جانب بڑھ آیا۔

”ہاں تو راجر کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں اب تک؟“ اس کے قریب جاتے ہی مارکم نے کہا۔

”سر مرنے والی لڑکی کا نام جولیا ہے جو ایک معروف ماڈل تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھی اور اس گھر میں تنہا رہائش پذیر تھی۔ جولیا کے ماں باپ وفات پا چکے ہیں جبکہ دو بھائی علیحدہ رہتے ہیں۔ ایک کا نام جوزف ہے اور دوسرے کا مائیکل ہے۔ وہ دونوں بھی غیر شادی شدہ ہیں۔ جوزف سے میں مل چکا ہوں جبکہ دوسرا بھائی مائیکل جو پیشے کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر ہے۔ شاید کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے۔ اس کا ذاتی کلینک اس جگہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ اہل علاقہ سے جو معلومات ابھی تک حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق دھماکے کی آواز کسی نے نہیں سنی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائلنسر لگا ریوالور استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے جولیا کی لاش کا معائنہ کیا ہے اس کے سر میں تین گولیاں ماری گئی ہیں۔ گھر کے دروازے کے لاک کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ لاک کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی نہیں کی گئی۔ لگتا ہے کہ مقتولہ آنے والے شخص کو جانتی تھی اور اس نے اس کے لیے خود دروازہ کھولا تھا۔“ راجر نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”لاش کو سب سے پہلے کس نے دیکھا؟“ مارکم نے سوال کیا۔

”جولیا کے بھائی جوزف نے۔“ راجر نے جواب دیا۔ ”وہ آج صبح تقریباً آٹھ بجے جولیا سے ملنے آیا تھا۔ لاش دیکھنے کے بعد پولیس کو کال بھی اسی نے کی ہے۔ ہمیں اس کی فون کال آٹھ بج کر تین منٹ پر موصول ہوئی تھی جس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد میں پولیس کے ہمراہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ جوزف کا کہنا ہے کہ اس نے جولیا کی لاش دیکھ کر فوراً ہی پولیس کو فون کر دیا تھا۔“ راجر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”جوزف کہاں ہے؟“ مارکم نے.... چونک کر پوچھا۔

”اپنی کار کے اندر بیٹھا ہوا ہے وہ سامنے۔“ راجر نے سڑک پر کھڑی ایک کار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مارکم نے گردن گھما کر سڑک پر کھڑی کار کی جانب دیکھا جس کی فرنٹ سیٹ پر ایک گنجے سر والا شخص براجمان تھا۔

”آؤ، اس جوزف سے بھی ملاقات کر لیں۔“ مارکم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو راجر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیا۔ جوزف ان دونوں کو دیکھ کے گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”ہیلو مسٹر جوزف، مجھے سارجنٹ مارکم کہتے ہیں۔“ مارکم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جی میں جولیا کا بڑا بھائی ہوں۔“ جوزف نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ مارکم کے لیے اس کا یہ انداز... خاصا انوکھا اور نرالا تھا۔ اب سے کچھ دیر قبل اس کی بہن کا مرڈر ہوا تھا اور وہ اس سچویشن میں بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زیادہ پریشانی کے تاثرات بھی نہیں تھے۔ سارجنٹ مارکم کو پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نشے میں تھا اس کی سرخ آنکھیں اور بات کرنے کے دوران لڑکھڑاتا ہوا لب و لہجہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس نے خاصی مقدار میں ڈرنک کی ہوئی ہے۔

”مسٹر جوزف آپ آج صبح کتنے بجے یہاں آئے اور آپ نے سب سے پہلے کیا دیکھا؟“ مارکم نے سوال کیا۔

”میں صبح تقریباً آٹھ بجے کے قریب جولیا سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا تاہم بار ہا بیل دینے کے بعد بھی جب

دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دروازے کا ہینڈل گھما کر دیکھا تو یہ انکشاف ہوا کہ دروازہ لاک نہیں ہے۔ میں اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی میں نے ڈرائنگ روم میں جولیا کو پڑے دیکھا اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے جس کے بعد میں نے فوراً پولیس کو کال کر دی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے بھائی مائیکل کو فون کر کے اس اندوہناک واقعے کی اطلاع کر دی وہ بس یہاں پہنچنے ہی والا ہے، اس کا ذاتی کلینک ہے جو یہاں سے کافی دور ہے شاید اسی لیے ابھی تک نہیں آیا۔'' جوزف نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کی بہن کی کسی سے کوئی دشمنی یا پھر کوئی چپقلش وغیرہ تھی؟'' مارکم نے پوچھا۔

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔'' جوزف نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''میری بہن ماڈلنگ کی دنیا میں ایک ابھرتا ہوا نام تھا۔ نہ جانے کس نے اسے قتل کر ڈالا، ممکن ہے ماڈلنگ کی دنیا میں اس کی کسی کے ساتھ چپقلش وغیرہ چل رہی ہو۔ شوبز کی دنیا میں آگے نکلنے کی تمنا اور حسد رقابت جیسے جذبات بڑی شدت سے پائے جاتے ہیں۔''

''کیا آپ کی بہن کا کوئی دوست تھا...... میرا مطلب ہے کوئی بوائے فرینڈ وغیرہ؟'' مارکم نے سوال کیا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اس نے کبھی اس بارے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی ویسے بھی لڑکیاں اس قسم کی باتیں اپنے بھائیوں سے کم ہی ڈسکس کرتی ہیں ویسے وہ رابرٹ نام کے ایک لڑکے کے ساتھ اکثر دیکھی جاتی تھی۔ ان کی دوستی کی نوعیت کیا تھی، یہ میرے علم میں نہیں۔'' جوزف نے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر سارجنٹ مارکم کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تاہم اس کے چہرے پر گہری سوچ بچار کے تاثرات تھے۔

''مجھے میری بہن کی ڈیڈ باڈی کب تک مل جائے گی؟ تاکہ میں اس کی آخری رسومات ادا کر سکوں۔'' جوزف نے چند ثانیوں کی خاموشی توڑتے ہوئے سوال کیا۔

''باڈی تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی مل سکے گی۔'' مارکم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ایک پرسنل سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اس بہن کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر آپ دونوں بھائیوں نے بھی شادی نہیں کی اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ کی اور جولیا کی عمر میں بھی خاصا فرق ہے کیا آپ سگے بہن بھائی ہیں یا آپ کے والد یا والدہ نے دوسری شادی کی تھی؟''

''ہم سگے بہن بھائی ہی ہیں۔'' جوزف نے جواب دیا ہمارے والدین نے بھی ایک ہی شادی کی تھی بس اولاد کی پیدائش میں کچھ وقفہ رکھا تھا۔ میں جولیا سے تقریباً بارہ سال بڑا ہوں جبکہ مائیکل مجھ سے چھ سال چھوٹا ہے۔ شادی کا معاملہ واقعی پرسنل ہے تاہم میں صرف اپنی بات کر سکتا ہوں۔ میں آزاد منش انسان ہوں اور آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اسی لیے شادی نہیں کی۔ جولیا ابھی ماڈلنگ کی دنیا میں اپنا نام بنا رہی تھی، وہ کسی سے شادی کرنا چاہتی تھی یا نہیں میں اس بارے لاعلم ہوں تاہم مائیکل پچھلے ماہ اپنے کلینک ہی کی ایک ڈاکٹر جس کا نام ڈاکٹر شیلا ہے، شادی کرنے والا تھا مگر چند دن قبل اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر شیلا کے ساتھ اس کا بریک اپ ہو گیا ہے اب وہ اس سے شادی نہیں کر رہا۔ ڈاکٹر شیلا اس کا کلینک بھی چھوڑ کر چلی گئی ہے اب وہ اپنے کلینک کی ہی ایک نرس مارگریٹ کے ساتھ شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہے...... لو وہ آ گیا۔'' جوزف نے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا تو سارجنٹ مارکم اور راجر کی نگاہیں بھی جوزف کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوم گئیں۔ سڑک پر ایک جدید ماڈل کی کار آ کر کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے ایک لمبا تڑنگا اور خوش شکل نوجوان باہر نکل رہا تھا۔ جوزف کے اشارے کے بعد سارجنٹ مارکم اور راجر کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آنے والا نوجوان جولیا کا بھائی مائیکل ہے۔ نوجوان بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ مارکم...... نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ مائیکل کے چہرے پر رنج و غم کے تاثرات نمایاں تھے۔ بظاہر وہ ایک شریف اور سلجھا ہوا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ ''جوزف یہ کیا ہو گیا، جولیا کو کس نے مار دیا؟'' قریب آتے ہی اس نے جوزف کے گلے لگتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا۔

''ابھی تک اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تاہم جلد ہی قاتل کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ پولیس نے تفتیش شروع کر دی ہے۔'' جوزف نے اس کی پشت تسلی آمیز انداز میں تھپتھپائی اور پھر اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

''یہ سارجنٹ مارکم اور ان کے ماتحت مسٹر راجر ہیں، یہ جولیا کے مرڈر کی تفتیش کر رہے ہیں اور اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان کے ساتھ تفتیش میں مکمل تعاون کریں تاکہ جولیا کے قاتل کو جلد از جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جا سکے۔''

''مسٹر مائیکل آپ خاصی دیر سے پہنچے ہیں؟'' مارکم

نے سنجیدہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میرا کلینک یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔'' مائیکل نامی نوجوان نے جواب دیا۔ ''مجھے جیسے ہی جوزف کی کال موصول ہوئی، میں وہاں سے روانہ ہو گیا تھا تاہم راستے میں ٹریفک جام کے پرابلم کی وجہ سے مزید دیر ہوگئی۔''

سارجنٹ مارکم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر مائیکل کی ٹریفک جام کے بارے میں بات سو فیصد درست ہے۔ اسے یہاں آتے ہوئے اس کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔

''آپ کے بھائی مسٹر جوزف کا کہنا ہے کہ آپ لوگوں کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، کیا آپ اس بارے میں ہماری کوئی رہنمائی کر سکتے ہیں؟''

''مجھے افسوس ہے، میں آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکوں گا۔'' مائیکل نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''میرا پچھلے تین سالوں سے جولیا کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا یوں کہہ لیں کہ ہمارے درمیان ناراضگی چل رہی تھی۔''

''کیا مطلب، میں آپ کی بات نہیں سمجھ پایا؟'' مارکم نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''دراصل جولیا اور مائیکل کی بول چال کافی عرصے سے آپس میں بند تھی۔'' ڈاکٹر مائیکل کی جگہ جوزف نے جواب دیتے ہوئے کہا ویسے اس ناراضگی میں مائیکل کا کوئی قصور نہیں تھا بس جولیا ہی اپنی ضدی طبیعت کی وجہ سے اس سے ناراض ہو گئی تھی۔''

''مگر جولیا کی ناراضگی کی وجہ کیا تھی؟'' مارکم سوال کیا۔

''ویسے تو یہ لمبی کہانی ہے۔'' اس بار بھی جوزف نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تاہم میں آپ کو مختصراً بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے جوزف کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا شاید وہ سارجنٹ مارکم کو سنانے کے لیے اپنے ذہن میں کہانی ترتیب دے رہا تھا ڈاکٹر مائیکل نے اسے ٹوکنے یا روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی، وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

''یہ قضیہ تین سال پرانا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد جوزف بولا۔ ''جولیا کی ایک انتہائی عزیز ترین اور بچپن کی سہیلی جس کا نام میری تھا، نے ایک دن اچانک خودکشی کر لی اور اس نے مرنے سے پہلے جولیا کو ایک میسج کیا جس میں کہا کہ وہ مائیکل کی بے اعتنائی مزید برداشت نہیں کر سکتی اس لیے خودکشی کر رہی ہے میری، جولیا کے ساتھ ساتھ مائیکل کی بھی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ واقعی مائیکل کو بہت پسند کرتی تھی بلکہ یوں کہہ لیں کہ وہ مائیکل پر دل و جان سے عاشق ہو گئی تھی ویسے تو وہ خوبصورت اور حسین تھی مگر مائیکل کو نہ جانے کیوں اس میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ اسے اپنانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ جولیا نے اس سلسلے میں مائیکل کو کافی مجبور کیا تھا مگر مائیکل نہیں مانا جس پر وہ اس سے ناراض ہو گئی اور پھر میری کی خودکشی کے بعد اس کی اس ناراضگی نے شدت اختیار کر لی۔ اس نے مائیکل سے قطع تعلق کر لیا۔ مائیکل نے کافی مرتبہ اسے منانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانی خیر اب تو وہ خود بھی اس دنیا میں نہیں رہی۔'' بات کرتے ہوئے جوزف کا لہجہ بھرا گیا۔

''جولیا خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی حالانکہ اگر وہ ٹھنڈے دماغ سے غور کرتی تو اسے اندازہ ہو جاتا کہ اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔'' مائیکل گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری اس قدر حساس طبیعت کی مالک ہو گی اگر کچھ اندازہ ہوتا تو میں اسے منانے کی کوشش ضرور کرتا۔ مجھے اس بات کا شدید دکھ ہے کہ میری نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' مارکم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں واقعی آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بعض لڑکیاں بہت حساس طبیعت کی مالک ہوتی ہیں شاید میری بھی لڑکیوں کی اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔''

''شاید نہیں یقیناً...... تبھی تو اس نے خودکشی کر لی۔'' جوزف نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا... اور پھر اس کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہونے لگیں۔ اس کے چہرے پر یک بہ یک تکلیف کے تاثرات بھی امنڈ آئے تھے۔

سارجنٹ مارکم اور اس کا ماتحت راجر حیرت بھری نگاہوں سے جوزف کو تکنے لگے۔ انہیں سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ جوزف کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ چند ثانیوں پہلے تک وہ بالکل نارمل تھا۔

''جوزف، مجھے لگتا ہے تم نے آج اپنی دوا استعمال نہیں کی؟'' ڈاکٹر مائیکل نے تیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''میری دوا گاڑی میں پڑی ہے۔ میں ابھی کھا لیتا

ہوں۔ آج مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' جوزف نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا اور پھر تیزی سے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

''معاف کیجیے گا۔ سارجنٹ دراصل جوزف سر درد کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کے سر کی شریانیں تنگ ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے خون کی سپلائی پوری طرح رواں نہیں ہو پاتی اور اسی وجہ سے اکثر سر میں درد ہوتا ہے۔ میں اس کا معالج ہوں اور میں نے ہی اس کے لیے دوا تجویز کی ہے مگر شاید آج یہ کھانا بھول گیا ہے۔'' ڈاکٹر مائیکل نے معذرت خواہانہ لہجے میں سارجنٹ مارکم کو مخاطب کیا۔

''کوئی بات نہیں آپ ڈاکٹر ہیں اپنے بھائی کی اس کنڈیشن کو بہتر سمجھتے ہیں۔'' سارجنٹ مارکم نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ہے۔ ''ویسے زیادہ تشویش کی بات تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں۔'' ڈاکٹر مائیکل نے جواب دیا ہے۔ ''ابھی دوا کھانے کے چند منٹ بعد یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ دوا خاصی زود اثر ہے اور شریانوں میں خون کی روانی فوراً بحال کر دیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر ڈاکٹر مائیکل بعد میں بات ہوگی آپ اپنے بھائی کو سنبھالیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑ گیا۔ راجر بھی اس کے ہمراہ تھا۔

''راجر، ڈاکٹر مائیکل اور جوزف کا بیان لے کر ان کے دستخط کروالو۔ دو دن تک پوسٹ مارٹم رپورٹ آئے گی تبھی قتل کی تفتیش آگے بڑھ سکے گی۔ جولیا کی شوبز کی دنیا سے معلومات حاصل کرو اس کے شوبز کے قریبی دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں تمام معلومات۔ میں تمہیں اس کام کے لیے بھی دو دن دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مائیکل اور جوزف کی آج کے دن کی موبائل لوکیشن ٹائمنگ کے ساتھ نکلوالو۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد یہ لوکیشن بھی مائیکل اور جوزف کو گناہ گار یا بے گناہ ثابت کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ جولیا شوبز کی دنیا میں ہونے کی وجہ سے خاصے پیسے کماتی ہوگی اور اس نے شادی بھی نہیں کی۔ اس لحاظ سے اس کی تمام جائداد کے وارث اس کے بھائی ہی ٹھہرتے ہیں اس لیے ان کے بارے انکوائری ضروری ہے جولیا کی موت کا فائدہ صرف ان دونوں کو ہی ہوا ہے۔''

''سر جوزف کی موبائل لوکیشن اور ٹائمنگ تو اسی علاقے کی آئے گی کیونکہ اس نے آٹھ بجے یہاں سے فون کیا تھا ڈاکٹر مائیکل کی دس بجے کے قریب آنی چاہیے کیونکہ وہ تقریباً اسی وقت یہاں آیا ہے۔ جوزف آٹھ بجے یہاں موجود تھا اور میرے خیال میں جولیا کو بھی لگ بھگ اسی وقت قتل کیا گیا ویسے سر مجھے جوزف پر شک ہے۔ کسی کی بہن کا قتل ہو جائے تو اس کا غمزدہ ہونا فطری سی بات ہے مگر جوزف کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے اپنی بہن کے مرنے کا کوئی خاص افسوس نہیں ہے۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور وجہ جوزف پر شک کرنے کی؟'' سارجنٹ مارکم نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''قاتل گن پوائنٹ پر اس لڑکی کو یرغمال بنا کر اس کا فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا، میرا مطلب ہے کہ جولیا ایک خوبصورت لڑکی تھی مگر جولیا کی ڈیڈ باڈی دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جولیا اور قاتل کے درمیان کوئی ایسا تقدس بھرا رشتہ موجود تھا جس نے قاتل کو کسی ایسی حرکت سے باز رکھا ہے۔'' راجر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں، تمہاری بات صحیح ہو۔'' مارکم نے جواب دیا۔ ''قاتل جانتا تھا کہ اگر اس نے لڑکی کے ساتھ ریپ کیا تو بعد میں ڈی این اے ٹیسٹ اس کے خلاف ثبوت بن جائے گا اور پھر وہ قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کر رہا تھا ایسی صورتِ حال میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اور قاتل کو نکلنے کی جلدی ہوتی ہے تمہاری بیان کردہ وجوہات میں کچھ وزن تو ہے مگر یہ اتنا ٹھوس ثبوت نہیں کہ ہم جوزف کو گرفتار کر سکیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے تک اس کیس میں مزید پیش رفت نہیں ہو سکتی، دو دن تک ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آجائے گی پھر دیکھیں گے۔ تم اپنی تفتیش جاری رکھو اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے اطلاع کر دینا۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مارکم اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

سارجنٹ مارکم کو یقین تھا کہ دو دن تک راجر اس کی ہدایات کے مطابق تمام معلومات حاصل کر لے گا اور پھر اسے انہی معلومات کی بنیاد پر کوئی ایسا کلیو بھی مل جائے گا جس کی مدد سے قاتل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر اپنے گھر روانہ ہو گیا وہ جانتا تھا کہ جلد ہی یہ کیس میڈیا کی زینت بنے گا کیونکہ مقتولہ جولیا ایک ابھرتی ہوئی ماڈل تھی۔ میڈیا میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے کے بعد اس پر اس کیس کو حل کرنے کے سلسلے میں دباؤ بھی بڑھے گا اس لیے اس کیس کو جلد از جلد حل کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے ہی آفس آ گیا تھا۔ راجر

ابھی تک نہیں آیا تھا اس نے اپنے آفس کی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اپنے پی اے کو ہدایات جاری کر دی کہ راجر جیسے ہی آئے، اسے اس کے آفس میں بھیج دیا جائے۔

تقریباً ایک گھنٹے میں راجر بھی آ گیا۔ اسے سارجنٹ مارکم کی آفس میں موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی اس لیے وہ وقت ضائع کیے بغیر سارجنٹ کے آفس میں آ گیا۔ سیلیوٹ کرنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود ایک فائل مارکم کے سامنے ٹیبل پر رکھی اور پھر خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سر یہ ابتدائی پوسٹ مارٹم فرانزک رپورٹ اور فنگر پرنٹس رپورٹ ہے۔ ساتھ ہی جوزف اور رابرٹ کی جولیا کے قتل والے دن کی موبائل لوکیشن اور ٹائم کی رپورٹ بھی ہے۔''

مارکم نے فائل اٹھائی اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جولیا کی موت کی وجہ سر میں لگنے والی گولیاں تھیں اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ جولیا کی موت سات سے آٹھ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ فرانزک رپورٹ کے مطابق جولیا کے سر میں لگنے والی گولیاں سائیلنسر لگے ریوالور سے ہی چلائی گئی تھیں فنگر پرنٹس رپورٹ کے مطابق گھر میں جولیا کے علاوہ صرف ایک اور انسان کے فنگر پرنٹس ملے تھے اور وہ فنگر پرنٹس گھر کے ڈرائنگ روم سے ملے تھے ابھی تک ان انگلیوں کے نشانات کو کسی مشکوک شخص کے ساتھ میچ نہیں کیا گیا تھا مگر سارجنٹ مارکم کو اندازہ تھا کہ جولیا کے علاوہ دوسرے فنگر پرنٹس جوزف کے ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ اس نے گھر کے اندر داخل ہو کر اپنی بہن کی لاش دریافت کی تھی اس لیے اس کی انگلیوں کے نشانات مختلف جگہوں پر ثبت ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی اور نہ یہ ایسا ثبوت تھا جس کی بنا پر اس پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا کیونکہ اندر داخل ہونے کا اعتراف تو جوزف نے خود کیا تھا۔ موبائل لوکیشن رپورٹ میں بھی کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھی وہی کچھ تھا جس کا مارکم کو پہلے ہی اندازہ تھا۔

مارکم نے فائل ایک طرف رکھی اور پھر راجر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اگر غور کیا جائے تو جوزف کا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔'' وہ پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جولیا کی موت سات سے آٹھ بجے کے درمیان ہوئی ہے جبکہ جوزف نے تمہیں آٹھ بج کر تین منٹ پر فون کیا تھا، اس حساب سے دیکھا جائے تو اس پر شک کرنے کی ٹھوس وجہ موجود ہے۔''

''سر میرے پاس کچھ اور ایسی معلومات بھی ہیں جن کی وجہ سے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ مرڈر جوزف نے ہی کیا ہے۔'' راجر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کون سی معلومات؟'' مارکم نے چونک کر پوچھا۔

''اور کیا تم نے شوبز کی دنیا سے جولیا کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں؟''

''سر میں نے شوبز انڈسٹری سے جولیا کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ ان معلومات کے مطابق جولیا کی چپقلش تو کافی افراد سے چل رہی تھی مگر شوبز کی دنیا میں یہ بہت عام سی بات ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اسے قتل کر ڈالتا۔ شوبز کی دنیا میں رابرٹ نام کا ایک لڑکا جولیا کے بوائے فرینڈ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جوزف نے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ رابرٹ سے میری ملاقات تو نہیں ہو سکی مگر اس کا سیل نمبر حاصل کرنے کے بعد میں نے اس سے فون پر بات کی ہے۔ رابرٹ نے بتایا کہ اسے جولیا کے قتل کی اطلاع میڈیا کے ذریعے ملی تھی اور وہ اس دن شہر میں موجود نہیں تھا۔ رابرٹ نے جولیا کے بارے کافی کچھ بتایا تاہم ایک بات ایسی تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا اور میرا جوزف پر شک یقین میں بدل گیا۔ جولیا نے کچھ عرصہ پہلے ایک وصیت تیار کروائی تھی جس کے مطابق اگر اس کی کبھی کسی وجہ سے موت واقع ہو جائے تو اس کی تمام جائداد کا وارث اس کا بڑا بھائی جوزف ہوگا۔ ڈاکٹر مائیکل کا اس کی جائداد سے کچھ حصہ نہیں ہوگا۔ تاہم اس نے وصیت میں ایک کنڈیشن بھی رکھی تھی۔ وہ فی الحال تو تنہا زندگی گزار رہی تھی مگر جیسے ہی وہ شادی کرتی، اس کی وصیت کینسل ہو جاتی، یہ شق اس نے خصوصی طور پر وصیت میں شامل کروائی تھی کہ جس دن اس کی شادی ہوگی، اس دن یہ وصیت بے اثر ہو جائے گی تاہم وصیت میں اس نے اپنی شادی کی تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا اور اس وصیت کے مطابق اگر اس کی کبھی اچانک موت واقع ہو جائے تو اس کی تمام جائداد کا وارث صرف جوزف ٹھہرے گا۔ ڈاکٹر مائیکل کا اس کی جائداد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

''مجھے تمہاری معلومات پر حیرت ہے اس طرح کی وصیت تو عام طور پر وہ بوڑھے افراد کرتے ہیں جنہیں اپنی موت کا خدشہ ہوتا ہے یا وہ قریب آتی موت کی آہٹ سن چکے ہوتے ہیں۔ جولیا تو بھرپور جوان تھی اس کا اس قسم کی وصیت تیار کروانے کا بھلا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کیا اسے اپنی موت کا خدشہ تھا، کیا وہ کسی خوف میں مبتلا تھی؟'' مارکم نے

حیرت بھرے لہجے میں سوالات کیے۔

''یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی آیا تھا تاہم رابرٹ سے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔'' راجر نے کہا۔

''جولیا نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب رکھی تھی۔ اس میں اپنے دوستوں وغیرہ کے ساتھ اپنے بھائی جوزف کو بھی مدعو کیا تھا وہیں اس نے اپنی وصیت پڑھ کر سنائی دراصل جولیا اپنے بھائی مائیکل سے ناراض تو تھی مگر رابرٹ کے مطابق وہ مائیکل سے بہت محبت بھی کرتی تھی۔ جولیا چاہتی تھی کہ مائیکل اس سے میری کی خودکشی کے سلسلے میں معافی مانگے مگر مائیکل اس سلسلے میں اپنی غلطی تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری ایک بیوقوف لڑکی تھی اور اس نے خودکشی کر کے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ وہ نارمل لڑکی نہیں تھی، مائیکل کی انہی باتوں سے ناراض ہو کر جولیا بھی کبھی اسے چڑانے کے لیے عجیب و غریب حرکات کرتی رہتی تھی، یہ وصیت بھی اس نے اسی سلسلے میں تیار کروائی تھی۔ اس نے اگرچہ اس تقریب میں صرف جوزف کو مدعو کیا تھا تاہم وصیت کی ایک کاپی ڈاکٹر مائیکل کو بھی بھجوائی تھی۔ اس کا مقصد اپنے بھائی کو زک پہنچانا یا اسے یہ باور کروانا تھا کہ اس کی نظروں میں ڈاکٹر مائیکل کی کوئی اہمیت نہیں ہے شاید جولیا کے دل میں یہ خواہش شدت سے ابھرنے لگی تھی کہ اس کا بھائی اس سے میری کے سلسلے میں معافی مانگے شاید اسی لیے اس طرح کی حرکات کرتی رہتی تھی۔ رابرٹ کے مطابق وہ تھوڑی سی سنکی ٹائپ لڑکی تھی اب اس ساری صورتِ حال کو دیکھنے کے بعد یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کہ... جولیا رابرٹ سے شادی کرتی، جوزف نے اس وصیت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق جوزف رقم کے معاملے میں بھی بُری طرح پھنسا ہوا ہے اس لیے وہی اس طرح کا انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔''

''تمہاری باتوں میں وزن تو ہے۔'' مارکم نے کہا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''سر میرا خیال ہے جوزف کو باقاعدہ گرفتار کر کے اس سے تفتیش کی جائے۔''

''مگر صرف شک کی وجہ سے اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا ابھی تک ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ تم نے کہا کہ جوزف رقم کے معاملے میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے یہ کیا قصہ ہے؟''

''جی سر جب آپ نے مجھے جوزف اور ڈاکٹر مائیکل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کہا تھا تو میں اسی دن کام پر لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر کے بارے میں میں نے زیادہ معلومات حاصل نہیں کی کیونکہ موبائل لوکیشن ڈیٹا رپورٹ دیکھنے اور جولیا کی وصیت کے بارے میں جاننے کے بعد میری ساری توجہ جوزف پر مرکوز ہو گئی تھی اس لیے میں نے اس کے تقریباً سبھی قریبی دوستوں سے ملاقاتیں کر لی ہیں جن میں سے کچھ نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی شرط پر مجھے یہ معلومات فراہم کی ہیں۔ جوزف کے سبھی دوست اس سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ کینہ پرور طبیعت کا مالک ہے اور لڑائی جھگڑے کرنے میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دو بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے بہرحال جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق جوزف نے تقریباً دو ہفتے پہلے ایک کیسینو میں جوا کھیلتے ہوئے بہت بڑی رقم ہاری تھی۔ کیسینو کا مالک جوزف کا دوست ہے اور اس نے جوا کھیلنے کے لیے جوزف کو رقم ادھار دی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ جوزف کی ڈیمانڈ پر اسے چھوٹی موٹی رقمیں ادھار دیتا رہتا تھا مگر اس دن جوزف نے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے خاصی بڑی رقم ہار دی۔ وہ کیسینو کے مالک سے مزید رقم بھی مانگتا رہا مگر کیسینو کے مالک نے اسے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ ایک ماہ کے اندر اندر اسے ساری رقم واپس چاہیے بصورت دیگر وہ دوستی کا لحاظ نہیں کرے گا۔ جوزف جتنی بھی جھگڑالو طبیعت کا مالک ہو، کیسینو کے مالک سے مخاصمت مول نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے شہر کے نامی گرامی غنڈوں سے تعلقات ہیں اس لیے یہ رقم اسے ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ جولیا کی وصیت اس کے علم میں تھی اور میری رائے کے مطابق جب اسے یہ معلوم ہوا کہ جولیا، رابرٹ سے شادی کرنے والی ہے، اس نے فوراً اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا اپنا قرضہ اتارنے کے لیے اس طرح کا انتہائی قدم اٹھانا اس کی مجبوری بن گیا۔''

''جولیا کا بینک بیلنس کتنا ہے؟'' مارکم نے پوچھا۔

''ابھی تک جو معلومات میں نے حاصل کی ہیں، ان کے مطابق جولیا کا بینک بیلنس ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ ہے اس کے علاوہ اس کے زیورات ہیں جو اس نے بینک لاکر میں رکھے ہوئے ہیں، ان کی مالیت تقریباً پچاس ہزار ڈالرز ہے اور جولیا کی وصیت کے مطابق اب یہ سب کچھ جوزف کو ملے گا۔'' راجر نے جواب دیا۔

بینک نے اتنی جلدی معلومات کیسے فراہم کر دی؟ عام طور پر تو اس طرح کی معلومات ملنے میں قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے کافی دن لگ جاتے ہیں اور پھر لاکر تو خفیہ ہوتے ہیں

ان کے اندر کیا ہے یہ تو صرف کلائنٹ کے علم میں ہوتا ہے تمہیں کیسے علم ہو گیا؟'' سارجنٹ مارکم نے سوال کیا۔

سر جولیا نے اپنی وصیت میں اپنے موجودہ بینک بیلنس اور لاکر کے زیورات کا ذکر کیا ہے۔ بینک بیلنس کے بارے میں بینک سے تصدیق کر چکا ہوں کیونکہ قتل کا معاملہ ہے اس لیے بینک انتظامیہ نے تعاون کرتے ہوئے فوری معلومات فراہم کر دی ہیں۔''

''رابرٹ کا جولیا سے قریبی تعلق رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی ایک ملاقات ضروری ہو چکی ہے۔'' مارکم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''سر وہ واپس آ چکا ہے اگر آپ کہیں تو آج اسے بلا لیتے ہیں؟'' راجر نے استفسار طلب نگاہوں سے مارکم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اسے فوراً بلا لو میں اس سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔'' سارجنٹ مارکم نے تیز لہجے میں کہا۔

''سر میں اب بھی کہوں گا کہ جوزف کو گرفتار کر لینا چاہیے۔ ہم اِدھر اُدھر خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ جوزف ہی جولیا کا قاتل ہے کیونکہ اسے رقم کی اشد ضرورت تھی۔'' راجر نے پُراصرار لہجے میں کہا۔

''ویسے میں اس دن اس کے سر درد کی وجہ سے اس سے مزید پوچھ گچھ نہیں کر سکا تھا۔ تم نے اس سے پوچھا کہ وہ صبح سویرے ہی جولیا سے ملنے کیوں چلا آیا؟'' مارکم نے پوچھا۔

''جی سر میں نے اس سے پوچھا تھا اس نے جواب دیا کہ جولیا شوبز میں بہت مصروف ہو چکی تھی۔ اکثر اوقات اپنا سیل فون بھی بند رکھتی تھی اس لیے اس سے رابطہ مشکل ہو جاتا تھا اسی وجہ سے وہ صبح سویرے اس سے ملنے چلا آیا کیونکہ اس وقت جولیا گھر پر ہی ہوتی تھی۔ جوزف .... کیسینو میں رقم ہارنے کا سلسلہ تو گول کر گیا تاہم اس نے اتنا بتایا کہ اسے پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ اسی سلسلے میں اس سے ملنے آیا تھا۔'' راجر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا ذہن جوزف پر ہی مرکوز ہو گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک کی حاصل ہونے والی معلومات اسی کی جانب اشارہ کرتی ہیں مگر میں ابھی سو فیصد مطمئن نہیں ہوا میں اس پر اسی وقت ہاتھ ڈالوں گا جب میرے پاس ٹھوس ثبوت ہوگا فی الحال رابرٹ کو کہو کہ وہ جتنی جلدی آ سکتا ہے، پولیس اسٹیشن پہنچ جائے۔''

''جی سر۔'' راجر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اسے یہاں طلب کر لیتا ہوں۔ اس کی رہائش یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر وہ گھر پر ہوا تو ایک گھنٹے کے اندر اندر آ جائے گا۔''

''تم نے بتایا تھا کہ جوزف ایک دو بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے، کیا ڈاکٹر مائیکل کا بھی کوئی کرمنل ریکارڈ ہے؟'' مارکم نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''سر میں نے ویسے تو ڈاکٹر مائیکل کے بارے زیادہ معلومات حاصل نہیں کیں مگر کرمنل ریکارڈ چیک کیا تھا، اس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی رابرٹ آئے اُسے میرے آفس میں بھیج دینا۔'' مارکم نے کہا تو راجر اثبات میں سر ہلاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مارکم کو جولیا کے بوائے فرینڈ رابرٹ کی آمد کی اطلاع ملی۔ مارکم نے رابرٹ کو فوراً اپنے آفس میں طلب کر لیا۔

رابرٹ تقریباً پچیس سال کا ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت دیکھ کر ہی مارکم کو اندازہ ہو گیا کہ جولیا نے اسے اپنے مستقبل کے لائف پارٹنر کے طور پر کیوں چنا تھا رابرٹ بظاہر سیدھا سادہ سا ایک شریف نوجوان نظر آتا تھا اگرچہ مارکم نے راجر کو رابرٹ کی جولیا کے قتل والے دن کی موبائل لوکیشن حاصل کرنے کا کہا تھا تاہم بادی النظر میں اسے رابرٹ کی شخصیت میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی جس کی بنا پر وہ اسے مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کرتا۔

اس نے رابرٹ کو اپنے سامنے موجود کرسی پر بیٹھنے کا کہا اور پھر اس سے تفتیش کا آغاز کر دیا۔

''مسٹر رابرٹ آپ یہاں بلاوے کے پس منظر سے تو آگاہ ہی ہیں ویسے تو آپ کی میرے ماتحت راجر سے بات ہو چکی ہے تاہم میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے خود بھی بات کر لوں کیونکہ اب تک کی معلومات کے مطابق آپ جولیا کے بہت قریب تھے اور جلد ہی آپ کی اور جولیا کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ آپ نے جو باتیں راجر کو بتائی ہیں، وہ بھی میرے علم میں ہیں۔''

''جی بالکل۔'' رابرٹ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے خود جب اس کے قتل کی اطلاع ملی تو میں سکتے میں آ گیا تھا میں تو اس سے شادی کے لیے اپنے والدین کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک ہی مجھے چھوڑ

کر چلی جائے گی۔'' رابرٹ نے غمگین لہجے میں کہا۔

''آپ اُسے کب سے جانتے تھے؟'' مارکم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میں جولیا کو تقریباً دو سال سے جانتا ہوں۔ تاہم ہمارا افیئر شروع ہوئے تقریباً ایک سال ہوا تھا اس دوران ہمارے آپس میں جھگڑے بھی ہوئے لیکن جلد ہی صلح ہو گئی پھر ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔'' رابرٹ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا آپ شوبز کی کسی ایسی شخصیت سے واقف ہیں جو جولیا سے انتہائی نفرت کرتی ہو۔ ممکن ہے کسی نے حسد کی بنا پر اس کا مرڈر کیا ہو یا کروایا ہو؟ ماڈلنگ کے شعبے میں جن ماڈلز کا عروج کے بعد زوال شروع ہو جائے، وہ نئے ابھرتے ہوئے ناموں سے اکثر حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں بالخصوص خواتین ایسے معاملات میں بہت حساس ہوتی ہیں۔'' مارکم نے مستفسرانہ لہجے میں کہا۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے۔'' رابرٹ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''شوبز کی دنیا میں حسد رقابت جیسے جذبات عام پائے جاتے ہیں مگر میں یہ آپ کے ماتحت کو بھی بتا چکا ہوں کہ میں ایسی کسی خاتون سے واقف نہیں ہوں جس کے بارے میں یہ کہہ سکوں کہ وہ حسد میں اندھی ہو کر قتل جیسے بھیانک فعل کا ارتکاب کر ڈالے۔''

''کیا آپ شوبز کے کسی ایسے مرد سے واقف ہیں جو جولیا کو بہت زیادہ پسند کرتا ہو اور اسے آپ کا اور جولیا کا تعلق ایک آنکھ نہ بھاتا ہو۔'' مارکم نے پوچھا۔

''جولیا ایک خوبصورت اور حسین لڑکی تھی۔ اس کے عاشقوں کی تو پوری فہرست مرتب کی جا سکتی ہے مگر میں کسی ایسے عاشق سے لاعلم ہوں جو اس حد تک چلا جائے ویسے بھی اگر کوئی حاسد عاشق اس طرح کی حرکت کرتا تو اس کا ٹارگٹ میں ہوتا، جولیا نہیں۔'' رابرٹ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جولیا کے اپنے بھائی مائیکل اور جوزف کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔ کیا وہ دونوں جانتے تھے کہ جولیا جلد ہی آپ سے شادی کرنے والی ہے۔ آپ نے راجر کو جولیا کی وصیت کے بارے میں بتایا تھا جو اس نے ایک تقریب میں باقاعدہ پڑھ کر سنائی تھی اور جوزف کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔'' مارکم نے سوال کیا۔

''جوزف کے ساتھ جولیا کے اچھے تعلقات تھے بس وہ اس کی حد سے زیادہ شراب نوشی اور جُوا کھیلنے کی عادت سے نالاں تھی باقی سب ٹھیک تھا۔ جوزف کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ تاہم کبھی کبھی اس کی مالی مدد کر دیا کرتی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ اسے اپنے دونوں بھائیوں سے محبت تھی۔ ڈاکٹر مائیکل سے بھی وہ بس اپنی دوست میری کی خودکشی کی وجہ سے ناراض تھی، وہ چاہتی تھی کہ مائیکل اس سلسلے میں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے مگر اس معاملے میں شاید مائیکل پر بھی ضد سوار تھی۔ وہ میری کے معاملے میں غمگین تو ضرور ہوا تھا تاہم اپنی غلطی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور اسی وجہ سے جولیا اور اس کے درمیان مفاہمت یا صلح نہیں ہو سکی جہاں تک شادی کی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ مسٹر جوزف کو شاید اس بارے میں علم نہیں تھا مگر ڈاکٹر مائیکل کو تو جولیا نے وصیت نامے کی کاپی کے ساتھ خود یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ ایک ماہ بعد مجھ سے شادی کرنے والی ہے اور اس شادی میں صرف اپنے بڑے بھائی جوزف کو مدعو کرے گی۔ مسٹر جوزف کو ممکن ہے ڈاکٹر مائیکل سے علم ہو گیا ہو کہ جولیا ایک ماہ بعد مجھ سے شادی کرنے والی ہے بہرحال میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ جولیا نے اپنی شادی کا.... جوزف کو بتایا تھا یا ابھی بتانے والی تھی۔ وصیت میں اس نے صرف اتنا لکھوایا تھا کہ اس کی شادی کی صورت میں اس کی یہ وصیت بے اثر تصور ہو گی۔ شادی کی کوئی تاریخ درج نہیں کروائی تھی اور میرا خیال ہے کہ اس تقریب میں بھی جوزف کے سامنے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی ویسے بھی وہ جولیا کی حرکتوں سے واقف تھا اس لیے وہاں آ تو گیا تھا مگر جولیا کی وصیت کے بارے میں جان کر اس نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ یہ وصیت جولیا کی ان عجیب حرکتوں میں سے ایک ہے جو وہ اکثر کیا کرتی تھی۔''

''مسٹر جوزف کا کہنا تھا کہ انہیں جولیا کی مستقبل میں کسی شادی کا فی الحال کوئی علم نہیں ہے ممکن ہے ڈاکٹر مائیکل نے بھی اسے نہ بتایا ہو ویسے میری کا قصہ میں سن چکا ہوں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر مائیکل کا موقف درست ہے۔ اس سلسلے میں اسے کسی قسم کا دوش نہیں دیا جا سکتا۔'' مارکم نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''جی ہاں آپ کی بات بالکل درست ہے۔'' رابرٹ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ ''دراصل جولیا، مائیکل کی بڑی لاڈلی بہن تھی اس لیے چاہتی تھی کہ مائیکل اس سے معافی مانگے مگر مائیکل نے اسے سمجھانے کی تو شاید کئی بار کوشش کی مگر اس انداز میں نہیں جس انداز میں جولیا چاہتی تھی اسی

لیے وہ مائیکل سے ناراض تھی اور اسے چڑانے کے لیے اکثر اوقات اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی تھی۔''

''یہی زندگی ہے مسٹر رابرٹ' زندگی میں اکثر ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جن کے اثرات انسان کے ذہن پر تمام عمر رہتے ہیں بہر حال آپ کی آمد کا شکریہ۔ شوبز کی دنیا میں اپنے کان کھلے رکھیے گا اگر کوئی ایسی بات علم میں آئے جس کے بارے میں آپ کو محسوس ہو کہ یہ بات پولیس کے کام آسکتی ہے تو پولیس اسٹیشن بلا جھجک فون کر دیں بسا اوقات بظاہر معمولی سا کلیو... بھی بڑا کام کا ثابت ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مارکم نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ گویا رابرٹ سے سوال جواب کا سلسلہ مکمل ہو چکا تھا۔

''جی ٹھیک ہے ویسے میں شوبز کے اپنے دوستوں سے رابطہ کرتا ہوں اگر مجھے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جس سے جولیا کے مرڈر کی تفتیش میں کوئی مدد ملنے کا امکان ہوا تو میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔'' رابرٹ نے.... مارکم سے مصافحہ کیا اور پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارجنٹ مارکم خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے اس امید پر رابرٹ سے ملاقات کی تھی کہ شاید کوئی نئی کام کی بات معلوم ہو جائے مگر یہ حقیقت تھی کہ رابرٹ سے اسے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی جس سے اسے قاتل کو گرفتار کرنے میں مدد مل سکتی اب وہ بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ماتحت راجر کی رائے درست ہی ہے۔ جوزف ہی نے جولیا کو قتل کیا ہے۔ اس کی موت کا فائدہ صرف اسے ہی ہوا تھا مگر الجھن یہ تھی کہ ابھی تک وہ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت حاصل نہیں کر سکا تھا جس کی بنا پر جوزف کو عدالت میں مجرم قرار دیا جا سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ قتل کے کیس میں عدالت اسی وقت ملزم کو سزا سناتی ہے.... جب ٹھوس ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ عدالت صرف اس بنا پر جوزف کو سزا سنانے والی نہیں تھی کہ جولیا کی موت سے اسے فائدہ ہوا تھا۔

اسی لمحے راجر اندر داخل ہوا۔ ''سر میں نے رابرٹ کی موبائل لوکیشن بھی معلوم کر لی ہے۔ جولیا کے مرڈر والے دن صبح آٹھ بجے کے وقت اس شہر میں ہی نہیں تھا بلکہ اس سے دو دن پہلے بھی نہیں تھا وہ سچ بول رہا ہے وہ واقعی اپنے ماں باپ سے ملنے گیا تھا۔''

''ہاں میں نے بھی اس سے پوچھ گچھ کر لی ہے۔'' مارکم نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ اس قتل میں نہ تو ملوث ہے اور نہ اس بارے میں کچھ جانتا ہے مگر صرف موبائل لوکیشن سے ہم کسی کو بے گناہ قرار نہیں دے سکتے۔ یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ پولیس کسی بھی کیس کی تفتیش میں جرم کے وقت کی موبائل لوکیشن کو خاص اہمیت دیتی ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل نے جولیا کی طرف روانہ ہوتے وقت دانستہ اپنا موبائل فون ساتھ نہ لیا ہو قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرتے وقت ہر قاتل پہلے پلاننگ کرتا ہے فی الحال ہمارے سامنے تین نام ہیں جو جولیا کے قریبی تھے۔ ان میں جوزف بھائی ہونے کی وجہ سے اس کے قریب تھا اور رابرٹ دوست ہونے کی وجہ سے۔ ڈاکٹر مائیکل اگرچہ میری والے معاملے کی بنا پر جولیا سے میل جول رکھنے والے افراد میں شامل نہیں ہوتا مگر پھر بھی اس کا بھائی تو تھا۔ مجھے اس پر زیادہ شک نہیں ہے اور رابرٹ کے بارے میں بھی اس سے بات چیت ہونے کے بعد یقین ہو چلا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرنے جیسے سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا اس لیے فی الحال مشکوک افراد میں ہمارے سامنے ایک ہی نام ہے اور وہ نام ہے جوزف مگر میں اسے گرفتار کرنے سے پہلے اپنی مکمل تسلی کرنا چاہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل کوئی اور ہی ہو اور ہم ابھی تک ہوا میں ہی تیر چلا رہے ہوں۔ میں تمہیں کچھ نئی ہدایات دے رہا ہوں، اس بارے میں بھی معلومات حاصل کرو۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ نے راجر کو ہدایات دینی شروع کر دیں راجر نے اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ اس کی مطلوبہ معلومات کل تک حاصل کر لے گا۔ مارکم اس دن آفس سے بھی جلدی گھر چلا گیا۔ آج وہ کچھ تھکان محسوس کر رہا تھا اس لیے جلدی گھر آ گیا تھا تاکہ آرام کر سکے۔ اس رات بھی وہ جلدی سو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ جلدی اٹھ گیا تھا۔ طویل نیند لینے کے بعد اب وہ خود کو خاصا فریش محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ناشتا کیا اور پھر آفس روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنے آفس روم میں داخل ہوا تو اس کا ماتحت راجر پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ راجر نے اس کی ہدایات کے مطابق تمام معلومات حاصل کر لی تھی۔

''سر بہت اہم اور چونکا دینے والی معلومات حاصل ہوئی ہیں' مجھے لگتا ہے کہ اب یہ کیس ایک نیا رخ اختیار کرنے والا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے راجر نے ایک چھوٹا سا کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔

سارجنٹ مارکم نے پیپر اٹھایا اور پڑھنے لگا۔

''اسی لیے میں تم سے کہتا تھا کہ کبھی جلدی نہ کیا کرو۔

نوٹ پڑھنے کے بعد مارکم نے اسے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال ابھی بھی بہت سے ایسے سوالات ہیں جو وضاحت طلب ہیں۔ مجھے آج شام تک ان کی وضاحت درکار ہے اب کچھ افراد سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مارکم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ راجر بھی اس کے ساتھ تھا کچھ ہی دیر میں وہ دونوں سارجنٹ مارکم کی کار میں روانہ ہو گئے تاہم ڈرائیونگ سیٹ راجر نے سنبھال لی تھی۔

ان دونوں کی پولیس اسٹیشن میں واپسی تقریباً چار گھنٹے بعد ہوئی تاہم وہ اپنے مطلوبہ افراد سے ملنے میں کامیاب رہے تھے جب وہ دونوں واپس پولیس اسٹیشن پہنچے تو مارکم کا چہرہ کامیابی کی خوشی میں چمک رہا تھا۔ واپس آکر بھی اس نے دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور راجر کو فوراً پولیس ٹیم تیار کرنے کا کہا۔ راجر نے بھی اس کے حکم کی تعمیل میں دیر نہ لگائی اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔

''ارے مسٹر جوزف آپ بھی یہاں موجود ہیں ویسے اچھا ہی ہوا کیونکہ بعد میں آپ کو بھی بلانا ہی پڑتا۔'' مارکم جیسے ہی ڈاکٹر مائیکل کے آفس میں داخل ہوا وہاں ڈاکٹر مائیکل کے ہمراہ جوزف کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی سارجنٹ مارکم دراصل میری دوا ختم ہو گئی تھی، میں وہ لینے آیا تھا۔ ڈاکٹر مائیکل کے کلینک سے وہ دوا مجھے مفت مل جاتی ہے اس لیے میں بازار سے نہیں خریدتا مگر آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟'' جوزف نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ڈاکٹر مائیکل کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات موجود تھے۔ تاہم حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر موجود بے چینی اور گھبراہٹ کے تاثرات بھی سارجنٹ مارکم جیسے گھاگ آدمی کی نگاہوں سے نہ چھپ سکے۔

''میں تو آپ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مائیکل سے ملنے آیا ہوں۔ آپ کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا کہ آپ بھی یہاں موجود ہوں گے لیکن اچھا ہے اب ساری بات آپ کے سامنے ہی ہو جائے گی۔'' مارکم نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

ڈاکٹر مائیکل کے کلینک میں تو وہ پوری پولیس ٹیم سمیت گھس آیا تھا تاہم آفس کے اندر وہ صرف اپنے ماتحت راجر کے ہمراہ داخل ہوا تھا باقی پولیس ٹیم کو اس نے باہر کھڑا رہنے دیا تھا۔

''سارجنٹ مارکم آپ کو مجھ سے کیا کام ہے ویسے آپ آج صبح بھی میرے کلینک آئے تھے، میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ آپ نے میرے کچھ ملازمین سے بھی بات چیت کی تھی؟'' ڈاکٹر مائیکل نے کہا۔

''کیا آپ نے اپنے ملازمین سے نہیں پوچھا کہ میں نے ان سے کیا بات کی ہے؟'' مارکم نے کہا۔

''وہ ملازمین ڈے ڈیوٹی پر تھے۔ میرے آنے تک جا چکے تھے، میں نے بھی اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ آپ پوچھ گچھ کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید جولیا کے معاملے میں آپ تفتیش کر رہے تھے مگر اس انویسٹی گیشن کا میرے کلینک سے کیا تعلق ہے اور اب آپ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں، کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟''

''جی بالکل آپ اس کی وجہ جان سکتے ہیں۔ دراصل میں آپ کو آپ کی بہن مس جولیا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔ میں اپنی پوری پولیس ٹیم کے ساتھ آیا ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر مائیکل اپنی کرسی سے بے اختیار اچھل پڑا جبکہ جوزف بھی حیرت بھرے انداز میں کھڑا ہو کر مارکم کا چہرہ تکنے لگا۔

''میں بھلا جولیا کو کیوں قتل کروں گا، مجھے اس کی موت سے کیا فائدہ حاصل ہونے والا تھا۔ میں تو اس سے بہت پیار کرتا تھا، یہ الگ بات ہے کہ وہ مجھ سے ناراض تھی مگر بہن بھائیوں میں ناراضگی کوئی انہونی تو نہیں ہے۔'' مائیکل نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا بھائی کسی کو قتل نہیں کر سکتا سارجنٹ مارکم آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' جوزف نے بھی ڈاکٹر مائیکل کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ کے بھائی نے ہی جولیا کو قتل کیا ہے۔'' مارکم نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ویسے ہمارا پہلا شک تو آپ پر تھا اور شاید آج ہم آپ کو گرفتار بھی کر لیتے مگر پھر ہمیں کچھ ایسی معلومات حاصل ہوئی جس کی بنا پر ہمیں اس کیس کو ایک نئے رخ سے جانچنا پڑا۔''

''مگر سارجنٹ ہر قتل کے پیچھے ٹھوس محرکات ہوتے ہیں، مجھے جولیا کو قتل کرنے کا کیا فائدہ تھا؟'' ڈاکٹر مائیکل نے بھی مضبوط لہجے میں کہا۔

''مسٹر مائیکل آپ نے یہی بیان دیا تھا کہ آپ کو

جولیا کے قتل کی جس وقت اطلاع ملی آپ اپنے آفس میں موجود تھے اور یہ اطلاع آپ کے بھائی مسٹر جوزف نے دی تھی جس کے بعد آپ فوراً جولیا کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے تاہم ٹریفک جام کی وجہ سے آپ کو کچھ دیر ہو گئی۔ راجر نے بعد میں آپ سے تحریری بیان بھی لیا تھا اور دستخط بھی کروائے تھے۔'' سارجنٹ مارکم نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''جی میں نے بالکل سچ کہا تھا۔'' ڈاکٹر مائیکل نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں وہاں آپ کے سامنے ہی تو پہنچا تھا، کیا آپ کو وقت بھی یاد نہیں ہے۔''

''جی بالکل، مجھے سب یاد ہے یہ کون سا برسوں پرانا واقعہ ہے۔'' مارکم طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اس وقت تقریباً دس بجے کا وقت تھا جب آپ میرے سامنے وہاں پہنچے تھے آپ کے موبائل فون کا ٹائمنگ لوکیشن ریکارڈ بھی آپ کے بیان کی تصدیق کرتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو چکے تھے کہ آپ ہمارے سامنے ہی آئے تھے اور آپ کا اس مرڈر سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر کل میں نے راجر کو کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کا کہا اور جیسے ہی وہ معلومات ملی، ہمارے سامنے آپ کا اصل چہرہ آ گیا۔ دراصل آپ کی کار اپنے بھائی جوزف کی کار کے برعکس بہت جدید ماڈل کی تھی اس لیے مجھے خیال آیا کہ آپ کے بیان کی ایک اور زاویے سے تفتیش کی جائے اگر اس بار بھی آپ کلیئر نکلتے تو پھر شاید ہماری ساری توجہ مسٹر جوزف کی طرف ہو جاتی۔ آپ کی جدید کار دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ نے اس کار میں ٹریکر ضرور نصب کروا رکھا ہوگا۔ نئے ماڈل کی کاروں میں بہت جدید قسم کے ٹریکر نصب کیے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں خاصی بڑی کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ بہرحال آپ کی کار کا نمبر ہمارے پاس موجود تھا۔ راجر نے اس شہر کی ان کمپنیوں سے رابطہ کیا جو کاروں میں ٹریکر کے بزنس سے وابستہ ہیں اور وہاں سے ہمیں معلومات مل گئی وہاں سے ملنے والے ریکارڈ کے مطابق جس دن جولیا کا قتل ہوا آپ کی کار سات بجے سے لے کر ساڑھے سات بجے تک جولیا کی رہائش گاہ والے علاقے میں ہی موجود تھی۔ اتفاق سے جولیا کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کے وقت کا جو تعین کیا گیا ہے وہ بھی سات سے آٹھ بجے کے درمیان ہے جبکہ آپ ہمارے سامنے تو تقریباً دس بجے وہاں آئے تھے۔ آپ کے بیان کے اس تضاد کے سامنے آنے کے بعد ہی ہم آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہمارے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ کار میں لگے ٹریکر کی رپورٹ آپ کی کار کی جولیا کے گھر والے علاقے میں موجودگی ساڑھے سات بجے بتاتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پھر آپ کی کار وہاں سے اپنے کلینک والے علاقے میں گئی اور پھر دوبارہ تقریباً دس بجے ایک بار پھر جولیا کے علاقے میں آئی۔ ٹریکر کمپنی نے آپ کی کار کی ایگزیکٹ ٹائمنگ کے ساتھ حرکت کرنے کا پورا نقشہ ہمیں فراہم کیا ہے جس کے بعد یہ تو طے ہو گیا کہ آپ نے پولیس کو جھوٹا بیان دیا ہے اور جھوٹا بیان وہی دیتا ہے جو جرم میں ملوث ہوتا ہے مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آپ کو جولیا کے مرڈر سے آخر فائدہ کیا ہوتا تھا اس کی جائداد کا وارث تو جوزف تھا۔ جولیا نے وہ وصیت چاہے مذاق میں تیار کروائی تھی یا آپ کو چڑانے کی خاطر مگر اس کی قانونی حیثیت تو اپنی جگہ قائم تھی۔ آپ کو تو جولیا کی موت کی صورت میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملنے والی تھی پھر آپ نے اسے کیوں مارا، یہ سوال بہت اہم تھا اور مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا تھا اس لیے میں نے آپ کے کلینک کے عملے سے آج صبح بھی آ کر پوچھ گچھ کی تھی آپ کے متعلق مجھے آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ ابھی کلینک نہیں آئے اور یہ اچھا ہی تھا۔ میں بھی آپ کی غیر موجودگی میں ہی آپ کے کلینک کے عملے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال میں نے جولیا کے مرڈر والے دن کلینک میں آپ کی مصروفیات کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ عملے کے کچھ افراد نے بتایا کہ اس دن آپ رات سے ہی کلینک پر موجود تھے تاہم صبح چھ بجے سے کچھ اوپر کا وقت ہوگا جب آپ اپنی گاڑی پر کہیں گئے تھے۔ آپ کی واپسی تقریباً نو بجے ہوئی تھی تاہم آپ کلینک آفس میں صرف دس منٹ موجود رہے اور پھر اپنی گاڑی پر نکل گئے۔ آپ نے اپنے کلینک کے کچھ افراد کو جاتے ہوئے بتایا کہ آپ کی بہن جولیا کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور آپ وہیں جا رہے ہیں۔

''اب میں بتاتا ہوں جس دن جولیا کا مرڈر ہوا آپ صبح چھ ساڑھے چھ کے درمیان جولیا کے گھر روانہ ہوئے اور آدھے گھنٹے یا پینتالیس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ اتنی صبح سڑک پر رش نہیں ہوتا اس لیے آپ جلدی پہنچ گئے آپ نے اپنا موبائل فون دانستہ اپنے کلینک میں چھوڑا تھا۔ یہ بات آپ کے ذہن میں تھی کہ پولیس

موبائل لوکیشن اور وقت میچ کرے گی بس اس وقت ٹریکر ریکارڈ والی بات آپ کے ذہن میں نہیں آئی۔ بہرحال جولیا نے آپ کے بارے معلوم ہوتے ہی فوراً دروازہ کھول دیا شاید وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ اس کا بھائی اس سے میری کے سلسلے میں معافی مانگنے آیا ہے۔ آپ نے اسی غلط فہمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کے ڈرائنگ روم میں اس کے سر میں سائیلنسر لگے ریوالور سے تین فائر کیے اور پھر فوراً وہاں سے نکل آئے۔ آپ ایک ڈاکٹر ہیں فنگر پرنٹس سے بچنے کے لیے ربڑ کے دستانے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بات تو چھوٹے بچوں کو بھی معلوم ہے۔ کرائم پر مبنی فلمیں تو آپ بھی دیکھتے ہوں گے بہرحال باقی کہانی یوں ہے کہ جولیا کو مارنے کے بعد آپ اپنے کلینک واپس پہنچے مگر جوزف کے فون نے آپ کو ایک بار پھر اُدھر جانے پر مجبور کردیا۔ اس بار آپ نے اپنا موبائل ساتھ لیا اور کلینک کے عملے کو بھی بتایا کہ آپ کی بہن کا مرڈر ہوگیا ہے۔ آپ نے انہیں اپنے حق میں گواہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات شاید آپ کے سان گمان میں بھی نہیں تھی کہ جولیا کے قتل کا عقدہ اتنی جلدی کھل جائے گا یہ ایک اتفاق تھا کہ مسٹر جوزف بھی آپ کے وہاں سے نکلنے کے تقریباً چالیس پینتالیس منٹ بعد وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے جولیا کی لاش دیکھنے کے بعد پولیس کو فون کردیا ساتھ ہی آپ کو بھی فون کردیا۔ مارکم نے اس بار پوری تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا۔

مارکم نے ابھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شیلا سے ملاقات کر چکا ہے۔ ڈاکٹر شیلا سے اسے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں جس سے سو فیصد یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر مائیکل نے ہی اپنی بہن کو مارا ہے۔ ڈاکٹر شیلا کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ ڈاکٹر مائیکل نے اپنے کلینک کی ایک نرس کی خاطر اسے ٹھکرا دیا۔ ٹھکرائی ہوئی عورت بہت خطرناک ہوتی ہے سارے راز کھول دیتی ہے۔

''اب میں آتا ہوں اس سوال کی جانب کہ ڈاکٹر مائیکل نے اپنی بہن کو کیوں مارا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر مائیکل نے کلینک سے علیحدہ گولڈ کا بھی بزنس کر رکھا تھا جس میں شدید نقصان کی وجہ سے ان کو رقم کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنا کلینک بھی بینک میں گروی رکھ کر قرضہ لے رکھا ہے تاہم ابھی مزید رقم کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر شیلا سے حاصل ہونے والی ان معلومات کی بدولت میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر مائیکل نے یہ سارا کھیل جولیا کی جائداد حاصل کرنے کے لیے کھیلا ہے تاکہ اپنے کاروبار کو دوبارہ کھڑا کرسکے۔''

''آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں۔'' سارجنٹ جوزف نے پہلے سے بھی زیادہ برہم لہجے میں کہا۔ ''آپ خود بھی یہ جانتے ہیں کہ جولیا کی وصیت کے مطابق اس کی ساری جائداد کا میں اکیلا وارث ہوں پھر مائیکل کو جولیا کو مار کر کیا فائدہ؟ آپ کی باتیں اُلجھی ہوئی اور ناقابلِ فہم ہیں۔''

''یہی تو اس کھیل کا سب سے اہم نکتہ ہے مسٹر جوزف۔ جولیا کی موت کے بعد ساری جائداد آپ کو ملنی تھی۔ اگر آپ کی بھی موت واقع ہوجاتی تو پھر آپ کی دولت کا وارث تو ڈاکٹر مائیکل ہی ہوتا۔'' مارکم نے جواب دیا۔

''کیا مطلب آپ کا، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مائیکل مجھے بھی قتل کرنے والا تھا، یہ ناممکن ہے۔'' جوزف نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ غصیلے لہجے میں کہا ساتھ ہی وہ ڈاکٹر مائیکل کے چہرے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ڈاکٹر مائیکل سارجنٹ مارکم کے الزامات پر خاموش کیوں کھڑا ہے۔

''آپ کا بھائی آپ کو نہیں مارنے والا تھا مسٹر جوزف دراصل آپ خود ہی مرنے والے ہیں۔'' مارکم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے سارجنٹ، آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ آپ کافی دیر سے اول فول بولے جارہے ہیں' میں بھلا خود کیوں مرنے والا ہوں۔'' جوزف نے اس بار بے چین لہجے میں کہا۔

''آپ کا غصہ بجا ہے مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے مسٹر جوزف، آپ واقعی مرنے والے ہیں۔ میں ذرا آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر شیلا نے آپ کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے آپ کو یاد ہے آپ کو سردرد کی جو شکایت ہوتی تھی، یہ پہلی بار کب ہوئی تھی'' مارکم نے ٹھنڈے لہجے میں سوال کیا۔

''جی تقریباً تین ماہ پہلے۔'' جوزف نے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اور آپ نے اپنا چیک اَپ کس ڈاکٹر سے کرایا تھا۔'' مارکم نے دوبارہ پوچھا۔

''مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی،

میرا اپنا بھائی ڈاکٹر ہے اس لیے میں نے اپنا چیک اپ مائیکل سے کروایا تھا ویسے اس چیک اپ میں ڈاکٹر شیلا بھی موجود تھیں، انہوں نے میرے کچھ ٹیسٹ وغیرہ بھی کیے تھے۔'' جوزف نے جواب دیا۔

''تو پھر ڈاکٹر مائیکل نے آپ کو کیا بتایا؟'' مارکم نے کہا۔

''مائیکل نے مجھے کہا کہ میرے دماغ کی شریانوں میں خون کی روانی کا مسئلہ ہے۔ دوا سے ٹھیک ہو جائے گا۔'' جوزف مضطرب لہجے میں بولا۔

''نہیں مسٹر جوزف آپ کی دماغ کی شریانوں کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے دراصل آپ کے دماغ میں رسولی ہے برین ٹیومر جو لاسٹ اسٹیج پر ہے اور کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ ڈاکٹر شیلا کے مطابق آپ اب بس زیادہ سے زیادہ ایک ماہ مزید زندہ رہ پائیں گے۔'' مارکم نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو جوزف بے اختیار اچھل پڑا۔

''نہیں، نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مائیکل تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' جوزف نے اس بار بوکھلائے ہوئے لہجے میں مائیکل کو مخاطب کیا۔

''میں درست کہہ رہا ہوں مسٹر جوزف، آپ کا بھائی آپ کی بیماری کے بارے میں جانتا ہے جو دوا آپ کو دی جا رہی ہے وہ بس ایک پین کلر کی ہائی ڈوز ہے اور کچھ نہیں تاہم اس وقت ... ڈاکٹر مائیکل نے آپ کو یہ بات اس لیے نہیں بتائی کہ اس کا خیال تھا کہ کسی مناسب وقت پر آپ کو آرام سے بیٹھ کر سمجھا دے گا کیونکہ ڈاکٹر مائیکل اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ آپ کا مرض اب لاعلاج ہے۔ تو مسٹر جوزف اب آپ ساری بات سمجھ گئے ہوں گے جولیا کے قتل کے بعد ساری جائداد آپ کو ملنی تھی۔ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے آپ کو جائداد ٹرانسفر ہونے میں دو ماہ لگ جانے تھے اور آپ کے بھائی صاحب جانتے تھے کہ اس سے پہلے برین ٹیومر پھٹنے سے آپ کی بھی موت ہو جانی تھی لہٰذا بھائی ہونے کے ناتے ساری جائداد مسٹر مائیکل کی گود میں کسی پکے ہوئے پھل کی طرح خود بخود گرنے والی تھی کیونکہ آپ کے وارث تو ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔'' مارکم نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مائیکل کیا میں مرنے والا ہوں، کیا سارجنٹ مارکم نے درست کہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم رقم کی خاطر اس حد تک گر سکتے۔'' جوزف نے اس بار رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

تاہم ڈاکٹر مائیکل نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گونگا ہو گیا تھا شاید اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا کھیل بے نقاب ہو گیا ہے۔

''راجر، ڈاکٹر مائیکل کو گرفتار کر لو۔'' مارکم نے اپنے ساتھ کھڑے راجر سے کہا تو راجر نے اپنے کوٹ کی جیب سے ہتھکڑیاں نکال لیں اور آگے بڑھ کر ڈاکٹر مائیکل کے ہاتھوں میں پہنا دیں۔

یہ دسمبر کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ مارکم دھوپ سے لطف انداز ہو رہا تھا۔ پچھلے دنوں دھند کی وجہ سے خون منجمد کر دینے والی سردی پڑ رہی تھی۔ آج کافی دنوں بعد دھوپ نکلی تھی اس لیے سارجنٹ کو دھوپ کی تپش بڑا سکون دے رہی تھی۔ اسے پولیس سے ریٹائر ہوئے سات سال ہو چکے تھے۔ ان دنوں اس کا زیادہ وقت اپنے گھر پر ہی گزرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے گھر کے لان میں بیٹھا دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سامنے گھر کا مین گیٹ کھلا ہوا تھا کیونکہ وہاں اس کے لان کا مالی پودوں کو پانی وغیرہ دے رہا تھا اسی وقت اس کے گھر کے کھلے گیٹ کے عین سامنے ایک کار آ کے رکی، یہ پولیس کار تھی اس لیے سارجنٹ مارکم چونک کر سیدھا ہو گیا اسی لمحے اس نے کار سے راجر کو نکلتے دیکھا مارکم کی ریٹائرمنٹ کے بعد اب راجر بھی ترقی پا کے سارجنٹ کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ راجر نے بھی سارجنٹ مارکم کو لان میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ سیدھا لان میں آ گیا۔

''ہیلو سارجنٹ مارکم۔'' راجر نے قریب آ کر مارکم سے باقاعدہ مصافحہ کیا اور پھر سارجنٹ مارکم کے اشارے پر اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ راجر، مارکم سے اکثر ملنے آ جاتا تھا اس لیے سارجنٹ مارکم کو اس کی آمد پر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔

''کیسے ہو راجر' بڑے دنوں کے بعد ادھر کا چکر لگایا۔'' مارکم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس سر کام کی مصروفیت ہی کچھ ایسی تھی۔ آج بھی یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر آگے ایک خودکشی کے کیس کی وجہ سے آیا تھا۔ میری ٹیم وہاں سے شواہد اکٹھے کر رہی ہے تاہم کیس خودکشی کا ہی ہے اس لیے میں وہاں سے آ گیا۔ راستے میں آپ کا گھر پڑتا تھا اس لیے سوچا آپ سے بھی ملتا چلوں۔''

''ارے کیس کا اچھی طرح جائزہ لیا، ایسا نہ ہو کہ کسی نے قتل کر کے خودکشی کا ڈراما رچایا ہو۔'' مارکم نے کہا۔

"نہیں سر خودکشی کرنے والے نے اپنا دستخط شدہ خط اور موبائل ویڈیو بھی چھوڑی ہے جس میں اس نے صاف کہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہے ویسے آپ خودکشی کرنے والے شخص کو جانتے ہیں۔" راجر نے کہا تو مارکم بے اختیار چونک پڑا۔

"اچھا کس کی بات کر رہے ہو، کون ہے وہ؟" اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ کو سات سال پہلے جولیا نامی ماڈل کا مرڈر تو یاد ہوگا جس کے مرڈر کے الزام میں آپ نے اس کے بھائی ڈاکٹر مائیکل کو گرفتار کیا تھا۔" راجر نے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے ڈاکٹر مائیکل کو گرفتار کر کے عدالت میں بھی پیش کر دیا تھا۔ اس شخص نے بہت گہرا کھیل کھیلا تھا۔"

"سر اگرچہ ہم نے ڈاکٹر مائیکل پر مضبوط کیس بنایا تھا مگر اس نے بہت مہنگے وکیل کا بندوبست کیا تھا۔ وکیل نے عدالت میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ صرف ٹریکر کمپنی کی رپورٹ اور دستخط شدہ بیان کے تضاد پر کسی کو مجرم ثابت نہیں کیا جا سکتا ہم آلۂ قتل بھی برآمد نہیں کر پائے تھے اور سب سے بڑھ کر عدالت میں جوزف کی گواہی بھی پیش نہ کر پائے تھے کیونکہ اپنی بیماری کا علم ہونے کے بعد اس نے دوسرے اسپتال سے اپنا چیک اپ کروایا تھا جس کے بعد اسے اسپتال ہی میں داخل کر لیا گیا۔ اور اسی جگہ اس کی موت ہو گئی۔ اس کا برین ٹیومر پھٹ گیا تھا اس لیے ہمارا کیس کچھ کمزور ہو گیا۔ عدالت نے ڈاکٹر مائیکل کو عمر قید کی سزا تو نہ سنائی مگر بالکل بری بھی نہ کیا اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے کم سزا سنائی گئی تھی صرف چھ سال کی سزا سنائی گئی۔ پچھلے سال وہ جیل سے چھوٹ گیا تھا تاہم اس دوران بینک نے اس سے اپنا قرضہ وصول کرنے کے لیے اس کا کلینک نیلام کروا دیا تھا جو رقم اس کے پاس بچی وہ مہنگے وکیل کی فیس میں خرچ ہو گئی اس لیے وہ جب جیل سے باہر آیا تو بالکل کنگال ہو چکا تھا اور یہ خودکشی کرنے والا وہی ڈاکٹر مائیکل تھا سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے اسے کہیں نوکری بھی نہیں مل رہی تھی جس کے بعد اس نے آج خودکشی کر لی۔ مجھے اس کی شناخت اس کی جیب میں موجود کاغذات سے ملی ورنہ یہ حقیقت ہے کہ میں اس کی لاش دیکھ کر اسے نہ پہچان پایا تھا۔ چھ سال کی جیل نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کی وضع قطع ہی بدل گئی تھی۔"

"مگر جوزف کی موت کے بعد جولیا کی جائداد تو اسے ہی ملی ہوگی پھر وہ کنگال کیسے ہو گیا۔ تم نے خود بتایا کہ جوزف کی موت ہو گئی تھی تو اس کا واحد وارث تو ڈاکٹر مائیکل ہی تھا اس حساب سے دیکھا جائے تو اس نے جولیا کو مار کر اس کی دولت حاصل کرنے کا جو پلان بنایا تھا، وہ اس میں کامیاب رہا اگرچہ چھ سال کی سزا کاٹنے کے بعد۔" مارکم نے پہلے سے بھی زیادہ حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"جوزف شراب کے نشے میں دھت رہنے والا ایک بیوقوف انسان تھا مگر اتنا بیوقوف بھی نہیں کہ اپنے بھائی کا منصوبہ کامیاب ہونے دیتا شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ مائیکل قانونی پیچیدگیوں کا فائدہ اٹھا کر جلدی چھوٹ سکتا ہے اس لیے اس نے بستر مرگ پر ایک وصیت تیار کروائی جس کے مطابق جولیا کی جائداد جیسے ہی اس کے نام ٹرانسفر ہوتی، اس وصیت پر عمل درآمد ہو جاتا۔ وصیت کے مطابق جوزف کے مرنے کی صورت میں جولیا کی جو جائداد اسے حاصل ہوتی اس سے اسپتال کا بل، اس کے کچھ قرض خواہوں کے پیسے ادا کرنے کے بعد باقی تمام رقم ایک ٹرسٹ کے نام چلی جاتی جوزف مر گیا مگر جولیا کی جائداد جیسے ہی اس کے نام ٹرانسفر ہوئی اس کی وصیت کے مطابق اسپتال اور قرض خواہوں کی رقم دینے کے بعد باقی ساری رقم ایک فلاحی ادارے کو دے دی گئی۔ ڈاکٹر مائیکل کو جیل سے چھوٹنے کے بعد ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکی اور مکمل طور پر کنگال ہونے کے بعد .... اس نے آج خودکشی کر لی۔ میں کیونکہ اس کے سارے پس منظر سے واقف ہوں اسی لیے جانتا ہوں کہ اس نے خودکشی ہی کی ہے، یہ مرڈر کا کیس نہیں ہے اس نے جو اپنی بہن جولیا کے ساتھ کیا تھا شاید یہ قدرت کی طرف سے اسے سزا ملی ہے، مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں۔" راجر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جولیا کی وصیت کی وجہ سے ہی ڈاکٹر مائیکل نے اسے قتل کیا تھا کیونکہ وہ اس وصیت کا فائدہ اٹھا کر دولت حاصل کرنا چاہتا تھا اور آج جوزف کی وصیت کی وجہ سے وہ ایک پھوٹی کوڑی نہ حاصل کر سکا، الٹا خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا عجیب قاتل وصیت تھی۔" مارکم نے کہا تو راجر اس کی قاتل وصیت کی انوکھی منطق پر بے اختیار ہنس پڑا۔

❖❖❖

مظلوم رفاقت

رو بینہ رشید

جذباتی... ذہنی مریض کی ذات سے کیا کیا یادیں جڑی ہوتی ہیں... عورتوں کا قرب حاصل کرنے کے طریقے... اندازِ محبت... ملاقات و تعلقات کا کھیل... ہر دم اسے جینے اور مرنے کا ہنر سکھا رہے تھے... گویا جسم میں شرارے دوڑ رہے تھے... نشاط پرستی کا نقارہ بج رہا تھا... جنسی اور عیش پرستی کے جنون میں اَن دیکھی دلدل میں دھنستے جارہے تھے... جنونی... دیوانے شکاری کی لرزہ خیز داستان... اسے ہر پل ایک نئے شکار کی تلاش و جستجو رہتی تھی... اس کی تڑپ... بے قراری... شدت سے سوا تھی...

نازنین احمد کی آنکھ کھلی تو وہ وہیں تھی۔

اس نیم اندھیرے کمرے کی ٹھنڈی زمین پر......

اس کے ہاتھ اور پیر موٹی مضبوط ٹیپ سے سختی سے بندھے ہوئے تھے۔ ذرا سی حرکت پر ٹیپ اسے اپنے گوشت میں گھستی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے اردگرد بھیانک سکوت طاری تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا میں کہیں زندگی باقی نہ رہی ہو۔ اس نے خود کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر درد و تکلیف کی شدید لہر نے اسے جھنجوڑ دیا۔ کندھے پر موجود تازہ زخم سے اب بھی ہلکا ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکی سی برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے زندگی میں خود کو کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ شروع میں اسے یہ امید تھی کہ کوئی نہ کوئی اسے یہاں سے ڈھونڈ نکالے گا اور اذیت کی یہ وحشت ناک رات ختم ہو جائے گی مگر اب ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی یہ امید دم توڑتی جارہی تھی۔ ’شاید یہی اس کا انجام تھا‘ اس نے یاسیت سے سوچا۔ ”اللہ میری مدد کرے۔“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بڑبڑائی۔ اپنی آواز اُسے خود اجنبی محسوس ہورہی تھی۔

اس نے اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرا تھا۔ اس میں ایک جانب ایک بیڈ اور صوفے وغیرہ بھی موجود تھے مگر کمرے کے اس کونے میں جہاں وہ موجود تھی وہاں کسی قسم کا کوئی فرنیچر موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے عین سامنے دیوار پر ایک قدِآدم آئینہ ضرور لگا ہوا تھا۔ اس ملگجی روشنی میں بھی وہ اس میں خود کو دیکھ سکتی تھی۔

یہ...... یہ وہ تو نہیں تھی۔

اس کی سفید گلابی مائل رنگت سنولا چکی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے موجود تھے۔ چہرے پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشان اور نیل تھے اور اس کے لمبے سنہرے بھورے بال جو

اس کی پہچان ہوا کرتے تھے، وہ اب نہیں تھے‘ اس نے انہیں بُری طرح کاٹ ڈالا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے بالوں میں اسے اپنا آپ نہایت بُرا لگ رہا تھا۔ اب وہ کبھی پہلے والی نازنین احمد نہیں بن سکتی تھی۔ اس نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بس سونا چاہتی تھی۔ صرف نیند ہی میں وہ زندگی کے اس بھیانک منظر کو بھول سکتی تھی۔

’’میں ہی کیوں؟ آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟‘‘ وہ دیوانوں کی طرح بولی۔ ’’میں مرنا نہیں چاہتی میرے اللہ...... میں جینا چاہتی ہوں۔‘‘

وہ روئے جا رہی تھی۔ اس باران آنسوؤں میں دکھ، اذیت، خوف اور تکلیف کے ساتھ ساتھ پچھتاوا اور ندامت بھی شامل تھی۔ وہ اللہ سے شکوہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی مگر اس نے تو کبھی گمان یا تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ جس کے ساتھ دن رات چیٹنگ کر رہی تھی، وہ بھی اس کے ساتھ یہ سب کچھ بھی کر سکتا ہے۔

مراد ایک دراز قامت، وجیہہ اور کسرتی جسامت والا شخص تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس سے دوستی کر سکتی تھی۔ نازنین نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ اس سے فیس بک پر ملی تھی اور اس نے اسے اپنی فرینڈز لسٹ میں شامل کر لیا تھا۔ وہ بہت نرم مزاج اور خیال رکھنے والا شخص تھا۔ نازنین کے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کرنے کو اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ اس نے اسے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خاص لڑکی ہے۔ شروع میں اس نے اسے اپنی عمر اکیس سال بتائی تھی مگر بعد میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ چالیس سال کے قریب تھا۔

اچانک سیڑھیاں اترتی قدموں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا دل حلق میں آ گیا۔ وہ...... وہ واپس آ گیا تھا۔ وہ خوف سے لرزنے لگی۔

’’ہیلو ڈارلنگ...... دیکھو میں آ گیا ہوں۔‘‘ اس کی آواز سن کر نازنین نے آنکھوں کو سختی سے بند کر لیا۔ اس کی آواز اور لہجہ نارمل تھا مگر اس پر نفرت گویا پھن کاڑھ کر بیٹھی محسوس ہو رہی تھی۔ ’’چلو...... چلو...... اداکاری مت کرو...... ہر روز ایک ہی ڈراما پسند نہیں ہے مجھے......‘‘ وہ اس کی کمر پر ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ٹھوکر کی وجہ سے نازنین کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔

’’اوہو، تم تو ڈر گئیں...... چلو کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’تمہیں معلوم ہے کہ آج ایک بہت خاص دن ہے۔‘‘ وہ ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے چاقو سے اس کے ہاتھوں اور پیروں پر لپٹے ٹیپ کو کاٹتا جا رہا تھا۔

’’نن...... نہیں......‘‘

’’یہی تو مسئلہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا......

آخر تمہارا دماغ رہتا کہاں ہے۔'' وہ بولا۔ ''آج تمہاری سالگرہ ہے اور آج میں تمہیں ایک زبردست تحفہ دینے والا ہوں۔''

''میری سالگرہ۔'' وہ بڑبڑائی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج اس کی سالگرہ نہیں تھی، وہ اپنی سالگرہ کے اگلے روز ہی تو اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ اس کی فرمائش پر وہ کسی کو بھی بتائے بغیر اس کے ساتھ اس فارم ہاؤس تک آئی تھی، یہ اور بات ہے کہ اس نے اسے راستے میں بے ہوش کردیا تھا۔

''اب زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کھڑی ہو جاؤ۔'' نازنین کے ہاتھ اور پیر سن ہو رہے تھے وہ بمشکل کھڑی ہوئی۔ اسے اپنا توازن قائم کرنے میں کئی لمحے لگ گئے تھے۔ وہاں سے بھاگ جانے کا خیال کسی سونامی کے مانند اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہوگا۔ پچھلی بار اس کی ایسی ہی کوشش پر اس نے اس کی ناک توڑ دی تھی۔ وہ سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''مراد......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''کیا، میں نے تمہیں پتہ نہیں بتایا کہ میرا نام نہیں لیتا ہے۔'' وہ غرایا۔ ''میں نے کیا نہیں دیا تمہیں مگر تم میری ذرا سی بھی عزت نہیں کرتیں، تمہاری آنکھوں میں، میں نفرت دیکھ سکتا ہوں۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے باتھ ٹب میں لگے نل کو کھول دیا۔ ٹب کے بھرتے ہی وہ باہر آگیا اور گم صم کھڑی نازنین کو گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے گیا۔

''تمہارے دماغ کو صفائی کی ضرورت ہے۔'' اس نے بالوں سے نازنین کو پکڑ کر اس کے سر کو کپڑے کی گڑیا کے مانند ٹب میں غوطہ دیا۔ نازنین کی سانس رکنے لگی۔ وہ مسلسل ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ مراد نے اس کے سر کو پانی سے نکالا تو وہ بے حال ہو چکی تھی۔

''تمہیں سالگرہ کا تحفہ چاہیے؟'' وہ سفاکی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ لمحے بھر میں اس کے دوسرے ہاتھ میں سیاہ اسٹن گن نظر آئی۔ ''تمہیں معلوم ہے، میں تم سے بور ہوگیا ہوں۔''

گن دیکھ کر نازنین کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ الیکٹرک گن اسے موت سے قبل مفلوج کردے گی۔ اس نے جھٹکا دے کر خود کو مراد کی گرفت سے بچانے کی کوشش کی۔ زندگی بچانے کی اس کی تمنا اتنی طاقتور تھی کہ اس کے دھکے نے مراد کو دوسری جانب دھکیل دیا مگر سنبھلتے ہی اس نے اس کی گردن کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ الیکٹرک شاک نے یکلخت نازنین کے دماغ کو فریز سا کردیا۔ اس کا جسم اس کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہوتا جارہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر جا گرتی، مراد نے اسے پکڑا اور ٹب میں دھکا دے دیا اب وہ ہاتھ پیر مارنے کی سکت بھی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کے سر کو پانی میں ڈبو کر دبا رہا تھا۔ نازنین کی سانس رکتی جارہی تھی۔ وہ ٹب اس کے لیے موت کا سمندر بن گیا تھا جس کے پار اترنا اب اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ ایک غلطی اس کے لیے موت کا سامان بن گئی تھی۔

''گڈ بائے نازنین...... گڈ بائے......'' اس کی دم توڑتی سماعت سے ٹکرانے والی آخری آواز جو دور پانی کے اس پار سے آرہی تھی، مراد کی تھی۔

☆☆☆

فون کی تیز آواز بالآخر اسے نیند کی آرام وہ وادی سے باہر کھینچ لائی۔ وہ ایک لمحے ساکت لیٹی رہی پھر اس نے آلکسی سے بیڈ سائڈ سے فون اٹھایا اور اسکرین پر نظر ڈالی جہاں کوئی نمبر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ عام طور پر رات گئے آنے والی نامعلوم کالز ریسیو نہیں کرتی تھی مگر جب سے اس غریب نگر باصلاحیت لڑکیوں کے لیے کام کرنے والی ایک این جی او کے لیے سیلف ڈیفنس (دفاع) کی میٹوری ذمے داری سنبھالی تھی، وہ یہ سوچ کر اجنبی کالز اٹھالیتی تھی کہ شاید ان میں سے کسی کو اس کے مشورے یا مدد کی ضرورت ہو۔

''ہیلو......'' وہ بولی۔ نیند سے اچانک جاگنے کی وجہ سے آواز حلق میں پھنس سی رہی تھی۔ وہ کھنکھاری اور پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''ہیلو۔''

دوسری جانب سے ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' اس بار اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

دوسری جانب اب خاموشی طاری تھی۔ صرف بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چند لمحے موبائل کو گھورتی رہی پھر فون بند کردیا۔ اس قسم کی پُراسرار کالز اس کے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ کسی بھی اٹارنی یا سرکاری وکیل کے لیے اس طرح کی کالز قدرے معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔

''شاید فون کی ایجاد سے پہلے وکیلوں کو ٹیلی گرام یا خطوط موصول ہوتے ہوں گے جن پر ''بھاری سانسیں...... وقفہ...... بھاری سانسیں...... وقفہ......'' تحریر ہوتا ہوگا۔'' اس نے جل کر سوچا پھر اس نے بیڈ سائڈ کی دراز سے ٹوٹ

بک نکال کر خاموش فون کال کی تاریخ اور وقت نوٹ کیا تاکہ بعد میں ریفرنس کے طور پر محفوظ رہے۔ ڈائری دراز میں ڈال کر وہ دوبارہ لیٹ گئی مگر اب نیند اس کی آنکھوں سے دور جا چکی تھی۔ کئی کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بالآخر اٹھ بیٹھی۔ اب اسے نیند آنے والی نہیں تھی۔ یوں بھی کسی اہم کیس کی شنوائی سے پہلے کی رات اسے نیند کم ہی آتی تھی اور کل اس کا کیس کورٹ میں لگا ہوا تھا۔ وہ بستر سے کھڑی ہو گئی اور بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے اسٹڈی کی جانب بڑھ گئی۔ میز پر مقدمے کی فائل موجود تھی۔ اس نے فائل کھولی جس میں لگی نازنین احمد کی لاش کی تصاویر ہر بار اسے جھنجوڑ ڈالتی تھیں۔ اس کے جسم اور چہرے پر موجود زخم، نیل، نشانات اور آنکھوں میں جمی دہشت قاتل کی سفاکی کی کہانی بیان کرنے کے لیے کافی تھے۔ اسے کل کورٹ میں اس احساس کو جیوری کے سامنے ایسے پیش کرنا تھا کہ وہ بھی اس تکلیف کو محسوس کر سکیں۔ اس کا دل اس مظلوم لڑکی کے لیے بہت افسردہ تھا۔

پولیس نے اس کی لاش کو شہر سے دور ایک فارم ہاؤس سے برآمد کیا تھا۔ اسے الیکٹرک گن کا نشانہ بنایا گیا تھا، بعد میں اس کی لاش کو بے دردی سے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ قاتل مراد شہزاد موقعِ واردات سے گرفتار ہوا تھا۔ گرفتاری کے باوجود اس کا رویہ مسلسل تضحیک آمیز تھا جیسے اسے یقین ہو کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ عام حالات میں شاید یہ حقیقت بھی ہو، وہ امیر تھا بہت زیادہ امیر...... ایک بڑے رئیل اسٹیٹ ٹائیکون کا بیٹا تھا اور مراد انکارپوریشن کا مالک۔ اس کے پاس اثر و رسوخ بھی تھا اور نوٹوں کی طاقت بھی۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے شہر کے چار بہترین وکلا کا پینل بنایا تھا مگر اس سب کے باوجود اس کے پاس مراد شہزاد کے خلاف اس قدر ثبوت موجود تھے کہ اس کی ضمانت تک کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا مگر اس کے باوجود وہ کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی تیاری مکمل نہ ہو۔ اس نے فائل بند کی۔ کچن میں جا کر اپنے لیے کافی تیار کرتے ہوئے بھی اس کے ذہن پر نازنین کیس سوار تھا۔

''ریلیکس سارہ۔'' وہ اپنے آپ سے بولی۔ ''تمہارے پاس اس درندے کے خلاف بہت ثبوت ہیں، وہ کتنے ہی وکیل کیوں نہ کر لے، وہ بچ نہیں سکتا...... یہ کیس تم ہی جیتو گی۔ مراد کو ہر صورت سزا ہو کر رہے گی۔''

'اور اگر وہ بچ نکلا......؟' ایک سوال بجلی کے مانند اس کے ذہن میں چمکا۔

''تو پھر میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ بے اختیار غرائی۔ نازنین کی لاش کے تصور نے اسے غصے سے بھر دیا تھا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا تھا جب بھی کوئی گناہ گار عدم ثبوت یا قانونی گہرائیوں کا فائدہ اٹھا کر بچ کو مات دیتا نظر آتا تھا، ہر بار اس کے اندر شدت سے یہ خواہش ابھرتی تھی کہ وہ انہیں خود کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔

''یہ میں کیا سوچ رہی ہوں، میں اسسٹنٹ اٹارنی ہوں، سرکاری وکیل...... مولا جٹ نہیں ہوں۔'' اس نے خود کو گھر کا اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

صبح کے اخبار میں مراد شہزاد اور اس قتل کی اسٹوری موجود تھی۔ رپورٹ میں مراد شہزاد اور نازنین کے علاوہ اس کی بھی تصویر موجود تھی۔ یہ تصویر غالباً کورٹ سے باہر نکلتے ہوئے بنائی گئی تھی۔ اسے بناتے ہوئے اور چھاپتے ہوئے کسی نے اس کی اجازت لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے اپنی تصویر کو گھور کر دیکھا۔ اس کے خوب صورت گہرے بھورے بال اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ سرمئی مائل سیاہ آنکھوں میں اعتماد اور مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ رپورٹر نے اسے 'خوب صورت ترین اٹارنی' کا کیپشن دیا تھا۔ رپورٹ پڑھتے ہوئے اس کی پیشانی پر مزید بل پڑ گئے تھے۔ اس میں کیس کے بارے میں ابتدائی معلومات کے بعد خود اس کے بارے میں کافی تفصیلات موجود تھیں۔

'نہ جانے یہ لوگ ذاتیات میں اس قدر کیوں گھس جاتے ہیں۔' اس نے غصے سے سوچا۔ یوں بھی وہ اس کیس کے بارے میں تھوڑا متفکر ہو رہی تھی۔ مراد شہزاد اور اس کے وکلا کی باڈی لینگویج اور ان کے چہروں کے تاثرات اسے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے جبکہ انہیں پریشان ہونا چاہیے تھا۔

پولیس کے پاس لاش اور اس سے متعلق تمام شواہدات موجود تھے۔ قاتل موقعِ واردات سے گرفتار ہوا تھا۔ اس کے قریبی فارم ہاؤس سے کیے گئے فون پر پولیس وہاں پہنچی تھی۔ اسٹن گن پر اس کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ اس کا ڈی این اے کرایا جا چکا تھا۔ یہ ایک اوپن اینڈ شٹ کیس تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور اخبار میز پر ڈال کر کھڑی ہونے لگی۔ اسی وقت موبائل گنگنا اٹھا۔ یہ کال اس کے دفتر سے تھی۔

''یس......''

''سارہ تمہیں فوراً دفتر پہنچنا ہوگا۔'' یہ اس کا باس شرجیل خان تھا۔

''فوراً مگر یہ کیا کچھ زیادہ جلدی نہیں ہے......؟ کیا اس کا تعلق آج کی کارروائی سے ہے؟''

''ہاں کسی حد تک...... ہمیں جج سے دس بجے اس کے چیمبر میں ملنا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ انہیں کچھ ضروری بات کرنا ہے۔''

''اوہ......'' اس نے ناک سکیڑی۔ یہ کوئی اچھی نشانی نہیں تھی۔ ''او کے میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔'' وہ راستے بھر اسی بارے میں سوچتی رہی تھی۔ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس کے لیے جج کو ہمیں اپنے چیمبر میں بلانا پڑا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر مراد شہزاد کے وکیلوں کی فوج پر پڑی تھی۔ وہ چاروں سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ میز کے سامنے موجود کرسی پر اس کا باس شرجیل خان براجمان تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی جج صاحب کمرے میں داخل ہوئے، ان سب نے اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

''تشریف رکھیے۔'' جج پرویز اقبال نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہاں آپ سب کی طلبی کی وجہ ایک نیا ثبوت ہے جو میرے سامنے پیش کیا گیا ہے جو جیوری کے ایک ممبر کے پیسے کے لین دین میں ملوث ہونے سے متعلق ہے۔'' وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ جج کے مطابق اسے ملزم کو مجرم قرار دینے کے لیے پیسے کی آفر کی گئی ہے۔

''سر! اگر آپ کا خیال ہے کہ استغاثہ یا ہمارے دفتر میں سے کسی نے یہ کام کیا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک اوپن اینڈ شٹ کیس ہے۔'' شرجیل خان نے کہا۔

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس بات کے بعد مقدمے پر نظر ثانی ہونی چاہیے۔'' وکلائے صفائی میں سے ایک کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میڈیا پہلے ہی ہمارے کلائنٹ کو وحشی درندہ، سفاک قاتل جیسے القابات سے نواز رہا ہے۔''

''آپ تشریف رکھیے۔'' جج نے کہا۔ ''میں نے جیوری میں ایک نئے جج کو طلب کر لیا ہے۔ ہم مذکورہ جج کو جیوری سے ہٹا رہے ہیں۔''

''مگر سر اب یہ عدم اعتماد کا مسئلہ بن چکا ہے، ہمیں کیا معلوم کہ اس معاملے میں کون، کون ملوث ہو سکتا ہے۔'' وکیل ارسلان شاہ نے سر ہلا کر کہا۔ اس کے اس جملے پر سارہ نے اسے بُری طرح گھورا۔

''آخر ہم کسی پر کوئی روپیا کیوں خرچ کریں گے...... غیر اخلاقی اور بُرا ہونے کے علاوہ ہماری کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ آخر ہم ایک جیتے ہوئے کیس میں گڑبڑ کیوں ہونے دیں گے۔'' میں نے ارسلان شاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مس سارہ آپ شواہدات پر حد سے زیادہ یقین اور جیوری کی طاقت پر بے یقینی کا اظہار کر رہی ہیں۔ کیس ہارا ہوا ہے یا جیتا ہوا، اس کا فیصلہ کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔'' جج نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور مسٹر شرجیل خان دنیا میں کوئی اوپن اینڈ شٹ کیس نہیں ہوتا، شواہدات کو ثابت کرنا پڑتا ہے کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لیے گفتگو میں محتاط رہیں۔''

شرجیل خان کے سر ہلانے کے بعد وہ مزید بولا۔ ''ہم اس حوالے سے مکمل تفتیش کریں گے۔ ایک نیا جج شامل کیا جائے گا اور مقدمے کی کارروائی پر اثر نہیں پڑنے دیا جائے گا۔ آپ میں سے کسی کو میرے فیصلے سے اختلاف ہے؟''

مراد کے چاروں وکلا نے چند لمحے آپس میں گفتگو کے بعد جج کے فیصلے کو قبول کر لیا۔

''گڈ، اب یہ کیس معمول کے مطابق چلایا جائے۔ میں آپ سب کو اپنے کورٹ روم میں ایک گھنٹے بعد دیکھنا چاہتا ہوں اور جیسے ہی ہمیں معلوم ہوگا کہ اس ساری گڑبڑ کے پیچھے کون ہے اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔'' ان جملوں کے ساتھ ہی میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ عدالت کے کوریڈور میں داخل ہوئی تو اسے ہر طرف افراتفری سی نظر آئی۔ پولیس والے آ اور جا رہے تھے۔ وکلا بھی مختلف ٹولیوں میں چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کاغذات تھے اور آنکھوں میں اُلجھن نظر آ رہی تھی۔

سارہ نے شرجیل خان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جواب میں اس نے کندھے اچکائے۔ اسی وقت اسے سامنے سے ساجد صادق آتا نظر آیا۔ وہ لا کالج میں اس کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا۔

''ساجد...... کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے پوچھا۔

ساجد صادق نے سنجیدگی سے پہلے سارہ اور پھر شرجیل کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔

''فارنسک کا سینئر ٹیکنیشن اور آفیسر عالم فردوس آج

سخت نشے کی حالت میں کام پر پہنچا ہے۔ اس کے لاکر میں کار میں اور اس کے گھر میں ہر جانب ہیروئن پائی گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ وہ کافی عرصے سے نشہ کر رہا تھا۔''

''تو......؟'' سارہ نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسے ملازمت سے نکال دیں گے اور کسی نئے شخص کو رکھ لیں گے۔''

''بالکل......'' ساجد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''مگر بات صرف اتنی نہیں ہے سارہ، کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کب سے یہ سب کر رہا ہے اس لیے اس نے اس سال جتنے شواہدات اور ثبوت جمع کیے تھے، ان سب کو نل (بے کار) قرار دے دیا گیا ہے جس کا مطلب تم خوب سمجھتی ہو، وہ قسمیں کھا رہا ہے کہ اس نے کبھی نشہ نہیں کیا اور یہ سب جو ہوا ہے، وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں۔''

''یعنی جتنے ڈی این اے وغیرہ سب......'' شرجیل خان نے پوچھا۔

''ہاں، اس کے جمع اور کیٹلاگ کیے تمام ثبوت اب کسی عدالت میں استعمال نہیں کیے جاسکیں گے۔'' ساجد نے کہا۔

''ایک سال میں اس نے سیکڑوں ٹیسٹ کیے ہوں گے اور اب اس ایک واقعے کی وجہ سے وہ سب بے کار بن گئے تھے۔ نہ جانے کتنے مجرم اس وجہ سے آزاد ہو جائیں گے۔'' سارہ نے سوچا پھر اس نے وہیں کھڑے، کھڑے اپنا چھوٹا سا بریف کیس کھول کر کاغذات کو دیکھنا شروع کیا۔ بالآخر مطلوبہ کاغذ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

''تم نے کیا نام لیا......؟'' اس نے ساجد سے پوچھا۔

''عالم فردوس۔''

''نہیں......'' وہ یکلخت چیخ سی پڑی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس کی تیز آواز پر آتے جاتے لوگ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ مراد شہزاد کے کیس کی فارنسک رپورٹ عالم فردوس نے ہی تیار کی تھی جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہمارے 'اوپن اینڈ شٹ' اور 'جیتے ہوئے کیس' کی دیواریں ڈھے گئی تھیں۔

''سارہ......راستے نکل آئیں گے۔'' شرجیل خان نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ سارہ نے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ جھٹکا پھر شرمندگی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کا ذہن اس کے قدموں سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عالم فردوس درست کہہ رہا ہوگا۔ اسے یقیناً اس سارے چکر میں پھنسایا گیا ہے اور مراد شہزاد ہی اس کا ذمے دار ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ہیروئن کا بندوبست کرنا اور یہ سارا سیٹ اپ کھڑا کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو سکتا تھا۔ اب جبکہ ثبوتوں کی عمارت میں دیمک لگ گئی تھی۔ وہ اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ اس نے سوچا۔ وہ اسٹن گن ان کا ثبوت بھی پھر اس کے پاس ایک گواہ بھی تھا۔ وہ پڑوسن جس نے پولیس کو خبر دی تھی یعنی ابھی فلم ختم نہیں تھی۔ اسے نازنین احمد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔

☆☆☆

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس کیس کے شواہدات پر عالم فردوس نے کام کیا تھا اور اب وہ بحیثیت ثبوت پیش نہیں کیے جاسکتے۔'' جج صاحب نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ان حالات میں آپ کو اگر آپ چاہیں تو نئی تاریخ دے سکتا ہوں۔''

''نہیں یور آنر......'' مراد شہزاد کے وکیل ارسلان شاہ نے کہا۔ ''ہم نئی تاریخ نہیں چاہتے۔'' اس نے یہ جملہ مکمل کرنے سے قبل مراد کی طرف دیکھا تھا جس نے گردن کی ہلکی سی جنبش سے اسے بات کرنے کی اجازت دی تھی۔

ان کے جواب کے بعد جج نے سارہ کی طرف دیکھا۔ اس نے چند لمحے اپنے پاس موجود کاغذات پر نظر ڈالی۔ اس کی گواہ عدالت میں موجود تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی گواہی کافی ثابت ہوگی۔

''نہیں یور آنر...... مجھے نئی تاریخ درکار نہیں ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔

شرجیل خان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جونیئر انٹرن مجید بھی تھا جو کارروائی کے نوٹس لے رہا تھا۔ شرجیل خان اہم کیسز کی شنوائی پر موجود رہنا پسند کرتا تھا اور یہ کیس تو سال کا سب سے بڑا اور مشہور کیس تھا۔ سارہ کو اس کیس میں خود کو ثابت کرنا تھا۔ اس کا نام، ساکھ اور ملازمت کا انحصار اس کیس میں اس کی کارکردگی پر تھا۔

کمرۂ عدالت مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ وہاں رپورٹرز اور میڈیا سے متعلقہ افراد کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ وہاں نازنین احمد کے خاندان سے اس کی بہن، بہنوئی موجود تھے۔ نازنین کی لاش برآمد ہونے کے چھ ماہ...... بعد

اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد پہلے سے حیات نہیں تھے۔ وہ صرف دو ہی بہنیں تھیں اور عدالت میں اس کی بہن اور بہنوئی کے سوا کبھی بھی کوئی اور رشتے دار نظر نہیں آیا تھا۔ وہاں مراد شہزاد کی والدہ اور کئی رشتے دار بھی موجود تھے۔ دلچسپی لینے والے شہریوں اور این جی اوز سے بھی کچھ لوگ کیس کی کارروائی سننے آتے تھے۔ سارہ نے ایک نظر کورٹ روم پر ڈالی، اسے ان سب کو فراموش کر کے اپنی پوری توجہ اپنی گواہ اور جیوری پر رکھنی تھی۔

دن کی پہلی گواہ مراد شہزاد کی والدہ تھیں جنہوں نے کورٹ کے سامنے عہد لیا کہ ان کے بیٹے نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ سارہ نے ان سے مختصر سوال کیے مگر اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں جو اسے گڑبڑا رہی تھیں۔

اس کے بعد خالدہ سرور کی باری تھی۔ وہ وہی پڑوسن تھی جس نے پولیس کو کال کی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ دہری جسامت والی اس خاتون کے چہرے پر عجیب سی سختی تھی جبکہ آنکھیں دھندلائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ قدرے نروس نظر آرہی تھی۔ اس کے بیان میں یقین کی جگہ 'شاید'، 'ہوسکتا ہے' اور 'اس طرح' کے الفاظ زیادہ استعمال ہورہے تھے جو کہ مقدمے کے لیے مثبت چیز نہیں تھی۔

''جس رات قتل ہوا آپ نے وہاں اس فارم کے اردگرد کوئی غیر معمولی چیز یا حرکت دیکھی تھی؟'' سارہ نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں نے وہاں کالے رنگ کی وہ شاندار کار دیکھی تھی۔ وہ کار ایک مہینے تک تقریباً روز آتی جاتی تھی۔''

سارہ نے مڑ کر مجید کی طرف دیکھا، وہ پہلے ہی ایک لفافہ فائل سے باہر نکالے اس کا منتظر تھا۔ سارہ نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا، مڑی اور جج کی طرف دیکھا۔

''یور آنر میں یہ تصویر گواہ کو دکھا سکتی ہوں؟'' جج کی اجازت پر اس نے مراد شہزاد کی کار کی تصویر خالدہ کے سامنے رکھی۔ تصویر دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک گئی تھیں۔

''بالکل، یہی وہ کار ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے اس کی بیک ونڈو پر عجیب سا اسٹیکر موجود تھا۔ شاید کسی سانپ کے مانند...... اور یہ دیکھیے وہ اس میں بھی موجود ہے۔'' وہ بے اختیار بولی۔

''شکریہ، آپ عدالت کو بتا سکتی ہیں کہ اس روز آپ نے وہاں کیا سنا۔''

''وہ شام کا وقت تھا۔ میں ٹہلنے کے لیے باہر نکلی تھی۔ یہ کار اس فارم ہاؤس کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی' میں نے سوچا کہ وہ کوئی کتا یا بلی ہوگا۔''

''آپ نے اس کی اطلاع پولیس کو کیوں نہیں دی؟ آپ نے مدد کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''مجھے یہ علم تھوڑی تھا کہ وہاں یہ سب ہورہا ہے۔'' اس نے سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا یہ علاقہ نہایت پُرامن ہے۔ اکثر لوگ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں' ہماری طرح چند ہی لوگ مستقل وہاں رہتے ہیں مگر وہاں کبھی کوئی چوری چکاری تک نہیں ہوتی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔'' اس نے یہ کہہ کر آنکھیں پونچھیں۔

''یعنی نا کہ وہاں کوئی ایسا ظالم ہوسکتا ہے کہ ایک معصوم لڑکی کے ساتھ اس قدر بُرا سلوک بھی کرسکتا ہے؟'' سارہ نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''آبجیکشن یور آنر......'' مراد کا دوسرا وکیل خرم بیگ تیزی سے بولا۔

سارہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور اپنی ڈیسک کی طرف آکر بولی۔ ''مجھے کچھ اور نہیں پوچھنا یور آنر۔''

وہ اپنا کام کرچکی تھی۔ کمرائے عدالت اور جیوری اس بیان سے متاثر نظر آرہے تھے۔ اس نے بیٹھتے ہوئے مراد شہزاد کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی نہایت مطمئن اور پُرسکون نظر آرہا تھا۔ 'آخر یہ کیا چھپا رہا ہے۔' سارہ نے سوچا۔

خرم بیگ اب سوالات اور جرح کے لیے آگے بڑھ چکا تھا۔

''مس خالدہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ پہلے کسی مقدمے میں سزا کاٹ چکی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے سوال پر خالدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''آبجیکشن یور آنر...... وکیل صفائی غیر متعلق سوال پوچھ رہے ہیں۔'' سارہ نے کہا۔

''سر، یہ گواہ کے بارے میں حقائق کو کھولنے کے لیے کیا گیا ہے۔'' خرم نے کہا۔

''اوور رولڈ۔'' جج بولا۔ ''آپ اپنی جرح جاری رکھیے۔''

خالدہ سرور بہت زیادہ نروس نظر آرہی تھی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ''جی ہاں۔'' وہ بالآخر بولی۔

''آپ پر کیا الزام تھا؟''

''منشیات استعمال کرنے کا...... ان دنوں میں بہت

پریشان تھی۔ ایک دوست کی سگریٹ نے مجھے اس چکر میں پھنسا دیا تھا۔ اس نے میری اور میرے بیٹے کی زندگی تباہ کر دی، اسی لیے اب ہم اس دور دراز فارم ہاؤس میں رہ رہے ہیں مگر اب میں ایسا کچھ نہیں کر رہی اور میں نے اپنی سزا بھی بھگت لی تھی۔''

''یعنی اب، آپ کے خاندان اور گھر میں کوئی نشہ نہیں کرتا؟'' خرم بیگ نے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... نہیں تو......'' وہ بالکل ڈھے گئی تھی۔ سارہ نے ججز کی جانب دیکھا، ان کی آنکھوں اور چہرے پر اب گواہ کے حوالے سے بے اعتباری صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے خالدہ کے چہرے پر نظر ڈالی مگر وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''یعنی اگر آج میں پولیس کو لے کر آپ کے گھر پر چھاپا ماروں تو وہاں کسی قسم کا نشہ یا نشہ کرنے والا نہیں ملے گا؟'' خرم بیگ نے متانت سے پوچھا۔

''آبجیکشن...... وکیل صفائی گواہ کو دھمکا رہے ہیں۔'' سارہ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اب کہانی اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ خالدہ کسی اور کو بچا رہی تھی۔ نشے کی عادت غالباً ان کے بیٹے کو تھی۔ سارہ کے دل و دماغ پر مایوسی پھیلتی جارہی تھی، اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے وہ کس حد تک جاسکتی تھی۔

''آبجیکشن سسٹینڈ......'' جج کی آواز نے اسے چونکا دیا مگر خرم بیگ اپنا کام کر چکا تھا۔ خالدہ اب ایک خوف زدہ بلی کے مانند نظر آرہی تھی۔

''تو اب کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ اس شام آپ پورے ہوش و حواس میں تھیں اور آپ نے اسی کار کو وہاں دیکھا تھا؟'' خرم بیگ نے تیزی سے پوچھا۔

خالدہ سوچ میں پڑ گئی تھی شاید وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ہاں کہتی ہے تو اس صورت میں اس کے گھر پر پولیس آسکتی تھی۔

''سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ آپ کے جواب پر کسی کی زندگی کا انحصار ہو سکتا ہے۔'' وہ دوبارہ بولا۔

خالدہ اب بھی چپ تھی پھر چند لمحے بعد اس نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ ''نہیں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتی......''

سارہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''اب......'' شرجیل خان، سارہ اور مجید کورٹ کے کوریڈور میں کھڑے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے کہا تھا کہ وہ ایک مضبوط گواہ ہے۔''

''ہاں، وہ تھی مگر جو کچھ وہاں ہوا، وہ ہم سب نے دیکھا ہے۔'' سارہ بولی۔ ''مگر ہمارا کیس اب بھی مضبوط ہے، اسے آج ضمانت نہیں مل سکی ہے۔''

''مگر آٹھ گھنٹے پہلے یہ زیادہ مضبوط کیس تھا۔'' شرجیل خان نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''تو اب تم آگے کیا کرنے والی ہو؟''

سارہ کو اس کی صرف یہی ایک عادت پسند تھی۔ وہ وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔

''میں جائے واردات کا ایک بار پھر بھرپور جائزہ لوں گی، اس کے علاوہ میں مراد شہزاد کی بیٹی سے بھی ملاقات کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس سے کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا ہمیں اس کے بارے میں مزید جاننا ہوگا اور حقائق کو جمع کرنا ہوگا۔''

''گڈ...... چاہو تو ہم آج ڈنر ساتھ کر سکتے ہیں۔'' وہ جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو تم شاید دفتر جاؤ گی...... مجھے ایک اور کام ہے۔''

''ہاں میں دفتر جاؤں گی اور میرا خیال ہے کہ تمہاری بیوی ڈنر پر جا کر زیادہ خوش ہوگی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ شرجیل خان کا تعلق مردوں کے اس طبقے سے تھا جو ہر لڑکی پر محبت نچھاور کرنے کے جذبے سے مالا مال رہتے ہیں۔ سارہ کے سخت جوابات کے باوجود وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سارہ چند لمحے وہاں کھڑی رہی۔

جونہی وہ احاطے سے باہر نکلی، کئی رپورٹرز اور کیمرا مینز نے اسے گھیر لیا۔ وہ اس سے کیس کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے۔ چند جوابات دے کر وہ بمشکل ان کے گھیرے سے باہر نکلی۔ وہاں ایک ٹیکسی موجود تھی۔ وہ تیزی سے اس میں بیٹھ گئی۔

''چلو......'' وہ اُسے پتا بتاتے ہوئے بولی۔

لمبے بالوں اور درشت چہرے والے ڈرائیور نے اسے شیشے سے دیکھا اور سر ہلایا اور ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ٹیکسی کے چلتے ہی سارہ نے فون نکال لیا۔ اسے ایک دو اہم کالز کرنا تھیں۔ ان سے فارغ ہو کر اس نے مجید کو کال کی اور اسے مراد شہزاد کی بیٹی سے اگلے روز کا وقت لینے کی ہدایت کی۔ فون بند کر کے اس نے باہر کی طرف دیکھا اور چونک گئی۔ یہ اس کے دفتر کا راستہ نہیں تھا۔ ڈرائیور کس راستے سے دفتر جا رہا تھا؟ سوالات اس کے

ذہن میں خطرے کی گھنٹی کے مانند بج رہے تھے۔ اس نے اپنا پرس کھولا فون دوبارہ باہر نکالا۔ اس بار اس نے پولیس کا نمبر ڈائل کیا تھا، وہ بٹن دبانے ہی والی تھی کہ اچانک کوئی چیز اس کے ماتھے سے آلگی۔

وہ ایک ریوالور کی نال تھی۔ ''میڈم، پلیز یہ فون مجھے دے دیں۔'' اس نے ٹیکسی قدرے ویران سڑک کے کنارے کی جانب لے جا کر روکتے ہوئے کہا۔ سارہ نے فون اس کے ساتھ موجود پسنجر سیٹ پر ڈال دیا۔ اس نے سب سے پہلے فون بند کر دیا... پھر وہ اس کی جانب مڑا۔

''آپ تھک گئی ہوں گی تھوڑا آرام کر لیں میڈم......'' اس نے ہاتھ میں پکڑے رومال کو پھرتی سے سارہ کی ناک پر جما دیا۔ وہ کسمسائی۔ اس کے ہاتھ کو دھکا دینے اور چلانے کی کوشش کی مگر لمحے بھر میں سب کچھ دھندلانے لگا تھا۔ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ دروازے کی جانب بڑھ کر بے جان ہو کر گر پڑا۔ دو لمحے بعد وہ پھسل کر سیٹ پر جا گری تھی۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو وہ میٹل کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کرسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ چاروں جانب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں ایک دو منٹ لگ گئے تھے کہ اس کے سر پر ہڈ نما کوئی چیز چڑھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ یہ کون ہو سکتا ہے؟ ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ سوالات اس کے ذہن کی اسکرین پر جگمگا رہے تھے۔ اتنے میں قدموں کی آہٹ نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ تعداد میں یقیناً کئی تھے۔

''ہڈ اتارو۔'' ایک نرم مہذب آواز نے تحکمانہ لہجے میں حکم دیا۔

ہڈ اترتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ اس کے چہرے کے بالکل سامنے کوئی ٹارچ یا طاقتور لیمپ موجود تھا جس کی تیز روشنی نے اسے نیم اندھا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے سامنے کھڑے افراد اسے ہیولوں کی شکل میں نظر آرہے تھے۔ بس وہ یہ سمجھ پائی تھی کہ وہ چار افراد تھے اور اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی نئی دریافت ہو۔ سارہ نے اپنے جسم کو ہلکی سی حرکت دی۔ اس کے پیر کھلے ہوئے تھے۔ ماحول میں عجیب سی نمی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی تہ خانے میں تھی۔

''خوش آمدید مس سارہ......'' وہی آواز پھر مخاطب ہوئی۔ ''میں آپ کے مخالف کیمپ سے ہوں۔ اس وقت میں صرف یہ تعارف کرا سکتا ہوں، ہم چاہتے ہیں کہ مراد شہزاد کا کیس فوراً ختم ہو جائے اور اس میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' نہ جانے کیوں سارہ کو یہ آواز قدرے مانوس سی لگ رہی تھی۔

''اور اس کے لیے تم لوگ کیا کرو گے؟ مجھے رشوت دو گے یا میرے خاندان کو برباد کر دینے کی دھمکی دو گے؟ یا مجھ پر تشدد کرو گے۔'' سارہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ''یوں بھی ہم آپ کے خاندان کا مزید کیا نقصان کر سکتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی اچھے حال میں نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کی والدہ آپ کے والد کو قتل کرنے کے الزام میں جیل میں ہیں۔''

سارہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سینے میں تیز خنجر اتار دیا ہو۔ اگرچہ اب اس بات کو برسوں بیت چکے تھے مگر یہ بات اب بھی اسے اتنی ہی تکلیف دیتی تھی۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا اس کے خاندان کے حالات مزید کیا خراب ہو سکتے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ چھ فٹ لمبا شخص تھا اور اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم شاید پوری کوشش کرو گی کہ یہ کیس جیت پاؤ اور اگر اس کے اردگرد بھی کچھ ہوا تو میں تم سے ایک وعدہ کرتا ہوں۔'' اس کے جملہ مکمل کرنے سے قبل ہی کلک کی آواز کے ساتھ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ''اگر تم نے ہماری بات نہ مانی اور نتائج وہ نہ آئے جو ہم چاہتے ہیں تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ مراد شہزاد تمہارے ساتھ بالکل وہی کرے گا جو اس نے نازنین احمد کے ساتھ کیا تھا۔'' اس کی سرگوشی نما آواز اس کے بالکل قریب سے آئی تھی۔ ''بس فرق صرف یہ ہوگا کہ تمہیں اس سے زیادہ تکلیف اٹھانا پڑے گی۔''

غصے کی تیز لہر نے سارہ کے دماغ کو گھما دیا تھا۔ اسے ہر قیمت پر یہاں سے نکلنا تھا۔ اس کی ٹانگیں آزاد تھیں۔ وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ کرسی گویا اس کی پشت پر بندھی ہوئی تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے اس آواز پر حملہ کیا تھا۔ اس کا مکا کسی کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس کے حرکت کرتے ہی روشنی پھر جلا دی گئی مگر سارہ اندھوں کے مانند تیزی سے گھوم رہی تھی۔ اس کے آگے پیچھے آنے والے کرسی اور اس کے مکوں کا شکار بن رہے تھے۔ اس دوران اسے

بھی چوٹ لگ رہی تھی۔ اس وقت وہ کرسی اس کا ہتھیار بن گئی تھی۔ وہ اچھل کر آگے بڑھی تھی کہ اچانک اس کے سر پر کسی نے وار کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گری تھی۔ بے ہوش ہونے سے قبل جس آخری منظر نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ایک چہرہ تھا جو اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ہو بہو مراد شہزاد تھا۔

☆☆☆

سارہ کی آنکھ کھلی تو اس کے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ بے اختیار اپنا ہاتھ سر کے درد والے حصے پر پھیرا وہاں خون کی چپچپاہٹ موجود تھی۔ اسے یکدم وہ ٹیکسی ڈرائیور، وہ جگہ اور وہ سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ اپنے گھر میں اور اپنے بستر پر تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اچانک اٹھنے کی وجہ سے کمرا گویا جھول سا گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا اور دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں سب کچھ بالکل معمول کے مطابق تھا۔ اس کا پرس ہمیشہ کی طرح اس کی سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا اور فون اور چابیاں اس کے سامنے رکھی تھیں۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ سامنے لگی دیوار گیر گھڑی رات کے آٹھ بجا رہی تھی۔ وہ دو بجے کورٹ سے باہر نکلی تھی یعنی اسے اس کے گھر سے بہت دور نہیں لے جایا گیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہاں سات مس کالز موجود تھیں۔ ایک مجید کی تھی، دو کالز شرجیل خان کی تھیں۔ دو کالز رفیہ کی تھیں۔ رفیہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہیں وہ سیلف ڈیفنس سکھا رہی تھی۔ ایک کال آنی کی تھی...... آنی کا نام دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں...... عملی معنوں میں وہی اس کی ماں تھیں۔ اس کی اپنی ماں کی ذہنی حالت کبھی بھی بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ ابوجی کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ انہوں نے آنی اور سب کے سمجھانے کے باوجود ان کی بیماری کو تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی انہیں کبھی کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں ان کا مرض بڑھتا گیا اور ساتھ ساتھ شکایتیں بھی...... پہلے تو وہ سارہ کے ساتھ تھوڑا بہت اچھا برتاؤ کر لیتی تھیں مگر پھر اس کے ساتھ بھی ان کا رویہ جارحانہ ہو گیا۔ اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب اس نے انہیں اور ابوجی کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ آنی اس کی سگی پھوپی تھیں۔ وہ اس روز ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ جب امی نے غصے میں میز پر رکھی اسٹیل کی پلیٹ سارہ پر پھینکی تو وہ پریشان ہو گئی۔

''آخر آپ سمجھ کیوں نہیں رہے بھائی جان، واجدہ کو علاج کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے اس بار بھائی سے بات کر ہی لی۔

''سعدیہ...... اس کا غصہ تھوڑا تیز ہے اب اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔'' وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولے۔

''یہ صرف غصہ نہیں ہے اسے علاج کی ضرورت ہے۔'' انہوں نے اپنی بات کو دہرایا۔ ''آخر آپ انہیں ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھانا چاہتے۔ اس طرح تو وہ کسی روز کسی کو بڑا نقصان پہنچا دیں گی۔''

''تمہیں معلوم ہے نا کہ یہ ڈاکٹر علاج میں اسے کیا دیں گے نیند کی دوائیں، وہ میں بھی دے سکتا ہوں اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ میری بیوی پاگل ہے...... میں اس چکر میں نہیں پڑ سکتا...... اس کا حل یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔''

''سارہ ابھی بچی ہے...... آپ دیکھتے نہیں کہ وہ کتنی خوف زدہ رہتی ہے۔''

''میں نے اسے سمجھایا ہے کہ اس سے دور رہا کرے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں، آپ اس دوران سوچیے کہ آپ کو اس بارے میں کیا کرنا چاہیے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

اس روز وہ ان کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔ اس سے چار دن بعد امی نے ابوجی کے پستول سے ان کا قتل کر دیا۔ اس کے بعد آنی نے ہی اس کی ماں اور باپ کی ذمے داری سنبھال لی۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ یوں انہیں بھی سارہ کی شکل میں ایک سہارا مل گیا۔ انہوں نے اسے بہترین انداز میں پڑھایا لکھایا اس کے اعتماد کی بحالی کے لیے اسے مارشل آرٹ کا...... ماہر بنایا۔ امی کے جیل جانے کے بعد وہ اسے چند بار ان سے ملانے کے لیے بھی لے گئی تھیں مگر امی نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ ان سے کبھی نہیں ملی تھی۔ آنی کالج میں پروفیسر تھیں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اسکول کھول رکھا تھا۔

موبائل پر آنے والی میسج کی نوٹیفکیشن ٹون اسے واپس کھینچ لائی، یہ میسج رفیہ ہی کا تھا۔

''میڈم ایک خوش خبری ہے۔ ہم تینوں والی بال ٹیم

میں سلیکٹ ہو گئے ہیں۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ ہمیں کون پوچھتا، بہت شکریہ...... کیا آپ آج جم آئیں گی؟''

''بہت مبارک...... آج نہیں کل......'' اس نے جوابی میسج ٹائپ کیا۔

رفی، کومل اور سائرہ تینوں نہایت غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ منشیات کے چکر میں پڑنے کی وجہ سے گرفتار ہوئی تھیں جس کے بعد ایک مقامی این جی او نے ان کی ذمے داری لی تھی۔ اس این جی او کی سربراہ سارہ کو جانتی تھی۔ اسی کی درخواست پر وہ ان تینوں کی مینٹور بھی تھی مگر گزرتے وقت کے ساتھ اسے ان تینوں سے بہت انسیت ہو گئی تھی۔ وہ ہر دوسرے دن ان کے جم جاتی تھی۔ جہاں وہ مارشل آرٹ کی مشقیں کرتی تھیں۔ جونیئر ٹیم میں سلیکشن ایک بڑی کامیابی تھی۔ وہ مسکرائی۔ اب وہ خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پولیس کا نمبر ڈائل کیا۔

''جی فرمائیے......'' دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز میں کہا گیا۔

''میں اغوا کی رپورٹ کرانا چاہتی ہوں...... میری سینئر انسپکٹر سجاد سے بات کروائیے۔'' انسپکٹر سجاد اس سے واقف تھا۔

''اوکے...... مجھے افسوس ہے میں آپ کی جانب اپنی ایک بہترین ٹیم بھیج رہا ہوں...... آپ انہیں مکمل تفصیلات بتا دیں ہم انہیں پکڑ لیں گے۔'' اس کی یقین دہانی کے بعد سارہ نے فون بند کر دیا اور بستر سے اتر کر گھر کا جائزہ لیا۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر گر پڑی۔

وہ بالکل ٹھیک نہیں تھی وہ اس پُراسرار طریق کار کی وجہ سے خوف زدہ تھی مگر اس سے بھی زیادہ اسے عدم تحفظ کا احساس کھائے جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا اور اس واقعے نے اس سے وہ یقین چھین لیا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر سلیم اور انسپکٹر شیبا پچیس منٹ میں اس کے سامنے تھے۔ وہ دونوں اٹھائیس سے تیس سال کی عمر کے درمیان تھے اور اپنے کام میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے سارہ کے بیان کے آغاز میں ہی ٹیکسی ڈرائیور اور تہ خانے میں موجود لوگوں کے بارے میں ڈھیروں سوال کیے جن سے پورے واقعے کی ہر چھوٹی بڑی بات سامنے آ گئی تھی۔ سارہ سوچ سوچ کر ہر سوال کا جواب دے رہی تھی اور اس دوران خود کئی چیزیں اس پر بھی واضح ہوئی تھیں۔ بیان کے دوران ان دونوں سے اجازت لے کر اس نے ایک دفتری ساتھی کے ریفرنس سے ایک قفل ساز کو بھی بلوا لیا تھا۔ اغوا کرنے والوں کے پاس اس کے گھر کی چابیاں تھیں اس لیے فوری طور پر تالے بدلوانا ضروری تھا اور اس کی خواہش یہ تھی کہ یہ کام دونوں انسپکٹرز کی موجودگی میں ہی ہو جائے۔ قفل ساز دس منٹ میں پہنچ گیا تھا اور آتے ہی اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اسی دوران ان دونوں کے لیے کافی بناتے ہوئے اس نے اپنی بہترین دوست فوزیہ کو بھی ایس ایم ایس کر دیا تھا۔

''آپ دونوں سے ایک درخواست اور ہے۔'' وہ کافی سرو کرتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر سلیم ایک دبلا پتلا مگر صحت مند شخص تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کرکٹ یا ہاکی پلیئر ہو جبکہ شیبا قدرے چھوٹی قامت کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ وہ پولیس انسپکٹر سے زیادہ پروفیسر ٹائپ نظر آ رہی تھی۔

''میں اس وقت ایک ہائی پروفائل کیس پر کام کر رہی ہوں اس لیے یہ ضروری ہے کہ میرے اغوا یا اس قسم کی کوئی خبر میڈیا تک نہ پہنچے۔ اگر میرا آفس مناسب سمجھے گا تو خود خبر ریلیز کرے گا۔''

''ہم سمجھتے ہیں مس سارہ۔'' انسپکٹر شیبا نے کہا۔ ''ویسے اس واقعے کے علاوہ گزشتہ دنوں میں ایسی کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہو جو آپ کو یاد رہ گئی ہو؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' سارہ نے کندھے اچکائے۔ ''ہاں گزشتہ کئی دنوں سے مجھے خاموش کالز آ رہی ہیں مگر میرے پروفیشن میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔''

''میں آپ کی فون ہسٹری چیک کرواتی ہوں۔'' شیبا اس بات کو نوٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''تہ خانے میں آپ کو بہت واضح دھمکی دی گئی ہے مراد شہزاد کا نام لے کر۔''

''جی ہاں۔''

''آپ کو بہت محتاط رہنا ہوگا۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''آپ رات کو اکیلی باہر نہیں جائیں گی، اپنا فون نمبر بدل لیں اور ہو سکے تو کسی دوست یا عزیز کے گھر کچھ دنوں کے لیے منتقل ہو جائیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' سارہ نے اسے گھورا۔ ''میں ایک مجرم سے جو خود اس وقت سلاخوں کے پیچھے ہے، ڈر کر اپنی زندگی جینا چھوڑ دوں؟''

’’اچھا...... میں جانتا تھا آپ یہی کہیں گی۔‘‘ انسپکٹر سلیم نے گہری سانس لی۔ ’’پتا نہیں ہم پرہیز کو علاج سے بہتر سمجھنے پر راضی کیوں نہیں ہوتے...... میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے...... ہم آپ کی حفاظت کریں گے مگر جسے سب سے پہلے یہ ذمّے داری اٹھانی ہے وہ آپ خود ہیں، کیا آپ کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے؟‘‘

’’آ، ہاں...... ہے۔‘‘ سارہ نے جواب دیا اور اس نے اٹھ کر الماری سے اسے باہر نکال لیا۔ وہ ایک ’’لیڈی گلوک‘‘ تھا۔ یہ اس کے ابو جی نے اسے دیا تھا۔ انہوں نے اسے لوڈ کرنا اور صاف کرنا بھی سکھایا تھا۔ ایک بار اس نے اس سے خرگوش کا شکار کیا تھا مگر اس کے بعد اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

’’کیا آپ کو اسے استعمال کرنا آتا ہے؟‘‘ انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔

’’تھوڑا بہت۔‘‘

’’میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ وہ آپ کو سیفٹی کورس کے تحت زبردست ٹریننگ دے سکتا ہے جو آپ کے کام کے حوالے سے نہایت ضروری ہے۔ آج کل زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہتھیار کی موجودگی ضروری ہے مگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا آنا بھی ضروری ہے۔ ایک غیر تربیت یافتہ اناڑی شخص کے ہاتھ میں ہتھیار اسے خودکش بمبار جتنا خطرناک بنا سکتا ہے۔‘‘

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘ سارہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

’’ہاں، شاید آپ کو اس لیے حیرت ہوگی کہ میں ایک پولیس والا ہو کر یہ کہہ رہا ہوں مگر اس میں غلط کیا ہے؟ دیکھیے اگر ہر گھر میں گن موجود ہو اور لوگوں نے اس کے استعمال کی تربیت بھی حاصل کر رکھی ہو تو کرائم ریٹ (جرائم کی شرح) میں کتنی کمی آسکتی ہے۔‘‘

’’اور اس سے جو حادثات کا خطرہ ہے...... بچے غلطی سے چلا لیتے ہیں وغیرہ۔‘‘

’’اگر آپ نے تربیت حاصل کر رکھی ہے تو ان کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہوگا۔‘‘

’’اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ میرے لیے ضروری ہے تو میں یہ کروں گی۔‘‘ سارہ نے بالآخر کہا۔

’’بالکل میں یہ سمجھتا ہوں۔‘‘ انسپکٹر سلیم نے اپنی نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑا اس پر ایک نام اور نمبر لکھ کر سارہ کی طرف بڑھا دیا۔ ’’یہ ان کاموں میں بے حد ماہر ہے۔ اس کی چند کلاسز آپ کے لیے کافی ہوں گی۔‘‘

سارہ نے کاغذ لیتے ہوئے اس پر نظر دوڑائی اس پر سلیمان اصفہانی لکھا تھا اور اس کے سامنے رابطے کے نمبر تھے۔

اس کے بعد انہوں نے سارہ کے سر اور چہرے پر موجود چوٹوں کی تصاویر بنائیں۔

’’آپ کو یقین ہے نا کہ آپ کچھ بھولی نہیں ہیں؟‘‘ انسپکٹر شیبا نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ سارہ نے کہا۔ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا صرف اس ایک آخری منظر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے وہاں مراد شہزاد کو دیکھا تھا جبکہ وہ جیل میں تھا۔ اس بارے میں وہ خود مشکوک تھی اس لیے اس بات کو وہ پی گئی۔

دونوں افسران اس کا بیان لے کر اور اسے جلد اچھی خبر سنانے کا وعدہ کر کے چلے گئے تھے۔ سارہ جانتی تھی کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر پائیں گے مگر پولیس کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ وہ لوگ اب بھی آزاد تھے اور جب تک وہ دوبارہ حملہ نہ کرتے ان کے خلاف کچھ ہونا مشکل تھا اور اگر وہ ان کے حکم کے مطابق کیس ہار جاتی ہے تو پھر وہ درندہ بھی آزاد ہو جانے والا تھا اور اگر وہ یہ کیس جیت جاتی ہے تو اس صورت میں اس کے لیے خطرہ مزید بڑھ جاتا، اس نے گہری سانس لی اور صوفے پر گر گئی۔

☆☆☆

فوزیہ اس وقت ٹریڈمل پر دوڑ رہی تھی۔ اس کی عمر 29 سال تھی۔ وہ متناسب جسامت اور قد و قامت کی مالک تھی۔ گردن تک کٹے سیاہ بال، ذہانت سے چمکتی سیاہ آنکھیں اور تیکھے نقوش کسی کو بھی اس کا گرویدہ بنانے کے لیے کافی تھے۔

اس کا شوہر احسن سامنے صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ احسن اس کا ہم عمر تھا۔ قد میں البتہ وہ اس سے خاصا لمبا تھا۔ گھنگریالے بال اور چہرے پر لگی عینک اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھار فوزیہ پر نظر ڈالتا اور پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو جاتا۔

’’تم بھی تھوڑی بہت ایکسر سائز کر لو۔‘‘ وہ ٹریڈمل سے اتر کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

’’یار مجھے کیا ضرورت ہے؟ ٹھیک تو ہوں میں...... اسمارٹ اور چارمنگ۔‘‘ وہ مسکرایا۔

''یعنی تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو ایکسر سائز کرتے ہیں وہ نہ اسمارٹ ہوتے ہیں اور نہ ہی چارمنگ......'' فوزیہ نے اسے گھورا۔ ''اور یہ توند سی بنتی جارہی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟''

''ارے تو بہ...... میں بھی یہ سوچ بھی سکتا ہوں۔'' وہ بناوٹی خوف سے بولا۔ ''اور جہاں تک بات توند کی ہے تو بھائی یہ چھوٹی سی توند مرد کی خوش حالی کی نشانی ہوتی ہے۔'' وہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میری بیوی کتنی سگھڑ ہے، کتنا اچھا کھانا بناتی ہے۔''

''باتیں جتنی چاہے کوئی تم سے کروالے بس ہلنا نہیں ہے اپنی جگہ سے۔'' وہ جل کر بولی۔

''لیجیے یہ کیا بات کر دی آپ نے؟ ذرا میرے دفتر جا کر معلوم کیجیے میرے کلائنٹس سے پوچھیے...... تمہارا شوہر شہر کے چند مانے ہوئے سیکیورٹی سافٹ ویئر انجینئرز میں شمار ہوتا ہے۔ دیکھتی نہیں تمہیں بھی میں نے کتنا ایکوپڈ (تیار) کر رکھا ہے۔ کوئی پرندہ تک یہاں پر نہیں مار سکتا۔''

''جی ہاں پتا ہے، کل بھی پچھلی کھڑکی پر دو کبوتر بیٹھ گئے تھے، پورے گھر میں سائرن بجنے لگے تھے۔'' فوزیہ نے متانت سے جواب دیا۔

''یار یہ تم بیویاں، شوہروں کے کاموں سے مطمئن کیوں نہیں ہوتیں۔ ہم ہوا میں اڑنے لگیں تو یہی کہو گی کہ ٹیڑھا ٹیڑھا اڑ رہے ہو۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

''پرانا جوک بلکہ پھٹا پرانا جوک......'' فوزیہ نے جواب دیا اور میز پر رکھے موبائل کو اٹھا کر اسکرین روشن کی۔ ''ارے سارہ کا میسج ہے......'' ایک لمحے میں اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''احسن مجھے فوری طور پر سارہ کے گھر جانا ہے۔''

''کیا ہوا؟ سب خیر ہے نا؟ سارہ ٹھیک ہے؟'' احسن نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے؟...... مجھے تو سارہ کی سخت فکر ہو رہی ہے۔'' فوزیہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اور سارہ بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ کالج میں بھی وہ ساتھ ہی رہی تھیں بعد میں سارہ نے لا کا انتخاب کیا اور فوزیہ نے کمپیوٹر سائنس کو چنا تھا مگر اس سے ان کی دوستی میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''تم اتنی پریشان مت ہو، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔'' احسن نے اسے تسلی دی۔

''میرا خیال ہے کہ تم مجھے ڈراپ کر دو۔'' سارہ کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں پہنچ کر فوزیہ نے کہا۔

''میری یہ مجال بیگم صاحبہ......'' احسن نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مسخرے پن سے کہا۔

''میں پریشان ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔'' اس نے احسن کو گھورا۔ ''میں اس لیے یہ کہہ رہی ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے سامنے کھل کر بات نہ کر پائے۔''

''میں سمجھتا ہوں، تم مجھے فون کر دینا، میں تمہیں واپس پک کر لوں گا۔'' وہ مسکرایا۔ سارہ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی زوردار دستک کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ غالباً صوفے پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دوسری دستک پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھی۔ سارہ کا دل ایک لمحے کے لیے گویا حلق میں آ گیا۔

''یہ...... یہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے سوچا پھر دروازے کے پاس پہنچ کر پپ ہول سے باہر جھانکا اور اطمینان کی سانس لی۔ باہر فوزیہ کھڑی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' دروازہ کھلتے ہی فوزیہ نے کہا۔ ''اگر اس بے ہودہ شرجیل خان نے کچھ گڑبڑ کی ہے تو مجھے بتاؤ...... میں ابھی اس کا دماغ......'' اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ قدرے پیلا پڑ گیا۔

''یہ کس نے کیا ہے......؟'' اس نے بمشکل پوچھا۔ غصہ اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

''میں تمہیں سب بتاتی ہوں پہلے اندر تو آؤ......'' سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹا اور دروازے کو مقفل کر دیا۔ ''تم یہاں بیٹھو۔''

''سارہ......''

''فوزیہ میں بتا رہی ہوں، مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔'' پھر اس نے...... مختصر الفاظ میں اسے ساری تفصیل بتائی۔ ''ویسے وہ بھی کیا یاد کریں گے، پیٹا تو میں نے بھی انہیں خوب ہے۔''

فوزیہ جواب میں دو لمحے بالکل خاموش رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سارہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ محبت، فکر اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' سارہ نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اور اب جب تم آ گئی ہو تو میرا خوف بھی دور ہو

گیا ہے۔''
اسی وقت سارہ کا فون بجا۔ سارہ نے اسکرین پر چمکتے نام کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لی۔
''کون ہے؟ کیا ان کا ساتھی ہے؟ اگر ایسا ہے تو فون مجھے دو۔''
''ارے نہیں، یہ باس کی کال ہے، وہ صبح سے کئی کالز کر چکا ہے۔ یہ فون مجھے ریسیو کرنا پڑے گا۔'' سارہ اسے دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ اس کی گردن کے ہلتے ہی اس نے فون ریسیو کر لیا تھا۔
''تم کہاں ہو سارہ! یہ کیا طریقہ ہے؟'' وہ اس کے ہیلو بولتے ہی شروع ہو گیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم کیس میں کس بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ سب اس وقت تک کام کر رہے ہیں اور تم دفتر ہی نہیں پہنچیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کیس پر کام کرنا ہی نہیں چاہتیں......''
''ایک منٹ شرجیل صاحب......'' وہ بالآخر اس کی بات کاٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ ''مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔''
''یہ کیا بکواس ہے۔'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
''مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔'' وہ ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔
''میں ابھی تمہاری طرف آ رہا ہوں۔''
''نہیں......'' اس نے زور دے کے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے پولیس ابھی، ابھی یہاں سے گئی ہے اور میری بیسٹ فرینڈ میرے پاس ہے۔''
''کیا یہ مراد شہزاد کا کام تھا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں، کچھ لوگ مجھے کسی تہ خانے میں لے گئے تھے اور دھمکی دی ہے کہ مجھے یہ کیس ہارنا ہے پھر مجھے بے ہوش کر دیا۔ آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں تھی۔'' سارہ نے اسے تمام تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔
''مجھے بہت افسوس ہے، یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس کیس سے الگ کر سکتا ہوں۔''
''نہیں۔'' سارہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اب میں زیادہ دلچسپی سے اس کیس کو لڑوں گی۔''
''او کے۔'' شرجیل نے فوراً کہا۔ ''کیا کل تم میرے ایک دوست رپورٹر کو اس سب کے حوالے سے بیان دو گی تاکہ لوگ یہ جان سکیں کہ مراد شہزاد کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے؟''
''بالکل۔'' سارہ نے جواب دیا۔ ''آپ اُسے کل آفس بلا لیں۔''
''او کے......تم اپنا بہت خیال رکھنا، کل ملاقات ہوتی ہے۔''
''چلو بہت ہو گیا آفس، اب جلدی سے نہا کر چینج کر لو۔'' فوزیہ جو اسے فون پر بات کرتا دیکھ کر کچن میں چلی گئی تھی، واپس کمرے میں آتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ تیس منٹ ہیں۔ اس کے بعد مجھے تمہارے سر اور چہرے پر دوا بھی لگانی ہے۔''
''مگر اتنا ٹائٹ ٹائم ٹیبل کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''کیونکہ میں نے تمہاری پسند کے پیزا آرڈر کر دیے ہیں اور وہ پینتالیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اس سے پہلے ہمیں ہر کام سے فارغ ہونا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔
''او کے میڈم......'' سارہ مسکرائی۔ فوزیہ کے آجانے نے اسے کافی نارمل کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ آج صبح سے مصروف تھی۔
رپورٹر سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ مجید اس دوران اس کے لیے مراد شہزاد سے متعلق ڈیٹا جمع کر رہا تھا۔
''آپ کا روشنا مراد سے کل کا وقت طے ہو گیا ہے۔ آپ کو تین بجے وہاں پہنچنا ہے۔'' مجید نے کہا۔
''او کے......اس کے متعلق کچھ اور ملا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں کچھ چیزیں ملی ہیں۔ وہ میں نے اس فائل میں لگا دی ہیں۔'' وہ فائل میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''ایک عجیب سی بات معلوم ہوئی ہے۔''
''وہ کیا......؟''
''مراد شہزاد کی زندگی میں ایک نہیں، دو روشنا مراد ہیں۔''
''کیا مطلب؟'' میں نے اُسے گھورا۔
''ایک اور لڑکی بھی بچپن سے اس کے ساتھ رہتی تھی جس کا نام روشنا مراد تھا اور وہ اس کی بیٹی تھی مگر بعد میں اس نے اپنا نام بدل کر سونیا احمد رکھ لیا تھا۔''
''یہ واقعی عجیب بات تھی۔ مجھے تو اب تک یہی معلوم تھا کہ مراد شہزاد کی ایک ہی بیٹی ہے۔ یہ دوسری بیٹی کہاں سے آگئی؟ کوئی اپنے دو بچوں کا ایک جیسا نام آخر کیوں

رکھے گا؟'' اس نے سوچا۔ خیر وہ اس حوالے سے کل کی ملاقات میں سوال کر سکتی تھی۔

اگلے دو گھنٹے اس نے اس کیس کو گواہی اور دیگر شواہد کے بغیر موجودہ صورت حال کے مطابق تیار کرنے میں لگائے اور جب اسے یہ یقین ہونے لگا کہ اس کا کیس اب مضبوط ہو گیا ہے، اس نے کام کے لیے تمام راستے طے کر لیے ہیں عین اسی وقت اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف شرجیل خان تھا۔

''جج صاحب نے ایمرجنسی میٹنگ طلب کی ہے، مجھ سے فوراً کورٹ میں ملو۔'' اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا مگر سارہ کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے میز پر رکھے اپنے نوٹس کی جانب دیکھا، ایکشن پلان پر ہاتھ پھیرا اور کورٹ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کی گٹ فیلنگ (چھٹی حس) کہہ رہی تھی کہ اس کی آج کی محنت بھی ضائع ہونے والی ہے۔ مجید اس کے ساتھ تھا۔

کورٹ پہنچ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ خبر یقیناً بڑی ہے وہاں میڈیا کی کئی وینز موجود تھیں۔ وہ رپورٹرز اور کیمرامین کی بھیڑ سے گزرتے ہوئے چیمبر میں پہنچی تھی۔ شرجیل خان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ جج کا کمرا بھرا ہوا تھا وہاں مراد کے وکلا کی ٹیم بھی موجود تھی کچھ دیگر وکیل بھی تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں سارہ کے لیے ہمدردی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس کے اغوا کی کہانی ان سب کے علم میں آچکی ہے۔ اس نے منہ بنا کر شرجیل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، جج صاحب کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر جج کے اشارے پر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

''میرے پاس مزید بری خبر ہے۔'' جج صاحب بیٹھتے ہی بولے۔ ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جیوری کے مزید ایک جج کو رشوت دی گئی ہے۔ مقصد مراد شہزاد کو سخت سزا دلوانا ہے۔ قواعد کی رُو سے اب میں اس کا متبادل طلب نہیں کر سکتا۔''

سارہ کے لیے پُرسکون چہرہ بنائے رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اب تک کی ساری محنت ضائع ہونے والی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت اس کمرے سے نکل جاتی۔

''میرے پاس اس کیس کو مس ٹرائل قرار دینے کے سوا کوئی رستہ نہیں بچتا۔ استغاثہ کو اب دوبارہ اپیل کے ذریعے یہ کیس دائر کرنا ہوگا۔'' وہ مزید تفصیلات بتا رہے تھے مگر سارہ کچھ سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ شرجیل خان کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

''یور آنر اس صورت میں ہماری درخواست ہے کہ ہمارے موکل کو ضمانت پر رہا کیا جائے۔ اس کے خلاف بمشکل ہی کوئی ثبوت موجود ہے۔'' مراد کے وکیل خرم بیگ نے استدعا کی۔

سارہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر بند کر لیا۔ اس وقت کسی بحث کو شروع کرنا نہ تو فائدہ مند تھا اور نہ ہی اس میں اتنی ہمت تھی مگر ایک بات وہ طے کر چکی تھی۔ وہ اس کیس پر کام کرتی رہے گی اور اس بار وہ اس قدر ثبوت لے کر آئے گی جس میں مراد شہزاد کو دفن کیا جا سکے۔

وہ اس وقت بھی بالکل خاموش رہی جب جج نے دو کروڑ کے بانڈز پر مراد شہزاد کی ضمانت منظور کر لی۔ اس پر شہر سے باہر جانے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اس وقت بھی بالکل خاموش رہی جب شرجیل خان نے اس ضمانت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مراد شہزاد ایک خطرناک کرمنل ہے۔ اس کی ضمانت منظور ہونے کا مطلب معصوم زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔ قانون الفاظ نہیں ثبوت مانگتا ہے۔ یوں مراد شہزاد کی ضمانت منظور ہو گئی۔

وہ اپنے دل میں ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ وہ اسے زیادہ عرصے باہر رہنے نہیں دے گی۔ یہ اس کا خود سے اور نازنین احمد سے وعدہ تھا۔

☆☆☆

دفتر واپسی کے سفر میں وہ تینوں بالکل خاموش تھے۔

''کیا ہم نے اپنی شکست مان لی ہے۔'' سارہ نے یکدم پوچھا۔

''کیا مطلب......؟'' شرجیل خان نے اسے گھورا۔ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

''مراد شہزاد کی ضمانت کا مطلب ہماری ہار نہیں ہے۔ مکاری اور جھوٹ سے جیتی گئی بازی کسی بھی وقت پلٹی جا سکتی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''یہ کہ ہمیں چہرے لٹکانے کے بجائے اس درندے کو لٹکانے کے لیے بہت کام کرنا ہے...... بہت کام، اس بار ہم اتنے ثبوت جمع کریں گے کہ مراد شہزاد کے لیے بچ نکلنے کا راستہ نہ بچے گا۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولی۔

''کیا تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے؟'' شرجیل خان بھی

مسکرایا۔

''ہاں، بہت کچھ ایسا ہے، جو ابھی ہمارے علم میں نہیں ہے اور جس پر ہم نے کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے موجود ثبوتوں کو کافی جانا تھا۔''

''اوکے، اگلے سات دنوں میں ہمیں اس کے خلاف دوبارہ کورٹ جانا ہے۔'' شرجیل بولا۔

''اوکے سر...... مجید کل سے تمہیں دگنا کام کرنا ہو گا۔''

''میں تیار ہوں میڈم......'' وہ بھی مسکرایا۔

کار کے اندر دلوں کا مزاج بدل گیا تھا۔ ڈوبتے تارے، سورج بن کر ابھرنے کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆

سارہ اور مجید، سارہ کے اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر بنے پارک میں موجود تھے۔ وہ اس وقت وہاں جاگنگ کر رہی تھی۔ مجید کو اسے ایک ضروری کاغذ دینا تھا اس لیے اس نے اسے یہیں بلا لیا تھا۔ وہ پارک سے نکل کر سائڈ روڈ پر آئے ہی تھے کہ کسی نے چیخ کر اسے آواز دی۔ سارہ نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کی دوسری جانب رفیہ، کومل اور سائرہ موجود تھیں۔ رفیہ کے ہاتھ میں میڈل تھا اور وہ تینوں بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ سڑک پر ایک بڑی بس کے گزرنے کی وجہ سے وہ چند لمحے کے لیے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئیں مگر بس کے گزرتے ہی انہوں نے سڑک پار کر لی۔

''میں جیت گئی میڈم میں جیت گئی۔'' رفیہ خوشی سے بے حال تھی۔ والی بال میں ہماری ٹیم جیتی اور ٹورنامنٹ کے باقی مقابلوں میں، میں فرسٹ آئی ہوں۔'' وہ سارہ کا بازو پکڑے بچوں کی طرح اسے اپنا میڈل دکھا رہی تھی۔ ''مجھ سے آپ کا انتظار نہیں ہوا اس لیے ہم یہاں آ گئے۔''

''بہت اچھا کیا۔'' سارہ نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم پر فخر کرتی ہوں، تم تینوں پر...... یاد رکھو یہ تم لوگوں کی سخت محنت کا ثمر ہے۔''

''ایتھلیٹ مقابلوں میں میرا پیر مڑ گیا تھا ورنہ میں فرسٹ آتی۔'' کومل نے رفیہ کو چھیڑا۔

''ہاہاہا......'' رفیہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تم تینوں ہی چیمپئن ہو اور انشاء اللہ آگے بھی جیتو گی، ان سے ملو یہ مجید شہباز ہیں یہ ہمارے انٹرن ہیں اور اس کیس میں میرے خاص اسسٹنٹ......''

کومل اور سائرہ اپنے مزاج کے مطابق جھجک کر مسکرا کر رہ گئی تھیں جبکہ رفیہ آگے بڑھ کر بات چیت میں مصروف ہو گئی تھی۔

اچانک ایک جانب سے ایک سایہ سا سارہ کے سامنے آ گیا۔ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ مراد شہزاد تھا۔ اس کے وکیل وغیرہ چند قدم پیچھے اس کی شاندار کار کے باہر کھڑے اس کے منتظر تھے۔ مجید اسے دیکھ کر یکدم الرٹ ہو گیا اور تینوں لڑکیوں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ سارہ سیدھی کھڑی اسے گھورتی رہی، وہ مسکرایا۔

''کیا یہ خوب صورت لڑکیاں تمہاری بہنیں ہیں؟''

اس نے پوچھا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا جس نے سارہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی پیدا کر دی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک رفیہ کو گھور رہا تھا۔ سارہ نے اس کے سوال میں جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ غصہ اس کے اعصاب پر چھاتا جا رہا تھا۔ وہ پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ماننا پڑا تھا کہ لمبے قد، کسرتی جسم اور گھنیرے بالوں کی وجہ سے وہ کسی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا مگر اندر سے وہ ایک جانور تھا۔ اس نے نفرت سے ناک سکیڑی۔

''کیا تم بہت پریشان ہو؟'' وہ پھر بولا۔ ''دیکھو کیس میں جو کچھ ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم نے اچھی کوشش کی۔'' اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ سارہ اب بھی خاموش کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ کبھی کبھار ایسے لوگوں کے لیے بہترین جواب، جواب نہ دینا ہوتا ہے۔

''تم سے پھر ملاقات ہو گی، میں تمہیں جاننا پسند کروں گا۔'' مراد نے اس کی جانب جھکتے ہوئے کہا۔ مڑنے سے قبل اس نے ایک بار پھر رفیہ کو غور سے دیکھا پھر کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھ گئی۔

سارہ اب بھی سڑک کو گھور رہی تھی۔ درندہ پنجرے سے باہر آ چکا تھا۔ اب یہاں کسی کا بھی محفوظ رہنا مشکل تھا۔ اسے جو بھی کرنا تھا، جلد کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے دفتر کی شاندار کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا پسندیدہ مشروب تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ آزاد تھا اور آزادی کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوبارہ شکار کر سکتا تھا۔ بس ایک ذرہ بھر رکاوٹ موجود تھی مگر وہ اسے روک نہیں پائے گی۔ وہ مسکرایا۔ اصل میں تو وہ بھی اس کے لیے ایک لطف تھا ایک کھیل جس میں جیت صرف اور صرف اسی کی ہونی چاہیے۔ یہی اس کا نمبرون اصول تھا۔

مشروب سے ایک گھونٹ لینے کے بعد اس نے اپنا

موبائل اٹھایا اس میں ایک وائس میسج موجود تھا۔ اس نے وائس میل کے بٹن کو دبایا۔

''یہاں ایک چھوٹا سا پرابلم ہونے والا ہے۔ لومڑی، مرغیوں کے ڈربے کی جانب جا رہی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں کیا کرنا ہے؟''

پیغام بالکل صاف اور سادہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو غصے سے دبوچا اور پھر دیوار پر دے مارا۔ مضبوط گلاس کرچی، کرچی ہو کر بکھر گیا۔

اس نے فون اٹھا کر ایک کال لگائی۔ ''آپ کا کیا حکم ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو ختم کر دو...... سب کچھ صاف ہو جانا چاہیے۔'' وہ دھیمے مگر تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''اوکے سر۔''

''اس بار خیال رکھنا کہ کام ہو جائے۔''

''اوکے سر۔'' دوسری جانب سے مشینی انداز میں کہا گیا اور پھر لائن کٹ گئی۔

☆☆☆

شام کے سات بج رہے تھے۔

وہ تینوں اس فارم ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے۔ سارہ اور مجید کو پروگرام کے مطابق اکیلے آنا تھا۔ سارہ کا ڈیجیٹل کیمرا خراب تھا اور وہ موبائل سے تصاویر نہیں کھینچنا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے فوزیہ سے اس کا کیمرا مانگا۔ جواب میں اس نے اسے الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر اسے کیمرا چاہیے تو وہ بھی اس کے ساتھ چلے گی اور یہ بھی کہ اگر وہ ساتھ لیے بغیر چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے بھی آسکتی ہے جس کے بعد سارہ کے پاس اسے ساتھ لے کر آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔

سارہ کو وہ بھوت بنگلا اسٹیفن کنگ کے ناولوں میں دکھائی جانے والی پُراسرار جگہوں سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ یہاں دن میں بھی آنا پسند نہ کرتی مگر اس وقت یہاں آنا ان کی مجبوری تھی۔

''یہاں تو بالکل اندھیرا ہے......'' فوزیہ نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

''یہاں اندھیرا ہی ہونا تھا، روشنی ہوتی تو فکر کی بات ہوتی۔'' سارہ نے جواب دیا۔ ماحول بالکل ٹھہرا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مکمل سکوت میں جھینگروں کی آوازیں فل بینڈ بجا رہی تھیں۔ اردگرد بڑھی ہوئی گھاس ہوا میں جھوم رہی تھی۔

''فوزیہ میرا خیال ہے کہ تم یہیں کار میں رہو۔''

''یہ تو تم سوچنا بھی مت......'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ اندر جاؤں گی۔''

''اوکے...... مگر تمہیں خاموش رہنا ہوگا۔ تم ڈرتے وقت بہت بولتی ہو...... معلوم ہے نا......؟''

''نہیں تو...... میں ڈرتے وقت چپ رہتی ہوں زیادہ تر...... میرا مطلب ہے کہ تھوڑا بہت بولتی ہوں مگر اس کی ایک بڑی وجہ ہے...... باتیں کرنے سے ذہن بھی بٹتا ہے اور ڈر کم بھی ہو جاتا ہے...... سوچنے کے لیے کچھ اور مل جاتا ہے جب انسان دوسری طرف مصروف ہوتا ہے تو خود بخود بہتر محسوس کرنے لگتا ہے...... اوہ...... شاید میں پھر زیادہ بول رہی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے پوچھا۔

''بالکل......'' سارہ مسکرائی۔ ''یہی تمہیں نہیں کرنا ہے۔''

وہ تینوں گھاس کو عبور کر کے اندرونی دروازے تک پہنچے جہاں پولیس نے ''کرائم سین...... آگے نہ بڑھیں'' کے ٹیپ لگا رکھے تھے۔ وہ تینوں اس کے نیچے سے گزر کر دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''تو یہاں ہوا تھا وہ سب؟'' مجید نے سرگوشی کی۔ ''یہ فارم ہاؤس مراد شہزاد کا ہے؟''

''نہیں، یہ اس کے نام نہیں ہے مگر درحقیقت یہ اسی کی ملکیت ہے۔'' سارہ نے سر ہلایا۔ مجید نے اس کے اشارے پر بھاری دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔

''سارہ یہ غیر قانونی تو نہیں ہے نا میرا مطلب اس طرح کسی کی پراپرٹی میں داخل ہونا۔''

''نہیں۔'' سارہ بولی۔ ''میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ کو مطلع کر کے اجازت لے لی ہے۔''

وہ اندر داخل ہوئے تو ان کے سامنے ہال نما ایک کمرا تھا جسے سٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس سٹنگ روم کے درمیان سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے جا رہی تھیں۔ وہ ٹارچ کی طاقتور روشنی میں راستہ بناتے نیچے اترے۔ نیچے بھی ایک ہال نما کمرا تھا جس میں ایک جانب بیڈ روم بنا ہوا تھا جبکہ اس کی دوسری جانب ایک کمرے جتنی جگہ فرنیچر سے بالکل عاری تھی۔ اس کی ایک دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ باتھ روم تھا جس کے ٹب میں نازنین احمد کو ڈبویا گیا تھا۔

سارہ اور مجید باریکی سے ایک، ایک انچ کا جائزہ

لے رہے تھے۔ پولیس یہاں اچھی طرح چھان بین کر چکی تھی مگر پھر بھی سارہ کا دل کہتا تھا کہ اسے وہاں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ملے گا جو اس کیس میں ان کی مدد کر سکے گا۔

بیڈ روم والے حصے میں ایک بند دروازہ دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ دروازہ سختی سے بند تھا۔ مجید قدرے زور آزمائی کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ہوا کے تیز جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے باہر جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں سی موجود تھیں۔ گویا یہ اس جگہ کا عقبی یا خفیہ دروازہ تھا۔

''یہ کیسا المیہ تھا......'' سارہ نے سوچا۔ ''وہ لڑکی اس کمرے میں ایک ماہ بند رہی مگر اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر آزادی کا دروازہ موجود تھا یا پھر شاید اس نے اسے اس قابل ہی نہ چھوڑا ہو۔'' یہ سوچ اس کے دل کو دکھا گئی۔ باہر کھلی جگہ تھی جہاں درخت، پودے اور گھاس موجود تھی۔ یہاں کئی گاڑیاں پارک ہو سکتی تھیں اور اگر یہاں سے کوئی اندر آتا تو قریبی پڑوسی کے لیے بھی اسے دیکھنا نہایت مشکل تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ مراد یہاں اکیلا نہ آتا ہو۔'' اس نے سوچا۔

''یہ دیکھیں، مجھے کچھ ملا ہے۔'' مجید کی آواز نے اس کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

''کیا چیز ہے؟'' وہ اس کی طرف لپکی۔

''یہ چھالیہ کا ریپر ہے اسے منہ سے پھاڑا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں اس کا میلویا (تھوک) خشک ہو گیا ہو۔''

''اسے محفوظ کرلو......'' سارہ اس کی تصاویر بناتے ہوئے بولی۔ وہ اپنے ہمراہ شواہد جمع کرنے کے لیے خصوصی پلاسٹک بیگ لائے تھے۔

''مجھے بھی کچھ ملا ہے۔'' چند لمحوں بعد سارہ کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ میں چند بال تھے۔ ''یہ اسی کے ہو سکتے ہیں۔'' وہ اسے تھیلی میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس کیس کے انچارج کو فون کر کے بلا لینا چاہیے۔'' مزید کچھ دیر کی چھان بین کے بعد سارہ نے کہا۔ انہیں فارم ہاؤس میں داخل ہوئے آدھے گھنٹے کے لگ بھگ ہو گیا تھا۔ وہ یہ ثبوت ان کے حوالے کرنا چاہتی تھی تا کہ بعد میں ان میں کسی تبدیلی کا الزام نہ لگ سکے۔ انہوں نے ہر چیز کی کافی تصاویر لے لی تھیں۔

''اتنی سی دیر میں ہم نے کچھ ثبوت حاصل کر لیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم فل ٹائم یہ کام کریں تو بہت سارے کیسز حل کر سکتے ہیں۔'' فوزیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''بالکل۔'' سارہ اسے آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ''ہم غلط پروفیشن میں آ گئے ہیں۔ ہم تینوں کو پرائیویٹ ڈیٹیکٹو بن جانا چاہیے۔'' وہ کیس انچارج انسپکٹر شایان کو فون ملاتے ہوئے بولی۔ انسپکٹر شایان پہلے تو اس بات پر ناراض ہوا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر وہاں کیسے گئے۔ ڈی آئی جی سے لی گئی اجازت کا سن کر اس کا مزاج کچھ بہتر ہوا مگر جب سارہ نے اسے ثبوت لے جانے کے لیے آنے کو کہا تو وہ چیں بہ جبیں ہو کر رہ گیا۔ آخر سارہ کو پھر ڈی آئی جی کارڈ استعمال کرنا پڑا جس کے بعد اس نے آنے کی ہامی بھری۔

سارہ نے فون بند کیا اور فوزیہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہوا؟'' وہ اسے کچھ سوچتا ہوا دیکھ کر بولی۔

''جھینگروں کی آوازیں بالکل بند ہو گئی ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''تو کیا ہوا......'' سارہ نے کہا مگر باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز پر وہ بھی ٹھٹک سی گئی۔

''پولیس اتنی جلد کیسے آسکتی ہے۔'' فوزیہ بڑبڑائی۔

باہر بریک لگنے کی تیز آواز کے ساتھ کار کا دروازہ بند ہوا تھا اور پھر کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

مجید اپنی جگہ منجمد سا ہو گیا تھا۔ سارہ نے اسے دھکا دیا اور فوزیہ کا ہاتھ پکڑ کر عقبی دروازے کی جانب چھلانگ لگائی۔ اس کا دل اس کے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچے تھے کہ پیچھے کانچ ٹوٹنے کی تیز آواز گونجی اور پیٹرول کی تیز بُو نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔

''باہر...... باہر نکلو......'' مجید نے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلنے سے قبل ہی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ اوپر لکڑی کا دروازہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ آگ چاروں طرف سے فارم ہاؤس کو لپیٹ میں لے رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں شدید گرمی اور دھوئیں نے ان کے لیے سانس لینا محال کر دیا تھا۔ ثبوتوں کا تھیلا مجید کے گلے میں تھا۔ تیسرے دھکے پر دروازہ کھل گیا مگر آگ وہاں تک پہنچ گئی تھی۔ کسی نے اس فارم ہاؤس کو ان کے لیے بھٹی بنانے کے لیے پورے اقدامات کیے تھے۔

''باہر نکلو......'' اس نے فوزیہ کو دھکا دیا۔ اس کے چہرے پر خوف دہشت بن کر لہرا رہا تھا۔

''تم......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''بحث کا وقت نہیں ہے فوزیہ۔'' وہ بولی۔ ''تم بھی

مجید جلدی......'' مجید کے نکلتے ہی سارہ نے بھی دروازے کی جانب قدم بڑھائے، اتنے میں اوپر سے کسی چیز کے گرنے کی زوردار آواز سنائی دی شاید کوئی دیوار یا چھت کا کوئی حصہ منہدم ہوگیا تھا۔ سارہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ دھواں اس کے سینے میں اتر گیا تھا۔ آنکھیں بُری طرح جل رہی تھیں۔ وہ اندھوں کے مانند آگے بڑھ رہی تھی۔ آگ تہ خانے میں موجود فرنیچر کو جلا رہی تھی۔ سارہ دروازے سے باہر نکلی مگر پہلی سیڑھی پر وہ گر پڑی تھی جس کے بعد مجید اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی مگر ساکت پڑی جلتے اور گرتے ہوئے فارم ہاؤس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس سب کے پیچھے کون تھا مگر سچ کو جاننے اور اسے عدالت میں ثابت کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس نے گہری سانس لی۔

''سب ٹھیک ہے نا۔'' بالآخر وہ بولی۔ فوزیہ اس کے برابر میں کھڑی تھی جبکہ مجید زمین پر بیٹھا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ثبوتوں کا تھیلا اس کے گلے میں محفوظ تھا۔ ان تینوں کی حالت خراب تھی۔ وہ موت کے منہ سے نکلے تھے۔

☆☆☆

ڈوربیل کی آواز کسی بم دھماکے کے مانند اس کی سماعت سے ٹکرائی اس وقت صبح کے چھ بجے تھے۔ اتنی صبح کون آسکتا تھا اور کیوں؟ اس سوچ نے اسے ایک لمحے کے لیے ساکت سا کردیا۔ کل رات کا ایڈونچر اب بھی اس کے اعصاب پر موجود تھا۔ واپسی پر وہ فوزیہ کے انتہائی اصرار کے باوجود اس کے گھر نہیں رکی تھی۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ گھر آکر اس نے طویل غسل لیا، اور بستر میں گھس گئی تھی۔ دن میں اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ بستر میں لیٹتے ہی وہ نیند کی آغوش میں کھو گئی تھی۔ عادت کے مطابق علی الصبح اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ اپنی معمول کی ورزش میں مصروف تھی۔ دوبارہ بیل بجی تو وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ ہول سے باہر جھانکنے پر اسے پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ نظر آیا۔ اس نے گہری سانس لے کر دروازہ کھولا۔ وہاں ایک دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ وہ کوریئر کمپنی سے آیا تھا۔ اس نے وہ گلدستہ اور ایک کارڈ سارہ کے حوالے کیا۔ اس کے دستخط لیے اور واپسی کا راستہ لیا۔

یہ پھول اسے کون بھیج سکتا ہے؟ وہ لاؤنج کی طرف آتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی اگر یہ شرجیل تھا تو اسے یہ بات پسند نہیں تھا۔ وہ فلرٹی اور ٹھرکی تھا مگر وہ اسے خود سے اس طرح فری ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے گلدستے کو وہاں رکھے گلدان میں لگا دیا۔ وہ بہت خوب صورت گلاب تھے اور ان کی خوشبو سے کمرا مہک اٹھا تھا پھر اس نے کارڈ کو کھولا۔

''بچ نکلنے پر مبارکباد...... مگر جو کچھ تم نے کیا ہے، اس کے بعد تمہارے پاس زندگی جینے کے لیے بہت کم وقت رہ گیا ہے، انجوائے اِٹ...... ایم ایس۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چند لمحے اس کارڈ کو گھورتی رہی۔ غصہ اس کے اعصاب پر اور خوف پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ اس کے بعد اس نے پھولوں کو گلدان سے نکال کر ڈسٹ بن میں پھینکا اور ایک بار پھر کارڈ پر لکھی عبارت پر نظر ڈالی۔

قتل کی اس دھمکی نے اس کے حوصلے کو اور بلند کردیا تھا۔

☆☆☆

اسے تین بجے روشا مراد سے ملاقات کے لیے مراد انکارپوریشن کے دفتر پہنچنا تھا مگر اپنے دفتر جانے، شرجیل خان کو حالات کی مکمل رپورٹ دینے، اس کارڈ کی رپورٹ کرنے میں اس کا کافی وقت لگ گیا تھا۔ مراد انکارپوریشن کی عظیم الشان عمارت شہر سے قدرے باہر تھی۔ تیز رفتاری کے باوجود اسے وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ وہ تین بج کر بیس منٹ پر وہاں پہنچی تھی۔ گیٹ کے ساتھ ریسپشن ایریا اور سیکیورٹی چیک موجود تھا۔ وہاں سے اندر بنی عمارتوں کے درمیان بہت بڑا لان اور سڑک موجود تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق اس کمپنی میں چار ہزار افراد کام کرتے تھے۔ وہ مختلف شعبوں میں کام کررہے تھے اور ملک کی چند بڑی کمپنیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سارہ نے گہری سانس لی اور سیکیورٹی چیک پر رک کر کھڑکی کا شیشہ اتارا۔ سامنے موجود گارڈ درمیانی قدوقامت کا چوکس شخص تھا۔

''سارہ...... ڈسٹرکٹ اٹارنی آفس سے آئی ہوں۔'' وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''میرا روشا مراد سے آج کا اپائنٹمنٹ ہے۔''

''ایک منٹ میڈم۔'' گارڈ ادب سے مسکرایا اور ہاتھ میں پکڑے فون کو کان سے لگالیا۔ ''مجھے افسوس ہے مگر آپ کافی لیٹ ہوگئی ہیں۔'' وہ فون کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو دوبارہ اپائنٹمنٹ لینا پڑے گا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' سارہ نے سختی سے کہا۔ ''مجھے آج اور ابھی ان سے ملنا ہے، مجھے تاخیر اس لیے ہوئی ہے

کہ ان کے والد نے مجھے دھمکی آمیز کارڈ بھیجا تھا اور میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ اس حوالے سے کیا کہتی ہیں۔ مجھے ہر صورت ان سے ابھی ملنا ہے۔''

''دیکھیے میڈم میں یہاں ملازم ہوں میرے تین بچے ہیں اور مجھے اس ملازمت کی بہت ضرورت ہے جبکہ یہاں کے حالات کا عالم یہ ہے کہ یہاں زور سے چھینک مارنے پر بھی لوگوں کو ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر کر نہیں سکتا۔'' گارڈ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں میڈم کی سیکریٹری سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اسے قائل کر لیں۔'' نمبر ملا کر اس نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

''میں سارہ بول رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہیلو مس سارہ...... مجھے افسوس ہے کہ آپ کو دوبارہ وقت لینا پڑے گا۔'' ایک سنجیدہ آواز نے کہا۔

''نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ اسے مجھ سے آج ہی ملنا ہو گا۔ میں اس کے والد سے متعلق کیس پر کام کر رہی ہوں اور مجھے اس حوالے سے اس کا بیان لینا ہے۔'' سارہ نے سخت لہجے میں کہا۔ دوسری جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ''میں یا تو ابھی اس سے ملوں گی یا تین گھنٹوں میں کورٹ آرڈر کے ساتھ واپس آؤں گی۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اس الجھن میں پڑنا نہیں چاہیں گے۔''

''آپ میری گارڈ سے بات کرائیں۔'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

سارہ نے فون گارڈ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے کچھ سن کر سر ہلایا۔ فون بند کیا اور مسکرایا۔ ''آپ اندر جا سکتی ہیں مس۔'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بول رہا تھا۔ سارہ نے کار اسٹارٹ کی۔ اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کیا تم مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو؟''

''آپ کو میڈم کی جگہ فواد شہزاد سے ملنا چاہیے۔''

''یہ کون ہے؟'' سارہ نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔

''وہ مراد صاحب کے بھائی ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''اور ان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' سارہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں مگر لوگ انہیں بھوت کہتے ہیں۔ آج تک کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ کبھی کبھار آتے ہیں مگر لوگ کہتے ہیں کہ انہیں سب کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور مجھے اس شخص کے بارے میں مزید تفصیلات کون بتا سکتا ہے؟ روشنا؟''

''آپ کو اس کے بارے میں سونیا احمد سے بات کرنی چاہیے۔'' وہ رازداری سے بولا۔

یہ نام دوسری بار سارہ کے سامنے آیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مراد شہزاد کی بیٹی تھی اور اس کا نام پہلے روشنا مراد تھا۔

''یہ کون ہے؟ اس کا مراد شہزاد سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔

''جی ہے۔'' وہ بولا۔ اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ''ویسے مجھے اس پر ترس آتا ہے......'' وہ آہستگی سے بولا اور پیچھے ہٹ گیا۔

سارہ نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

روشنا مراد کا دفتر عمارت کے ٹاپ فلور پر تھا وہاں تک پہنچنے کے لیے سارہ کو مزید دو سیکیورٹی چیکس اور پھر ریسپشن سے گزرنا پڑا تھا۔

''مس سارہ؟'' اس کے دفتر کے باہر ایک طویل القامت خاتون اس کی منتظر تھی۔ اس سے ہی اس کی فون پر بات ہوئی تھی۔

''جی۔''

''تشریف لایئے، مس روشنا آپ کی منتظر ہیں۔''

اس کا دفتر بہتر شاندار تھا۔ وہ خود بہت شاندار شخصیت کی مالک تھی۔ خوب صورت مغلئی آنکھیں، ستواں ناک، دودھ جیسی رنگت کے ساتھ وہ مس ورلڈ جیسے حسن کی مالک تھی۔

''تشریف رکھیے۔'' اس کی آواز اس کی شخصیت کے مقابلے میں قدرے سخت تھی۔ ''سب سے پہلے میں ایک بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں اپنے وکیلوں کی غیر موجودگی میں اپنے والد کے کیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔''

''او کے۔'' سارہ نے نوٹ پیڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ہمیں ان سے زیادہ دلچسپی فواد شہزاد کے بارے میں جاننے سے ہے۔ وہ آپ کے والد کے بھائی ہیں نا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے اپنی معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں، وہ میرے چچا نہیں ہیں۔''

سارہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ''یعنی یہ وزٹ میرے ڈیڈی کے حوالے سے نہیں ہے۔''

''نہیں یہ آپ کے اور فواد صاحب کے حوالے سے

ہے۔''

''میرے...... میرا ان تمام معاملات سے کیا تعلق ہے؟''

''آپ اپنے والد صاحب کے ساتھ کام بھی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانتی ہوں گی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ ان کے خلاف گواہی دیں۔ ظاہر ہے کہ آپ یہ نہیں کریں گی مگر ان کی زندگی، رویوں، دلچسپیوں کے بارے میں تو بتا ہی سکتی ہیں۔'' سارہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ بولی۔

''پھر آپ مجھے سونیا احمد کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟'' سارہ نے ترپ کا پتا پھینکا۔ ''وہ کون ہے؟''

اس سوال کے جواب میں روشنا کھڑی ہوگئی تھی۔

''یہ میٹنگ ختم ہو چکی ہے، آپ جا سکتی ہیں۔'' اس نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

''مس روشنا...... زندگی میں سکون رکھنے کے لیے سچ بولنا ضروری ہے۔'' سارہ بولی۔

''آپ جا سکتی ہیں۔'' روشنا نے زہریلے لہجے میں کہا اور ڈیسک پر رکھا بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحے دو ہٹے کٹے گارڈ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''اتنی زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔'' سارہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ مجھ سے کبھی بھی بات کرنا چاہیں تو مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔'' اس نے میز پر کارڈ رکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

نیچے ریسیپشن کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ڈیسک پر موجود لڑکی کے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ وہ کچھ سوچ کر ریسیپشن کی طرف مڑ گئی۔

''جی فرمائیے۔'' اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''اصل میں مجھے کچھ ڈاکیومنٹ روانہ کرنے ہیں۔'' اس نے نوٹ بک کو دیکھ کر پڑھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''مس سونیا احمد کو...... مجھے کہا گیا ہے کہ مجھے آپ سے اس کا پتا مل جائے گا۔''

''ایک منٹ۔'' وہ مسکرائی پھر اس نے قلم اٹھا کر کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے سارہ کی جانب بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' اس نے سر ہلایا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ یہ نام بار بار اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سونیا احمد اسے اہم معلومات دے سکتی تھی۔ سب سے پہلے تو اس کی شخصیت ہی پُراسرار تھی۔ اس کے بارے میں معلومات مراد شہزاد کے رازوں پر سے پردہ اٹھنے کے برابر تھی۔ مراد انکارپوریشن کے احاطے سے باہر نکل کر اس نے مجید کو سونیا کا ایڈریس بھیجا اور اسے فوراً وہاں پہنچنے کی ہدایت دی، وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایکسلریٹر پر پیر رکھا۔ گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے پاس بے شمار دولت تھی، طاقت تھی، ملازمین کی فوج تھی۔ وہ ہر کام کے لیے دس ملازم رکھ سکتا تھا مگر اس کے باوجود ہر تجربہ اس کی اس سوچ کو سچ ثابت کرتا تھا کہ اگر کوئی کام بالکل ٹھیک کرنا ہو تو اسے خود ہی کرنا چاہیے۔ شکار کرنا اس کا مشغلہ تھا اور اسے اس میں بہت لطف آتا تھا مگر اس کے بعد پھیلی گڑبڑ کو ٹھیک کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے ہی وہ ان لوگوں کو تنخواہیں دیتا تھا مگر یہ لوگ......

اس نے گہری سانس لی اور زمین پر پڑے طویل القامت شخص کے سینے پر اپنے گھٹنے کا وزن بڑھا دیا۔

''مم...... میں...... میں معافی مانگتا ہوں...... میں نے تو آپ کے کہنے کے مطابق اس معاملے کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ گھگیا کر بولا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں مراد شہزاد کے ہاتھ میں موجود آٹھ انچ لمبے چمک دار چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔

''کوشش......'' وہ زور سے بولا۔ ''کیا میں تمہیں کوشش کرنے کی تنخواہ دیتا آیا ہوں۔ اگر تم نے اپنا کام ٹھیک طرح سے کیا ہوتا تو وہ میرے کاموں میں گھس نہ رہی ہوتی۔ آخر وہ اب تک زندہ کیوں ہے؟''

''آپ نے مجھے اسے قتل کرنے کو نہیں کہا تھا۔ میں اسے آج ہی ختم کر دوں گا۔'' جواب میں مراد کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔

''مجھے یہ مت بتاؤ کہ میں نے کیا کہا تھا، تم نے مجھے ناکام کیا ہے اب یہ کام میں خود کروں گا۔'' گھونسے کی وجہ سے شاید اس کا چہرہ پھٹ گیا تھا۔ اس نے مراد کو اپنے سینے سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ اس نے اس کے سینے پر وزن اور بڑھا دیا۔

''مم...... میں ایک موقع مانگ رہا ہوں۔'' وہ بمشکل بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''ہاہاہا...... مجھے مایوسی سے نفرت ہے اور ناکام لوگوں سے بھی...... زندگی طاقتور کا حق ہے کمزور کو جینے کا حق نہیں ہے۔'' وہ اسے آنکھ مار کر مسکرایا پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور

چاقو اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس کے اردگرد خون کا تالاب سا بننے لگا تھا۔ مراد چند لمحے اسے تڑپتے دیکھتا رہا پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

''آپ کے خیال میں سونیا احمد سے ہمیں کیا مدد مل سکتی ہے؟'' مجید نے پوچھا۔ وہ سارہ کے بھیجے ہوئے ایڈریس پر اس سے پہلے پہنچ گیا تھا۔

''پتا نہیں۔'' سارہ نے سادگی سے کہا۔ ''میں صرف اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہمیں اس سے مدد ملے گی، میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ اس نے اپنا نام کیوں بدلا؟''

سونیا احمد کا فلیٹ اس مضافاتی بستی کی سب سے پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ سیڑھیاں اور پوری عمارت ہی نہایت خستہ حالت میں تھی۔ اس کے فلیٹ کے دروازے پر کوئی گھنٹی وغیرہ موجود نہیں تھی۔ مجید نے ایک بار کنڈی بجائی۔ جواب نہ ملنے پر اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' ایک لمبی دبلی پتلی خاتون نے دروازہ کھولا۔ وہ ملگجے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔

''آپ سونیا احمد ہیں؟'' سارہ نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں...... کس اخبار سے آئی ہیں؟'' اس نے سختی سے پوچھا۔

''نہیں، میں سرکاری وکیل ہوں' مجھے آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔''

''مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' اس نے یہ کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر سارہ پہلے ہی اپنا پاؤں چوکھٹ میں اڑا چکی تھی۔

''دیکھو، ہم ایک گھنٹے میں کورٹ آرڈر لے کر آ سکتے ہیں مگر پھر تمہیں بیان دینے کے لیے عدالت آنا پڑے گا۔''

وہ اپنی بڑی، بڑی آنکھوں سے چند لمحے سارہ کو گھورتی رہی جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کر رہی ہو۔

''او کے، کیا پوچھنا ہے تمہیں......؟''

''کیا ہم اندر بیٹھ سکتے ہیں؟'' سارہ نے پوچھا۔ جواب میں وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

یہ دو کمروں پر مشتمل فلیٹ تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ، جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ گھر بے حد گندا ہو رہا تھا۔ دیواروں پر جالے لٹک رہے تھے۔ ہر طرف گندے کپڑے، سنے ہوئے برتنوں اور کچرے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بو پورے فلیٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔

''کوئی اس قدر گندا کیسے رہ سکتا ہے؟'' سارہ نے سوچا۔

''سوری، میں کئی دنوں سے صفائی نہیں کر پائی۔'' وہ ایک صوفے پر بکھرے کپڑوں کو جمع کر کے بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے بولی۔ ''آپ لوگ یہاں بیٹھ جائیں، مجھ سے کیا پوچھنا ہے آپ کو......؟''

''آپ بھی بیٹھیں۔'' سارہ نے کہا۔ ''یہ مجید ہیں، میرے اسسٹنٹ۔'' سارہ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے تو مجھے یہ جاننا ہے کہ تم نے اپنا نام کیوں بدلا؟''

''نام...... مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ سارہ ایک لمحے تک اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تمہارا مراد شہزاد سے کیا رشتہ ہے؟'' اس سوال نے اسے یکدم بے چین کر دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے تھے مگر وہ بالکل خاموش رہی۔

''کیا تم فواد شہزاد کو جانتی ہو؟'' سارہ نے دوبارہ پوچھا۔

اس بار اس نے کھوئی ہوئی نظروں سے سارہ کو دیکھا اور اثبات میں گردن ہلائی مگر اس بار بھی وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

''سونیا! مجھے اندازہ ہے کہ تم بات کیوں نہیں کرنا چاہتیں مگر تمہیں اپنی بات کسی نہ کسی سے تو شیئر کرنا ہو گی تا اپنی کہانی سنانا ہو گی۔''

''میری کہانی......'' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور جہان میں چلی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں فضا میں گھور رہی تھیں۔ سارہ خاموشی سے اس کے بولنے کی منتظر تھی بالآخر وہ بولی۔

''میں نے عرصے سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ یہ مقدمہ بُری یادوں کو دوبارہ اکھیڑنے کا سبب بنا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ دوبارہ اپنی یادوں میں کھو گئی۔

''سونیا......'' چند لمحوں بعد سارہ نے اسے پکارا۔

''میں تمہاری کہانی سننا چاہتی ہوں۔''

''یہ کوئی پریوں کی کہانی نہیں، یہ ایک ہارر اسٹوری ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔ ''اس کا آغاز اس وقت ہوا جب میں بارہ سال کی تھی۔ اس گھر میں زندگی ایک مسلسل عذاب تھی، لوگوں کی نظر میں وہاں سب کچھ تھا۔ کپڑے، کھلونے، دعوتیں، تفریح مگر اصل میں خوف، دہشت، ڈر اور اذیت

ہمارا مقدر تھی، وہ ایک جانور ہے۔'' وہ لرز کر بولی۔
''تو کیا تم نے کسی کو اس سب کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟''
''ہاں، انکل فواد کو مگر انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب میرا تخیل ہے، ان کا خیال تھا کہ میں اپنی ماں کی موت کی وجہ سے ذہنی انتشار کا شکار ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے کسی اور کو اپنی کہانیاں سنائیں تو مجھ سے سب کچھ چھن جائے گا۔ میں نے چند راتوں بعد انہیں بتایا تھا کہ مراد کیا کر رہا ہے۔ میں نے انہیں کمرے میں بلا لیا تھا۔''
''مجھے بہت افسوس ہے سونیا۔'' سارہ نے اپنے دل کی گہرائی سے کہا۔
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں جن میں سے چند قطرے اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔
''تم وہاں سے کب اور کیسے نکلیں۔'' سارہ نے پوچھا۔
''میں نے اپنی اٹھارویں سالگرہ کے اگلے روز وہ محل چھوڑ دیا تھا۔ میں دفتر میں کام کر رہی تھی مگر اب وہ بھی ممکن نہیں تھا۔ میری ایک دوست نے مجھے ملازمت دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ملازمت کی کوشش کرتی رہی۔ وہ تو نہیں ملی ہاں اس نے مجھے بھری ہوئی سگریٹ پی کر غم بھلانا سکھا دیا۔'' وہ روتے روتے مسکرائی۔ ''مجھے ڈر تھا کہ مراد مجھے نہیں چھوڑے گا مگر کسی نے میرا پیچھا نہیں کیا۔ صرف انکل فواد آئے۔ انہوں نے میرے لیے ماہانہ ایک جیب خرچ طے کر دیا۔ میں مجبور تھی، کم از کم اس طرح میں یہاں رہ سکتی ہوں۔ میں مراد اور انکل فواد دونوں میں سے کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ یوں بھی ان دونوں کو ساتھ دیکھنا عجیب سا ہی لگتا ہے۔''
''وہ کیوں......؟'' مجید نے بے اختیار پوچھا۔
''ایک ہی جیسے دو لوگوں کو ساتھ ساتھ چلتے دیکھنا عجیب تو لگتا ہی ہے۔''
''کیا مطلب؟'' سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر دیوار پر لگی شیلف کے قریب گئی۔ وہاں سے ایک کتاب نکال کر اسے جھاڑا اور اندر سے ایک تصویر نکال کر لائی۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی سارہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس تصویر میں چھوٹی سی سونیا، ایک عورت اور دو بالکل ایک جیسے مرد موجود تھے۔ ان میں مراد شہزاد کون تھا اور فواد شہزاد کون...... یہ بتانا مشکل تھا۔
''انکل فواد اور مراد جڑواں بھائی ہیں۔'' سونیا کی آواز گویا کہیں دور سے اس کے کانوں میں آئی۔ ''انکل فواد شروع سے بیک گراؤنڈ میں رہے ہیں۔ لوگ انہیں نہیں جانتے۔''
سارہ کا دماغ قلابازیاں کھا رہا تھا۔ 'یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ مراد اور فواد اپنے کردار بدلتے رہتے ہوں۔' اس نے سوچا۔
''کیا ہم یہ تصویر رکھ سکتے ہیں؟'' مجید نے پوچھا۔
''ہاں بالکل......'' وہ بولی۔
''فواد شہزاد کہاں ہے؟''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم...... وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے ہیں۔'' سونیا نے کندھے اچکائے۔
سارہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب بھی کوئی بات اس کی نظر سے چھپی ہوئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ مراد نے اپنی بیٹی کو کیوں چھوڑ دیا۔ دفتر میں ملنے والی روشنا اس تصویر میں کیوں نہیں تھی؟''
''سونیا مجھے یہ لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟''
اس سوال نے دوبارہ اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔
''میں نے انکل فواد سے ملنے والے پیسے جمع کر کے کچھ کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے بعد میں ان سے پیسے نہ لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ انہی دنوں مجھے ایک خط ملا۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ سارہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل سونیا کے لیے رو رہا تھا۔
''اس خط پر کوئی ایڈریس نہیں تھا۔ اس خط نے مجھے بتایا کہ میں روشنا مراد نہیں سونیا احمد ہوں۔''
''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' سارہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔
''مجھے...... مجھے اغوا کیا گیا تھا۔''
''اغوا...... کس نے اور کیوں؟'' یہ کہانی لحہ بہ لحہ اُلجھتی جارہی تھی۔
''مراد شہزاد نے...... مراد شہزاد میرا اصل باپ نہیں ہے نہ ہی اس کی بیوی میری اصل ماں تھی۔ اس نے مجھے اس وقت اغوا کیا جب میں تین سال کی تھی۔ میرے اصل ماں باپ کو مراد شہزاد نے قتل کر دیا تھا۔''

''رکو...... تمہیں یہ کس نے بتایا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو قتل کیا ہے؟''

''خود اس نے...... میں نے آخری ملاقات میں اس سے پوچھا تھا اس نے تسلیم کیا کہ اس نے یہ کیا ہے مگر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' آنسو پھر اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اس سب کے بعد مجھے پینک اٹیک آنے لگے۔ میں ایک ماہ تک اسپتال میں داخل رہی، میں نے پولیس کو یہ سب بتانے کی کوشش کی مگر مراد شہزاد کے مقابلے میں میری آواز کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے پاس سب کچھ ہے اور میرے پاس کچھ بھی تو نہیں......'' اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

''مگر تمہارے پاس ایک ثبوت یہ تصویر بھی ہے کہ تمہارا ان سے تعلق رہا ہے۔''

''مگر اب کاغذات میں، میں روشنا نہیں ہوں اور ان کے پاس دوسری روشنا مراد ہے۔ تمہارے خیال میں کیا وہ میڈیا کو یہ سوال کرنے دیتے کہ ان کی بیٹی کہاں گئی، انہوں نے اس کا انتظام کرلیا۔ روشنا مراد اس کے لیے کام کرتی ہے جب وہ یہاں نہیں ہوتا تو وہی سب کچھ سنبھالتی ہے۔''

''اوہ...... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں، کس طرح تمہاری مدد کروں۔''

''تم کچھ نہ کرو، اگر تم نے اس کے خلاف کچھ کیا تو تمہاری حالت بھی میری جیسی ہوجائے گی یا شاید مجھ سے بھی بُری...... وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ تم اچھی لگی ہو مجھے، میرا مشورہ ہے اس کے بارے میں سب کچھ بھول جاؤ، یہ سمجھو کہ تم کسی مراد شہزاد کو نہیں جانتیں۔''

''سونیا کیا تم اس کے خلاف گواہی دے سکتی ہو، تمہاری گواہی ہمارے لیے بہت اہم ہوسکتی ہے۔''

''نہیں......'' وہ زور سے چلائی۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتی، اس سے پہلے ہی وہ مجھے مروا دے گا۔ سارہ تم نہیں جانتیں، وہ کتنا طاقتور ہے۔'' اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ''اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

''مگر کسی کو تو اُسے روکنا ہے نا......'' سارہ نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کو جانا چاہیے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''مگر سونیا......'' سارہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''جاؤ......'' وہ چلائی۔

سارہ اور مجید ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر سارہ رکی اور مڑ کر بولی۔ ''زندگی میں کبھی نہ کبھی انسان کو جرأت کرنا پڑتی ہے۔ اگر تم ہمت کرتی ہو تو تم کسی دوسری لڑکی کو تباہ ہونے سے بچا سکتی ہو۔ اگر یہ تمہاری سمجھ میں آجائے اور تم میرا ساتھ چاہو تو مجھے اس نمبر پر کال کرسکتی ہو۔'' وہ اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ لے لیا اور دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ''کوئی مراد شہزاد سے نہیں بچ سکتا...... کوئی نہیں۔''

☆☆☆

واپسی کے سفر میں وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ سونیا احمد کی کہانی نے انہیں دکھی کردیا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے فواد شہزاد نے اغوا کیا تھا۔'' سارہ نے بالآخر کہا۔

''میرا خیال تھا کہ آپ ان میں سے کسی کو نہیں پہچان پائی تھیں۔''

''میں نے یہ کبھی نہیں کہا...... اصل میں، میں نے وہاں مراد شہزاد کو دیکھا تھا مگر ان دنوں وہ جیل میں تھا اس لیے یہ بتانا حماقت لگ رہا تھا۔''

''میں ایک بات اور سوچ رہا ہوں......'' وہ چند لمحوں بعد بولا۔

''وہ کیا......؟''

''اس سب کے بعد آپ کا اپنے اپارٹمنٹ میں رہنا خطرناک ہوسکتا ہے، اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں، میں نے بھی یہی سوچا ہے، ہم ابھی میرے اپارٹمنٹ چل رہے ہیں، مجھے وہاں سے کچھ سامان لینا ہے پھر ہم آفس جائیں گے۔''

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی سارہ نے سب سے پہلے الماری سے اپنی گن نکالی۔ وہ لوڈڈ نہیں تھی۔ اس کے پاس اس کے تین بلٹس بھی موجود تھے۔ اس نے وہ بلٹس بھی پرس میں ڈال لیے۔ اس کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ پہلا کیس تھا جس کی وجہ سے اسے اپنا گھر چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے تصور میں سونیا احمد کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا تو گویا دماغ کا چینل بھی تبدیل ہوگیا۔ اس بار اسے نازنین احمد کی زخموں سے بھری لاش نظر آرہی تھی۔

اسی دوران اس کا فون بجا۔ خاموشی میں بیل کی آواز پر وہ باقاعدہ اچھل پڑی تھی۔

''ہیلو......'' دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

''ہیلو......'' اس بار وہ چیخ پڑی۔ وہ دوسری سمت سے

کسی کی سانسوں کی آواز بخوبی سن سکتی تھی پھر اس نے جھنجلا کر فون بند کر دیا۔ کالز آئی ڈی میں وہ نمبر نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے فون میز پر رکھا، چند منٹ بعد فون پھر بج اٹھا۔ اسکرین پر اس بار بھی کوئی نمبر نظر نہیں آرہا تھا۔ سارہ نے فون اٹھایا مگر کچھ نہیں بولی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سرگوشی میں کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے فون کی آواز فل والیوم تک بڑھائی۔ اب وہ اسے سن سکتی تھی۔

''سارہ۔'' دوسری طرف سے کوئی اس کا نام لے رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سارہ کے پورے جسم پر سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سانپ جیسی زہریلی آواز بار، بار اس کا نام لے رہی تھی۔ سارہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ گھنٹی فوراً ہی دوبارہ بجی۔ اسکرین پر اس بار بھی کوئی نمبر نظر نہیں آرہا تھا۔ سارہ نے فون بند کر دیا...... اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ وہ چند لمحے وہیں بیٹھی رہی پھر تیزی سے کمرے میں گئی، بیگ میں اپنا ضروری سامان رکھنا شروع کیا۔ خوف پر اب غصہ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مراد شہزاد کو گولی سے اُڑا دینا چاہتی تھی مگر وہ اس کی وجہ سے مزید نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے اب نئی اسٹریٹجی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا تھا۔

مجید نیچے اس کا منتظر تھا۔ گھر سے دفتر کا رستہ خاموشی سے گزرا تھا۔ اس دوران میں وہ مسلسل سوچتی رہی تھی۔

شرجیل خان ان دونوں کا منتظر تھا۔ سارہ نے سب سے پہلے روشنا اور پھر سونیا سے ملاقات کی رپورٹ پیش کی۔

''تو اب تم آگے کیا کرنا چاہو گی......؟'' شرجیل خان نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے وہ کچھ مختلف نظر آرہی تھی۔

''میں......'' سارہ نے پہلے اُسے اور پھر مجید کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ''میں یہ کیس چھوڑنا چاہتی ہوں۔''

''کیا......؟'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

''آپ اب یہ کیسے کر سکتی ہیں؟'' مجید کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ''اگر آپ نے یہ کیس چھوڑ دیا تو یہ کبھی حل نہیں ہو پائے گا۔ آپ اس بارے میں سب کچھ جانتی ہیں، اتنی محنت کی ہے آپ نے۔''

''اور وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، میرا گھر یا کوئی جگہ بھی میرے لیے محفوظ نہیں رہی ہے۔'' اس کی آواز بھیگ سی گئی۔ ''اس نے مجھے اغوا کیا، تم اور فوزیہ میرے ساتھ مرتے مرتے بچے، ہم اتنی خطرناک آگ میں پھنسے...... وہ میرے گھر دھمکیوں بھرے کارڈز کے ہمراہ پھول بھیجتا ہے، گمنام کالیں کر کے میرے اعصاب سے کھیل رہا ہے اور اس کے باوجود آزاد ہے...... میں مزید اس کیس پر کام نہیں کرنا چاہتی۔''

''آپ درست کہہ رہی ہیں مگر پھر بھی اب آپ کا اسے چھوڑنا غلط ہے۔'' مجید بہت ہرٹ ہوا تھا اُسے سارہ سے اس فیصلے کی امید نہیں تھی۔

''میں چاہتی ہوں کہ یہ کیس کسی زیادہ تجربہ کار وکیل کو دیا جائے شاید وہ اسے مجھ سے بہتر طور پر ڈیل کر سکے۔'' سارہ نے اپنی بات مکمل کی۔

سارہ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اور...... اسے تم سے زیادہ اچھی طرح لڑ سکتا ہے۔'' شرجیل خان بولا۔ ''پھر بھی تمہیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ میں یوں بھی پہلے اپنی حفاظت کے اصول کو پسند کرتا ہوں۔ اگر تم یہ کیس چھوڑنا چاہتی ہو تو میں تمہارے فیصلے کو قبول کرتا ہوں، تم اس وقت بہت الجھی ہوئی ہے۔ چند دن آرام کرو۔ منگل کو واپس آؤ، میں تمہیں کوئی دوسرا کیس دے دوں گا۔''

سارہ خاموشی سے سب سن رہی تھی۔

''مجید تم اس کیس پر کام کرتے رہو۔ میں جلد ہی مناسب شخص ڈھونڈ لوں گا۔'' مجید اب بھی سارہ کی طرف پُرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ نے یہ چند دن کسی مناسب گیسٹ ہاؤس میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں وہ مراد شہزاد کے معاملے سے الگ ہو کر اس کے بارے میں ٹھیک طرح سے غور کر سکتی تھی مگر اس سے قبل اس کا فوزیہ سے ملنا اور بات کرنا ضروری تھا۔ ورنہ یقیناً وہ اسے خود ہی گولی مار دیتی۔ اس لیے دفتر سے نکل کر اس نے کار کا رخ فوزیہ کے گھر کی جانب موڑ لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا یہ فیصلہ کیسا ثابت ہونے والا تھا مگر اسے یہ یقین تھا کہ وہ شیطان اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اسے اپنی حفاظت کا خود انتظام کرنا تھا۔ اس نے پرس میں رکھے لیڈی گلوک کو تھپتھپایا اور پرس سے انسپکٹر والا کارڈ نکال کر اس پر لکھا نمبر ڈائل کیا۔

''سلیمان ہیئر......'' کار کے اسپیکر پر ایک بھاری تحکمانہ آواز گونجی۔

''ہیلو...... مسٹر سلیمان، میں سارہ ہوں، مجھے آپ کا نمبر انسپکٹر شیبا سے ملا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' دوسری جانب سے ہلکے سے قہقہے

کے ساتھ کہا گیا۔ ''وہ اور سلیم بہت اچھے آفیسر ہیں مگر سلیم تھوڑا خبطی ہے، اسے یقین ہے کہ اس کے لیے گن کی موجودگی ضروری ہے۔ آپ کیا کرتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سرکاری وکیل ہوں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی۔''

''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں...... ویسے ہتھیار اور ان کے استعمال کی تربیت میرا شوق اور پہچان ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاید کم ہی لوگ میری نشانہ بازی کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔''

''مجھے بھی اسی لیے آپ سے ملنا ہے۔'' سارہ نے جواب دیا۔

''آپ کے پاس کوئی گن ہے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ اس کے بارے میں کتنا جانتی ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں، یہ ایک لیڈی گلوک ہے اور میرے والد نے اسے مجھے دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے صرف ایک شکار پارٹی میں استعمال کیا تھا سال پہلے...... اور میرا نشانہ نہیں لگا تھا۔'' اس نے متانت سے کہا۔

''گڈ پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ آئی ہیں، مجھے چیلنج پسند ہیں۔'' دوسری جانب سے اتنی ہی متانت سے کہا گیا۔ ''ہمیں ایک ملاقات کرنا ہوگی تاکہ ہم کام شروع کرسکیں۔ کیا آپ کل صبح نو بجے میرے شوٹنگ رینج پر پہنچ سکتی ہیں؟''

''کل صبح......؟'' سارہ کو اتنی تیزی کی توقع نہیں تھی مگر اس کے لیے جلدی کرنا ہی بہتر آپشن تھا۔

''او کے...... یہ کافی جلدی ہوگا مگر میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔'' سارہ نے جواب دیا۔

''گریٹ، میں ایڈریس آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اگر کوئی دقت ہو تو مجھے کال کر لیجیے گا۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

سارہ، فوزیہ کے گھر کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ اسے اپنی آمد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ وہ گاڑی پارک کر کے باہر نکل رہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین کی جانب دیکھا، فون کسی انجان نمبر سے آیا تھا۔

''ہیلو۔''

''میڈم جی میں رفیہ کی ماں بول رہی ہوں۔'' دوسری جانب سے آنے والی آواز قدرے پریشان لگ رہی تھی۔

''آپ......؟ خیریت ہے نا......؟'' سارہ نے پوچھا۔

''بس اس لڑکی نے پریشان کیا ہے، آپ سے شکایت کرنے کے لیے فون کیا ہے۔''

''کیا کیا رفیہ نے......؟'' سارہ چلتے ہوئے بولی۔ رفیہ قدرے منہ پھٹ تھی مگر سارہ کی ہر بات مانتی تھی۔

''سویرے سے پریکٹس کے لیے گئی ہے۔ شام ہوگئی ہے ابھی تک نہیں لوٹی۔ کومل اور سائرہ بھی گھر پر ہیں۔ اس نے فون بند کر رکھا ہے۔ ماں کا ذرا خیال نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں، میں اُس کے کان کھینچتی ہوں اچھی طرح سے، وہ تھوڑی دیر میں آجائے گی۔'' رفیہ کی ماں کو تسلی دینے کے بعد اس نے رفیہ کا نمبر ملایا، فون اب بھی بند آرہا تھا۔ اس نے اسے فوری طور پر ماں سے رابطے اور گھر پہنچنے کی ہدایت کا ایس ایم ایس بھیجا تاکہ وہ فون کھولتے ہی اسے پڑھ سکے۔

دروازہ احسن نے کھولا تھا۔

''محترمہ کہاں ہیں؟'' اس نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

''تمہاری خطرناک دوست غسل فرما رہی ہے۔'' احسن نے کہا اور سینٹر ٹیبل پر پھیلائے ہوئے موٹر سائیکل کے پُرزوں کو ترتیب سے رکھنے لگا۔

''کیا آج ڈنر میں اسپیئر پارٹس ملنے والے ہیں؟'' سارہ نے اُسے چھیڑا۔

''کیا بات کی ہے۔ انہیں اگر گریس میں میرینیٹ کر کے کھایا جائے تو دگنا مزہ آتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ احسن اسے بہت پسند تھا۔ وہ ایک مانا ہوا سیکیورٹی سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ ایک اچھی کمپنی میں اعلیٰ پوسٹ پر کام کرتا تھا۔ اینٹک اور بہترین موٹر سائیکلوں کے انجن اور باڈی جمع کر کے انہیں بنانا اس کا شوق تھا اس کے لیے اس کے گیراج میں ہر قسم کے ٹولز دستیاب تھے۔

''تم یہ نہیں پوچھو گی کہ یہ سب یہاں کیا کررہا ہے؟''

''آپ بتا دیجیے......'' سارہ صوفے کے کشن کو گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

''فوزیہ کئی دن سے کہہ رہی تھی کہ میں اس سے زیادہ وقت ان کو دے رہا ہوں اس لیے میں انہیں اندر ہی لے آیا۔''

''پھر خوش ہوئی وہ؟''

''نہیں بھئی۔'' احسن نے مصنوعی افسوس کے ساتھ سر

ہلایا۔ سارہ ہنس رہی تھی۔
”آ گئیں تم......“ فوزیہ آتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ اس کے گیلے بالوں سے ٹپکتے پانی نے سارہ کا چہرہ گیلا کر دیا تھا۔ ”میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہی تھی۔ یہ بتاؤ پہلے کھانا کھاؤ گی یا باتیں کر لیں۔“
”کھانا تھوڑی دیر میں۔“ سارہ ذرا سستی سے بولی۔
”تو پھر مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔“ وہ اس کے سامنے صوفے پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بولی۔
سارہ نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے فیصلے کے متعلق بتایا۔ اس کے خیال میں فوزیہ کو اس بات سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
”کیا ہوا؟“ سارہ نے چند لمحوں بعد پوچھا۔
”یہ تمہاری عادت نہیں ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔
”کیا مطلب؟“ سارہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔
”تم کسی چیز کو یا کیس کو اس طرح درمیان میں چھوڑنے والی نہیں ہو اور نہ ہی تم کسی سے اس قدر خوف زدہ ہو سکتی ہو...... کیا تم اپنے اس فیصلے سے مطمئن ہو؟“
سارہ جواب میں پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ اسے واقعی فوزیہ سے بہتر شاید ہی کوئی سمجھ سکتا تھا۔ یہ تو صرف وہی جانتی تھی کہ اس نے کیس کو نہیں چھوڑا تھا صرف خود کو تازہ دم کرنے کے لیے منظر سے ہٹایا تھا۔ یوں بھی اب یہ اس کے لیے صرف ایک مقدمہ نہیں تھا۔ یہ اس کی اپنی بقا اور ذاتی زندگی سے جڑ گیا تھا۔ اسے اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہی تھا اور اس کے لیے اسے خود کو تیار کرنا تھا۔
”خیر، ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم اب محفوظ ہو۔ اس منحوس کو اس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی تم اب اپنے ذہن سے اس کی ٹینشن نکال پھینکو۔“
”میں خود اس کے بارے میں اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ سارہ نے کہا۔ ”مجھے ان چار دنوں میں خود کو پُرسکون کرنا ہے۔ اس فراغت کا مجھے بہت دنوں سے انتظار تھا۔ میں نے گیسٹ ہاؤس میں ایک کمرا بک کرایا ہے۔ میں خوب سوؤں گی اور رکے ہوئے کاموں کو نمٹاؤں گی۔“
”یہ تو بہت اچھا ہے...... مگر رکو تم نے کیا کہا تم کسی گیسٹ ہاؤس میں رکو گی؟“ فوزیہ نے اسے خطرناک انداز میں گھورا۔
”ہاں، دیکھو فوزیہ تم جانتی ہو کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں۔ میں تمہیں اس اُلجھن میں پھنسانا نہیں چاہتی۔“
”بہت اچھے، تو پھر ابھی یہاں کیوں آئیں؟“ وہ غرائی۔ ”یہ تو براہِ راست میری بے عزتی ہے، بہرحال میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس عام حالات میں عقل تھوڑی کم ہے اس لیے میں تم کو معاف کرتی ہوں۔ یہاں میرے گھر کے ہوتے ہوئے تمہیں کہیں اور ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اوپر ہمارا گیسٹ روم ہے وہاں اپنا سامان رکھو لے جا کر۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔
”مگر فوزیہ......“
”تمہیں معلوم ہے نا کہ تمہیں وہی کرنا پڑے گا جو میں کہہ رہی ہوں۔ میں جذباتی نہیں ہو رہی سارہ۔ تم اس گھر میں زیادہ محفوظ رہو گی۔ احسن تمہیں سیکیورٹی روم بھی دکھا دیں گے۔ ہماری غیر موجودگی میں تم وہاں سے پورے گھر پر نظر بھی رکھ سکو گی۔“
”فوزیہ ٹھیک کہہ رہی ہے سارہ، تمہیں یہیں رہنا ہے۔ اس طرح میں بھی کچھ ٹائم تمہاری ظالم دوست کے جبر و ستم سے بچ جاؤں گا۔“
فوزیہ نے مڑ کر احسن کی جانب دیکھا تو گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
”اب جب تمہارے پاس کچھ وقت بھی ہے تو تم کل رات ہمارے ساتھ جیم خانہ بھی چلو گی، وہاں ایک بہت اچھی پارٹی اور ڈنر ہے احسن کے دفتر والوں کی جانب سے......“
”ارے یار......“ سارہ نے اسے گھورا۔
”سوال جواب نہیں، ہم کل رات وہاں جائیں گے۔ دن میں تم اپنے کام نمٹا لینا۔“
”جو حکم سرکار......“ سارہ بالآخر بولی۔ اسے بھی ماحول تبدیل کرنے کی ضرورت تھی مگر اس سے پہلے صبح اسے سلیمان سے ملنا تھا۔

☆☆☆

سارہ ٹھیک نو بجے سلیمان احمد کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال کے درمیان تھی۔ کسرتی جسامت اور چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کے ساتھ وہ خاصی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا اگر اسے موقع ملتا تو وہ یقیناً ہالی ووڈ کا مقبول ایکشن ہیرو بن سکتا تھا۔
”مل کر اچھا لگا۔“ وہ بولا۔ ”کیس کیسا چل رہا ہے، میں نے اس کے بارے میں خاصا پڑھا ہے۔“
”پتا نہیں۔“ سارہ نے سادگی سے کہا۔ ”میں اب

اس کیس پر کام نہیں کر رہی۔'' وہ درحقیقت کیس یا مراد شہزاد کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے پرس سے اپنی گن نکال کر میز پر رکھی۔

''کیا ہم کلاس شروع کر سکتے ہیں؟''

''بالکل۔'' اس نے گن اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے اس کی کلپ کو ہٹایا اور گن کا ماہرانہ جائزہ لیا۔

''یہ ایک بہترین گن ہے۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے پاس اس کا ایمونیشن ہے؟''

''جی ایک باکس ہے۔'' سارہ نے جواب دیا۔

''گڈ...... ہمیں سب سے پہلے حفاظتی اصولوں کو سمجھنا ہوگا۔ حفاظت کے لیے معلومات سب سے اہم ہوتی ہیں اور جب آپ جاننا شروع کرتے ہیں تو مزید جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔''

سارہ نے اس کے مزید سوالوں کے جواب میں گن کی صفائی اور دیکھ بھال کے حوالے سے بتایا۔ کئی چیزوں میں اس نے اس کی اصلاح کی۔ اس نے سارہ کو ریوالور اور پسٹل کے فرق کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے گلوک کی کلپ کو لوڈ کرنا اور چیمبر کے بارے میں بتایا۔

''ریوالور نئے افراد کے لیے پسٹل سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ دیکھنا آسان ہوتا ہے کہ وہ لوڈ ہے یا نہیں ویسے یہ......'' وہ گلوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ زیادہ راؤنڈز رکھتا ہے۔''

''کیا میں آپ کے سامنے اسے ایک بار اَن لوڈ اور پھر لوڈ کر سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں، اس سے آپ کی پریکٹس ہوگی اور جلد سیکھنے اور دلچسپی لینے والے شاگردوں کو میں اسپیشل کافی پلاتا ہوں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''البتہ میرے لیے بہت مشکل ثابت ہو رہی ہے۔''

''وہ کیا؟'' سارہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''یہ آپ، آپ کہنا اور سننا......'' وہ بولا۔ ''اجازت ہو تو کیا میں تمہیں تم کہہ سکتا ہوں یوں بھی تم شاید ایک آدھ سال چھوٹی ہوگی مجھ سے۔''

''بالکل اور ہاں آپ کا میتھ اچھا نہیں ہے۔'' سارہ بھی خوش دلی سے بولی۔

''وہ کیسے؟''

''کیونکہ یہ ایک آدھ کم از کم تین چار کے برابر تو ہے ہی۔''

''بس...... عالمی مسئلہ یہ ہے کہ عورتیں عمر کے بارے میں جس قدر حساس واقع ہوتی ہیں اتنی اور کسی چیز کے بارے میں نہیں ہوتیں ویسے یہ تم والا معاملہ دوطرفہ ہوگا۔ مجھے زیادہ آپ، آپ سن کر ضعیفی اور بزرگی والی فیلنگ آنے لگتی ہے، نشانہ چوکنے لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سارہ کو وہ اچھا لگا تھا۔

''اب کیوں نہ تمہارا نشانہ چیک کرلیں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اِن ڈور شوٹنگ رینج میں داخل ہوئے۔ سارہ نے وہاں موجود ائر پلگ کانوں میں لگائے اور سامنے موجود کینز کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ پہلا فائر ہی نشانے پر لگا تھا دوسرا فائر خطا ہو گیا جبکہ تیسری گولی نے ایک اور کین کو الٹا دیا۔

''واؤ...... زبردست...... تم بہت جلدی سیکھ جاؤ گی۔'' وہ مسکرایا۔ ''ویسے یہ میرے لیے نقصان کی بات ہو گی۔''

''ہاں آپ کو کم فیس مل پائے گی، میرا مطلب ہے تم کو......'' سارہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں...... یہ نہیں۔'' وہ ایک لمحے رک کر بولا۔ ''تمہیں شاید میں نے بتایا نہیں کہ میں صرف دوستوں کو تم کہنے کی اجازت دیتا ہوں اور دوستوں سے فیس نہیں لی جا سکتی۔''

''یہ کیا بات ہوئی...... یہ آپ کا کام ہے۔'' سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں، یہ میرا شوق ہے، کام کچھ اور ہے اور اس مسئلے پر ہم بحث نہیں کریں گے۔ یوں بھی وکیلوں سے بحث کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔'' وہ بولا۔

''مگر یہ تو آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔''

''نہیں، بالکل نہیں...... میں آپ سے معاوضہ لے لوں گا مگر وہ جو میں مانگوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرائی اور دوبارہ ائر پلگ لگا کر پریکٹس میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

پارٹی واقعی بہت زبردست تھی۔ اس کی تھیم دوستی پر بنائی گئی تھی۔ ریسٹورنٹ کے اس حصے کو خاص انداز میں سجایا گیا تھا۔ فوزیہ اور اس کو احسن کے دفتری ساتھیوں اور ان کے خاندان والوں سے ملاقات کے لیے بار، بار اٹھنا پڑ رہا تھا جبکہ سارہ اپنی میز پر بیٹھی کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ کافی دنوں بعد کسی دعوت میں آئی تھی۔ خصوصاً اس کیس

کے بعد سے تو بالکل ہی مصروف ہو گئی تھی۔ اسے یوں بھی رش میں اس طرح اکیلا ہو کر باقی سب کا جائزہ لینا...... پسند تھا۔ اس کے خیالات کی رو بار بار رفیہ کی جانب جا رہی تھی۔ اس نے اس کے پیغام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے اس کا نمبر ملایا اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ سارہ نے فون بند کر دیا۔ نہ جانے مراد شہزاد کو اس کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی یا نہیں؟ اس کا کیس کچھ آگے بڑھا یا نہیں اور ایسے بہت سے سوالات اس کے ذہن میں تھے مگر وہ اس کے لیے مجید یا شرجیل خان سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

''سلیمان نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا۔'' اچانک اس کے ذہن کی رو بھٹکی۔ 'کہیں بھی ہو تمہیں اس سے کیا؟' اس نے گویا اپنے دل کو جواب دیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔'' کانوں میں آنے والی آواز نے اسے چونکایا۔

'کیا اب اسے سلیمان کی آواز بھی سنائی دینے لگی ہے۔' اس نے گھبرا کر سوچا۔

''ہیلو......'' سلیمان کے دوبارہ متوجہ کرنے پر وہ چونک گئی۔

''آپ......آپ یہاں......؟''

''جی، میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے نا۔'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ اچانک آپ کو یہاں دیکھا۔'' سارہ نے دل ہی دل میں اپنی گھبراہٹ کو صلواتیں سناتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''بیٹھیے۔''

''میں تمہیں تھوڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں، تم یہاں اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہو۔''

''نہیں، میں بور نہیں ہو رہی تھی اور میں اکیلی نہیں ہوں، میری دوست اور اس کے شوہر بھی میرے ساتھ آئے ہیں بلکہ میں اُن کے ساتھ آئی ہوں۔''

''گڈ، لیکن وہ شاید مصروف ہیں تو اتنی دیر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی کوشش کر لیتے ہیں کیا کہتی ہو تم......؟''

''اوکے، تو پھر تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم، میرے بارے میں...... میرا پسندیدہ رنگ بلیو ہے، پسندیدہ کھانا باربی کیو، یہیں پیدا ہوا، اکلوتی اولاد مگر بگڑی ہوئی نہیں، بیک گراؤنڈ فوجی۔ پاپا فوج میں کرنل تھے۔ مجھے ایکشن فلمیں، ہتھیار اور...... اور تم پسند ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''اوکے......'' سارہ بھی ہنس پڑی۔

''بات ہنسی میں اُڑانے کی نہیں ہو رہی اب تمہاری باری ہے۔''

''میں کیا بتاؤں، مشکل بلکہ ڈراؤنا بچپن، تھوڑی بہت اچھی یادیں بھی ہیں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مجھے ورزش کرنا، پیزا اور پیپسی پسند ہے، مجھے کام کرنا بہت پسند ہے۔ مجھے تھرلر اور ہارر فلمیں پسند ہیں۔ سبزیاں اور باربی کیو دونوں پسند نہیں۔ ایک دن میں اصل زندگی جیوں گی۔ جہاں چند بچے بھی ہوں گے۔'' وہ مسکرائی۔

''زبردست...... مجھے یہ منظر پسند آیا مگر تم ایک بات کہنا بھول گئیں، میرے بارے میں تو کچھ کہا ہی نہیں...... یعنی کیا میں تمہیں پسند نہیں ہوں؟'' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔ مجھے متاثر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔'' اس نے متانت سے کہا۔ ''ویسے یہ کہنا پڑے گا کہ تم نے اچھی شروعات کی ہیں۔'' سارہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عرصے پرانے دوست ہیں اور اسے اس بات پر خود بھی حیرت تھی۔ وہ اتنی جلدی دوستی نہیں کر پاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک فوزیہ کے علاوہ اس کی کوئی پکی دوست نہیں بن سکی تھی۔

''اوہ سوری سارہ...... تم بور تو نہیں ہوئیں۔'' فوزیہ اور احسن بھی اس دوران میں آ پہنچے تھے۔ ''ویسے لگ تو رہا ہے کہ بور نہیں ہوئیں۔''

''نہیں بالکل نہیں...... فوزیہ، یہ سلیمان ہیں میرے آرمز ڈیلر۔'' وہ شرارت سے مسکرائی پھر سلیمان کے گھورنے پر دوبارہ بولی۔ ''میرا مطلب ہے کہ میرے انسٹرکٹر۔''

''بہت اچھا لگا آپ سے مل کر مگر آپ کئی ایکشن ہیروز کی یاد دلا رہے ہیں۔'' احسن نے سلیمان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ارے بس......'' وہ ہنسا۔ ''ویسے آپ لوگ پریشان نہ ہوں، میں آپ کی دوست کو کمپنی دے رہا ہوں اور یہ مذاق اُڑا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ درمیان میں کہیں کہیں یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ مجھ سے بات کرنا انہیں اچھا لگ رہا ہے۔''

''ایسا بالکل نہیں ہے، مجھے واقعی تم سے بات کرنا اچھا لگا ہے۔'' سارہ نے پورے دل سے کہا۔ عین اسی وقت

اسے روشنا مراد نظر آئی۔ وہ...... بہت خوب صورت سیاہ لباس میں ملبوس تھی اور ایک میز پر تنہا بیٹھی تھی۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا کیونکہ اس کی نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا سارہ کہیں جا رہی ہو؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''صرف دو منٹ کے لیے...... ایک کام ہے مجھے، میں ابھی واپس آ رہی ہوں۔'' سارہ، سلیمان کی جانب دیکھے بغیر تیزی سے آگے نکل گئی۔

''ہیلو...... کیا میں چند لمحے یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ تم پہلے ہی بیٹھ چکی ہو۔'' وہ ناک سکیڑ کر بولی۔ ''میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''نہیں، مجھے اب کچھ پوچھنا بھی نہیں ہے کیونکہ مجھے اپنے سوالوں کے جواب مل چکے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ مراد شہزاد تمہارا باپ نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر روشنا کی آنکھوں سے شرارے سے نکلنے لگے۔

''تمہیں شاید زیادہ بولنے کا مرض ہے سارہ بیگم مگر اس بات کے لیے تم بہت پچھتاؤ گی۔ تمہارے لیے مناسب یہ تھا کہ تم ان معاملات میں اپنی ناک نہ گھساتیں اور اگر تم کچھ جان گئی تھیں تو تمہیں کم از کم مجھے یہ بتانا نہیں چاہیے تھا۔''

''کیا یہ دھمکی ہے؟'' غصہ سارہ کے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا۔ ''جھوٹ پر تعمیر کیے گئے محل مضبوط نہیں ہوتے، ڈھے جاتے ہیں۔''

''تم بہت بے وقوف ہو، اطمینان رکھو کچھ بھی نہیں ختم ہو گا، ہاں تم ضرور ٹوٹ پھوٹ جاؤ گی۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور اس سے قبل کہ سارہ کچھ کہہ پاتی۔ وہ اس کے قریب آئی۔ اس کے گال کو تھپتھپایا اور تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔ سارہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر فوزیہ، احسن اور سلیمان والی میز کی طرف چلی آئی۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ کون مل گیا تھا؟'' فوزیہ نے اسے دیکھتے ہی تقریر شروع کر دی۔

''ایک پرانی ساتھی نظر آ گئی تھی۔ اس سے ایک ضروری کام تھا مجھے۔'' وہ مسکرائی۔

''ملاقات اچھی رہی سارہ اور بہت معلوماتی۔'' سلیمان اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی جس کی وجہ سے سارہ خود کو نروس محسوس کر رہی تھی۔ ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔ ''دوسرا لیسن جلد ہی کرنا ہوگا...... مجھے تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔ ویسے میں پلان اے، پلان بی دونوں کا قائل ہوں یعنی اگر تمہارا فون نہ آیا تو پھر پلان بی پر عمل کرنا پڑے گا یعنی میں خود کال کرلوں گا۔''

''میں فون کروں گی۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''گڈ اور اپنا خیال بھی رکھنا۔'' اس کے جانے کے بعد وہ چند لمحے اسی پوزیشن میں کھڑی رہی پھر فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ فوزیہ اور احسن اپنے دوستوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اسکرین پر مجید کا نام چمکتے دیکھ کر اس نے بے تابی سے ہیلو کہا۔

''سلام، میڈم کیسی ہیں آپ...... میرے پاس آپ کے لیے ایک گڈ نیوز ہے ویسے کچھ دیر سے کال کر لی ہے...... امید ہے بُرا نہیں مانیں گی۔''

''ارے کوئی بات نہیں...... تم جانتے ہو نا کہ مجھے گڈ نیوز کس قدر پسند ہے۔''

''میڈم ہم نے فارم ہاؤس سے جو چیزیں حاصل کی تھیں ان کے ٹیسٹ ہو گئے ہیں اور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا اور...... بات کو مکمل کرو جلد۔'' وہ غرائی۔

''چھالیا کے ریپر سے خشک سلیوا (تھوک) ملا تھا مگر وہ مراد شہزاد کے ڈی این اے سے میچ نہیں ہوا ہے۔ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق یہ اس کا نہیں مگر اس کے خاندان کے کسی فرد کا ڈی این اے ہے۔''

''یعنی...... وہی بھوت...... فواد شہزاد ہو گا یعنی وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔'' سارہ بڑبڑائی۔ ''اور وہ بالوں کا گچھا......؟''

''وہ بھی مراد شہزاد کا نہیں ہے مگر اس کی رپورٹ بھی وہی تھی یعنی وہ تھوک اور بال ایک ہی شخص کے ہیں۔''

''یعنی ہمارے پاس اس شیطان کے خاندان کے دوسرے درندے کا ڈی این اے بھی آ گیا ہے؟''

''ہاں، فواد کے بارے میں مزید معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں۔ ہانگ کانگ میں بھی اس پر ہیومن ٹریفکنگ (انسانی اسمگلنگ) کا کیس چل رہا ہے اور یہ وہاں سے بھاگا ہوا ہے مگر ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا تعلق فواد سے ہی ہے۔''

''ہاں اب ہمیں یہی معلوم کرنا ہے۔''

"اور یہ آپ ہی کر سکتی ہیں۔ واپس آجائیے میڈم، ابھی تک شرجیل صاحب خود ہی یہ کیس چلا رہے ہیں اور میری شامت آئی ہوئی ہے۔" مجید نے تاسف سے کہا۔

"فکر نہ کرو جلد ہی ملاقات ہوگی۔ اگر کوئی تازہ خبر ملے تو مجھ سے شیئر کرنا مت بھولنا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مجید نے جواب دیا۔

فون بند ہونے کے چند لمحوں بعد ہی فوزیہ اور احسن بھی فارغ ہو گئے تھے۔ وہ تینوں سارہ کی کار میں وہاں آئے تھے۔ کار تک پہنچنے کے دوران فوزیہ، اس کے تین دوستوں کی بیویوں کی نقل اتار چکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے کے دوران ان تینوں کی نظر ایک ساتھ وائپر میں اٹکے لفافے پر پڑی۔

"یہ کیا ہے؟" احسن نے سب سے پہلے کہا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" سارہ نے یہ کہہ کر لفافہ وائپر کے نیچے سے نکال لیا۔ یہ ایک قیمتی سفید لفافہ تھا جس پر کسی طرف کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ وہ قدرے بھاری تھا۔ سارہ کو عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ فوزیہ اس کے برابر میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے اور وہ مشکوک انداز میں لفافے کو دیکھ رہی تھی۔

سارہ نے لفافے کو کھولنا چاہا مگر ذرا زور سے کھینچنے کی وجہ سے لفافہ پھٹ گیا اور اس میں سے چار تصویریں نکل کر زمین پر پھیل گئیں۔ سارہ بے اختیار انہیں اٹھانے کے لیے نیچے جھکی مگر ان پر نظر پڑتے ہی اس کا دل حلق میں آ گیا۔

یہ ایک لڑکی کی تصویریں تھیں۔ وہ بندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ پر بھی چوڑا ٹیپ لگایا گیا تھا۔ سارہ کا دل لرز رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے تصویریں جمع کیں۔ انہیں دوبارہ دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اسے اپنے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔

ان تصویروں میں نظر آنے والی لڑکی کوئی اور نہیں، رفیہ تھی۔

☆☆☆

مراد شہزاد نے سگار سلگایا اور گہرا کش لگایا۔ کافی دنوں بعد آج وہ خاصا خوش تھا۔ انسانی شکار اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور کئی دنوں بعد اسے اچھا شکار ملا تھا۔ یہ لڑکی خوبصورت تھی اور جنگلی بھی...... اسے یقیناً باکسنگ اور کراٹے وغیرہ آتے تھے اور اس نے اس کا خوب مقابلہ بھی کیا تھا مگر اس کی ککس اور مکے شہزاد جیسے طاقتور شخص کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

سگار کے چند کش لگانے کے بعد وہ پھر اندر کی جانب مڑا۔ لاؤنج میں اپنی سیڑھیوں سے وہ بیسمنٹ میں بنے ہال نما کمرے میں پہنچا تھا۔ وہ اسے کمرے کے ایک کونے میں نیم بے ہوش حالت میں چھوڑ کر گیا تھا مگر نیچے پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتا، اس کے کندھے پر ڈنڈے کا ایک اچٹتا ہوا سا وار پڑا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور پھر اس نے ڈنڈے کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اچھلی تھی مگر اس کی طرف آنے کے بجائے وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ڈنڈا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یعنی مجھے تمہیں باندھے بغیر باہر جانے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" وہ بولا۔ "اب تم یہ ڈنڈا پھینک دو، کہیں اس سے تمہیں چوٹ نہ لگ جائے۔"

"چوٹ مجھے نہیں، تمہیں لگے گی...... تم گھٹیا انسان، تم جینے کے قابل نہیں ہو۔" وہ غرائی۔

"اوہ! میں ڈر گیا...... پلیز مجھے مت مارو......" وہ اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ اسے بھی اس کھیل میں مزا آرہا تھا۔

"میں نے تم جیسے ذلیل انسان بہت دیکھے ہیں اور میں تمہیں سبق سکھا دوں گی کہ تمہیں کسی بھی عورت کو برباد کرنے کا حق نہیں ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میرے والد نے مجھے ایک سبق دیا تھا کہ اگر تم کوئی کام بالکل ٹھیک کرنا چاہتے ہو تو اسے خود کرو۔" وہ یہ کہتے ہوئے رفیہ کی جانب بڑھا۔ اس نے اسے قریب آتا دیکھ کر ڈنڈے کو زور سے گھمایا جو مراد کی پسلی پر لگا تھا۔ درد کی لہر کے باوجود وہ رکا نہیں تھا۔ اس نے ڈنڈے کو جکڑ کر رفیہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اسے زمین پر پھینک کر اس کے ہاتھوں کو موڑ دیا تھا۔

"کوئی مدد کرو۔" رفیہ زور سے چلائی۔

"کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ تم اس بیسمنٹ میں ہو اور تمہاری آواز یہاں صرف میں سن سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چاقو نکال کر رفیہ کی گردن پر رکھ دیا۔

"ہم ایک مقابلہ کرتے ہیں۔ تم ایک چیخ مارو اور میں تمہاری گردن پر خون کی ایک لکیر بناؤں گا۔ دیکھتے ہیں، کون جیتتا ہے۔" رفیہ چاقو کو دیکھ کر ساکت ہو گئی تھی۔

"کیوں! خاموش کیوں ہو گئیں......" وہ اسے بے دردی سے جھنجھوڑتا ہوا بولا۔ اس نے سب سے پہلے اس کے

منہ پر ٹیپ لگایا، پھر اس نے اس کے ہاتھ باندھے۔
''تم نے دیکھا کہ تم عورتیں مجھ جیسے مردوں کی غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ہم نے تمہیں کہیں کوئی اختیار دیا ہے تو وہ بھی ہماری مرضی ہے۔ مگر تم عورتیں...... کمزور ہونے کے باوجود ہم سے طاقتور بننے کی کوشش کرتی ہو۔'' وہ اس وقت بالکل پاگلوں کی طرح بول رہا تھا۔ پھر اس نے اس کی پسلی کے نیچے چاقو کا وار کیا۔ ٹیپ سے بند ھے ہونے کے باوجود اس کے منہ سے تکلیف کے مارے آوازیں نکل رہی تھیں۔
''گھبراؤ مت...... میں ایک فنکار ہوں۔'' اس نے چاقو سے دوسرا وار کرتے ہوئے کہا۔ رفیہ تکلیف کے مارے دوہری ہو رہی تھی۔ اس کے جسم سے خون تیزی سے رسنے لگا تھا۔ ایک لمحے بعد اس نے چاقو کو صاف کر کے جیب میں رکھا اور کھڑا ہو گیا۔
''تم جانتی ہو کہ تم مرنے والی ہو مگر فکر مت کرو، تم اتنی جلدی نہیں مرو گی۔ تمہارا خون چند گھنٹوں تک بہتا رہے گا اور یہ تکلیف تمہیں احساس دلائے گی کہ تمہیں میرے ساتھ بدتمیزی نہیں کرنا چاہیے تھی۔''
اس نے یہ کہہ کر سگار کا کش لگایا اور اس کی جانب دیکھا۔
اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ وہ چند گھنٹوں میں بالکل ویسی نظر آنے والی تھی جیسا تحفہ وہ اپنے اگلے شکار کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ سارہ کو اس کا یہ تحفہ ہمیشہ یاد رہنے والا تھا۔

☆☆☆

سارہ نظریں جمائے ان تصویروں کو گھور رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں اس لفافے سے ملنے والا پرچہ تھا۔ وہ اس وقت فوزیہ کے گھر کے گیسٹ روم میں تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ تھے اور ان سب کی توجہ کاغذ کے اس ٹکڑے کی جانب تھی۔
''ڈیئر سارہ، تو تمہیں کھیل کھیلنے کا بہت شوق ہے تو چلو اب کھیلتے ہیں۔ یہ رفیہ ہے...... ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ کیا تم ہماری محبت کو روکنا چاہتی ہو۔ اگر ہاں تو تمہارے پاس صبح کے پانچ بجے تک کا ٹائم ہے...... اگر تم آنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر کھیل ختم ہو جائے گا۔ تو دل آویز پھر رہے گا انتظار...... ایم ایس۔ اور ہاں! اگر تم نے پولیس یا اپنے دفتر میں کسی سے رابطہ کیا تو کھیل وقت سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ مجھے دھوکا پسند نہیں ہے اور تم جانتی ہو کہ مجھے سب معلوم ہو جاتا ہے۔''

سارہ نے تین بار اس پیغام کو پڑھا تھا۔ وہ یہ سب فوراً پولیس تک پہنچانا چاہتی تھی مگر اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور یہ بھی طے تھا کہ وہ میری ساری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میری ذرا سی غلطی رفیہ کی جان لے سکتی تھی۔
''چار گھنٹے......'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں نے اپنے فون پر الارم لگایا، ہر گزرتا سیکنڈ رفیہ کی زندگی کے امکانات کو کم کر رہا تھا۔
''تمہیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔'' فوزیہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ''انہیں اس کام کو کرنا آتا ہے سارہ۔''
''شش!'' اس نے سختی سے کہا۔ اس دوران اس نے لیپ کو قریب کر لیا تھا اور اب وہ ہر تصویر کی اپنے کیمرے سے تصویر بنا رہی تھی۔ پھر اس نے اس پرچے کی تصویر بنائی۔
''تم خود یہ کیسے کر سکتی ہو سارہ! تم ایک وکیل ہو، کوئی جاسوس نہیں۔'' فوزیہ نے غصے سے کہا۔
''میں یہ کر سکتی ہوں۔'' سارہ نے سرگوشی کی۔
''یہ کھیل نہیں ہے، نہ ہی اس میں غلطی کی کوئی گنجائش ہے۔'' احسن نے سنجیدگی سے کہا۔
''تمہاری ذرا سی غلطی اس لڑکی کی جان لے لے گی۔ ہم یہ سب چیزیں لے کر پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔''
سارہ اب خود کو پہلے سے بہت زیادہ پُراعتماد محسوس کر رہی تھی۔ رفیہ کے اس معاملے میں شکار بن جانے سے اب معاملہ خود اس کی بقا کے بجائے رفیہ کو بچانے سے متعلق ہو گیا تھا۔
''میں پولیس کے پاس نہیں جاؤں گی...... یہ تصویریں مجھے رفیہ تک پہنچا دیں گی۔ میں یہ کھیل کھیلنا چاہتی ہوں۔'' اس کے ان جملوں پر فوزیہ اور احسن دونوں اسے عجیب انداز سے گھور رہے تھے۔ سارہ اپنی بات مکمل کر کے کھڑی ہوئی۔ ''میں اتنی خاموشی میں سوچ نہیں سکتی......'' اس نے کہا اور اپنے لیپ ٹاپ پر ایک گانا چلا دیا۔ اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ وہ کمرے میں گونج رہی تھی۔ فوزیہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سارہ شور میں سوچ نہیں پاتی تھی۔
سارہ کرسی پر بیٹھ کر میز پر جھک گئی اور اس نے فوزیہ اور احسن کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دونوں قریب آ گئے تو سارہ اشاروں اور ہونٹوں کی حرکت سے بے آواز

انداز میں بولی۔ ''ان تصویروں اور نوٹ کو پولیس کے پاس لے جاؤ......!''

احسن نے فوراً تصویریں اور نوٹ اٹھالیا اور گردن ہلائی جبکہ فوزیہ نے اسے آنکھ مار کر کہا۔ ''اگر تم اس لڑکی کو مروانا ہی چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں، جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔'' اس دوران اس نے ایک لفافے میں تصویریں وغیرہ ڈال کر اسے اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد سارہ کچھ دیر مسلسل سوچتی رہی۔ اب اسے مراد شہزاد کو تلاش کرنا تھا اور اس کے لیے اس کے پاس صرف چار گھنٹے تھے۔

☆☆☆

فوزیہ اور احسن کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تصویروں پر غور کرتی رہی تھی۔ اس نے اس تحریری نوٹ کی تصویر بھی کھینچی تھی۔ اسے وہ کئی بار پڑھ چکی تب اچانک ایک لفظ نے اس کو تھام سا لیا...... اسے یقین تھا کہ رفیہ کو اسی جگہ رکھا گیا تھا جہاں خود اسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ ان تصاویر میں لکڑی کے وہ پٹھے سے نظر آرہے تھے جو اس نے اس شام وہاں دیکھے تھے۔ وہ جگہ اس کے اپنے اپارٹمنٹ سے بیس پچیس منٹ کے فاصلے پر واقع تھی ورنہ ان کے لیے اسے اغوا کر کے دھمکیاں دینے کے بعد شام آٹھ سے قبل اس کے اپنے گھر پہنچا دینا ناممکن ہوتا۔ اس کے اپنے اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک موڑ تھا جس کا نام دل آویز تھا۔ اس نوٹ کا آخری جملہ بھی دل آویز کے لفظ سے سجا ہوا تھا۔ وہ یکدم جوش میں آگئی۔ گھر سے باہر نکلنے سے قبل وہ اپنے لیڈی گلوک کو لوڈ کر کے ساتھ لینا نہیں بھولی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے مجید کا نمبر ملایا۔

''مجید! تم کہاں ہو اس وقت......؟'' اس کے فون اٹھاتے ہی سارہ نے پوچھا۔

''گھر پر...... آپ بتائیے کیا ہوا ہے؟'' اس کی آواز میں فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''مجید میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ دل آویز موڑ پر مراد شہزاد یا اس کے خاندان کے نام سے یا کرائے پر کوئی بنگلا وغیرہ لیا گیا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کون سا؟ کیا تم کہیں سے یہ معلومات حاصل کر سکتے ہو؟'' سارہ نے پوچھا۔

''بالکل، میں کل تک......''

''کل تک نہیں، ابھی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے دس منٹ میں یہ معلومات چاہئیں ورنہ کسی کی جان جا سکتی ہے۔''

''ابھی...... ٹھیک ہے۔'' وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں آپ کو دس منٹ میں فون کرتا ہوں۔''

سارہ نے فون بند کیا ہی تھا کہ دوبارہ گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر چمکنے والا نام اس بار سلیمان کا تھا۔ عام حالات میں اتنی رات گئے فون اٹھانا اس کے قاعدے میں شامل نہیں تھا مگر جن حالات سے وہ گزر رہی تھی، وہ عام نہیں تھے۔ اس نے فون ریسیو کیا۔

''میں نے سوچا کہ شاید آپ یہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں گھر پہنچا یا نہیں، اس لیے کال کر کے بتا رہا ہوں کہ میں بخیر ہوں۔'' اسے یقین تھا کہ وہ یہ سب کہتے ہوئے مسکرا رہا ہوگا۔

''مگر میں بخیر نہیں ہوں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

''کیا مطلب......! مجھے بتاؤ، کیا مسئلہ ہے......؟''

''مسئلہ ہے مگر فی الحال بتا نہیں سکتی۔'' وہ بولی۔ ''میں دوبارہ کال کرتی ہوں۔'' مجید کی کال آرہی تھی اس لیے اس نے سلیمان کی کال کاٹ کر اس کی کال ریسیو کی۔

''ہاں بولو مجید...... کچھ معلوم ہوا؟'' سارہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ کا شک درست نکلا۔ وہاں دل آویز پر مراد انکار پوریشن کی ایک جائداد ہے۔ یہ سڑک کا تیسرا بنگلا ہے۔ پی 3...... مگر فی الحال یہ کسی کے استعمال میں نہیں ہے......''

''بہت شکریہ مجید......'' سارہ نے کہا۔

''مگر بات کیا ہے؟ کیا آپ مجھے تفصیل نہیں بتائیں گی......''

''بتاؤں گی مگر ابھی نہیں......'' اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ اب وہ مزید اپنے کسی پیارے کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ یوں بھی وہ اس کا شکار تھا۔

☆☆☆

سارہ نے دل آویز موڑ سے مڑتے ہی کار کی لائٹس بند کر دی تھیں۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس بھی بند تھیں۔ اس کی گاڑی سڑک پر تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ پی 3 سڑک سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی جو اس وقت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سارہ نے گھر سے دو قدم دور کار چھوڑ دی اور گھر کی جانب بڑھی۔ موبائل میں لگے اسٹاپ واچ الارم کے مطابق اب اس کے پاس صرف

دو گھنٹے بچے تھے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اس کا اندازہ درست ہو ورنہ رفیہ کے ساتھ نہ جانے کیا ہو سکتا تھا۔

وہ آہستہ قدموں سے اندر کی جانب جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس سے غلطی ہوگئی ہے مگر پھر اسے کھڑکی سے اندر اندھیرے میں ایک شخص کا ہیولا نظر آیا جو ایک کمرے سے دوسرے میں جا رہا تھا۔ روشنی جلائے بغیر کسی کا اندر موجود ہونا جرم کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

وہ پورچ کی جانب کھلنے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ ایک کمرے سے گزر کر وہ لاؤنج میں پہنچی۔ لاؤنج میں لگی سیڑھیاں تہ خانے کی سمت جا رہی تھیں۔ نیچے ایک بڑا سا ہال تھا جہاں ملگجی روشنی موجود تھی۔ یہاں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ میں ریوالور لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی ہی تھی کہ اسے وہ نظر آگئی۔

اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، سر ڈھلکا ہوا تھا اور اس کے جسم کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔

''رفیہ......'' وہ گن نیچے کر کے اس کی جانب لپکی۔ اس کی آواز پر رفیہ نے گویا بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سارہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے رفیہ۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

سارہ نے اس کے چہرے کو تھوڑا اٹھا کر اس پر سے ٹیپ اتارنا شروع کیا ہی تھا کہ رفیہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ منہ سے بے معنی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سارہ کے پیچھے کسی چیز پر مرکوز تھیں۔ سارہ نے مڑے بغیر ترچھی آنکھ سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑی مگر وہ اس سے بھی تیزی سے اس سے ریوالور چھیننے کے لیے لپکا۔ وہ برسوں سے مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ وہ تیزی سے گھومی اور اس کی زوردار کک اس کے گھٹنے پر پڑی۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ دوہرا ہو گیا تھا۔ سارہ نے اپنے کندھے سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی اور ساتھ ہی ساتھ گھوم کر دوسری کک دوبارہ اس کے چہرے پر پڑی۔ سارہ کو اپنے پیر میں اس کے دانت کا ٹکڑا لگتا محسوس ہوا تھا۔ اس بار وہ بھی ایک مکا سارہ کی پسلیوں میں مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ زمین پر جا گری تھی۔

''اب تم دونوں مرو گی......'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

مگر یہ اس کا دن نہیں تھا۔ سارہ نے زمین پر پڑے پڑے اس کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ وہ سارہ کے حرکت کرتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔ یوں گولی نشانے پر نہیں لگ پائی۔

''اوہ! تو ڈیئر وکیل صاحبہ پوری تیاری سے آئی ہیں۔'' وہ غرایا اور اس کی جانب کوئی چیز اچھالی۔ وہ لوہے کی چھوٹی سی بال کے مانند چیز سارہ کے ہاتھ پر لگی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکلتے نکلتے بچا۔ اس نے فوراً دوسری گولی چلائی۔ مراد اس بار بھی اس کا نشانہ نہیں بن سکا تھا مگر اسی لمحے علاقہ پولیس سائرن کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے زچ ہو کر اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر زینوں کی طرف لپکا...... لمحے بھر میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ سارہ پستول کو ہاتھ میں لیے زینے تک گئی، پھر اس کے نظر نہ آنے پر پلٹ کر رفیہ کی جانب آئی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک پیلا ہو چکا تھا۔ اس نے رفیہ کے ہاتھ کھولے۔ اس دوران اس کے دونوں ہاتھ خون میں سرخ ہو چکے تھے۔

''آخر یہ خون بہہ کہاں سے رہا ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ اس نے رفیہ کو سیدھا کیا۔ اس کی دائیں پسلیوں کے نیچے ایک بڑا سا زخم موجود تھا جہاں سے خون رس رہا تھا۔ وہ دہشت بھری آنکھوں سے اس زخم کو دیکھ رہی تھی۔ اسی اثنا میں یہ خانہ روشنیوں اور لوگوں سے بھر گیا۔ پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ سارہ یہ دیکھ کر حیران تھی کہ پولیس کے ساتھ سلیمان بھی موجود تھا۔

☆☆☆

''میں تمہیں مسلسل کال کر رہا تھا، جب تمہارا فون نہیں ملا تو سخت پریشانی میں، میں نے احسن کا نمبر ملایا۔ احسن نے مجھے تمام تفصیلات بتائیں...... میں نے اپنے چند دوستوں اور پولیس کی مدد سے تمہارے موبائل سے تمہاری لوکیشن معلوم کی اور پولیس کے ساتھ یہاں آگیا۔'' سلیمان نے سارہ کے سوالوں کے جواب میں کہا۔ وہ ابھی وہیں تھے۔ ایمبولینس رفیہ کو اپنے ہمراہ لے گئی تھی۔ سارہ اس کے ساتھ جانا چاہ رہی تھی مگر انسپکٹر سلیم نے اسے خود کو سنبھالنے کو کہا تھا۔

''وہ اب محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں آپ کے بیان کی ضرورت ہے تاکہ اُسے پکڑا جا سکے......''

''وہ...... وہ مراد شہزاد تھا۔'' سارہ نے کہا۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ مناسب جگہ نہیں ہے آفیسر...... میں سارہ کو لے کر آپ کے آفس پہنچتا ہوں......'' سلیمان

بولا۔
''ٹھیک ہے، آپ لوگ دفتر پہنچیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہوکر وہیں آرہے ہیں۔''
تین گھنٹے بعد جب وہ اور سلیمان پولیس اسٹیشن سے نکل رہے تھے تب اس کا سر پہلے سے زیادہ چکرا رہا تھا۔ اس کے مکمل بیان کے بعد پولیس کی ابتدائی تفتیش میں ہی معلوم ہوا تھا کہ مراد شہزاد دو دن پہلے ہی ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا اور اس سلسلے میں اس نے عدالت سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔

☆☆☆

''میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو مگر اس کے وکیل یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ وہ شہر میں نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ تہ خانے سے کچھ ایسے ثبوت حاصل ہوسکیں جنہیں جھٹلایا نہ جاسکے......'' سلیمان نے کہا۔ ''مگر اس وقت ضرورت یہ ہے کہ تم خود کو سنبھالو......''
''ٹھیک ہے......'' سارہ بولی۔ اس کے دماغ میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔
وہ اس وقت فوزیہ کے گھر پر تھے۔ فوزیہ نے سب کے لیے گرما گرم کافی تیار کی تھی۔ جبکہ احسن اسپتال سے رفیہ کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کررہا تھا۔
''اچھی خبر ہے......'' وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ ''رفیہ اب خطرے سے باہر ہے۔''
''شکر ہے......'' سارہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ ''اور تمہارا بھی شکریہ، اگر تم بروقت نہ پہنچتے تو شاید ہم رفیہ کو نہ بچاپاتے......'' اس نے سلیمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ جواب میں مسکراتا رہا تھا۔

☆☆☆

سارہ کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ چند لمحے بستر پر لیٹی رہی۔ اس کا ذہن گزشتہ رات کے واقعات دہرا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب خطرہ پہلے سے زیادہ تھا۔ زخمی شیر دوبارہ وار کرسکتا تھا۔ اسپتال میں رفیہ پولیس پروٹیکشن میں تھی مگر یہ سب ہمیشہ نہیں ہوسکتا تھا۔ زندگی اب شاید پہلے جیسی کبھی نہ ہوسکے۔ اس نے تاسف سے سوچا مگر اس سب کو اس کے منطقی انجام تک پہنچنا تھا۔ اگر وہ یہ ظاہر کررہا تھا کہ وہ شہر میں نہیں ہے تو وہ یقیناً اپنے گھر پر نہیں ہوگا۔ وہ کہاں ہوسکتا ہے؟ وہ یہی سوچے جارہی تھی۔
''اٹھ گئیں تم...... چلو ناشتا کریں میرے پیٹ میں چوہوں کی کانفرنس شروع ہوچکی ہے۔'' فوزیہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
''ارے تو تم مجھے اٹھا دیتیں۔'' سارہ نے جواب دیا۔ ''میں پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔'' وہ باتھ روم میں گھستے ہوئے بولی۔
''تم آج دفتر نہیں جارہیں؟'' اس نے ناشتا کرتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے تھوڑا سا کام ہے دوپہر میں نکلوں گی۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔ ''تم آج گھر پر آرام کرو۔''
''میں اسپتال جاؤں گی۔'' سارہ بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم سب بھی اس گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہو۔''
''کیا فضول باتیں شروع کردیں تم نے...... یہ بتاؤ کیا میں تمہارے ساتھ اسپتال چلوں؟''
''نہیں، تم اپنے دفتر جاؤ...... شام میں ملاقات ہوگی۔''
''ٹھیک ہے تم یہ چابیاں رکھ لو۔'' فوزیہ نے چابیوں بھرا کی چین اس کی جانب بڑھایا۔ ''جلد فارغ ہوجاؤ تو سیدھی گھر آنا، اکیلے اپنے اپارٹمنٹ کی جانب جانے کی غلطی بالکل مت کرنا۔''
''بہتر امی جان۔'' سارہ مسکرائی۔

☆☆☆

اسپتال سے نکلتے ہوئے وہ ذہنی طور پر قدرے مطمئن تھی۔ رفیہ اب کافی بہتر تھی۔ اس کی ماں، کومل، سائرہ سب اس کے پاس تھے۔ سارہ وہاں سے جلد نکل آئی تھی۔ وہ سکون سے بیٹھ کر پلاننگ کرنا چاہتی تھی۔ اسپتال والی سڑک سے مڑتے ہی اس کی نظر ایک سلور لیکسس پر پڑی۔ اس گاڑی کو دیکھ کر سارہ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مراد شہزاد موجود تھا۔ وہ تیزی سے آگے نکل گیا تھا اور اس نے سارہ کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کے ٹھکانے سے واقف ہوکر پولیس کو مطلع کرسکتی تھی۔
''وہ اس وقت کہاں جارہا ہوگا، شاید اپنی پناہ گاہ کی طرف۔''
مراد شہزاد کی کار مختلف سڑکوں سے گزر کر اب جس جانب جارہی تھی۔ اس نے سارہ کو دوسرا ذہنی جھٹکا دیا تھا۔
اس کا رخ فوزیہ اور احسن کے گھر کی جانب تھا۔ یعنی اب وہ دونوں بھی اس ہٹ لسٹ میں آچکے تھے۔ سارہ کا

ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے مراد سے پہلے گھر پہنچنا تھا۔ اس نے گاڑی کو سروس لین میں موڑا اور ایکسلیریٹر پر پیر رکھ دیا۔ اسے آج اس معاملے کو ختم کرنا تھا۔

وہ پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئی تھی اور سیدھی اوپر گیسٹ روم میں پہنچی جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے ریوالور نکال کر اسے چیک کیا اسے اب اپنے پلان کو بہتر کرنا تھا۔ وہ ایک لمحے بعد ان کے سیکیورٹی روم کی جانب بڑھ گئی، اسے ان کا کوڈ معلوم تھا اور گزشتہ دو دنوں سے فوزیہ اسے وہ سب یاد بھی کرا رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے تمام الارم آن کیے مگر انہیں سائلنٹ موڈ پر کر دیا۔ اب اسے کسی کی بھی کہیں سے آمد کا علم ہو جاتا مگر الارم نہیں بجنے والے تھے۔ تقریباً پونے گھنٹے بعد سیکیورٹی سسٹم نے بپ دینا شروع کی وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ سسٹم کے مطابق لاؤنج کی کھڑکی سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ یہ وہ کھڑکی تھی جسے وہ خود آدھا کھول کر آئی تھی۔ اسکرین پر اسے اندر گھسنے والا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک طویل القامت شخص تھا اور اس نے سیاہ ہڈ پہن رکھا تھا۔ اس بار اسکرین پر دوسری وارننگ آگئی تھی۔

''پولیس کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ اگر کینسل کرنا ہو تو اپنا پاس ورڈ ٹائپ کریں۔''

سارہ نے پاس ورڈ ٹائپ کر دیا۔ اس وقت اسے پولیس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب لپکی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بستر پر تکیے لگا کر انہیں چادر اڑھا دی اور خود الماری کی پچھلی سمت میں جا کر چھپ گئی۔ چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ اندر داخل ہوا اور بستر کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے اپنا ہڈ سر سے اتارا اور جیب سے چاقو باہر نکال لیا پھر اس نے چاقو والے ہاتھ کو بلند کیا۔ اسی وقت سارہ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی مراد۔'' اس کی آواز پُرسکون تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور مسکرایا۔ حیرت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

''تم میرے تصور سے بھی زیادہ تیز ہو سارہ، تم کب سے یہاں میرا انتظار کر رہی تھیں؟''

''کافی دیر سے۔'' وہ بولی۔

''چلو تمہارا انتظار ختم ہوا۔'' وہ بولا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بستر پر پڑا تکیہ اچانک اس کے ہاتھ کی جانب اچھالا۔ تکیے کی وجہ سے پستول اس کے ہاتھ سے پھسل گیا

اسی وقت اس نے سارہ کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ لہرا کر پیچھے گری تھی لیکن وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور اس نے گھوم کر اپنی ٹانگ مراد کی پسلیوں میں ماری، زوردار کک کی وجہ سے اس کی پسلیوں سے ٹک کی آواز بلند ہوئی تھی۔ وہ جھکا تھا مگر سارہ کے گھٹنے نے اسے اچھل کر الٹنے پر مجبور کر دیا۔ گھٹنے کی ضرب نے اس کی ناک کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ سارہ نے اس دوران جھک کر اپنا پستول اٹھایا اور اس پر تان لیا۔

''تمہارا بھائی کہاں ہے؟'' وہ غرائی۔

''وہ...... وہ بالی گیا ہے۔'' مراد بولا۔ ''وہ پس منظر میں رہنا پسند کرتا ہے۔ ویسے تم مجھے نہیں مار سکتیں، تم قانون کو ہاتھ میں نہیں لے سکتیں۔ ہے نا...... کیوں نا ہم بیٹھ کر بات کریں، کوئی راستہ نکال لیتے ہیں جس میں تم بھی مطمئن رہو اور میں بھی۔''

''فضول بکواس نہیں۔'' سارہ اس کے اس طرح پلٹنے پر حیرت میں تھی مگر لمحے بھر میں ہی اسے مراد کے اس پینترے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ بیڈ روم کا دروازہ یکلخت زور سے کھلا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اس جھٹکے سے وہ زمین پر جا گری تھی۔ اندر آنے والا وہی شخص تھا جس نے سارہ کو اغوا کیا تھا وہ اس وقت بھی سیاہ سوٹ میں تھا۔

''مار ڈالو اسے۔'' مراد چلایا۔

سارہ نے زمین پر قلابازی کھا کر اپنا پستول اٹھا لیا۔ طویل القامت شخص نے مراد کے حکم پر سر ہلایا اور جیب سے پستول نکالا، اس کے گولی چلانے سے قبل ہی سارہ نے گلوک کو سیدھا کیا اور پے در پے تین گولیاں چلائیں۔ تینوں گولیاں اس کے سینے میں لگی تھیں اور وہ اچھل کر دور جا گرا اس کے بعد سارہ مراد کی جانب مڑی۔

''تمہیں عدالت سے سزا ملتی مگر تمہارے پاس ثبوت بنانے اور منوانے کے بہت سے طریقے ہیں، اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔'' وہ بولی اور پستول کا رخ مراد کی جانب کر دیا۔

''رکو میری بات سنو۔'' اس بار پہلی دفعہ اس کی آنکھوں میں خوف نظر آیا تھا مگر سارہ اب کوئی چانس نہیں لینا چاہتی تھی اس نے ٹریگر دبا دیا۔ مراد اچھل کر دیوار سے ٹکرایا پھر وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت منجمد ہو گئی تھی۔ سارہ نے پولیس کا نمبر ملایا اور انہیں گھر میں گھسنے والے دو افراد کی موت کی خبر دی۔ اس کے بعد وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

☆☆☆

پولیس نے فواد شہزاد کو بھی اگلے روز ائرپورٹ سے گرفتار کر لیا تھا۔ سارہ نے دو دن آرام کے بعد دفتر جوائن کر لیا تھا۔ فواد شہزاد کے خلاف کیس میں سب سے بڑا ثبوت تہ خانے سے ملنے والے شواہدات تھے مگر وہ اس کے ڈی این اے سے مختلف تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے استغاثہ اس کے خلاف کیس ثابت نہیں کر پائے گا۔ سارہ دفتر جوائن کرتے ہی اس کیس کی تمام تفصیلات، فائلز اور ویڈیوز کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چھوٹی سی چیز کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اور مجید اس کیس کی ریکارڈنگ دیکھ رہے تھے۔ سارہ کی نظریں مراد شہزاد پر تھیں جو کمرائے عدالت میں کچھ لکھ رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اس نے وہ ڈی وی ڈی نکالی اور فواد شہزاد کی حالیہ ٹرائل کی ویڈیو لگائی۔ وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر کھڑی ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہیں میڈم۔'' مجید اس کے ساتھ باہر نکلا تھا۔

وہ آدھے گھنٹے بعد جیل میں موجود تھی۔ فواد شہزاد اس کے سامنے موجود تھا۔

''مس سارہ، آپ کی آمد کا شکریہ۔'' وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کیس کیسا جا رہا ہے؟''

''زیادہ اچھا نہیں، تم ہم سے ہر بار ایک قدم آگے رہتے ہو۔'' وہ بھی مسکرائی۔

''ظاہر ہے میں بے گناہ جو ہوں۔''

''مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ثبوتوں کا ڈی این اے کیوں تم سے میچ نہیں ہو رہا۔''

''آپ بہت وہمی خاتون ہیں مگر دلچسپ بھی ہیں۔ جب میں یہاں سے آزاد ہو جاؤں گا تو آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔''

''تمہیں اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ گیم اوور ہو چکا ہے اور تم ہار گئے ہو۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر بولی۔ ''مراد۔''

مراد کی آنکھیں ایک لمحے کو پھیل سی گئیں، چہرے کے تاثرات بدلے پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''ایسے کہ ہماری ویڈیوز میں تمہارے اور فواد دونوں کی ریکارڈنگ موجود ہے تم لیفٹ ہینڈر ہو، الٹے ہاتھ سے لکھتے ہو جبکہ ہمشکل اور جڑواں ہونے کے باوجود فواد سیدھے ہاتھ سے کام کرتا تھا۔ اس نے مجھ پر سیدھے ہاتھ سے چاقو کا حملہ کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فواد مارا گیا اور اس بات کو ڈی این اے ٹیسٹ ثابت کر دے گا۔''

''مگر تم بھی بچ نہیں سکو گی۔'' وہ یکلخت غرایا اور اس نے لپک کر سارہ کی گردن دبوچ لی۔ ''تم مجھ سے پہلے مرو گی۔''

سیکیورٹی اسٹاف ان کے گرد جمع ہو گیا۔ کئی پولیس والے مراد کو کھینچ رہے تھے مگر وہ سارہ کو چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔ سارہ کا سانس رکتا جا رہا تھا۔ یکلخت کسی نے بندوق کا بٹ مراد کے سر پر مارا...... اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے بعد ہی اس نے اس کی گردن کو چھوڑا تھا۔

''میڈم آپ ٹھیک ہیں۔'' اس کے اردگرد آوازوں کا شور تھا۔

''ہاں۔'' وہ بمشکل بولی اور سارا منظر اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو فوزیہ، سلیمان، احسن، مجید، شرجیل خان سب اس کے اردگرد موجود تھے۔

''شکر ہے۔'' فوزیہ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بولی۔

''تمہیں اکیلا وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔'' شرجیل خان نے کہا۔ ''بہرحال مراد کا کھیل ختم ہوا۔''

''شکر ہے۔'' اس بار سارہ بولی۔

''مگر پھر بھی تمہیں انسٹرکٹر کی ضرورت ہے۔'' سلیمان پہلی بار بولا۔ ''خصوصاً ایسے انسٹرکٹر کی جو تمہیں اس طرح دیوانہ وار موت کے منہ میں چھلانگیں مارنے سے بچا سکے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں میری تاعمر خدمات کی ضرورت ہے۔'' اس کی آنکھوں میں محبت، فکر، ہمدردی، شرارت سب کچھ ایک ساتھ موجود تھا۔

''سوچیں گے۔'' سارہ بھی مسکرائی۔

''سوچنا کیا ہے، نیک کام میں دیر کیسی؟'' فوزیہ نے کہا۔ ''اور میاں سلیمان اب چونکہ ہم ہی سارہ کے بڑے ہیں لہٰذا اب آپ کو ہم سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''بالکل مائی لارڈ۔'' وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا اور کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

❖❖❖

سرورق کی دوسری کہانی

مقدر کا سکندر

غلام قادر

معاشی مجبوریوں کی وجہ سے بہت سے ہم وطن دیارِ غیر کا رخ کرتے ہیں... وہاں بھی زندگی آسان نہیں ہوتی... زندگی کی کشتی کو رواں رکھنے کے لیے ہر دم پتوار چلانا پڑتا ہے... پردیس میں مقیم ایک ایسے ہی خاندان کی مسلسل جدوجہد... نظامِ زندگی کے معمولات میں اچانک ہی ایسے مسافر کی آمد ہوئی جس نے ان کا مقدر بدل ڈالا...

اس وقت جب وہ چاروں گاڑیاں میرے پیٹرول پمپ پر رکیں، اس سے چند لمحوں پہلے سیتا نے میری شادی کی درخواست یہ کہتے ہوئے مسترد کردی کہ "تمہارے پاس کچھ ہے بھی یا شادی کے بعد مجھے بھی اپنی ماں کی طرح ہمارے موٹیل میں آنے والوں کے لیے کھانا بنانا ہوگا؟"

"تم صحیح کہہ رہی ہو کہ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ میں کوئی گرل فرینڈ رکھ سکوں اور اسے کسی اچھی سی جگہ پر ڈیٹ پر لے جاسکوں۔"

''اس کے باوجود تم مجھ جیسی حسینہ سے شادی کے خواب دیکھ رہے ہو؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کیا تمہارے گھر کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔'' میں نے سوال کیا لیکن وہ میرے طنز کو سمجھ نہ سکی۔

''نہیں تو...... تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟'' اس نے طنز نہ سمجھتے ہوئے سوال کر دیا۔

''تم نے خود کو حسینہ کہا تو میرے ذہن میں خیال آ گیا کہ اگر تمہارے گھر کا شیشہ سلامت ہوتا اور تم نے کبھی اس میں اپنا چہرہ دیکھ لیا ہوتا تو یہ فقرہ نہ کہتیں۔'' میں نے تفصیل سے اسے اپنا طنز سمجھاتے ہوئے کہا۔

میری طرح اس نے بھی ہمارے پیٹرول پمپ پر گاڑیاں رکتی دیکھ لی تھیں۔

''جاؤ تمہاری کمائی آ گئی۔'' وہ جانتی تھی کہ میرا گزارہ پیٹرول پمپ پر آنے والے گاہکوں کی ٹپ پر ہوتا ہے۔

میں سیتا پر مزید توجہ دینے کے بجائے اپنے پیٹرول پمپ کی طرف دوڑ گیا۔

رکنے والی پہلی گاڑی سے جو شخص اترا تو اسے دیکھ کر میں پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا نہ تو میرا باپ وزیرستان سے چالیس برس پہلے شفٹ ہونے کے بعد کہیں گیا ہے اور نہ ہی اس بندے کی والدہ کبھی کینیڈا آئی ہے پھر ہم دونوں ہم شکل کیوں ہو گئے۔

اسے دیکھ کر جتنا میں حیران ہوا تھا اس سے زیادہ پریشان وہ شخص مجھے دیکھ کر ہوا تھا۔

''گاڑی کی ٹینکی فل کر دو۔'' میرے ہم شکل نے کار کی چابی میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''او کے سر۔'' میں نے باادب لہجے میں کہا۔

اس کی گاڑی کی ٹینکی فل کرنے کے بعد میں آگے بڑھا تو اس نے دوبارہ کہا۔

''صرف میری گاڑی نہیں، ان چاروں گاڑیوں کی ٹینکی فل کر دو ہمیں کل شام سے پہلے نیو یارک پہنچنا ہے۔'' اس نے بارعب انداز میں کہا۔

''تمہارے یہاں کمرے ہیں؟'' میرے ہم شکل نے سوال کیا۔

''جی ہیں اور خالی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم پاکستانی ہو؟'' اس نے ایک اور سوال کیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم پاکستانی نہیں ہو تو اس موٹیل کا نام کراچی موٹیل کیوں ہے؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا۔

''میرے ابا پاکستان کے علاقہ وزیرستان سے پہلے امریکا اور پھر یہاں کینیڈا شفٹ ہوئے ہیں۔''

''میرا نام مراد ہے اور میرا تعلق بھی وزیرستان سے ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں ذیشان ہوں یہیں کینیڈا میں پیدا ہوا ہوں۔'' میں نے جواب میں اپنا تعارف کروایا۔

''اگر تمہارے والد وزیرستان کے ہیں تو موٹیل کا نام کراچی موٹیل کیوں ہے؟'' اس نے ایک اور سوال کر دیا۔

جیسے جیسے میں گاڑیوں کی ٹنکیاں فل کرتا رہا، وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

''ضروری تو نہیں کہ نام کا کوئی تعلق اس جگہ سے ہو جہاں سے کوئی تعلق بنتا ہو۔'' میں نے جواب دینا شروع کیا۔

''یہ سامنے جو موٹیل دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے سیتا کے موٹیل کی جانب اشارہ کیا جو سڑک کی دوسری جانب تھا۔

''یہ وائٹ موٹیل۔'' مراد نے موٹیل پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتے ہوئے کہا۔

''نام اس کا وائٹ موٹیل ہے لیکن اس کا مالک کینیا سے آیا ہوا ایک بلیک ہے۔''

''اور وہ لڑکی جو تم سے باتیں کر رہی تھی؟'' مراد نے سوال کیا۔

''وہ مسٹر وائٹ کی بیٹی ہے لیکن اس کی ماں انڈیا کے شہر بنگلور سے ہے۔''

''انڈیا کی اکثر ہیروئنز کا تعلق بنگلور سے ہے۔'' مراد نے کہا۔

''میری معلومات انڈین فلم انڈسٹری کے بارے میں اتنی نہیں ہے۔'' میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

آخری گاڑی کی ٹینکی فل ہو گئی تو مراد نے اس گاڑی کے مالک کو آواز دی۔

''تصدق تیری گاڑی بھی فل ہو گئی۔''

''چلیں کسی ہوٹل میں کمرا دیکھتے ہیں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''آپ لوگ میرے موٹیل میں ہی کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟'' میرے لہجے میں دعوت سے زیادہ درخواست تھی۔

''تم مسلمان ہو اور میرے ساتھی رات سونے سے پہلے پیٹ بھر کر پینے کے عادی ہیں۔'' مراد نے کہا اور باقی

لوگوں نے قہقہہ لگا کر اس کا ساتھ دیا۔
''کینیڈا میں رہتے ہوئے ہم شراب پر پابندی کیسے لگا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''چلو تو پھر کمرے دکھاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے مراد نے اپنی کار کا رخ کیا۔
کمرے دکھانے سے پہلے یہ بتاؤ کہ گاڑیاں کہاں پارک کرنی ہیں۔'' اس بار اس شخص نے مخاطب کیا تھا جسے مراد نے تصدق کہہ کر پکارا تھا۔
''اس طرح سے پارک کر دو کہ رخ موٹیل کی جانب ہو اور ہائی وے سے نظر بھی آئے۔''
''یار تو تو بہت سمجھ دار ہے۔'' اس بار مراد نے کہا۔
''پاکستان میں ہائی وے پر جو ڈھابے ہوتے ہیں اس کے مالکان بھی یہ تکنیک استعمال کرتے ہیں اور اس کے لیے بس کے کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو فری کھانا بھی دیتے ہیں۔'' تصدق نے کہا۔
''مجھ سے یہ امید نہ رکھنا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
مراد نے مجھ سے پیٹرول کے پیسے پوچھے اور اس نے چاروں گاڑیوں میں ڈالے گئے پیٹرول کی قیمت ادا کی بلکہ اتنی ٹپ بھی دی کہ اس سے پہلے کسی گاہک نے نہیں دی تھی۔
''کھانے میں رعایت نہ دینا لیکن یہ بیگ اٹھا کر کمرے تک لے چلو۔''
میں نے ڈکی سے بیگ نکالا جو خاصا بھاری تھا۔ وہ چاروں میرے پیچھے پیچھے آئے لیکن کسی نے بیگ اٹھانے میں کوئی مدد نہ کی اور میں بھی اس بھاری تھیلے کو لے کر اس کمرے تک آ گیا جسے مراد نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ یہ کمرا وہ تھا جہاں سے سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔
کمرے میں پہنچ کر مراد نے ایک بار پھر خاصی معقول ٹپ دی۔
''اب ایسا کرو اچھی سی چائے پلا دو۔''
''چائے، کیسی تعویذ والی یا دودھ پتی۔''
''تعویذ والی چائے کیا ہوتی ہے اور دودھ پتی چائے کیا ہوتی ہے؟'' ان کے تیسرے ساتھی نے کہا جسے دورانِ گفتگو وہ آرتھر کہہ کر بلاتے رہے تھے۔
''تعویذ والی چائے مطلب ٹی بیگ والی چائے۔'' مراد کا جواب تھا۔
''اور دودھ پتی چائے کا مطلب؟'' آرتھر نے سوال کیا۔
''خاصے دودھ میں تھوڑی سی پتی ڈال کر اسے خوب ابال دیا جائے۔''
''یار ہم سب کے لیے دودھ پتی ہی لے آؤ۔'' آرتھر نے کہا۔
اس سے پہلے چار گلاس اور برف لے آنا۔'' میں جانے کے لیے پلٹنے ہی والا تھا کہ مجھے آرتھر کی آواز سنائی دی۔
میں کچن میں آیا تو ابا وہاں تھا۔
''آج تو ہماری قسمت کھل گئی۔ بارہ برس میں پہلا موقع ہے کہ چاروں کمرے بک ہو گئے۔'' ابا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
''جلدی سے چار دودھ پتی چائے بنا دو۔'' میں نے ابا کو جو موٹیل کے واحد کک تھے سے کہا۔
''چائے پتی چاہیے؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ پاکستان میں ہوتی ہے تم جرمنی والے کیا جانو۔'' ابا نے کہا اور چولھے کی جانب بڑھ گیا۔
اس دوران میں نے چار گلاس نکالے اور انہیں لے کر کمرے میں جانے لگا۔ جب برف نکال رہا تھا تو ابا نے پوچھ لیا۔
''وہ شراب بھی پییں گے؟''
''کیا یہ پہلا موقع ہوگا کہ موٹیل میں آنے والے کسی گاہک نے شراب پی ہو؟'' میں نے ابا سے ہی سوال کیا۔
''تم بھی ان کے ساتھ نہ بیٹھ جانا۔''
''اس وقت مسٹر وائٹ کا دل چاہ رہا ہوگا کہ وہ ہمارے موٹیل کو آگ لگا دے۔''
''ہمارا تو یہ پہلا موقع ہے ان کے یہاں تو تقریباً روز ہی یہ حالت ہوتی ہے۔'' اماں نے طنزیہ انداز میں کہا اور میں سمجھ گیا کہ اماں کس بات کا حوالہ دے رہی ہے۔
ابا جب کراچی سے نیویارک پہنچا تھا تو اس نے نئے دیس میں بھی پرانا دھندا نہیں چھوڑا کراچی میں بھی وہ ٹیکسی چلاتا تھا اور نیویارک میں بھی اس نے اپنا پرانا دھندا جاری رکھا جبکہ اماں نے بھی نیا پیشہ اپنانے کے بجائے پرانے پیشے کو ترجیح دی۔ وہ جرمنی میں بھی نرس تھی اور یہاں آ کر بھی نرس بنی۔ جب ان دونوں نے کینیڈا اشفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تو اماں نے موٹیل کے کاروبار کے لیے کہا۔
ابا اس کے لیے تیار نہ تھا لیکن اماں نے کسی نہ کسی طرح اسے تیار کر ہی لیا۔ اب مسئلہ تھا موٹیل کے نام کا۔ اس مسئلے پر ان دونوں کے درمیان کافی دن ٹھنی رہی۔ آخر کار ابا نے اس کا حل یہ بتایا کہ موٹیل کے خریدنے میں جس کی رقم

زیادہ ہوگی نام اس کی پسند کا ہوگا۔ اماں نے مصلحت کے تحت یہ بات مان لی لیکن جب ابا نے اپنی بچت نکالی تو بہت دن تک پچھتاتی رہی۔

''میں کینیڈین حکومت کو بتادوں گی کہ یہ ٹیکسی چلاتا تھا اور اس نے کبھی امریکی حکومت کو ٹیکس نہیں دیا بلکہ ہمیشہ گیراج والوں سے ملی بھگت کر کے انشورنس کمپنیوں سے ایکسیڈنٹ کے بہانے رقم لوٹتا رہا تھا۔ اماں نے کافی دن یہ دھمکیاں دیں لیکن اس پر کبھی عمل نہ کیا کیونکہ جانتی تھی کہ اس کی اپنی کچھ کمزوریاں ابا کے ہاتھ میں ہیں۔

میری عمر چونتیس برس ہوگئی تھی لیکن میں نے ابا اور اماں کو اس مسئلے پر ہمیشہ الجھتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اکثر بات کچھ اور ہوتی تھی لیکن یہ تنازعہ دونوں میں سے کسی ایک کی جانب سے دوبارہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ میں گلاس لے کر کمرے تک آیا تو وہ چاروں اپنے اپنے کمروں میں لیٹ چکے تھے۔

''بہت تھک چکے ہیں چائے لے آؤ تاکہ ہم اپنا اصل کام شروع کرسکیں۔''

''بہت دور سے آرہے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم جسمانی تھکن کی نہیں، ذہنی تھکن کی بات کر رہے ہیں۔'' مراد نے جواب دیا۔

میں دوبارہ کچن میں گیا تو ہلکی پھلکی جھڑپ میں تیزی آچکی تھی۔

''تم میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔'' اماں نے کہا۔

''کیا مان لوں؟'' ابا نے تلخ لہجے میں کہا۔

''جب کوئی کاروبار فلاپ ہوجائے تو اس سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔'' اماں نے اپنی توپیں سیدھی کرلیں۔

''یعنی اگر شادی ناکام ہوجائے تو بیوی کو چھوڑ کر نئی تلاش کرلینی چاہیے؟''

''یہ پاکستان نہیں...... یہاں طلاق دینا اتنا آسان نہیں ہے۔'' اماں نے بھاری توپ خانہ استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔

''طلاق دینے والے کی آدھی جائداد اسے مل جاتی ہے جسے طلاق دی جارہی ہو۔''

''یہ قانون بنانے والوں کی نظر میں فیملی سیٹ اپ نہیں ہوگا۔'' ابا نے کہا۔

''طلاق کی شرح میں کمی لانے کے لیے یہ قانون بنا تھا۔'' اماں نے دفاعی مورچے سے فائرنگ جاری رکھی۔

''طلاق کی شرح کم کیا ہونی تھی، شادی اور اس کے فیملی کا سیٹ اپ ہی ختم ہورہا ہے یورپ اور امریکا میں۔'' ابا نے اپنی سب سے بڑی توپ میں گولا ڈال کر اماں کا مورچا تقریباً تباہ کردیا تھا۔

اس دوران ابا کی دودھ پتی تقریباً تیار ہوچکی تھی۔

اماں حیرت سے دودھ پتی کی تیاری دیکھتی رہیں۔

ابا نے کافی کے مگوں میں چائے نکالی اور اماں موٹیل سے باہر چل پڑیں۔

''یہ اب کس طرف چل پڑی؟'' ابا نے مجھ سے سوال کیا۔

''آپ کے سامنے وہ بغیر کچھ کہے گئی ہیں اس لیے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''تمہارا دل کیا کہتا ہے؟'' ابا نے اگلا سوال کیا۔

''میں نے سیتا سے اپنی شادی کی بات کی تھی شاید وہ مسٹر وائٹ سے یہی بات کرنے گئی ہوں۔'' میں نے کہا اور ابا نے قہقہہ لگایا۔

''بلی کو صرف خوابوں میں چھیچھڑے ملتے ہیں۔'' ابا نے خوش دلی سے کہا۔

''آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں؟'' میں نے چھیچھڑے والی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''جس کے باپ کی شخصیت میں اتنا تضاد ہو کہ اپنا کالا رنگ بھول کر اپنا نام ''وائٹ'' رکھ لیا ہو، اس کی بیٹی کو میں بہو نہیں بنا سکتا۔''

''اماں کو اس کی ماں کے ہندو ہونے پر اعتراض ہے اور آپ کو اس کے باپ پر اعتراض ہے۔''

''ان اعتراضات کو دور کیے بغیر ان کی بیٹی ہماری بہو نہیں بن سکتی۔'' ابا نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''اماں کو تو میں کسی نہ کسی طور پر منالوں گا لیکن آپ وزیرستان کے پٹھان ہیں، بات ایک بار دماغ میں گھس گئی تو گولی راستہ بنائے گی تو بات باہر نکلے گی۔'' میں نے کہا۔

''آخر ایسی کیا بات ہے کہ تو اس لڑکی کے لیے مرا جارہا ہے؟'' ابا نے سوال کیا۔

''سیتا کی بات کررہا ہوگا یہ۔'' اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔'' میں نے اپنی عقل کے مطابق دلیل دی۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ مسٹر بلیک اپنی بیٹی کو جہیز میں موٹیل دے گا؟'' ابا نے سوال کیا لیکن ان کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

''آپ دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے تو ہم دونوں کسی روز کورٹ میرج ہی کر لیں گے۔'' میں نے دھمکی دی۔ انہوں نے میری دھمکی سنی اور ہنسنے لگے۔

''جو لڑکا تیس کراس کر چکا ہو اور ایک گرل فرینڈ نہ بنا سکا ہو اس کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔'' اماں نے میری دھمکی کو سنجیدگی سے نہ لینے کا واضح اعلان کیا۔ ساتھ ہی وہ پلیٹ میں چپس اور دوسری چیزیں سجانے لگی جبکہ ابا چائے کو ٹرے میں لگا چکے تھے۔

میں چائے کی ٹرے لے کر مہمانوں کے کمروں کی جانب گیا تو وہ سب مراد کے کمرے میں جمع تھے اور بوتل درمیان میں رکھی تھی۔

میں نے بوتل اور گلاسوں کو ہٹا کر جگہ بنائی اور چائے کی ٹرے وہاں رکھ دی۔ آرتھر وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنا مگ اٹھایا اور پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی اس نے تعریفی جملہ کہا۔ ''پہلے ہی گھونٹ نے تھکن دور کر دی۔'' میں اس سے پہلے بھی یہ چائے پی چکا ہوں انڈیا میں لیکن وہاں اس کا نام کچھ اور ہے۔'' اس نے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

''وہ آئی ہے جس کے پیچھے تم دیوانے ہو۔'' اماں نے میرا چہرہ دیکھتے ہی کہا۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس میں شراب کے لوازمات موجود تھے جن میں چپس اور نمکین بادام تھے۔

''آپ سیدھی جنت میں جائیں گی۔'' مراد نے ٹرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''حرام شے پینے میں مدد کرنے والے جنت میں کیسے جا سکتے ہیں؟'' میں نے کہا اور اماں نے کہا۔

''نیچے چل وہاں وہ تیرا انتظار کر رہی ہے۔''

''کس کی بات کر رہی ہو، سیتا کی؟'' میں نے وضاحت چاہی اگرچہ میں ان کے پہلے فقرے سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہی ہیں۔

''یہ سیتا وہی ہے نا جس کی تم بات کر رہے تھے؟'' مراد نے مجھ سے سوال کیا۔

''جس کے کالے باپ کا نام مسٹر وائٹ ہے۔'' مراد کے بعد تصدق نے بات آگے بڑھائی۔

''چلیں۔'' میں نے اماں کو آگے کرتے ہوئے کہا۔

وہ تو چلی گئیں لیکن مراد نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ''یہ وہی لڑکی ہے جس کے ساتھ کھڑے تم باتیں کر رہے تھے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''شراب پی کر مجھے اکیلا پن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے۔'' آرتھر نے گفتگو میں دخل دیا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' تصدق نے سوال کیا۔

''اگر آج رات وہ میری تنہائی دور کر دے تو میں ہر قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم نے کیا سمجھ کر ایسی بات کی؟'' مراد نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا اور آرتھر نے سوری کہنے میں دیر نہیں کی۔

''اوکے۔'' میں نے اس کی معذرت قبول کر لی۔

میں جب والدہ کے سامنے پہنچا تو وہ سیتا کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔

''ارے تم دونوں تو ہم شکل ہو۔'' سیتا نے میری پشت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں مراد موجود تھا۔

''میں بھی اس پر حیرت زدہ ہوں اور اس وقت سے ہوں جب میں پیٹرول پمپ پر گاڑی روک رہا تھا اور یہ تمہارے موٹیل کے باہر کھڑا تم سے باتیں کر رہا تھا۔'' مراد نے جواب دیا۔

''بات حیرت کی تو ہے لیکن یہ ہوا کیسے؟'' سیتا نے ایک اور سوال کیا۔

''میں وزیرستان، پاکستان سے ہوں جبکہ اس کے والد بھی وزیرستان سے ہیں۔'' اس نے بتایا تھا۔

''میں سیتا ہوں اور روڈ پار جو موٹیل ہے، اس کے مالک کی بیٹی ہوں۔'' سیتا نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کروایا۔

''آپ نے ہمارے موٹیل کو نظر انداز کر کے اس موٹیل میں ٹھہرنا پسند کیا۔'' سیتا نے کہا۔

''ہم جہاں سے آ رہے تھے، راستے میں ہماری نظروں سے آپ کے موٹیل کے سائن بورڈ نظر آتے رہے۔''

''میں نے اسی لیے کہا کہ ہمارا موٹیل نظر انداز کر کے یہاں قیام کرنا پسند کیا جبکہ ہمارے کمرے بھی بڑے ہیں

اور اس کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی ہیں۔''
''مثلاً کون سی اضافی سہولتیں ہیں جو آپ لوگ دے سکتے ہیں؟''
''ہر کمرے میں ٹی وی کی سہولتیں ہیں جس کے کوئی اضافی چارجز نہیں ہیں۔'' سیتا نے اپنے موٹیل کی مارکیٹنگ جاری رکھی۔
''اس کے علاوہ کوئی سہولت ہو تو بتاؤ۔'' میں نے گردن نہیں موڑی لیکن مجھے آرتھر کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا۔
''اس کے علاوہ کوئی اور اضافی سہولت؟'' آرتھر نے دوسرا سوال کیا۔
''ایک اضافی سہولت تو میں ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا اور میں چونک گیا۔ وہ کھلے عام دعوت دے رہی تھی جبکہ میں نے اس کے بارے میں کچھ اور کہا تھا۔
''یہ اضافی سہولت تو ہمیں راہ چلتے بھی مل جاتی ہیں۔'' مراد نے اس کی کھلی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ ''ہم کل نیویارک جا رہے ہیں اس لیے ہمارا قیام طویل نہیں ہوگا۔''
''چلیں جیسے آپ پسند کریں۔'' سیتا نے بھی ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔
''ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟'' والدہ نے گفتگو میں پہلی بار شامل ہوتے ہوئے کہا۔
''ناشتا تو صبح کیا جاتا ہے۔'' مراد نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔
''پہلے بات کرلیں کہ رات میں کیا کھانا پسند کریں گے۔'' مراد نے والدہ سے کہا۔
''آدھا گھنٹے میں کھانا آپ تک پہنچ جائے گا۔'' والدہ نے کہا۔
''اتنا وقت تو دیا جاسکتا ہے۔'' آرتھر نے کہا۔
''کھانے میں کیا ہوگا؟'' مراد نے سوال کیا۔
''میرے شوہر نے پاکستانی بریانی بنانی شروع کر دی ہے۔'' اماں کا جواب تھا۔
''یہ تو بہت اچھا ہوگیا۔'' میری والدہ کے جواب میں آرتھر بول پڑا۔
''آپ لوگ نیویارک جا رہے ہیں، کیا مجھے لفٹ دے سکیں گے؟'' سیتا نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیا۔
''ہم تو کسی کام سے جا رہے ہیں، آپ کیوں جا رہی ہیں؟'' آرتھر نے سوال کیا۔
''اسے آپ میرا ضروری کام سمجھ سکتے ہیں۔'' سیتا نے جواب میں کہا۔
''اور وہ کام کیا ہے؟'' مراد نے پوچھا۔
''میں اپنے بوائے فرینڈ سے ملنا چاہتی ہوں جس سے میں تین ماہ سے نہیں ملی۔'' سیتا کا جواب تھا۔
''کیا وہ نیویارک میں رہتا ہے؟'' مراد نے سوال کیا۔
''اگر وہ کینیڈا نہیں گیا ہے تو نیویارک میں ہی ہوگا۔'' سیتا نے جواب میں کہا۔
''آپ کے والد سے اس کا کیا رشتہ ہے؟'' مراد نے ایک اور سوال کیا۔
''میرے والد اس کے چچا ہیں۔'' سیتا کا جواب تھا۔
''یعنی کزن ہے تمہارا۔'' اس بار اس سوال کرنے والا آرتھر تھا۔
''آپ کہہ سکتے ہیں۔'' سیتا نے بغیر ہچکچاہٹ کے کہا۔
''تین ماہ پہلے تمہارا بریک اپ کس بات پر ہوا تھا؟'' مراد نے سوال کیا۔
''اس کا جواب میں دوں گی۔'' والدہ نے گفتگو میں حصہ لیا اور سیتا سمیت سب ان کی جانب متوجہ ہوگئے۔
''آنٹی چھوڑیں نا اس ذکر کو۔'' سیتا نے اماں کو بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔
''ہم سننا چاہتے ہیں۔'' مراد نے اصرار کیا۔
اماں جو بات بتانا چاہ رہی تھیں، اس کی ابتدا میں جانتا تھا۔
چھ ماہ قبل سیتا گھر چھوڑ کر بوائے فرینڈ کے ساتھ چلی گئی تھی اور دو ماہ بعد واپس آگئی تھی اور اس طرح واپس آئی کہ مہینہ بھر اسپتال میں رہنے کے بعد گھر آئی تھی۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کے بوائے فرینڈ نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر اس کی پٹائی کی تھی کیونکہ سیتا کی موجودگی میں اپنی پرانی گرل فرینڈ کو گھر لے آیا تھا اور جب سیتا گھر آئی تو وہ دونوں ایک بستر میں تھے۔ جب سیتا نے اعتراض کیا تو سیتا کے بوائے فرینڈ نے جو نشے کی حالت میں تھا اس نے بھرپور پٹائی کی جس کے بعد سیتا اسپتال پہنچی تھی۔
سوال یہ کیا جاسکتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں اس قدر تشدد کے بعد کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوئی۔ یہی سوال جب سیتا کی ماں سے کیا گیا تو اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔
''وائٹ نے بیٹی پر بھتیجے کو ترجیح دی تھی۔''
اس قدر پٹائی کے بعد سیتا دوبارہ اس بوائے فرینڈ

کے پاس جانے کے لیے کیوں تڑپ رہی ہے۔ تو اس کا جواب بھی سیتا کی والدہ نے دیا تھا کہ جس چیز نے مجھے اس کالے آدمی کے ساتھ رہنے پر مجبور کر رکھا ہے تقریباً وہی مجبوری سیتا کی بھی ہے۔

انہوں نے کھل کر بات نہیں کی لیکن سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی تھیں۔ سیتا کی والدہ ایک خوب صورت خاتون تھیں اور وائٹ ویسا ہی تھا جیسے دوسرے افریقن ہو سکتے ہیں۔ تقریباً سات فٹ لمبا قد، چوڑی چھاتی کثرت سے بالوں کی وجہ سے ڈھکی ہوئی۔ چوڑے ہاتھ اور اس کی چوڑی ہتھیلیاں۔ کبھی وہ باسکٹ بال کا مشہور کھلاڑی تھا جو کچھ باسکٹ بال سے کمایا تھا، وہ سب کچھ اس نے اس موٹیل میں لگا دیا تھا۔ سیتا کی ماں سے اس زمانے میں اس کی فرینڈ شپ ہوئی تھی جب وہ باسکٹ بال کا کھلاڑی تھا۔ سیتا کی ماں ایک بار اس کی اسیر ہوئی تو ہوتی چلی گئی۔

عجیب سا پیئر تھا ان دونوں کا، وہ ایک عرصہ تک ریلیشن شپ میں رہے تھے۔ سیتا اسی زمانے کی یادگار تھی۔ سات فٹ لمبے کالے شخص کے ساتھ پانچ فٹ دو انچ کی سیتا کی ماں اب بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی لیکن سیتا کے باپ کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ سیتا کی ماں بیمار ہوتی تو مسٹر وائٹ اسے اسپتال تک نہیں لے جاتا جبکہ وائٹ اگر بیمار ہو جاتا تو سیتا کی ماں رات بھر جاگ کر اس کی خدمت کرتی تھی۔

''آپ لوگوں کی واپسی کب ہوگی نیویارک سے؟'' سیتا کو ایک بار پھر نیویارک تک کی لفٹ یاد آ گئی تھی۔

''ہمارا کام تو چند گھنٹوں کا ہے۔'' مراد نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

''تب تو میں واپس بھی آپ کے ساتھ آ جاؤں گی۔'' سیتا نے کہا۔

''مگر آپ تو اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جا رہی تھیں؟'' مراد نے کہا۔

''جس شخص سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی وہ کہاں سے بوائے فرینڈ ہو گیا؟'' سیتا کا جواب تھا۔

''لیکن ابھی تو تم نے کہا تھا۔'' مراد نے سوال کیا۔

''بوائے فرینڈ تھا لیکن اب ہمارے بریک اپ کو بھی عرصہ ہو گیا۔'' سیتا نے جواب میں کہا۔

''تو اب تم اس آسرے پر جا رہی ہو کہ تعلقات بحال ہو جائیں۔'' مراد نے ایک اور سوال کیا۔

اس عرصے میں اس نے نئی گرل فرینڈ نہیں بنالی ہے تو ممکن نہیں ہے۔'' سیتا کا جواب تھا۔

''میری مانو تو کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر شادی کر لو۔'' مراد کا مشورہ تھا۔

''میری ماں کو شادی سے کیا سکھ مل گیا جو مجھے مل جائے گا۔'' سیتا کا لہجہ تلخ تھا۔

''ایک بوائے فرینڈ سے پیچھا چھڑوا کر دوسرے بوائے فرینڈ کی تلاش بھی کوئی زندگی تو نہیں۔'' مراد کا انداز ناصحانہ تھا۔

''تو تمہارے ملک میں ایسا نہیں ہے۔'' سیتا کا سوال تھا۔

''ہمارے ملک میں بغیر نکاح کے ساتھ رہنا جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے۔'' مراد نے کہا۔

''اور موت بھی ایسی کہ بستی کے تمام لوگ پتھر مارتے رہتے ہیں جب تک وہ مر نہ جائیں۔'' میں نے کہا۔

''تم یہ بات کیسے جانتے ہو، تم تو امریکا میں پیدا ہوئے اور اب کینیڈا میں ہو اور جہاں تک مجھے معلوم ہے تم آج تک پاکستان نہیں گئے۔'' سیتا نے کہا اور میں ہنس دیا۔

''تم بھی تو کبھی کینیا نہیں گئیں لیکن وہاں کی بہت سی باتیں جانتی ہو۔'' میرا جواب تھا۔

''میری بات اور ہے۔'' سیتا نے پتلی گلی پکڑنے کی کوشش کی۔

''الگ بات کیسے ہوئی؟'' آرتھر نے دخل دیا۔

اس دوران مراد کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا اور بولا۔ ''جی بابا خیریت ہے۔''

دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا، وہ تو میں نے نہیں سنا لیکن مراد نے جو کہا، وہ میں نے سنا بھی اور سمجھا بھی کیونکہ مراد وزیرستانی پشتو بول رہا تھا جو میں سمجھتا بھی تھا اور کسی حد تک بول بھی سکتا تھا۔ یہ سب بابا کی مہربانی تھی جن کا کہنا تھا کہ اپنی زمین سے رابطہ کبھی نہ ٹوٹنے دینا اور زبان سب سے بڑا رشتہ ہوتا ہے۔

''میں کل صبح نیویارک جا رہا ہوں اور مال پارٹی کے حوالے کر کے پیسے آپ کو ٹی ٹی کر دوں گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو رقم کی اشد ضرورت ہے۔'' مراد اپنی بات کہتا جا رہا تھا۔

''بابا میں امریکی شہری ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' مراد نے اپنے باپ کو تسلی دی اور کچھ دیر بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اب میرا تجسس بیدار ہوا۔ یہ شخص دراصل کون ہے۔

کس مال کی بات کر رہا ہے اور اس کا باپ کون ہے جسے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ ابھی میں اس سوچ میں گم تھا کہ بابا کی آواز سنائی دی، وہ مجھے ہی پکار رہے تھے۔

میں ان چاروں سے اجازت لے کر بابا کی جانب چلا آیا اور سیتا میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

''تم جاؤ، مجھے بابا سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے اسے پیچھے آتا دیکھ کر کہا۔

''تو تم مجھ سے شادی نہیں کر رہے ہو؟'' اس نے وہ سوال کیا جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔

''تم نے خود ہی تو انکار کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میری سمجھ میں مراد کی بات آ گئی ہے۔''

''میں اگر تیار ہو بھی گیا تب بھی میرے والدین نہیں مانیں گے۔'' میں نے زبان کھول دی۔

''انہیں کیا اعتراض ہے؟''

''ان دونوں کا مشترکہ اعتراض یہ ہے کہ سیتا کی ماں انڈین ہے۔''

''تمہارے والد کا اعتراض تو سمجھ میں آتا ہے لیکن تمہاری ماں تو پاکستانی نہیں۔'' مراد نے کہا۔

''اما کے ساتھ رہ کر وہ بھی پاکستانی ہو چکی ہیں۔ کشمیر میں ہونے والے مظالم پر وہ ابا سے زیادہ مودی کو گالیاں دیتی ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''یہ مودی اس لیے بیچ میں آ گیا کہ اماں مودی کی بہت بڑی حامی ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''تو تمہارا ارب پتی سے شادی کرنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔'' مراد نے سیتا سے کہا۔

''خواب ہر کوئی دیکھ سکتا ہے لیکن خواب نصیبوں والوں کا ہی پورا ہوتا ہے۔''

اماں جو اس وقت وہاں نہیں تھیں، وہ سیتا کا فقرہ مکمل ہوتے ہی داخل ہو گئیں۔

''بریانی تیار ہے بس دس منٹ انتظار کر لیں۔'' اماں مخاطب مجھ سے تھیں لیکن سنا وہ ان چاروں کو رہی تھیں جو قریب ہی کھڑے تھے۔

''تم بریانی لے کر آؤ ہم کمروں میں جا رہے ہیں۔'' مراد نے مجھ سے کہا اور وہ چاروں اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

اماں نے بریانی کی ٹرے اور پلیٹیں مجھے تھمائیں اور میں ان کے کمروں کی طرف چل دیا۔

وہ سب مراد کے کمرے میں تھے جبکہ مراد اپنے موبائل پر پشتو میں بات کر رہا تھا۔

''ابا جہاں اتنا انتظار کیا ہے، ایک دن اور انتظار کر لیں۔'' مراد اتنا کہہ کر رک گیا۔

میں بریانی کی ٹرے لے کر پہنچا تو اس کی نظریں مجھ پر پڑیں لیکن وہ دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنتا رہا۔

''بابا اگر وہ گروہ جو آپ کو دھمکیاں دے رہا ہے، اس سے کہہ دیں کہ کل تک رقم پہنچ جائے گی ورنہ وہ چلا جائے ملک میں اتنی غربت ہے کہ بیس لاکھ میں کوئی نہ کوئی جان دینے والا مل ہی جائے گا۔'' مراد نے کہا۔

''تو کیا مراد کا تعلق دہشت گرد تنظیم سے ہے؟'' میں نے خود سے سوال کیا اور غیر ارادی طور پر میری نظریں اس بھاری تھیلے پر پڑیں جسے میں ہی اٹھا کر کمرے تک لایا تھا۔

اس میں یقیناً ہیروئن ہوگی جسے کل یہ نیویارک میں بیچ کر اپنے باپ کے لیے رقم بھیجے گا۔

''اس سے پہلے کہ یہ منشیات نیویارک تک پہنچائے، مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''لیکن کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''پولیس کو فون کر دوں؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے خود سے دوسرا سوال کیا۔

''اگر کسی طرح ان کو پتا چل گیا کہ پولیس کو مخبری کرنے والا میں تھا تو کیا یہ مجھے زندہ چھوڑ دیں گے؟''

''تمہیں منشیات کی رقم کا بیس پرسنٹ ملے گا۔'' دماغ سے جواب آیا۔

''بیس پرسنٹ تو تب ملیں گے جب زندہ بچوں گا۔'' میں نے اس آئیڈیے کو مسترد کرتے ہوئے سوچا۔

مجھے کسی طرح اس منشیات کے تھیلے کو اپنے قبضے میں لینا ہوگا۔

''لیکن بیچو گے کیسے؟'' دماغ نے اس آئیڈیے کو مسترد کیا۔

''وہ بعد کی بات ہے۔'' میں نے دماغ کے سوال کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

وہ چاروں بریانی پر ٹوٹے ہوئے تھے اور میں دماغی جنگ میں مصروف تھا۔

''یار اب وہی دودھ پتی پلوا دے۔'' آرتھر نے فرمائش کی۔

''آپ چاروں کے لیے؟'' میں نے یونہی چلتے چلتے سوال کیا۔

''رات آرام سے کٹ جائے گی۔'' آرتھر نے ہی جواب دیا۔

میں نے کچن میں جا کر چار چائے کے لیے کہا اور والد سے کہا۔ ''بابا میڈیکل اسٹور سے خواب آور گولیوں کا ڈبا لے آئیں۔'' میں جانتا تھا کہ میڈیکل اسٹور والا بغیر ڈاکٹر کے نسخے کے خواب آور گولیاں مجھے نہیں دے گا لیکن بابا خواب آور گولیوں کے مستقل گاہک تھے اس لیے انہیں کسی حیل وحجت کے پیکٹ دے دے گا۔

بابا نے چائے کا پانی چولھے پر رکھا اور بغیر کسی سوال کے باہر کی جانب چل دیے۔

جتنی دیر میں وہ واپس آئے، چائے بن چکی تھی۔ میں نے مگوں میں چائے نکالی اور والد صاحب سے خواب آور گولیوں کا پیکٹ لیا جس میں تیس گولیاں تھیں۔ ہر مگ میں چار گولیاں ڈالیں اور کمرے میں جا کر ان چاروں کے سامنے مگ رکھ دیے۔

میری واپسی اس وقت ہوئی جب وہ چاروں اپنے اپنے کمروں میں سو چکے تھے۔ میں دبے پاؤں مراد کے کمرے کی طرف گیا اور احتیاط سے وہ بیگ کھولا۔ اس میں واقعی ہیروئن تھی اور سب سے اوپر ایک لال رنگ کی ڈائری تھی جس میں درج نام کے ساتھ فون نمبر تھے اور یہ بھی درج تھا کہ کس کو کتنی تعداد میں ہیروئن دینی ہے۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ واپس ہوا اور نیچے اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں نے ڈائری کو اپنے کاغذات پر اتارا اور واپس جا کر سرخ ڈائری کو بیگ میں اسی طرح رکھ دیا۔

صبح ہوئی اور دس بج گئے تو اماں نے مجھ سے کہا۔ ''جا کر دیکھ لے وہ لوگ اٹھے ہیں یا نہیں؟''

''آپ ہی جا کر دیکھ لیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

ہماری بحث ابھی جاری تھی کہ ابا نے کہا۔ ''میں دیکھ لیتا ہوں۔''

ابا گئے اور تھوڑی دیر میں ہی واپس آ گئے۔ ''وہ ناراض ہو رہے ہیں کہ آپ لوگوں نے صبح کیوں نہیں اٹھایا ہمیں سویرے ہی نکلنا تھا۔'' ابا نے آتے ہی کہا۔

وہ ایک ایک کر کے گاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ مراد نے مجھ سے کہا۔ ''میرا یہ بیگ تم لے کر آئے تھے اب تم ہی گاڑی کی ڈکی میں رکھ دو۔''

میں نے ہیروئن سے بھرا بیگ اٹھایا اور جا کر نیچے بیسمنٹ میں رکھ دیا۔

مراد آخری شخص تھا جو اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے تک میں یہ دعا کرتا رہا کہ وہ ڈکی نہ کھولے لیکن وہ اتنی جلدی میں تھا کہ چائے کے آخری گھونٹ بھی اس نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر لیے۔ ''کتنے ڈالر ہوئے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے بھی اندازے سے بتا دیے جو کچھ زیادہ ہی تھے۔

چاروں گاڑیاں آگے پیچھے نکلیں اور تیزی سے ہائی وے کی طرف گئیں۔

رات ہیروئن سے بھرا بیگ بیسمنٹ میں پہنچانے کے بعد میں نے مراد کی گاڑی کے آگے کے وہیل ڈھیلے کر دیے تھے۔ نٹ ڈھیلے ہونے سے وہیل کہیں بھی کھل سکتا تھا۔

مراد کی کار سب سے آگے تھی اور بقیہ گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں ان سب کی رفتار پیٹرول پمپ سے نکلتے ہی بہت تیز تھی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ ڈھیلے نٹ آگے جا کر وہیل کو چھوڑیں۔ مجھے امید تھی کہ ان ڈھیلے نٹوں کے ساتھ مراد ہائی وے پر زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔

ان کا حادثہ اس وقت کنفرم ہوا جب پولیس کی موبائل ہمارے موٹیل پر آئی۔

''یہ چار گاڑیاں اور ان کے سوار رات آپ کے یہاں ٹھہرے تھے؟''

انہوں نے جو تصویریں دکھائی تھیں، اس سے گاڑیوں کو پہچاننا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

پولیس والے ہم تینوں کو اپنی موبائل میں بٹھا کر ٹورنٹو کے سول اسپتال لے گئے۔

''پہچانو ان کو۔'' انہوں نے مجھے آگے کیا کیونکہ اماں کہہ چکی تھیں کہ پیٹرول ڈالنے سے لے کر آخری چائے میں نے ہی پہنچائی تھی۔ میں نے ایک ایک لاش پہچانی۔

''یہ آرتھر ہے۔ یہ چیمہ اور یہ مراد ہے۔'' میں نے ایک ایک لاش کو ناموں سے پہچانا۔ آخری لاش مراد ہی کی تھی۔

''مگر یہ تو بتائیں حادثہ ہوا کیسے؟''

میں نے آواز سن کر گردن موڑی تو مسٹر وائٹ تھے سیتا کے والد۔

''رفتار تیز تھی۔ سب سے اگلی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا اور پچھلی گاڑیاں ٹکراتی چلی گئیں۔''

مسٹر وائٹ کی آمد سے پولیس والوں کی توجہ ان کی جانب ہو گئی تھی اس لیے میں نے چپکے سے مراد کا قیمتی موبائل اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ شکر ہے کسی نے مجھے ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر مردہ خانے میں لگے کیمرے نے میری حرکت نوٹ کر لی جس کے بعد میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔

اگلے تین دن تک ہمارے موٹیل پر پولیس کی آمد جاری رہی۔ شکر ہے کوئی بیسمنٹ کی جانب نہیں گیا حالانکہ میں ہیروئن والا بیگ دوپہر ہونے سے پہلے ہی ابا کے کمرے میں شفٹ کر چکا تھا۔

تیسرے دن پولیس والے مجھے تھانے لے گئے اور سارجنٹ نے مجھے مراد کا موبائل چوری کرنے والی ویڈیو دکھائی۔ ''یہ کیا حرکت تھی؟'' سارجنٹ نے سوال کیا۔

''بہت عرصے سے میری خواہش تھی کہ میرے پاس قیمتی موبائل ہو۔'' میں نے اپنا سستا موبائل اس کے سامنے کیا۔

ایک لاش کا قیمتی موبائل چوری کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟'' سارجنٹ نے شرم دلانے والے انداز میں سرزنش کی۔

''موبائل کا مالک وہاں پہنچ گیا ہے جہاں کوئی نیٹ ورک کام نہیں کرتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

سارجنٹ کچھ دیر تو خاموش رہا۔

''ان چاروں کی اور کیا چیزیں چوری کی تھیں؟'' سارجنٹ نے دوسرا سوال کیا۔

''رات دیر تک وہ شراب پیتے رہے تھے اور صبح اٹھے بھی دیر سے تھے۔''

''سر میرے خیال میں یہ شراب کا ہینگ اوور تھا جو حادثے کی وجہ بنی۔'' ڈپٹی سارجنٹ نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

''جب تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آتی ہمیں خیالی گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سارجنٹ نے کہا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔'' ڈپٹی سارجنٹ نے اس سے اختلاف کیا۔

ان دونوں کی تکرار نے مجھے ایک نیا راستہ دکھایا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اگر خواب آور گولیوں کی نشاندہی ہو گئی تو میرا بچنا ممکن نہیں ہے۔'' میں نے سوچا۔

''کیا مجھے ڈاکٹر خریدنے ہوں گے؟'' میں نے سوچا۔

''یہ تو ممکن ہی نہیں۔'' میں نے اپنے خیال کو خود ہی رد کر دیا۔

اول تو یہ کہ ڈاکٹر خریدنے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی اور اگر ڈاکٹر نے کسی کو بتا دیا تو مصیبت بڑھ جائے گی۔

سوچتے سوچتے میرا خیال اس سرخ ڈائری سے حاصل ہونے والے فون نمبروں کی جانب مڑ گیا اور تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان سے رابطہ کر لینا چاہیے شاید وہ کچھ کر سکیں۔

یہ سوچنے کے ساتھ ہی میرے قدم سیتا کے موٹیل کی جانب اٹھ گئے۔

وہاں پہنچا تو سیتا اور مسٹر وائٹ دونوں غائب تھے۔ میں نے سیتا کی والدہ سے ایک فون کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے یہ پوچھے بغیر کہ اپنے موٹیل سے فون کیوں نہیں کر لیتے، مجھے اجازت دے دی۔

میں نے جو نمبر سرخ ڈائری سے لیے تھے اس میں سب سے اوپر والے نمبر پر ڈائل کیا تو دوسری جانب ایک بھاری آواز آئی۔ ''کس سے بات کرنی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مسٹر ہارڈی سے۔''

''میں ہارڈی ہی بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''مراد تمہارے لیے جو مال لا رہا تھا، وہ اب میرے پاس ہے۔'' میں براہِ راست مطلب پر آ گیا۔

''اور تم کہاں ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں اپنے موٹیل میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کونسا موٹیل؟'' اس نے سوال کیا۔

ٹورنٹو اور مسی ساگا کے ہائی وے پر ٹورنٹو سے پچاس کلومیٹر آگے دو موٹیل آمنے سامنے ہیں اس میں سے کراچی موٹیل پر آ جانا میں وہیں ملوں گا۔''

نیو یارک سے ٹورنٹو کا فاصلہ کم از کم دس گھنٹے کا ہے۔'' ہارڈی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''دس گھنٹوں میں آ رہا ہوں۔'' اس نے بغیر تفتیش کے کہا۔

''رقم بھی ساتھ لیتے آنا۔'' میں نے تاکید کی۔

''جو مال مراد لا رہا تھا، اس کی قیمت ساٹھ ملین ڈالر

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے مرصع ماہِ اگست 2020ء کا یوم آزادی نمبر
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
افشاں آفریدی و نایاب جیلانی کے قسط وار ناول نہایت اہم موڑ پر
سعدیہ رئیس کے انمول خیالات ...... پڑھیے منی ناول میں انمول میں
مدیحہ شاھد، عائشہ خان اور عفت گل اعزاز کی متاثر کُن تحریریں
عورت کہانی میں فرحین اظفر لائی ہیں ایک اور شاہکار داستان ......
شمع ہدایت میں
اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ
تقدیر ...... کاتبِ الٰہی
کے عنوان سے
نامور مصنفہ و ڈراما نگار
غزالہ عزیز کی زندگی کے
خوب صورت رنگ ملاحظہ کیجیے
وہ آئے بزم میں
اس کے علاوہ
سیما رضا ردا، فوزیہ سرور، ھما علی، فرحت انصاری
سلمیٰ غزل و دیگر کی شاندار قلم آرائیاں ......
رنگارنگ مستقل سلسلے پُر مزاح تراشے اور مسحور کن شاعری ......
یہ سب آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے

تھی۔'' ہارڈی کی آواز کانوں میں آئی۔

''یہ بہانہ مت بنانا کہ اتنی بڑی رقم کے لیے تمہیں وقت دیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''رقم میرے پاس تیار ہے۔'' ہارڈی نے جواب دیا۔

''میں صرف وہ وقت مانگ رہا ہوں جس میں ہم نیویارک سے تمہارے پاس پہنچ سکیں۔'' ہارڈی کا جواب تھا۔

ہارڈی سے بات ختم ہوتے ہی میں نے سیتا کی والدہ سے اجازت لی لیکن اسی وقت سیتا اپنے والد کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔

سیتا کو دیکھتے ہی میرے پرانے جذبات بیدار ہو گئے۔ اب تو میں سیتا کی خواہش کے مطابق ارب پتی ہونے والا تھا۔

''خیریت۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''تم سے ملنے آیا تھا لیکن تم نہیں تھیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اسپتال گئی تھی۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''شکر کرو تم نیویارک کے لیے ان کے ساتھ نہ نکلیں۔'' میں نے کہا۔

''ورنہ آج میری لاش بھی اسپتال میں ہوتی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں واپس آیا تو سب سے پہلے میں نے مراد کا بیگ بیسمنٹ سے نکال کر پیٹرول پمپ پر پہنچایا اب مجھے پاس صرف ہارڈی کا انتظار کرنا تھا۔

دس گھنٹے کا انتظار قیامت کے انتظار سے زیادہ طویل رہا۔

رات دو بجے کے قریب اماں آئیں اور مجھے اندر چلنے کے لیے کہا جسے میں نے ٹال دیا۔

''مجھے یہیں رہنے دیں کوئی گاڑی آئے گی تو مجھے دیکھ کر رک جائے گی، ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی موٹیل میں رک جائے۔'' میں نے بہانہ کیا۔

میں پیٹرول پمپ پر ایک کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

سیتا نے اپنے موٹیل کی چھت سے مجھے دیکھا اور سڑک کراس کرکے میرے پاس آگئی۔ ''نیند نہیں آرہی؟'' اس نے آتے ہی سوال کیا۔

''تم کیوں جاگ رہی ہو؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

''چار لاشیں دیکھنے کے بعد کیسے نیند آسکتی ہے۔''

''پوسٹ مارٹم کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کردیا۔

''ایکسیڈنٹ کیس کا کیا پوسٹ مارٹم ہوگا؟'' سیتا کے جواب نے میری رکتی سانسوں کو بحال کردیا۔

''یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے چھپ کر ڈاکٹرز کی باتیں سنی تھیں۔'' سیتا نے جواب میں کہا۔

''کیسی باتیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''جونیئر ڈاکٹرز نے سینئر ڈاکٹر سے پوچھا۔ پوسٹ مارٹم کب شروع کریں گے؟''

''تو پھر کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''سینئر نے جواب دیا کہ جب کچھ سامنے ہو تو پوسٹ مارٹم کی کیا ضرورت ہے۔'' سیتا کے جواب نے میری سانسیں پوری طرح بحال کردیں۔

''کیا مطلب تھا کہ سب کچھ سامنے ہے؟'' میں نے اپنی مزید تسلی کے لیے سوال کیا۔

''پوسٹ مارٹم کی ضرورت تب ہوتی ہے جب کوئی شک ہو یہاں تو معاملہ بالکل سیدھا اور صاف ہے، اگلی گاڑی کے ٹائر برسٹ ہوئے اور پچھلی گاڑیاں تیز رفتاری کے باعث کنٹرول نہ کرسکیں اور حادثہ ہوا۔ ایک اور وجہ ان سب کا نشے میں ہونا بھی ہے اور یہ سب کچھ بالکل واضح ہے۔'' سیتا نے سینئر ڈاکٹر کی گفتگو کی تفصیل دی تو میں پوری طرح سنبھل چکا تھا۔

سیتا کچھ دیر رکنے کے بعد چلی گئی۔ اس دوران اس کا موضوع میری اور اس کی آئندہ زندگی تھی۔ وہ اس حد تک آگے چلی گئی کہ شادی تو ہوتی رہے گی فی الحال میں تمہیں اپنے بوائے فرینڈ کے طور پر بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چل دی۔

سیتا کو گئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک فیملی بڑی کار میں سوار آکر رکی۔ میں کار میں سوار لوگوں کو پہچانتا تھا۔ فیملی ٹورنٹو کی جانب جارہے تھے۔ پیٹرول ڈلوا کر وہ کچھ دیر رکے پھر اچانک انہوں نے سوال کیا۔ ''ہم رات بھر کے لیے رک سکتے ہیں؟'' ان کا سوال تھا۔ اس فیملی کا تعلق پاکستان سے تھا وہ سن 2000ء میں پاکستان سے شفٹ ہوئے تھے اور ان کا تعلق کراچی سے تھا۔

''خبریں یہ ہیں کہ آگے تیز بارش ہورہی ہے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے ہم رک جائیں۔'' فیملی کے سربراہ نے کہا۔

اس فیملی کو پاکستان سے آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ میں وہ ''لبرل پارٹی'' میں اہم عہدہ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''یار تم بھی تو امیگرنٹ ہو تم لبرل میں شامل کیوں نہیں ہو جاتے؟'' انہوں نے مجھے اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت دی۔

''لبرل وہ واحد جماعت ہے جو امیگرنٹ کی بہتری کے لیے کام کر رہی ہے۔''

میں اگر پاکستان میں ہوتا تو بغیر کچھ مزید سوچے برسراقتدار جماعت میں شامل ہو جاتا لیکن میں خاموش اس لیے رہا کہ کینیڈا میں برسراقتدار جماعت میں شامل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کینیڈا میں قانون ہر ایک کے لیے یکساں ہے چاہے وہ برسراقتدار جماعت کا ہو یا اپوزیشن کا۔

باتوں میں اچانک میں نے سوال کیا۔ ''آپ ٹورنٹو سول اسپتال میں کسی کو جانتے ہیں؟''

''جانتا ہی نہیں ہوں وہاں کے ایک ڈاکٹر ہیں ہارون ان کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔ بہت عرصہ پہلے وہ کینیڈا آگئے تھے اب تو کافی سینئر ڈاکٹر ہیں بلکہ مردہ خانے کے انچارج ہیں، تمہیں کیا کام ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''ہمارے موٹیل میں کل چار افراد نے قیام کیا تھا آج صبح ان کا نیویارک جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوا اور چاروں ہلاک ہو گئے۔'' میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

''صبح جب ہم نکلیں گے تو تم ساتھ چلنا میں تمہاری ڈاکٹر ہارون سے ملوا دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

میرے لیے ان کا فقرہ ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا تھا اس لیے میں فوراً تیار ہو گیا۔

وہ فیملی دو کمروں میں شفٹ ہو گئی اور میں کچن کی طرف چلا گیا۔ ان کے لیے چائے بنانے۔

ہارڈی کا انتظار اب میرے لیے جان لیوا ہو رہا تھا۔ فیملی کی گاڑی کا پیٹرول ٹینک فل کرنے کے بعد میں نے چائے نکالی اور دونوں کمروں میں لے گیا۔

صبح جب میرے والدین بیدار ہوئے تو میں نے انہیں بتایا کہ ایک پاکستانی فیملی رات آئی تھی اور اب دو کمروں میں مقیم ہیں۔ والدہ خوش ہو گئیں کیونکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اس طرح کمرے بک ہوں۔ ابا نے ناشتا تیار کرنا شروع کیا۔ پریشانی بالکل نہیں تھی کیونکہ فیملی پاکستانی تھی۔

ہارڈی کا انتظار کرتے کرتے میں نے اسے ایک بار پھر فون کرنا چاہا اور سرخ ڈائری نکال بھی لی اور اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ میں نے ہارڈی کو اپنا نمبر نہیں دیا کہ وہ اگر لیٹ ہو رہا تو مجھے فون ہی کر دے۔

صبح ہو گئی سورج پوری طرح نکلا نہیں لیکن روشنی پھیل گئی تھی کہ مجھے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں باہر نکلا تو بڑی گاڑی سے ایک لمبا نیگرو اتر چکا تھا۔

''میں ہارڈی ہوں۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''مال کہاں ہے؟'' اس نے وقت ضائع کیے مقصد پر آتے ہوئے کہا۔

کوئی جواب دینے سے پہلے میں نے کمروں کی جانب دیکھا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں وہ صاحب موجود تھے جنہوں نے صبح مجھے ڈاکٹر ہارون سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔

میں ہارڈی کو لے کر اس گوشے کی جانب گیا جہاں مراد کا بیگ موجود تھا۔

ہارڈی کے چہرے پر بیگ دیکھتے ہی ایک معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بیگ کھولا بھی نہیں جیسے اسے اطمینان ہو کہ بیگ وہی ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا تھا۔

''رقم یہیں دے دوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی کار کی جانب اشارہ کیا۔

کار سے اسی کی نسل کا ایک نیگرو نکلا اور گاڑی لے کر ہماری طرف آیا۔

''تمہیں زحمت سے بچانے کے لیے ہم نے ملین ملین کی ساتھ گڈیاں بنا دی ہیں چیک کر لو۔''

میں نے اس بڑے بریف کیس کو تھاما اور صرف ایک نظر اندر موجود ڈالرز کو دیکھا اور بریف کیس لے کر موٹیل کے اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

بیگ اندر بیسمنٹ میں رکھ کر واپس آیا تو ہارڈی وہیں موجود تھا۔

''چیک کر لیے؟'' ہارڈی نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ لیکن اطمینان کر لیا۔'' میرا جواب تھا۔

''امید ہے ہماری آئندہ بھی ملاقات ہو گی۔'' ہارڈی نے اپنی گاڑی کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

جانے سے پہلے انہوں نے اپنی گاڑی کی ٹینکی فل کروائی، اس کے پیسے دیے اور تیزی سے ہائی وے کی جانب چلا گیا۔

میں جب واپس آیا تو پاکستانی فیملی کا سربراہ مجھے لان میں مل گیا۔

''یہ ہارڈی کیوں آیا تھا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

اب میں اسے حقیقت تو نہیں بتا سکتا تھا لیکن اس کے اگلے فقرے نے مجھے چونکا دیا۔

''جانتے ہو یہ امریکا کا سب سے بڑا ڈرگ ڈیلر ہے۔''

''آپ جانتے ہیں اسے؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

''میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ جیکسن ہائٹ میں بدمعاشی کرتا تھا اور ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتا تھا۔'' انہوں نے ایک طرح سے تفصیلی جواب دیا۔

''اس کے دو دوست ہیں جو ہمارا موٹیل خریدنا چاہتے ہیں۔ یہ ہارڈی اس کی سفارش کرنے آیا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔

''تم موٹیل بیچنے میں دلچسپی رکھتے ہو؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''موٹیل کا مالک میں نہیں، میرے والد ہیں۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''چلو ناشتے پر ان سے بھی بات ہو جائے گی۔'' انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

میں خاموش رہا اور کچن کی طرف چلا گیا جہاں والد صاحب آملیٹ تیار کر رہے تھے۔

میں نے پراٹھے اور آملیٹ ٹرے میں سجائے اور لے کر ان کمروں کی طرف چل دیا جہاں وہ فیملی مقیم تھی۔

واپس آکر میں نے ساٹھ ملین ڈالرز وہاں سے نکالے جہاں رکھے تھے اور اسے اپنے کمرے کی الماری میں منتقل کیا اور الماری میں تالا لگا کر چابی جیب میں رکھ لی۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں والد کے پاس آیا اور انہیں بتایا کہ پاکستانی فیملی کے سربراہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔

''کیوں؟'' انہوں نے ایک لفظی سوال کیا۔

''رات ایک شخص آیا تھا، وہ موٹیل خریدنا چاہتا تھا۔''

''لیکن ہم تو بیچنا نہیں چاہتے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گا ٹورنٹو تک۔'' میں نے اطلاع دی۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' والد صاحب نے مجھے مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔

میں وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا اور اپنی دولت پر ایک نظر ڈال کر ان کمروں کی طرف آیا جہاں وہ فیملی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے والد صاحب بھی آ گئے۔

''یہ آپ کے سامنے کا جو موٹیل ہے، وہ بک رہا ہے۔'' والد صاحب کے آتے ہی ان صاحب نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔

''وہ مسٹر وائٹ اور ان کی بیگم کا خیال ہو گا لیکن میں اپنا موٹیل بیچنا نہیں چاہتا۔''

''مسٹر وائٹ نے اپنے موٹیل کی قیمت دو ملین لگائی ہے۔''

''بے وقوف ہے وہ۔'' ابا نے کہا۔

''میں آپ کو اچھی قیمت دلوا دوں گا۔'' انہوں نے اصرار کرنے والے انداز میں کہا۔

ابا نے اس کے باوجود صاف انکار کر دیا۔

وہ کچھ دیر مزید رکے اور پوری فیملی جلدی سے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ میں نے بھی اپنی کار نکالی اور ہم آگے پیچھے موٹیل سے نکلے۔

ٹورنٹو پہنچ کر اگلی کار اسپتال کی جانب مڑی تو میں ان کے پیچھے تھا۔ اسپتال پہنچ کر انہوں نے کار پارک کی اور اندر وہ اسپتال میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ پارکنگ میں ایک اور گاڑی آکر رکی اور اس سے وہ ڈاکٹر اترے جس سے ایک روز پہلے مردہ خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔

''اتنی صبح تم کیسے؟'' ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میں تو پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے آیا تھا کیونکہ پولیس نے تنگ کر رکھا ہے۔''

''اب کیوں تنگ کر رہی ہے پولیس، رپورٹ تو وہ رات ہی لے گئے ہیں۔'' ڈاکٹر ہارون نے کہا۔

''اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں ڈاکٹر لیکن مہربانی کر کے ایک کاپی آپ مجھے بھی دے سکتے ہیں۔'' میں نے درخواست کی۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' انہوں نے آگے بڑھنے سے پہلے کہا۔

میں ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان کے دفتر تک آیا جو مردہ خانے کے ساتھ ہی تھا۔ میرے پیچھے وہ صاحب بھی آ گئے جن کے کہنے پر میں یہاں تک آیا تھا۔

''تم کب آئے؟'' ڈاکٹر ہارون نے ان صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے ساتھ ہوں۔'' انہوں نے جواب

دیا۔

''یہ بھی اچھا ہے کہ تمہارا اپنا کوئی کام نہیں۔'' ڈاکٹر ہارون نے ان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

میں نے اس دوران پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھنی شروع کی۔ رپورٹ میں صرف اتنا درج تھا کہ چاروں کے معدے میں شراب کی کافی تعداد موجود تھی۔ حادثہ شراب پی کر ڈرائیونگ کرنے کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ رپورٹ میں خواب آور گولیوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

''سنو لڑکے۔'' میں رپورٹ لے کر باہر جانے لگا تو ڈاکٹر ہارون نے مجھے مخاطب کیا۔

''تم نے کل ایک لاش کا موبائل اٹھا لیا تھا اس وقت جب ہم سب کی توجہ کسی اور جانب تھی لیکن کیمرے نے تمہاری حرکت نوٹ کر لی تھی۔''

''آپ اس شاٹ کو ڈیلیٹ نہیں کر سکتے؟'' اس شخص نے سوال کیا جسے ڈاکٹر ہارون نے آصف کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''ڈیلیٹ کر سکتا ہوں لیکن ایک کاپی پولیس کے پاس بھی ہے۔'' ڈاکٹر ہارون نے جواب دیا۔

''پولیس اس بارے میں سوال کر چکی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا جواب تھا؟'' ڈاکٹر ہارون نے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کہ میں اپنی گرل فرینڈ کو عرصے سے قیمتی تحفہ نہیں دے سکا تھا اس لیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ اس کی فرمائش تھی؟'' ڈاکٹر ہارون نے ایک اور سوال کیا۔

''نہیں، اس کی فرمائش تو نہیں تھی بس میں نے سوچا کہ قیمتی موبائل لے کر وہ مجھ سے شادی پر تیار ہو جائے گی۔''

''کون ہے وہ......'' ڈاکٹر ہارون نے ایک اور سوال کیا۔

''وہ بھی کل یہاں آئی تھی اپنے باپ کے ساتھ مسٹر وائٹ ہے اس کے باپ کا نام۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم سیتا کی بات کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر ہارون کو سیتا کا نام یاد تھا ان کے کہنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گرل فرینڈ تو بہت اچھی منتخب کی ہے۔'' ڈاکٹر ہارون نے داد دی اور میں مسکرا کر چپ رہا۔

ہم واپسی کے لیے مڑے تو ڈاکٹر ہارون اپنے آفس

کے دروازے تک آئے اور ہم سب سے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔

آصف اور ان کی فیملی اپنی کار میں سوار ہوئے تو ایک خاتون آصف کے سامنے آگئیں۔ انہوں نے کار سے اتر کر اس خاتون سے ہاتھ ملایا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”یہ اقرا ہیں ہمارے شہر کی ممبر پارلیمنٹ ہیں۔“

خاتون سے میں نے ہاتھ ملایا لیکن تعارف کروانے سے پہلے ہی اس نے کہا۔ ”میں انہیں جانتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ان کے والد ہماری طرح پاکستانی ہیں اور والدہ کا تعلق برطانیہ سے ہے۔“

”کیسے جانتی ہو؟“ آصف نے سوال کیا۔

”میں ان کے موٹیل میں اکثر قیام کرتی رہی ہوں۔“ اقرا نے جواب دیا۔

”مجھے یاد نہیں۔“ میں نے کہا اور اقرا نے یوں سر ہلایا جیسے اسے افسوس ہوا ہو یہ سن کر۔

”تمہیں اپنی گرل فرینڈ سے فرصت ملے تو کسی اور جانب دیکھو۔“ آصف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

آصف کا فقرہ سن کر اقرا کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”کون ہے تمہاری گرل فرینڈ؟“ اقرا نے مجھ سے سوال کیا۔

”یہ ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا اور آصف نے قہقہہ لگایا۔

”گرل فرینڈ کا اعتراف ابھی کچھ دیر پہلے تم کر چکے ہو۔“ انہوں نے قہقہے کے دوران کہا۔

”کون ہے وہ؟“ اقرا نے اس بار آصف سے سوال کیا۔

”اس سے ہی پوچھیں۔“ انہوں نے اپنے کاندھوں سے بوجھ اتارا اور اقرا کا رخ میری جانب ہو گیا۔

”گرل فرینڈ رکھنے کے لیے بھاری رقم میرے پاس نہیں تھی۔“ میں نے بھی اپنا بوجھ اتارا۔

”تھی کہہ رہے ہو یعنی اب اس قابل ہو گئے ہو کہ گرل فرینڈ رکھ سکتے ہو؟“ اقرا نے سوال کیا۔

”گرل فرینڈ کی جائز فرمائشیں پوری کرنے کے قابل ہوں۔“

”اور جائز فرمائشیں کیا ہوتی ہیں؟“ اقرا نے سوال کیا۔

”یہ تو تم بتاؤ گی۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”کیا میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہو نہیں تو کیا ہوا، بن تو سکتی ہو۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“ اس نے کہا۔

”تم اتنی مغرور کیوں ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے؟“ اس نے سوال کیا۔

”کس بات پر اتنا غرور ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں ایم پی ہوں، کیا یہ بات مغرور ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ایک سیاست داں کو غرور سوٹ نہیں کرتا۔“

میرے لیے اب وہاں رکنا مشکل ہو رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس آچکی تھی اب مجھے ساٹھ ملین ڈالر کو ٹھکانے لگانا تھا۔

واپسی کے راستے میں پلاننگ کرتا رہا کہ کس طرح ان ساٹھ ملین ڈالرز کو ٹھکانے لگاتا ہے کہ میں حکومت کی نظروں میں نہ آؤں۔

میں واپس پہنچا تو ابا ایک گاڑی میں پیٹرول ڈال رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور اپنے قریب بلایا میں قریب گیا تو انہوں نے مجھے پیٹرول ڈالنے کے لیے کہا۔ میں نے پیٹرول ڈالنے سے پہلے کار میں جھانکا تو وہاں ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ میں نے اسے ہیلو کہا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کو آج سے پہلے نہیں دیکھا آپ یہیں آس پاس تو یقیناً نہیں رہتی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں شکاگو سے آئی ہوں۔“

”کیا واپس جائیں گی یا یہیں رکنے کا ارادہ ہے؟“ میں نے بات سے بات نکالتے ہوئے سوال کیا۔

”میں گرینا ہوں اور ٹی وی پروڈیوسر ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”آپ پروڈیوسر سے زیادہ فلم کی ہیروئن لگتی ہیں۔“ میں نے بات بڑھائی۔

”تو آپ یہاں جاب کی تلاش میں آئی ہیں؟“ میں نے بات مزید بڑھائی۔

”میں اپنی نئی جاب پر آئی ہوں۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”مسی ساگا میں اردو چینلز میں مجھے پروڈیوسر کی جاب کی آفر ہوئی جسے میں نے قبول کرلیا۔“

''اردو چینل مطلب یہ کہ آپ پاکستانی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں انڈین۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'آپ انڈین ہیں یا آپ کے والدین انڈیا سے آئے تھے۔'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''میں پانچ برس پہلے دہلی سے آئی تھی۔'' اس نے مزید کہا۔ ''میں پروڈیوسر کے ساتھ اینکر بھی ہوں۔'' گریٹا نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ کسی روز آپ کے پروگرام میں موقع مل جائے۔'' میں نے کہا۔

''ضرور۔'' اس نے جواب دیا۔

میں ٹینکی فل کر کے پیسے لے رہا تھا کہ سیتا سڑک کراس کرتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔

''ہیلو مسٹر وائٹ۔'' میں نے سیتا کے باپ کو مخاطب کیا۔

''صبح صبح کہاں چلے گئے تھے؟'' انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے گیا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''سب ٹھیک تو ہے نا؟'' مسٹر وائٹ نے سوال کیا۔

''ہاں اب پولیس سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''کل رات میں نے آصف کو تمہارے موٹیل میں دیکھا تھا۔'' مسٹر وائٹ نے سوال کیا۔

''وہ بتا رہے تھے کہ آپ اپنا موٹیل اور پیٹرول پمپ بیچ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ایک دو لوگ آئے تھے دیکھنے لیکن بہت کم لگا رہے تھے۔'' اس کا جواب تھا۔

''آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''دو ملین۔'' ان کا جواب تھا۔

مسٹر وائٹ سے بات کرتے ہوئے میں یہ فراموش کر بیٹھا کہ گریٹا اب بھی وہیں ہے۔

''دو ملین تو بہت زیادہ ہیں۔'' گریٹا بول پڑی تھی۔

''آپ کی تعریف؟'' مسٹر وائٹ کا رخ گریٹا کی طرف تھا۔

''یہ گریٹا ہیں شکاگو سے آئی ہیں اور یہاں ایک ٹی وی چینل نے انہیں جاب آفر کی ہے۔'' میں نے گریٹا کا تعارف کروایا۔

''تمہارے موٹیل میں مجھے کمرا مل جائے گا؟'' گریٹا نے مجھ سے سوال کیا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''جب تک میں یہاں ہوں تب تک رہوں گی۔'' گریٹا نے کہا۔

''آیئے میں آپ کو کمرا دکھا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور گریٹا نے اپنی کار پارک کرنی شروع کر دی۔

گریٹا میرے ساتھ موٹیل میں داخل ہوئی۔

''دو ملین تو وہ بہت مانگ رہا ہے۔'' میرے ساتھ چلتے ہوئے گریٹا نے کہا۔

''اتنی رقم اگر تم اپنے موٹیل پر لگا دو تو اس سے زیادہ کما سکتے ہو۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''اس خالی زمین پر ٹک شاپ بنوا لو۔'' اس نے مشورہ دیتے ہوئے خالی جگہوں کی جانب اشارہ کیا۔

''ٹک شاپ بن تو جائے لیکن چلائے گا کون؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیوں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہماری ورکنگ فورس کم ہے۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' گریٹا نے سوال کیا۔

''یہ کل وقتی جاب ہے۔'' میں نے جواب دینا شروع کیا۔ ''ہم کل تین افراد ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''والد صاحب کی بنیادی ذمے داری کچن ہے جبکہ میں پیٹرول پمپ چلاتا ہوں۔'' میں نے مزید وضاحت کی۔

''جب ٹک شاپ بن جائے گی تو انتظام بھی ہو جائے گا۔'' گریٹا نے کہا۔

میں اسے کمرے تک لایا اور پوچھا۔ ''کچھ چاہیے تو نہیں؟''

''چائے۔'' اس نے کہا اور میں باہر آ گیا۔

میں کچن میں گیا جہاں والدہ موجود تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک ٹی وی اینکر اب مستقل قیام کرے گی۔'' ساتھ ہی کہا۔ ''وہ چائے مانگ رہی ہے۔''

والدہ خوش ہو گئیں اور انہوں نے والد کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔

میں وہاں سے باہر آیا اور کار نکال کر... قریبی قصبے پہنچا اور ایک ٹھیکیدار کو لے کر واپس آیا۔ اسے وہ زمین دکھائی جہاں ٹک شاپ بنی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگلے روز سے وہ کام شروع کر دے گا اور پندرہ دن میں ٹک

شاپ بن جائے گی۔ والد صاحب نے مجھے آواز دی کہ چائے بن گئی ہے۔

میں ٹرے لے کر گریٹا کے کمرے میں گیا تو وہ سو رہی تھی میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور ٹیبل پر ٹرے رکھ کر چائے ڈھک دی۔ خاموشی سے باہر آگیا۔

اگلے روز سے ٹھیکیدار نے کام شروع کر دیا۔

''یہ جو موٹیل کے پیچھے جگہ پڑی ہے تم وہاں لان بنا کر ''باربی کیو'' شروع کیوں نہیں کرتے۔'' ٹھیکیدار نے مشورہ دیا۔

میں ابھی اس مشورے پر سوچ ہی رہا تھا کہ والد صاحب آگئے۔ میں نے انہیں بتایا تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔

''ہمیں اس کے لیے کارگو چاہیے ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی فکر نہ کرو۔'' والد صاحب کا جواب تھا۔

''قصبے میں جو باربی کیو والا ہے، وہ بھی پاکستانی ہی ہے۔'' والد صاحب نے کہا۔

''اسے کینیڈا بلانے میں میرا بہت بڑا ہاتھ ہے بلکہ وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ وہ اپنا اسٹال یہیں لگانا چاہتا ہے۔''

''تو پھر وہ یہاں کے لوگوں کا ٹیسٹ بھی جانتا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' والد صاحب نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ہم تیز مرچ کھاتے ہیں جبکہ کینیڈین تیز مرچ پسند نہیں کرتے۔'' میں نے جواب میں کہا اور والد صاحب سرہلانے لگے جیسے انہیں مجھ سے مکمل اتفاق ہو۔

اس کے بعد کے پندرہ دنوں میں تک شاپ بھی تیار ہوگئی اور والد صاحب نے موٹیل کے پچھلے حصے میں لان بھی تیار کروالیا۔

تک شاپ کے ملازم کا مقصد اس طرح حل ہوا کہ گریٹا نے اسے سنبھال لیا۔

گریٹا ایک روز میرے ساتھ ٹورنٹو گئی اور وہاں سے تک شاپ کی خریداری کر کے لائی۔ ساتھ میں اس نے آئس کون مشین کا آرڈر بھی دیا جو اگلے روز آگئی اور گریٹا نے اپنی نگرانی میں اس کی فٹنگ بھی کروالی۔

گریٹا کا ٹی وی پروگرام شروع ہوا تو اچانک سے تک شاپ کی سیلز بھی بڑھ گئی۔

پیٹرول پمپ پر آنے والی شاید ہی کوئی گاڑی ہو جو تک شاپ کا رخ نہ کرتی ہو اور اگر کار میں بچے بھی ہوں تو وہ ضد کر کے آئس کون بھی خریدتے تھے۔

ابا نے کراچی موٹیل کا نام اب کراچی موٹیل اینڈ ریسٹورنٹ کر دیا تھا۔

میرے ساٹھ ملین ڈالر اسی طرح بیگ میں بند تھے جو رقم خرچ ہوئی تھی وہ اتنی نہیں تھی کہ مجھے اس میں سے رقم نکالنے کی ضرورت بھی ہوتی۔ ہمارا کاروبار چمک گیا تھا اور بہت سے تو ہمارے مستقل گاہک بن گئے تھے۔

موٹیل کے کمرے اب فل رہنے لگے تھے۔

ابا کا کام بھی بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی مدد کے لیے حسن رضا کو رکھ لیا تھا۔ وہی شخص جو باربی کیو کا کام بھی کرتا تھا اور کچن میں ابا کا ہاتھ بھی بٹاتا تھا۔

میں نے کئی بار سوچا کہ گریٹا کو پرپوز کر دوں لیکن حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اماں نے ایک دن کہہ ہی دیا کہ اب شادی کب کرے گا۔

سیتا مجھ پر پوری طرح مہربان تھی لیکن اماں کے سوال کے جواب میں گریٹا کا نام لیا تو انہوں نے یہ نہیں کہا۔ ''وہ تو انڈین ہے۔''

''ایک ہفتے کے اندر گریٹا میری بیوی بن گئی تھی لیکن اس میں ہمارا نقصان یہ ہوا کہ ایک مستقل گاہک سے ہمیں ہاتھ دھونا پڑا۔

گریٹا کا روم بھی اب دوسرے گاہکوں کے لیے کھل گیا تھا جبکہ گریٹا میرے روم میں شفٹ ہوگئی۔

ساٹھ ملین ڈالر کو میں نے اس طرح استعمال کیا کہ اپنی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی بنالی۔

آج میرے پاس ساٹھ سے زیادہ ٹینکرز ہیں جس کا آفس تو ٹورنٹو میں ہے لیکن وہ ڈیزل ہمارے پمپ سے ڈلواتے ہیں۔

ہمارا موٹیل کے کاروبار کے ساتھ ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی خوب چل رہا ہے۔

کچھ دنوں بعد میں اور گریٹا پلان کر رہے ہیں کہ بینک سے لون لے کر ٹیکسیاں لی جائیں۔ ہم نے اجازت لینے کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔ بینک والوں سے بھی بات ہو چکی ہے۔ اب دیکھیں کب اجازت ملتی ہے اور کب ہماری ٹیکسیاں روڈ پر آتی ہیں۔

ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ کنٹینرز کے ڈرائیورز کی طرح ٹیکسی ڈرائیور بھی پاکستان سے بلوائیں۔ آپ میں سے کوئی کینیڈا میں ٹیکسی چلانے کا خواہش مند ہو تو ضرور اپلائی کرے شرط صرف یہ ہے ڈرائیونگ آتی ہو۔ ٹیکسی کا لائسنس ہم بنوا دیں گے۔

❖❖❖